بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پچیسویں فقہی سمینار منعقدہ مؤرخہ ۲۵ـ۲۷ربیع الآخر ۱۴۳۷ھ
مطابق ۵ـ۷رفروری ۲۰۱۶ء کو جامعہ عربیہ اسلامیہ دارالحدیث بدرپور ضلع کریم گنج، آسام
میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات ومناقشات کا مجموعہ]

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) - نئی دہلی

B1

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب
صفحات	:	۳۶۲
قیمت	:	۳۶۰/روپے
سن طباعت	:	جنوری ۲۰۱۷ء

ناشر

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

۱۶۱—ایف، جوگا بائی، پوسٹ باکس نمبر:۹۷۴۶
جامعہ نگر، نئی دہلی — ۱۱۰۰۲۵
ای میل: fiqhacademy@gmail.com
فون: 011 - 26981779

مجلس ادارت

۱– مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی

۲– مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

۳– مولانا بدر الحسن قاسمی

۴– مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۵– مولانا عتیق احمد بستوی

۶– مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۹

باب اول : تمہیدی امور ۱۳–۷۲

سوالنامہ		۱۳
تجاویز		۱۵
تلخیص مقالات	مفتی امتیاز احمد قاسمی	۱۷
عرض مسئلہ : (سوال ۱–۵)	مولانا ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی	۵۰
عرض مسئلہ : (سوال ۶–۸)	مولانا اختر امام عادل قاسمی	۶۲

باب دوم : تفصیلی مقالات ۷۳–۳۰۰

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب	مولانا خورشید انور اعظمی	۷۵
بین مذہبی مذاکرات: احکام وآداب	مولانا اختر امام عادل قاسمی	۸۶
مختلف مذاہب کے مابین مذاکرات — اصولی وشرعی نقطہ نظر	مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی	۱۱۲
ہندوستان میں بین مذہبی مذاکرات: اصول اور طریقہ کار	ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی	۱۲۵
بین مذہبی مذاکرات — حدود وقیود، اصول وآداب	مولانا ثناء الہدی قاسمی	۱۴۳
موجودہ حالت میں بین مذہبی مذاکرات — ضرورت واہمیت	مفتی انور علی اعظمی	۱۵۲
مذاکرہ بین المذاہب — محرکات، ضرورت واہمیت اور خدوخال	ڈاکٹر مولانا صدر الحسن ندوی	۱۶۷
دیگر مذاہب کے ساتھ مذاکرات، اصول وآداب	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	۱۸۵
بین مذاہب مذاکرات۔ اصول وآداب	مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	۱۹۵
بین مذہبی مذاکرات — احکام وآداب	مفتی محمد جمال الدین قاسمی	۲۰۶
موجودہ حالات میں بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب	مفتی سید عبد الرحیم الحسنی	۲۲۸
بین مذہبی مذاکرات۔ اصول وآداب	مولانا محمد عثمان بستوی	۲۵۰

مختلف ثقافتوں کے مابین مذاکرات۔اصول وآداب	مولانا محمد قمر الزماں ندوی	۲۶۱
بین المذاہب مذاکرات—ضرورت واہمیت	مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی شافعی	۲۷۳
بین مذہبی مذاکرات —اصول اور طریقہ کار	قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی	۲۸۲
مذاہب کے درمیان مکالمات اور اس کے اصول۔اسلامی تناظر میں	مولانا مصطفی قاسمی آواپوری	۲۹۳

باب سوم :مختصر تحریریں

۳۵۰–۳۰۱

بین مذہبی مذاکرات۔اصول وآداب	مولانا ابوسفیان مفتاحی	۳۰۳
مختلف مذاہب کے درمیان مکالمات کے اصول وآداب	مفتی عبدالرحیم قاسمی	۳۰۷
ہندوستان میں بین المذہبی مذاکرات :ایک تاریخی جائزہ	مولانا محمد مشتاق تجاروی	۳۱۱
بین مذہبی مذاکرات کے اصول وآداب	مولانا ابوبکر قاسمی	۳۱۶
مذاکرات بین المذاہب کے اصول وآداب	ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری	۳۲۱
عصر حاضر میں بین مذہبی مذاکرات۔اصول وآداب	قاضی ذکاءاللہ شبلی	۳۲۹
بین مذہبی مذاکرات۔اصول وآداب	مولانا احسن عبدالحق ندوی	۳۳۱
دیگر اہل مذاہب سے مذاکرات اور اس کے اصول وآداب	مفتی محمد مقصود فرقانی	۳۳۹
مختلف دیانات کے مابین مذاکرات۔اصول وآداب	مولانا عبدالروف قاسمی	۳۴۳
بین مذہبی مذاکرات۔اصول وآداب	مولانا عبدالمنان آسامی	۳۴۷

باب چہارم :مناقشہ

۳۶۲–۳۵۱

مناقشہ ۳۵۱

پیش لفظ

دنیا میں مختلف ادیان ومذاہب کا وجود ایک حقیقت ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن دین حق ہمیشہ سے ایک ہی ہے، یہی دین حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ عالم انسانیت تک پہنچا، اسی دین کو اپنے اپنے عہد میں انبیاء کرام لے کر آئے، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تک نبوت کا سلسلہ تمام ہوگیا، اور یہ دین اس طرح محفوظ ہوگیا کہ اب قیامت تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی؛ لیکن اگر کسی معاشرے میں مختلف مذاہب پر یقین کرنے والے لوگ رہتے ہوں تو ان کا باہمی رویہ کیا ہونا چاہئے اور ایک کثیر مذہبی سماج میں کس طرح امن وامان کو قائم رکھا جاسکتا ہے؟

اس سلسلہ میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ اگرچہ دین حق ایک ہی ہے، اور اسی سے آخرت کی کامیابی اور نجات متعلق ہے؛ لیکن دنیا میں تمام انسانوں کو اللہ تعالی نے اخوت کے رشتہ سے جوڑا ہے؛ اس لئے مختلف مذہبی گروہوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنا چاہئے، اور دوسروں کے معاملے میں اس وقت تک دخل نہیں دینا چاہئے جب تک وہ خود دینِ حق کے دائرہ میں آنے کو قبول نہ کرلیں، ''**لكم دينكم ولي دين**'' اس کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ حُسن سلوک بھی کرنا چاہئے اور اختلافی امور میں باہم سنجیدہ مذاکرات ہونے چاہئیں، مسلمانوں کے لئے ان مذاکرات کے دو بنیادی مقاصد ہوں گے، ایک: مشترک انسانی مسائل اور اخلاقی اقدار کے لئے مل جل کر کام کرنا، دوسرے: برادران انسانیت تک اسلام کی دعوت پہنچانا، یہ مذاکرات نہ صرف دعوت حق کو سمجھانے میں معاون ثابت ہوں گے؛ بلکہ نفرت کے جذبات کو کم کرنے میں بھی مددگار رہوں گے۔

موجودہ حالات میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ بین مذہبی مذاکرات کئے جائیں اور ایسی کوششوں کو فروغ دیا جائے؛ تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں دنیا کے سامنے جو غلط تصویر پیش کی جارہی ہے، اس کا سد باب ہو، اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا پہلے بھی بین مذہبی مذاکرات کے موضوع پر دوروزہ سمینار منعقد کرچکی ہے، جس میں علماء اور مسلم وغیر مسلم دانشوروں کی ایک مناسب تعداد نے شرکت کی، پھر اس موضوع کے علمی اور فقہی پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے اکیڈمی نے اپنے پچیسویں سمینار منعقدہ جامعہ عربیہ اسلامیہ دارالحدیث بدرپور (آسام) میں اس کو بھی شامل رکھا؛ چنانچہ بحمد اللہ اس موضوع پر بڑے گراں قدر اور تفصیلی مقالات آئے اور غالباً اردو زبان میں پہلی بار اس موضوع پر اتنی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی۔

اللہ جزائے خیر دے محب عزیز مولانا امتیاز احمد قاسمی (رفیق شعبۂ علمی) کو کہ انہوں نے اس موضوع سے متعلق مقالات، مختصر آراء اور مناقشات کو بہتر طور پر مرتب کیا ہے، جو اس موضوع پر دستاویزی اہمیت کا حامل ہے، امید کہ سمینار کے دوسرے مجموعوں کی طرح اسے بھی قبول عام وتام حاصل ہوگا۔ **واللہ ھو المستعان**

۹؍ربیع الاول ۱۴۳۸ھ — (مولانا) خالد سیف اللہ رحمانی

۹؍دسمبر ۲۰۱۶ء — (جنرل سکریٹری: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

☆ ☆ ☆

باب اول

تمہیدی امور

سوالنامہ:

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

گذشتہ ادوار میں ایسا کم ہوا کرتا تھا کہ ایک خطہ میں مختلف مذاہب وادیان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی قابل لحاظ آبادی بستی ہو؛ لیکن موجودہ دور میں معاشی مواقع کی تلاش، سیاسی حالات اور بعض دوسرے اسباب کی بنیاد پر دنیا کے اکثر ملکوں میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی ملی جلی آبادیاں پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ایک اندازہ کے مطابق دنیا کی نصف مسلم آبادی غیر مسلم اکثریت ممالک میں بستی ہے، خود ہمارے ملک ہندوستان کی صورتحال یہ ہے کہ انڈونیشیا کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد یہیں آباد ہے، اسی طرح مسلم ممالک میں بھی غیر مسلم شہری یا تارکین وطن کی قابل لحاظ آبادیاں موجود ہیں، ملیشیا میں چالیس فیصد تعداد غیر مسلموں کی ہے، انڈونیشیا کا حال بھی اسی سے قریب ہے، اسرائیل کے بعد یہودیوں کی سب سے زیادہ تعداد ایران میں رہتی ہے، قبطی عیسائیوں کی سب سے بڑی آبادی مصر میں ہے، جو وہاں کی آبادی کا دس فیصد ہیں، وغیرہ۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ زمانہ میں بین ملکی تعلقات بہت محدود ہوا کرتے تھے، اکثر وبیشتر ان تعلقات کا دائرہ پڑوسی ممالک سے آگے نہیں بڑھتا تھا، ابلاغ اور مواصلات کے تیز رفتار وسائل کے معرض وجود میں نہ آنے کی وجہ سے دور دراز کے ملکوں سے تعلقات کو استوار کرنے کی صورت بھی نہیں تھی، اب مختلف ملکوں اور قوموں کے درمیان تجارتی، معاشی، سیاسی اور دفاعی تعلقات بہت وسعت اختیار کر گئے ہیں، اور کئی ایسے عالمی ادارے موجود ہیں، جو مختلف جہتوں سے مختلف ممالک کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کا کام کرتے ہیں۔

آبادیوں کے اختلاط اور تعلقات کے اس پھیلاؤ کی وجہ سے بین مذہبی مذاکرات کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے، کیونکہ مذاکرات دوسروں کو سمجھنے، اپنے آپ کو سمجھانے، غلط فہمیوں کو دور کرنے، امن وامان کو قائم رکھنے، باہمی اختلافات کو صلح کی میز پر حل کرنے، شدت پسندی کو روکنے اور بقائے باہم کے اصول پر رواداری اور ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ رہنے کو آسان بناتے ہیں؛ لیکن بین مذہبی مذاکرہ جہاں بہت مفید اور اہمیت کا حامل عمل ہے، وہیں یہ بڑا نازک کام بھی ہے؛ کیونکہ ایک مسلمان دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام تو کر سکتا ہے؛ لیکن اپنے مذہب کے کسی حکم سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔

موضوع کی اہمیت اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی ضرورت اور نزاکت کے پیش نظر اکیڈمی نے اپنے پچیسویں فقہی سمینار میں اس موضوع کو بھی شامل کیا ہے، اور اس سلسلہ میں درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں:

۱— مختلف مذاہب کے لوگوں سے جن امور پر مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، وہ بنیادی طور پر تین نوعیت کے مسائل ہوں گے: مذہبی، سماجی اور سیاسی — کیا ان تمام پہلوؤں پر باہمی مذاکرات ہوسکتے ہیں؟

۲— مختلف مذاہب کے درمیان بہت سی تعلیمات میں اشتراک پایا جاتا ہے، کیا باہمی مذاکرات میں ایسی چیزوں کے بارے میں دوسرے مذاہب کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے اوران سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

۳— باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے کیا دیگر اہل مذاہب کے بعض مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کی جاسکتی ہے؟۔

۴— ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے کیا کچھ ایسے اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے جو شرعا واجب نہیں ہیں؛ یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے۔

۵— یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام کی نظر میں اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کی گنجائش نہیں ہے، اس جہت سے شرک پر اور معبودان باطل پر تنقید کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے؛ لیکن بعض دفعہ شائستہ تنقید بھی دل آزاری کا سبب بن جاتی ہے اور بعض اوقات زبان کی بے احتیاطی کی وجہ سے واقعۃً تنقید دل آزار بن جاتی ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کی کیا حدود ہیں، اوران مسائل پر اظہار خیال میں کن آداب کی رعایت کی جانی چاہئے؟

۶— مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر کیا مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے چاہئیں؛ تاکہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جدوجہد کریں؟

۷— جمہوری ممالک کے اندر سیاست میں حصہ داری کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس کے لئے بھی بعض اوقات مذہب کی نمائندہ شخصیتوں یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت پیش آتی ہے، کیاان کے ساتھ باہمی مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں؟

۸— پردے کا جو تصور اسلام میں ہے، دوسرے مذاہب بحالت موجودہ اس سے خالی ہیں، اس صورت حال میں جب بین مذہبی مذاکرات کی مجلسیں یا پروگرام ہوتے ہیں تو بہت سی دفعہ اسٹیج پر خواتین مقرر بھی موجود ہوتی ہیں، ایسے مواقع پر مسلمانوں کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے؟۔

☆☆☆

تجاویز:

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

آج مورخہ ۷/فروری/۲۰۱۶ء کو تجویز کمیٹی کی میٹنگ میں بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب کے موضوع پر غور وخوض کے بعد مندرجہ ذیل تجاویز بہ اتفاق رائے مرتب ہوئیں:

۱۔ مذہبی، سماجی اور سیاسی بنیادوں پر بین مذہبی مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ ان مذاکرات سے مسلمانوں کے مذہبی تصورات وعقائد متاثر نہ ہوں، اور ان کو رواداری، پُرامن بقاء باہم، دعوت دین، غلط فہمیوں کے ازالہ اور سماجی وسیاسی مشکلات کے حل کے لئے استعمال کیا جائے۔

۲۔ مختلف مذاہب کے درمیان بعض قدریں مشترک ہیں، اس لئے مفید مقاصد کے لئے دیگر مذاہب کی کتابوں سے استفادہ اور حوالہ کی گنجائش ہے۔

۳۔ دیگر اہل مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں شرکت جائز نہیں ہے۔

۴۔ ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے عام حالات میں ایسے مباح اعمال سے دست بردار ہونا درست نہیں جو مسلمانوں کی متوارث تہذیب کا حصہ ہیں۔

۵۔ عقیدۂ توحید ورسالت اقوام عالم کے سامنے پیش کرنا اور جملہ کفر وشرک کے رسوم واعمال سے براءت کا اظہار کرنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے، البتہ اس بات کی پوری کوشش کی جائے کہ اظہار براءت کے ایسے طریقے اور اسالیب اختیار نہ کیے جائیں جن سے دیگر اہل مذاہب کی دل آزاری ہو۔

۶۔ صحت مند انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لئے مشترکہ سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن (بدعنوانی)، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور سن رسیدہ افراد کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات وقت کی اہم ضرورت ہیں اور مسلمانوں کو اس میں حصہ لینا چاہئے۔

۷۔ مسلمانوں کے دینی، قومی اور اجتماعی مفادات کے تحفظ کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں، مذہبی تنظیموں اور شخصیات کے ساتھ بہ وقت ضرورت شرعی اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے مذاکرات کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

۸۔ بین مذہبی مذاکرات کو ثمر آور بنانے کے سلسلہ میں درج ذیل اقدامات مفید ثابت ہوسکتے ہیں:

الف: مذاکرات کی صلاحیت کے حامل مسلم اسکالرس کا ایک وفاق بنایا جائے۔

ب: ہر صوبہ کے ممتاز دینی مدارس اور جامعات میں تقابلی مطالعۂ ادیان ومذاہب پر خصوصی توجہ دی جائے، اور اس کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا جائے۔

ج: ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں قائم مذاہب وادیان کے شعبوں سے مسلسل رابطہ رکھا جائے اور ان سے استفادہ کی بھرپور کوشش کی جائے۔

د: مختلف ادیان ومذاہب کے رہنماؤں کا ایک متحدہ پلیٹ فارم تشکیل دیا جائے، جس کے اجتماعات وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف اہم علاقوں میں منعقد کیے جائیں۔

ہ: ملک کی مختلف مذہبی تنظیموں اور اداروں سے براہ راست مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے کے عملی اقدامات کیے جائیں۔

و: مسلمانوں میں خدمت خلق کے رجحانات کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے، اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے رفاہی تنظیمیں (N.G.Os) قائم کی جائیں اور اس غرض کے لیے قائم اداروں کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

☆☆☆

تلخیص مقالات:

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

مفتی امتیاز احمد قاسمی ☆

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پچیسویں فقہی سمینار میں جن چار اہم موضوعات پر بحث وتحقیق اور مناقشہ ہونا ہے ان میں ایک موضوع ''بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب'' ہے، جس کے تحت ۸/سوالات قائم کئے گئے ہیں، اور اہل علم وتحقیق سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ ان سوالات کا مفصل جواب قرآن وسنت، آثار صحابہ اور اجتہادات فقہاء کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

چنانچہ اکیڈمی کو اس موضوع پر کل ۲۶ مقالات موصول ہوئے، جس کی تلخیص کی ذمہ داری اکیڈمی نے مجھے دی ہے، تاکہ ایک دوسرے کی آراء اور دلائل سے واقف ہوا جاسکے، مقالہ نگار کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا اختر امام عادل قاسمی، ڈاکٹر مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا صدر الحسن ندوی، مفتی محمد جمال الدین قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا عبدالرؤف قاسمی، مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی، ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری، مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبدالمنان صاحب، مولانا سید عبدالرحیم الحسنی، ڈاکٹر مشتاق احمد تجاروی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی شافعی۔

اس موضوع کا پہلا سوال یہ ہے:

۱— مختلف مذاہب کے لوگوں سے جن امور پر مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، وہ بنیادی طور پر تین نوعیت کے مسائل ہوں گے: مذہبی، سماجی اور سیاسی — کیا ان تمام پہلوؤں پر باہمی مذاکرات ہوسکتے ہیں؟

چند ایک مقالہ نگار کے علاوہ تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ چونکہ مذاکرات دوسرے کو سمجھنے، اپنے آپ کو سمجھانے، غلط فہمیوں کو دور کرنے، امن وامان کو قائم رکھنے، شدت پسندی کو روکنے اور بقائے باہم کے اصول پر رواداری کو قائم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، اس لئے مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مذہبی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر مذاکرات ہوسکتے ہیں۔ B2

☆ رفیق شعبہ علمی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

مذہبی مذاکرات کے جواز کے دلائل اور اس کے چند نمونے:

۱— بین مذہبی مذاکرات کی مشروعیت پر قرآن کریم کی یہ آیت صراحۃ دلالت کرتی ہے: "ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن" (سورۂ نحل: ۱۲۵) (مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۲— اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قل يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم أن لا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله" (سورۂ آل عمران: ۶۴) (مفتی عبد الرحیم قاسمی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی وغیرہ)۔

۳— رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "جاهدوا المشركين بأموالكم وأنفسكم وألسنتكم" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۵۰۴، سنن نسائی، حدیث نمبر ۳۰۹۶، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۱۸۳۷)۔

علامہ ابن حزم مذکورہ حدیث کے سلسلہ میں کہتے ہیں: یہ اعلیٰ درجہ کی صحیح روایت ہے، جس میں مباحثہ اور مذاکرہ کا حکم دیا گیا ہے اور یہ اس طرح فرض ہے، جس طرح سے کہ جسمانی جہاد (الاحکام ۱/۲۷) (مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

۵— عام الوفود میں یمن کے نصاریٰ کی ایک جماعت دربار رسالت ﷺ میں حاضر ہوئی، جو "وفد نجران" سے سیرت وحدیث کی کتابوں میں معروف ومشہور ہے، یہ وفد اہل علموں کا تھا، اس نے رسول اللہ ﷺ سے بہت طویل مذاکرہ ومکالمہ کیا... (فقہ السیرہ للغزالی ۴۵۹-۴۶۳) (مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، ڈاکٹر مبین سلیم ازہری، مفتی عثمان بستوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۶— اہل نجران کے واقعہ کے ذیل میں علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس کے جواز کی بات کہی ہے اور کوئی خاص مصلحت ہو تو اس کو واجب قرار دیا ہے: "فيها جواز مجادلة أهل الكتاب وقد تجب إذا تعينت المصلحة" (فتح الباری ۸/۹۵) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۷— دعوت وتبلیغ کے لئے بین مذہبی مذاکرات کا مستحسن ہونا "ادع إلى سبيل ربك بالحكمة..." (النحل: ۱۲۵) وغیرہ جیسی آیات سے ثابت ہوتا ہے، اور افہام وتفہیم وازالہ شکوک وشبہات کے لئے مذاکرہ کا ثبوت "وجادلهم بالتي هي أحسن" (النحل ۱۲۵)، اور "ولا تجادلوا أهل الكتاب إلا بالتي هي احسن" (العنکبوت: ۴۶) جیسی آیات اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا خوارج سے مذاکرہ وگفتگو کرنا اور حضرت عمر بن عبد العزیز کا خوارج کے وفد سے مذاکرہ کرنا، یہ اور اس جیسی دوسری روایات سے ہوتا ہے (مقالہ: مفتی عثمان بستوی، مولانا خورشید انور اعظمی)، اس آیت کی تفسیر میں علامہ نسفی لکھتے ہیں: "والآية تدل على جواز المناظرة في الدين" (تفسیر نسفی ۲/۶۸۰) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۸— مذہبی مذاکرات کے نمونے قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر مذکور ہیں، مثلاً :

الف :"قال له صاحبه وهو يحاوره أكفرت بالذى خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سواك رجلا" (سورۂ کہف :۳۷) (مفتی انور علی اعظمی وغیرہ)۔

ب :"وقالوا أإذا كنا عظاما ورفاتا أإنا لمبعوثون خلقا جديدا، قل كونوا حجارة أو حديدا أو خلقا مما يكبر فى صدوركم فسيقولون من يعيدنا قل الذى فطركم أول مرة فسينغضون إليك رؤسهم ويقولون متى هو قل عسى أن يكون قريبا" (سورۂ بنی اسرائیل :۵۰، ۵۱) (مقالہ: مفتی انور علی اعظمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ)۔

ج: سیدنا نوح علیہ السلام کی اپنی قوم سے گفتگو اور ان کا مباحثہ :"أن لا تعبدوا إلا الله، إنى أخاف عليكم عذاب يوم أليم، فقال الملأ الذين كفروا من قومه ما نرك إلا بشرا مثلنا وما نرك اتبعك إلا الذين هم أراذلنا بادى الرأى وما نرى لكم علينا من فضل بل نظنكم كاذبين، قال يقوم أرء يتم إن كنت على بينة من ربى وآتنى رحمة من عنده فعميت عليكم أنلزمكموها وأنتم لها كارهون، ويقوم لا أسلكم عليه مالا إن أجرى إلا على الله وما أنا بطارد الذين آمنوا إنهم ملاقوا ربهم ولٰكنى أركم قوما تجهلون، وياقوم من ينصرنى من الله إن طردتهم أفلا تذكرون، ولا أقول لكم عندى خزآئن الله ولا أعلم الغيب ولا أقول إنى ملك ولا أقول للذين تزدرى أعينكم لن يؤتيهم الله خيرا الله أعلم بما فى أنفسهم إنى إذا لمن الظالمين" (سورۂ ہود :۲۶—۳۱)۔

د : سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ اپنے وقت کے ظالم وکافر حکمراں کے ساتھ "ألم تر إلى الذى حاج إبراهيم فى ربه..." (سورۂ بقرہ :۲۵۸)۔

ھ : سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو اپنے کافر باپ کے ساتھ "إذ قال لأبيه يأبت لم تعبد ما لا يسمع ولا يبصر ولا يغنى عنك شيئا" (سورۂ مریم :۴۲)۔

و: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مباحثہ اپنی قوم کے ساتھ "إذ قال لأبيه وقومه ماهذه التماثيل التى أنتهم لها عاكفون، قالوا وجدنا أبائنا لها عابدين ..." (سورۂ انبیاء :۵۲، ۵۳) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۹ — مذہبی مذاکرہ خوشگوار ماحول میں ایک دوسرے کے مذہب کو جاننے اور حکمت سے اپنے مذہب کو دوسروں تک پہنچانے کا بہترین اور بڑا ذریعہ ہے، اس میں دوسرے کو دعوت کا احساس بھی نہیں ہوتا اور پیغام پہنچ جاتا ہے، اس کی دلیل نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیار کا بیان ہے (ڈاکٹر مبین سلیم ندوی)۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو یہودیوں کو دعوت دینے کے لئے خیبر روانہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :"لأن يهدى الله بك رجلا واحدا خير لك من حمر النعم" (صحیح بخاری ۴/ ۴۷) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ جبکہ مولانا اختر امام عادل قاسمی کی رائے یہ ہے کہ مذہبی بنیادوں پر مذاکرات ممکن نہیں، اس لئے کہ مذاکرات کے لئے مشترکہ بنیادوں کی ضرورت ہے، اور کوئی قوم بالخصوص امت مسلمہ کسی حال میں اپنی مذہبی بنیادوں پر صلح نہیں کرسکتی، چنانچہ عہد نبوی کے ابتدائی مکی دور میں رسول اللہ ﷺ کو مذہبی بنیادوں پر مصالحت کی پیش کش کی گئی تھی، لیکن اللہ پاک کے حکم پر آپ ﷺ نے اس کو مسترد کردیا جیسا کہ معجم صغیر میں ہے: **"فإنا نفرض علیک خصلة واحدة ولک فیها صلاح قال وما هي، قال تعبد إلهنا سنة اللات والعزى ونعبد إلهک سنة قال حتى أنظر ما يأتيني من ربي فجاء الوحي من عند الله عزوجل من اللوح المحفوظ"** (۴۴/۲، حدیث نمبر: ۷۵۱)۔

اور وحی "سورۂ کافرون" کی شکل میں نازل ہوئی، جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس نظریہ کو بالکل ناقابل قبول قرار دیا۔

☆ ایک صفحہ کے بعد مولانا لکھتے ہیں "مذہبی بنیادوں پر مذاکرات کا سب سے زیادہ مضرت انگیز پہلو یہ ہے کہ اس سے امت کی مذہبی شناخت اور تہذیبی وحدت ختم ہوجاتی ہے"۔ مولانا نے اپنی بات کو مختلف آیات واحادیث اور واقعات سے مدلل کیا ہے۔

☆ اسی طرح مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی کی رائے ہے کہ اب جب دین کی تکمیل ہوگئی تو ہم ان مذاکرات کے نتیجے میں اس میں کچھ داخل نہیں کرسکتے اور نہ ہی اس میں کچھ کم کرسکتے ہیں... اس لئے بین مذہبی مذاکرات میں مذہبی معاملات پر گفتگو ہوتو سکتی ہے، لیکن اس مذاکرہ کے نتیجے میں نہ تو کسی مذہبی حکم سے دستبردار ہوا جاسکتا ہے اور نہ ہی مختلف مذاہب کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کو جوڑ کر اور دیگر متقدات کو چھوڑ کر کوئی نیا دینی اور مذہبی اصول بنایا جاسکتا ہے، اس لئے مذہبی معاملات میں مذاکرہ کی بنیاد صرف اور صرف دعوت نقطہ نظر ہوگی اور اس میں سمجھوتے کا کوئی معاملہ کسی بھی درجہ میں نہیں کیا جاسکتا۔

☆ مفتی عبد الرحیم کشمیری صاحب **"إن الدين عند الله الاسلام"**، اسی طرح **"ومن يبتغ غير الاسلام دينا..."**، اور **"فإن حاجوک فقل أسلمت وجهي لله..."** وغیرہ آیات کے بعد لکھتے ہیں: ان آیات پر ایمان رکھنے کے بعد مختلف ادیان کے درمیان تقارب کا تصور قبول نہیں کرسکتا اور نہ ان ادیان کو برابری کے درجہ میں رکھ کر گفتگو کرنے پر راضی ہوسکتا ہے، دو متضاد فکر کیسے مجتمع ہوسکتے ہیں، آگے لکھتے ہیں: اسلام اور غیر اسلام کے درمیان وحدت اور تقارب کا تصور عقلا بھی درست نہیں ہے اور شرعا بھی غلط ہے۔

البتہ چند سطر کے بعد لکھتے ہیں: اب رہا یہ سوال کہ غیر مسلمین کے ساتھ مذاکرات یا مکالمات کی بنیاد کیا ہوگی؟ تو وہ یہ ہے کہ انہیں توحید کی طرف بلایا جائے، اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور اللہ کے آخری نبی ﷺ کی اتباع پر آمادہ کیا جائے، **"قل يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم..."** (آل عمران: ۶۴)۔

☆ مولانا عبید اللہ ابوبکر شافعی لکھتے ہیں: "مذہبی مذاکرات میں اگر دین اسلام کو کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ یا دین اسلام

کے کسی حکم میں ردوبدل، یا استہزاء کا امکان ہو اور اس کا دفاع ناممکن ہو تو پھر اس طرح کے مذہبی مذاکرات کی گنجائش نہیں ہے''۔

سماجی اور سیاسی مذاکرات کے جواز کے دلائل :

۱- "قل یا أهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم" (آل عمران: ۶۴)، اس آیت کریمہ میں یہودیوں کو ایک مشترکہ بنیاد پر مسلمانوں کے ساتھ جمع ہونے کی دعوت دی گئی ہے (اکثر مقالہ نگار نے اس دلیل کو سیاسی وسماجی مذاکرات کے جواز کے ذیل میں پیش کیا ہے)۔

۲- کفار ومشرکین کے ساتھ سماجی امور پر مذاکرہ کے لئے واضح دلیل قبائل قریش کا ایک معاہدہ ہے، جسے ''حلف الفضول'' کے نام سے جانا جاتا ہے، اس معاہدہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ بیان محفوظ ہے: "لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم ولو أدعی به في الإسلام لأجبت" (سیرت ابن ہشام ۱/۱۳۵) (مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۳- مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین اور یہود کی بھی آبادی تھی، علامہ شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں: ''جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمان اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپ ﷺ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا، پوری تفصیل سیرت ابن ہشام میں موجود ہے'' (سیرت النبی ۱/۱۹۵) (مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

یہاں بطور مثال ''میثاق مدینہ'' کی چند مشترکہ بنیادوں کو ذکر کیا جاتا ہے:

☆ جو شخص اس میثاق کی مخالفت کرے گا اس کے خلاف دونوں مل کر کارروائی کریں گے۔

☆ ان کے درمیان باہم ہمدردی اور خیرخواہی اور نیکی کا رشتہ ہوگا، کسی ظلم اور گناہ کا نہیں۔

☆ مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

☆ مدینہ منورہ پر جو حملہ کرے گا اس کے خلاف دونوں مل کر کارروائی کریں گے (مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۴- مشرکین مکہ کے ساتھ صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی اس کی دلیل ہے، جو مشرکین مکہ کے متعدد نمائندے سے گفتگو اور بحث و مباحثہ کے بعد ظہور میں آیا، جس کا سیاسی فائدہ فتح مکہ، شاہان عالم کو دین کی دعوت اور قبائل عرب کی اسلام کی طرف رغبت اور دیگر بہت ساری صورتوں میں سامنے آیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لقد رضي الله عن المؤمنين إذ يبايعونك تحت الشجرة..." (سورۂ فتح: ۱۸، ۱۹، سیرت ابن ہشام ۳/۳۲۲) (مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی وغیرہ)۔

۵—فتح مکہ سے قبل مختلف عربی قبائل ''بنوضمرہ، بنوخزیمہ'' وغیرہ سے معاہدات واضح ثبوت ہیں اس بات کے کہ دیگر مذاہب کے ساتھ ان پہلوؤں پر گفتگو کی جاسکتی ہے (مولانا انور علی اعظمی، ڈاکٹر مبین سلیم ازہری)۔

☆نبی ﷺ کا حلف خزاعہ کی تجدید اور اس میں ایک دفعہ کا اضافہ فرمانا (تاریخ طبری ۱۰۸۴/)۔

☆حضور ﷺ نے بعض جنگی مواقع پر غیر مسلموں سے جو دفاعی اتحاد قائم فرمائے، مثلاً بنو قریظہ کے مقابلہ میں یہود بنوقینقاع سے فوجی مدد لی۔

☆صفوان بن امیہ نے حنین وطائف میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کی جبکہ وہ مشرک تھا (مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۶—طائف سے واپسی میں اللہ کے رسول ﷺ کا مطعم بن عدی کی حمایت حاصل کرنا۔

☆حضور ﷺ کا اپنے چچا ابوطالب سے حمایت لینا۔

☆بعثت کے ساتویں سال کے آخر میں اقتصادی وسماجی بائیکاٹ اور شریف النفس کافروں کا تعاون ومروت۔

☆ہجرت حبشہ سے واپسی میں مکہ کے بعض لوگوں سے حمایت لینا۔

☆حضرت ابوبکرؓ کا ابن الدغنہ سے حمایت لینا وغیرہ واقعات سیاسی وسماجی مذاکرات کی دلیل ہیں (ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری)۔

۷—"أجمع الفقهاء على جواز الاستعانة بالمنافقين والفساق لاستعانة النبى ﷺ بعبد الله بن أبى وأصحابه، والخلاصة أن الاسلام لا يتوانى لحظة عن سعيه لاقامة علاقات طيبة مع غير المسلمين لتحقيق التعاون والبناء فى سبيل الخير والعدل والبر والأمن وحماية الحرمات ونحو ذلك" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶۴۲۱/۸) (مولانا عبید اللہ ابوبکر ندوی شافعی)۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی لکھتے ہیں: ''البتہ سیاسی وسماجی بنیادوں پر مختلف اقوام ومذاہب اور جماعتوں کے درمیان مذاکرات ہوسکتے ہیں اور کسی خاص معاہدہ پر اتفاق رائے بھی کیا جاسکتا ہے، خواہ دوسری جماعت سخت گیر اور متعصّبانہ نظریات ہی کی حامل کیوں نہ ہوں، بشرطیکہ مسلمانوں کا قومی تشخص اور ملی وقار مجروح نہ ہو اور معاہد جماعت اس اتفاقی منشور میں ان سخت گیر اور متعصّبانہ نظریات کو خارج کرنے پر آمادہ ہو، جو مسلمانوں کے مفادات سے متصادم ہوں اور مشترکہ بنیادوں پر اتحاد کے لئے تیار ہو، آیت کریمہ: "قل يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم" (سورۂ آل عمران: ۶۴) اس کی دلیل بن سکتی ہے (مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

مولانا اختر عادل قاسمی صاحب مزید لکھتے ہیں: البتہ اس طرح کے مذاکرات میں اس امر کا لحاظ بھی رکھنا ضروری ہے کہ سماجی وسیاسی بنیادوں پر ہماری قربت ممنوعہ موالات کے دائرے میں داخل نہ ہو، اس سلسلہ میں واضح ہدایات قرآن کریم میں موجود ہیں۔

اکثر مقالہ نگار نے اپنی رائے دینے اور جواب لکھنے سے پہلے تمہیدی طور پر مذاکرہ کا مقصد، اس کی ضرورت واہمیت، مذاکرہ کے اصول وآداب اوراحکام، نیز موجودہ حالات میں مذاکرہ کے مفید نتائج پر تفصیلاً گفتگو کی ہے۔

اس طرح مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے ابتداً مذہبی، سماجی اورسیاسی امور میں آنے والے مسائل کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے۔

سوال نمبر ۲-مختلف مذاہب کے درمیان بہت سی تعلیمات میں اشتراک پایا جاتا ہے، کیا باہمی مذاکرات میں ایسی چیزوں کے بارے میں دوسرے مذاہب کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے اوران سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل مقالہ نگار کی رائے ہے کہ مذاکرات کے درمیان کسی نقطہ اتفاق تک پہنچنے، کسی مشترکہ کاز کو قوت پہنچانے یا اتمام حجت کے لئے دوسرے مذاہب کی کتابوں کا حوالہ دینا اور ان سے استفادہ کرنا درست ہے (مولانا انور علی اعظمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عثمان بستوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا جمال الدین قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا عبدالرؤف صاحب، مفتی عبد المنان، مفتی عبدالرحیم کشمیری، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی مقصود فرقانی، مولانا ذکاء اللہ شبلی، مولانا عبیداللہ ابوبکر شافعی وغیرہ)۔

بشرطیکہ وہ چیزیں قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں موجود ہوں (مولانا انور علی اعظمی، مفتی عبد الرحیم کشمیری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عبیداللہ شافعی وغیرہ)۔

دلائل :

۱-اللہ تعالی نے توحید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے نبی ﷺ سے کہا کہ ان کو اسی متفق علیہ چیز کی دعوت دیجئے جو ان دونوں کے درمیان مشترک ہے، ’’قل يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم...‘‘ (آل عمران: ۶۴) (مولانا انور علی اعظمی، مولانا محمد شناء الہدی قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، مولانا ریاض ارمان قاسمی وغیرہ)۔

آیت مذکورہ سے تبلیغ ودعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہشمند ہو جو عقائد ونظریات میں اس سے مختلف ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اس چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہوسکتا ہو (معارف القرآن ۲/۸۷) (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۲-خود اللہ تعالی نے منسوخہ ادیان والوں پر حجت قائم کرنے کے لئے ان کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے :، چنانچہ اللہ تعالی نے اہل کتاب کو محمد ﷺ پر ایمان لانے کی ترغیب دیتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس نبی امی ﷺ کا ذکر ان کی کتابوں میں موجود ہے، اللہ تعالی نے آپ ﷺ پر ایمان لانے والے اہل کتاب کی تعریف بھی کی ہے :’’الذين يتبعون الرسول

النبی الأمی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والإنجیل یأمرهم بالمعروف وینهاهم عن المنکر ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم إصرهم والأغلال التی کانت علیهم، فالذین آمنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذی أنزل معه أولئک هم المفلحون"(سورۂ اعراف:۱۵۷)(ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی)۔

۳—اسی طرح اللہ تعالی نے یہودیوں کی مذہبی کتاب توریت کے حوالہ سے قصاص کے متعلق دو بنیادی احکام کا تذکرہ فرمایا ہے:

"وکتبنا علیهم فیها أن النفس بالنفس والعین بالعین والأنف بالأنف والأذن بالأذن والسن بالسن والجروح قصاص فمن تصدق به فهو کفارة له ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الظالمون"(مائدہ:۴۵)۔

"وکیف یحکمونک وعندهم التوراة فیها حکم الله ثم یتولون من بعد ذلک وما اولئک بالمؤمنین"(مائدہ:۴۳)۔

مفتی جمال الدین قاسمی ان دونوں آیات کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ضرورت پڑنے پر غیر قوموں کی مذہبی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور حوالہ دیا جاسکتا ہے(نیز دیکھئے: مقالہ مولانا انور علی اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۴—بعض فروعی مسائل میں بھی ان کی کتابوں کا حوالہ دے کر اہل کتاب کو دین محمدی کی طرف لوٹنے کا حکم دیا ہے:"کل الطعام کان حلالبنی اسرائیل إلا ماحرم اسرائیل علی نفسه من قبل أن تنزل التوراة، قل فأتوابالتوراه فاتلوها إن کنتم صادقین، فمن افتری علی الله الکذب من بعد ذلک فاولئک هم الظالمون"(سورۂ آل عمران: ۹۳، ۹۴)(مولانا انور علی اعظمی)۔

۵—قرآن کریم میں اللہ تعالی نے بہت سی آیات میں اہل کتاب کو متوجہ کرنے کے لئے توریت وانجیل کا حوالہ دیا ہے، مثلاً:

☆"وإذأخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون إلا الله وبالوالدین إحسانا وذی القربی والیتامی والمساکین وقولوا للناس حسناوأقیموا الصلاة وأتوا الزکاة ثم تولیتم إلا قلیلا منکم وأنتم معرضون"(سورۂ بقرہ:۸۳)۔

☆"وآتینا موسی الکتاب وجعلناه هدی لبنی اسرائیل أن لا تتخذوا من دونی وکیلا"(سورۂ بنی اسرائیل:۲)۔

☆"ولیحکم أهل الإنجیل بما أنزل الله فیه ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الفاسقون"(سورۂ مائدہ:۴۷)(دیکھئے: مقالہ مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی وغیرہ)۔

☆"شرع لکم ما وصی به نوحا والذی أوحینا إلیک وما وصینا به إبراهیم وموسی وعیسی أن أقیموا الدین

ولا تتفرقوا فيه“، آیت کے اس جملہ میں جس دین کی اقامت کا حکم اور اس میں تفرقہ کی ممانعت مذکور ہے وہ وہی احکام الٰہیہ ہیں جو سب انبیاء علیہ السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں، ان میں تفریق اور اختلاف حرام اور موجب ہلاکت امم ہے (معارف القرآن ۷؍۶۷) (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۶ – اللہ تعالیٰ نے باطل ادیان والوں پر بھی حجت قائم کرنے کے لئے ان کی صحیح بات نقل کی ہے: ”**ولئن سألتهم من خلق السموات والأرض وسخر الشمس والقمر ليقولن الله فأنى يؤفكون**“ (عنکبوت: ۶۱) (مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۷ – ”وید“ جو ہندو مذہب کی مذہبی کتاب ہے جسے وہ لوگ سب سے زیادہ مقدس مانتے ہیں اس پر متعدد مسلم عالموں نے کام کیا ہے، اور اس کے تراجم اور تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خالص توحید کا ذکر ہے، جنت وجہنم کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو قرآن وحدیث سے مطابقت رکھتی ہیں، اس لئے متعدد اشلوک سورۂ فاتحہ کی آیتوں سے ملتے ہیں، جیسا کہ شمس نوید عثمانی نے اپنی کتاب ”اگر اب بھی نہ جاگے تو“ میں لکھا ہے (مولانا انور علی اعظمی)۔

۸ – دوسروں پر الزام قائم کرنے کے لئے فقہاء کے یہاں صراحتاً اجازت بھی موجود ہے: ”**ولا ينبغي للرجل أن يسأل اليهودي ولا النصراني عن التوراة والإنجيل والزبور ولا يكتبه ولا يتعلمه ولا يستدل لإثبات المطالب بما ذكر في تلك الكتب وأما استدلال العلماء في إثبات رسالة سيدنا محمد ﷺ بالمذكور في أسفار التوراة وصحف الإنجيل فذلك للإلزام عليهم بما عندهم كذا في الوجيز للكردي**“ (فتاوی ہندیہ ۵؍۳۴۸) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۹ – اگر ان کو یاد دلایا جائے کہ تمہاری کتابوں میں بھی ایسی باتیں لکھی ہوئی ہیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ حق کے قریب آجائیں، نیز ان کی مقدس ہستیوں کے وہ حالات جو امن وامان کی فضا برپا کرنے میں معاون ہوں، وجود صانع اور توحید باری کی حقانیت پر دلالت کرنے والے ہوں، عقیدہ آخرت اور عقیدہ حشر ونشر کو مضبوط بنانے والے ہوں ان کو بیان کرنے سے ان کے قلب ودماغ کو اطمینان ہوسکتا ہے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۱۰ – اس طرح قرآن پاک نے کئی مذہبی کتابوں اور شخصیات کے حوالے دے کر اس کو ایک متفقہ نظریہ قرار دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت ایک واضح صداقت ہے، جس کے لئے بے شمار شواہد وبراہین موجود ہیں، لیکن قرآن کریم نے اس کو ایک بین الاقوامی عقیدہ اور مذاہب عالم کے متفقہ نظریہ کے طور پر پیش کیا ہے، اس کے لئے قرآن نے مختلف مذہبی شخصیات اور کتابوں کے حوالے دیئے ہیں، اور یہ ثابت کیا ہے کہ تمام سابقہ رسولوں اور آسمانی مذاہب کو حضور ﷺ کی نبوت کبری اور آخری زمانے میں آپ ﷺ کی آمد کا علم تھا اور اپنے اپنے دور میں انہوں نے اس حقیقت کا اعلان بھی کیا، دنیا کو بشارت بھی سنائی، اور آپ ﷺ کا اجمالی یا تفصیلی تعارف بھی پیش کیا (تفسیر القرآن العظیم ۸؍۱۱۱)۔

چنانچہ قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ارشاد ہے: ”**وإذ قال عيسى بن مريم يا بني اسرائيل إني**

رسول الله إليكم مصدقا لما بين يدي من التوراة ومبشراً برسول يأتي من بعدی اسمه أحمد فلما جاء هم بالبينات قالوا هذا سحر مبين"(سورۂ صف:٦)،اسی طرح سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ جو پچھلے صفحات میں گذر چکی وغیرہ(دیکھئے مقالہ : مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۱۱— حدیث میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ سے گفتگو کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا :"یا عدی اسلم تسلم فقلت إنی علی دین..."(عدی! اسلام قبول کرو، محفوظ ہوجاؤ گے، انہوں نے کہا کہ میں ایک دین کا پیروکار ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارے دین کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں، کیا تمہارا تعلق "رکوسی" فرقہ سے نہیں ہے؟ میں نے کہا ہاں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اپنی قوم سے چوتھائی مال وصول نہیں کرتے؟ میں نے کہا ہاں، حضور ﷺ نے فرمایا حالانکہ یہ تمہارے دین میں حلال نہیں ہے، میں نے کہا آپ ﷺ نے سچ فرمایا)(سیرت ابن ہشام ۵۸۰/۴،الطبقات الکبری ۳۲۲/۱) (مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

۱۲— مدینہ منورہ میں عبداللہ بن سلام کے اسلام کے قصہ میں یہودیوں سے اس حوالہ سے بات کہی گئی ہے(دیکھئے مقالہ : مولانا مبین سلیم ندوی ازہری، مفتی عثمان بستوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی وغیرہ)۔

۱۳— سابقہ شرائع کے بعض احکام کو اس شریعت میں بھی باقی رکھا گیا ہے، جیسے محصن زانی کے رجم کا حکم ہے، کتب حدیث میں مذکور ہے :"إن اليهود جاؤا إلى رسول الله ﷺ فذكروا له أن رجلا منهم وامرأة زنيا، فقال لهم رسول الله ﷺ ماتجدون فی التوراة فی شأن الرجم؟فقالوا نفضحهم ويجلدون، قال عبد الله بن سلام كذبتم إن فيها الرجم..."(صحیح بخاری مع فتح الباری ۱۶۶/۱۲، احکام اہل الذمہ، حدیث نمبر :۶۸۴۱)(مقالہ : مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۱۴— بعض دفعہ فریق ثانی کے لئے یہ طریقہ زیادہ مؤثر اور قابل قبول ثابت ہوتا ہے(مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۱۵— کئی صحابہ تورات وانجیل کے عالم تھے، مثلاً حضرت سلمان فارسی، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن کعب بن احبار وغیرہ، یہ حضرات تورات وانجیل پڑھنا جانتے تھے اور اس کا مطالعہ بھی کرتے تھے، جس کی خبر حضور ﷺ کو تھی، لیکن آپ ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا، دراصل تہذیبی اختلاط اور مصدر قانون سمجھ لئے جانے کے اندیشہ سے آپ ﷺ نے ابتداء میں دیگر مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے سخت ممانعت فرمائی تھی، لیکن جب لوگوں کے قلب میں راسخ ہوگیا کہ مصدر قانون صرف قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے تو محض علمی اضافہ یا اتمام حجت کے لئے ان کو گاہ بگاہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمادی(دیکھئے مقالہ : مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۱۶— اسی طرح حدیث نبوی ﷺ ہے :"حدثوا عن بنی اسرائيل ولا حرج"(صحیح بخاری، حدیث نمبر :۳۴۶۱)

(یعنی بنی اسرائیل سے منقول باتوں کو (اگر قرآن وحدیث سے نہ ٹکرائے تو اسے) بیان کرو، تائیدی بات نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (مولانا ابوبکر قاسمی)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی اور مفتی عثمان بستوی لکھتے ہیں : البتہ دیگر مذاہب کی تعلیمات کو باہمی مذاکرات میں تائید وتحسین اور استعجاب واستحسان کے طور پر ذکر کرنا مناسب نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے پسند نہیں فرمایا، اور صحابہ نے بھی اسے گوارا نہیں کیا (دیکھئے : مقالہ مذکور میں مشکاۃ المصابیح اور صحیح مسلم کی روایات)۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی لکھتے ہیں : لیکن یہ صرف مسلمات کو تاریخی تسلسل عطا کرنے اور سامنے والے کو سمجھانے کی غرض سے ہوگا اور مذاکرہ کرنے والے کو اس کا خیال رکھنا ہوگا بلکہ واضح کردینا ہوگا کہ کوئی بات اگر دوسرے مذہب میں تحریف وتبدیلی کی وجہ سے موجود نہیں ہے تو اس سے اسلام کی حقانیت وصداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور وہ اسی طرح قابل عمل ہیں جیسے دوسرے احکام۔

سوال نمبر ۳— باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے کیا دیگر اہل مذاہب کے بعض مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کی جاسکتی ہے؟۔

اس سوال کے جواب میں تقریبا تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ باہمی مذاکرے اور خوشگوار تعلقات کے لئے دیگر مذاہب کے مذہبی تہوار اور رسوم واعمال میں شرکت شرعا جائز نہیں ہے، خواہ انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو ہی سے کیوں نہ ہو (مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا جمال الدین قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عثمان بستوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا ذکاء اللہ شبلی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی اور مولانا عبیداللہ ابوبکر شافعی وغیرہ)۔

دلائل :

۱— اس لئے کہ یہ سخت گناہ اور حرام ہے اور توحید کے سراسر خلاف ہے، قرآن کریم میں سخت لہجہ میں کہا گیا ہے :

”ولن ترضی عنک الیہود ولا النصاری حتی تتبع ملتھم قل إن ھدی اللہ ھو الھدی ولئن اتبعت أھواء ھم بعد الذی جاء ک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا نصیر“ (سورۂ مائدہ : ۱۲۰) (مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۲— ان میں شرکت اللہ تعالی کے غضب کو دعوت دینے والی چیز ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے : ”لا تجد قوماً یؤمنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم أو أبناءھم أو إخوانھم أو عشیرتھم“ (سورۂ مجادلہ : ۲۲)۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ بیک وقت انسان مومن اور کافر دونوں نہیں ہوسکتا ہے، یا تو وہ حزب اللہ میں شامل رہے گا، یا حزب الشیطان سے ناطہ جوڑے گا (مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۳—اس لئے کہ اللہ تعالی نے کفار کی دوستی اور موالات سے منع فرمایا ہے:"**ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار، ومالکم من دون اللہ اولیاء ثم لاتنصرون**"(سورۃ ہود :۱۱۳)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ شبیر عثمانیؒ رقم طراز ہیں: ""پہلے "لاتطغوا" میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا، اب بتلاتے ہیں کہ جولوگ ظالم (حد سے نکلنے والے) ہیں ان کی طرف تمہارا ذرا سا میلان اور جھکاؤ بھی نہ ہو، ان کی موالات، مصاحبت، تعظیم وتکریم، مدح وثنا، ظاہری تشبہ، اشتراک عمل، ہر بات سے حسب مقدور محترز ہو، مبادا آگ کی لپیٹ تم کو نہ لگ جائے...." (ترجمہ شیخ الہند ر۳۱۰، نیز دیکھئے: تفسیر ماجدی ر۴۸۲) (مقالہ: مولانا ریاض ارمان قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی وغیرہ)۔

۴—اسلام کفار کے مذہبی خصائص کی مشابہت کو کفر نہیں تو حرام ضرور قرار دیتا ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "**من تشبہ بقوم فھو منھم**" (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۰۳۱) (مقالہ: ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مولانا عبیداللہ ندوی شافعی)۔

۵—اگر مسلمان بھی خواہ رواداری ہی میں کیوں نہ ہو ایسے امور میں شرکت کرتا ہے جو اسلامی نظریہ فکر کے لحاظ سے شرک و کفر پر مبنی ہیں تو خواہ تشبہ نہ سہی کم از کم مشابہت ضرور حاصل ہوتی ہے، جس سے منع کیا گیا ہے، حدیث میں واضح ارشاد موجود ہے: "**لیس منا من تشبہ بغیرنا، لا تشبھوا بالیھود ولا النصاری**" (ترمذی ۹۹/۲)، مذہبی رسوم میں شرکت بھی اسی زمرے میں آتا ہے، لہذا اگر بخوشی اور استحسان کے نظریہ سے شرکت ہو رہی ہو—العیاذ باللہ—تب تو بہت ہی سنگین جرم ہوگا، کیونکہ "**إنما الرضا بالکفر مستحسنا کفر**" (الملتقط: ۲۴۵) (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۶—حضرت عمر بن الخطابؓ غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں شرکت سے سختی سے منع فرماتے تھے اور اس کو غضب الہی کا باعث قرار دیتے تھے: "**ولا تدخلوا علی المشرکین فی کنائسھم یوم عیدھم فإن السخطۃ تنزل علیھم**" (السنن الکبری ۲۳۴/۹، حدیث: ۱۹۳۳۳، مصنف عبدالرزاق ۴۱۱/۱، حدیث نمبر ۱۶۰۹)۔

☆"**عن عبداللہ بن عمرو قال: من بنی ببلاد الأعاجم وصنع نیروزھم ومھرجانھم وتشبہ بھم حتی یموت وھو کذلک حشر معھم یوم القیامۃ...**" (السنن الکبری ۲۳۴/۹، حدیث: ۱۹۳۳۵) (مولانا اختر امام عادل قاسمی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی جمال الدین قاسمی، مفتی محمد مقصود فرقانی وغیرہ)۔

۷—اسی بنا پر ابوحفص کبیر حنفیؒ کا قول ہے: "**لو أن رجلا عبداللہ تعالی خمسین سنۃ ثم جاء النیروز وأھدی إلی بعض المشرکین بیضۃ، یرید تعظیم ذلک الیوم فقد کفر وحبط عملہ**" (البحر الرائق ۵۵۵/۸) اور اس میں شک نہیں کہ مذہبی رسوم واعمال میں شرکت اس دن کی سراپا تعظیم ہے (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۸—غیر مسلم کے مذہبی تہواروں، دینی معاملات میں ان کی موافقت اور ان کے خصائص میں ان کی مشابہت کے حرام ہونے پر علماء اسلام، ائمہ متبوعین اور تمام فقہاء کا اتفاق ہے (دیکھئے: اقتضاء الصراط لابن تیمیہ) (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، نیز دیکھئے

مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

۹— یہ مسلمانوں کی تہذیبی شکست ہے کہ وہ غیر مسلموں کے مذہبی رسوم کی رونق میں اضافہ کرے جبکہ ہمیں ان کی مشابہت سے بچنے بلکہ مخالفت کا حکم دیا گیا ہے، قرآن نے صریح طور پر مقام ''زور'' پر جانے سے منع کیا ہے: ''**والذین لا یشهدون الزور**'' (سورۂ فرقان: ۷۲)۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہاں ''**الزور**'' سے مراد مشرکین کے مذہبی مواقع اور مقامات ہیں (الدر المنثور فی التأویل بالمأثور ۷/۷۷۳، دیکھئے: ابن کثیر ۳/۲۰۹۷) (مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۱۰— شیخ سلیمان جمل شافعی لکھتے ہیں: ''**یعزر من وافق الکفار فی أعیادهم**'' (حاشیۃ الجمل ۱۰/۱۳۴) (ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی)۔

۱۱— علامہ ابن حجر ہیتمیؒ فرماتے ہیں: ''**ومن أقبح البدع موافقة المسلمین النصاری فی أعیادهم بالتشبه بأکلهم والهدیة لهم وقبول هدیتهم وأکثر الناس اعتناء بذلک المصریون وقد قال** ﷺ: **من تشبه بقوم فهو منهم، بل قال ابن الحاج: لا یحل لمسلم أن یبیع نصرانیا شیئا من مصلحة عیده لا لحما ولا دما ولا ثوبا إذ هو معاونة لهم علی کفرهم وعلی ولاة الأمر منع المسلمین من ذلک**'' (الفتاوی الکبری ۴/۲۱۶)۔

علامہ وہبہ زحیلیؒ فرماتے ہیں: ''**لا یجوز لهم إظهار أعیادهم فلا یجوز للمسلمین ممارتهم علیه ولا مساعدتهم ولا الحضور معهم**'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۲/۷۷۳) (مقالہ مولانا عبید اللہ ندوی شافعی)۔

۱۲— شریعت مقدسہ نے مسلمانوں کو ایسے مجمع میں شریک ہونے اور بیٹھنے سے منع کیا ہے، جہاں آیات اللہ (اسلامی احکام) کے ساتھ استہزا یا توہین یا ان کی تکذیب کی جاتی ہو، ''**إذا سمعتم آیات اللہ یکفر بها ویستهزاء بها فلا تقعدوا معهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره إنکم إذا مثلهم**'' (سورۂ نساء: ۱۴۰) (مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی)۔

مفتی عبد الرحیم قاسمی نے اس آیت کے ذیل میں اہل باطل کے ساتھ مجالست کی چند صورتیں اور اس کا حکم ذکر کیا ہے:

اول: ان کے کفریات پر رضا کے ساتھ، یہ کفر ہے، دوم: اظہار کفریات کے وقت کراہیت کے ساتھ یہ بلا عذر فسق ہے، سوم: کسی ضرورت دنیوی کے واسطے مباح ہے، چہارم: تبلیغ احکام کے لئے عبادت ہے، پنجم: اضطرار اور بے اختیار کے ساتھ اس میں معذور ہے (معارف القرآن ۲/۵۸۶)۔

البتہ بعض مقالہ نگار حضرات نے غیر مسلموں کی مذہبی اور غیر مذہبی تقریبات، اسی طرح عام حالات اور مجبوری کے حالات میں فرق کرتے ہوئے چند صورتوں میں گنجائش کی رائے دی ہے، مثلاً:

الف— البتہ وہ مسلمان جو پولس اور انتظامیہ میں ہیں، اگر مذہبی تہوار کے موقع پر ان کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے تو پھر

مجبوری کی صورت میں ان کے لئے ان خدمات کا انجام دینا اور حفاظت اور نگرانی کرنا جائز ہوگا (مولانا قمر الزماں ندوی)۔

ب—کسی غیر مسلم کے مرنے کے موقع پر ان کے گھر جاسکتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرسکتے ہیں، ان کے بچے ،بیوی بے سہارا ہوں تو ان کی مالی مدد کرسکتے ہیں، انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے ان کاموں کے کرنے کی گنجائش ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم**" (سورۂ ممتحنہ :۸) (مولانا انور علی اعظمی، مفتی عبد الرحیم کشمیری، مولانا ابوسفیان مفتاحی وغیرہ)۔

ج—دیگر مذاہب کے ایسے پروگرام میں شرکت کرنا جو حسن سلوک اور بھائی چارہ کے قبیل سے ہو، درست ہے، مثلاً ان کو خوشیوں کے موقع پر دعوت بھی دی جاسکتی ہے اور ان کے یہاں جا کر دعوت بھی کھائی جاسکتی ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے :"**لا بأس بأن يضيف كافراً لقرابة أولحاجة، ولا بأس بالذهاب إلى ضيافة أهل الذمة**" (فتاوی ہندیہ ۵/۳۴۷) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

د—ان کی عیادت کی بھی اجازت ہے، المحیط البرہانی میں ہے:"**عن أبي حنيفة: ولا بأس بعيادة اليهود والنصراني لأن العيادة من باب البر والصلة ولا بأس بالبر في حقهم وقد صح أن رسول الله ﷺ عاد يهودياً في جواره قد مرض**" (المحیط البرہانی ۵/۳۶۶) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

ھ—ہندوستان جیسے ملک میں رہنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور موقع کی مناسبت سے حکمت اپنانا ضروری ہے، البتہ ان کے مذہبی رسومات میں شرکت اسلام کے خلاف ہے (مفتی عبد الرحیم کشمیری، مولانا انور علی اعظمی وغیرہ)۔

و—البتہ یہ کہ کوئی شرعی ضرورت پیش آجائے تو اس وقت شرکت درست ہے، جیسے کہ کافر کو کوئی دفن کرنے والا نہ ہو اور وہ مرجائے تو پھر یہ مسلمان اسے گڑھے میں دفن کردے (مفتی محمد مقصود فرقانی)۔

ز—خوشگوار تعلقات اور باہمی مذاکرات کے لئے دیگر مذاہب کی ان مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کرسکتے ہیں جس میں مسلمانوں کا تعلق کام یا عقیدہ کے اعتبار سے صرف باہر کے کام سے رہے، اور دعوتی مقصد سے تجربہ کار دینداروں کی نگرانی میں ہو، جیسے پانی کی سبیل لگانا، غریبوں کو کھانا کھلانا، پریشان حالوں کی مدد کرنا وغیرہ (ڈاکٹر مبین سلیم ازہری، مفتی عبد الرؤف قاسمی وغیرہ)۔

ح—مذکورہ مقاصد کے لئے غیر مسلموں کے میلوں وغیرہ میں شرکت کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس عمل کی وجہ سے کسی بت وغیرہ کی تعظیم نہ ہوتی ہو اور نہ ہی وہاں مشرکانہ کام انجام دیئے جاتے ہوں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ دعوت وتبلیغ کے لئے کفار مکہ کے میلوں میں تشریف لے جایا کرتے تھے، اور اگر یہ شرط نہ پائی جاتی تو شرکت درست نہیں ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :"**وإذا رأيت الذين يخوضون في آياتنا فأعرض عنهم حتى يخوضوا في حديث غيره**" (سورۂ انعام: ۶۸) (مقالہ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا عبید اللہ شافعی وغیرہ)۔

ط—شرکیہ افعال کو چھوڑ کر، فتنہ وفساد سے بچتے ہوئے انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے شرکت کی اجازت ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو ابوطالب کی وفات کے بعد ان کی تدفین کی ذمہ داری انجام دینے کی ہدایت فرمائی تھی (اعلاء السنن ۸/ ۲۸۲، کتاب الفتاوی ۳/ ۱۶۷) (مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالمنان صاحب، مفتی عبدالرحیم کشمیری وغیرہ)۔

سوال نمبر ۴—ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے کیا کچھ ایسے اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے جو شرعاً واجب نہیں ہیں؛ یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے۔

اس سوال کے جواب میں تقریباً نصف مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ قیام امن، ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے ایسے اعمال کو ترک کرنا جو شرعاً واجب نہیں ہیں یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے، درست نہیں ہے (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی جمال الدین قاسمی، مفتی عبدالرحیم کشمیری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ریاض ارمان قاسمی)۔

پہلی رائے رکھنے والوں کے دلائل :

۱—ہر نفع بخش چیز میں اصل اباحت ہے :"**هو الذى خلق لكم ما فى الأرض جميعا**"(سورۂ بقرہ :۲۹)۔

☆امام جصاص رازیؒ لکھتے ہیں:"**الأشياء على الاباحة مما لا يحظر العقل**"(احکام القرآن ۱/ ۳۳)، جن چیزوں کو عقل (اور شرع) ممنوع نہ قرار دے، وہ اباحت پر ہیں۔

☆رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :"**الحلال ما أحل الله فى كتابه والحرام ما حرم الله فى كتابه وما سكت عنه فهو مما عفى عنه**"(المستدرک للحاکم، حدیث نمبر ۷۱۱۵)۔

ان نصوص کے ذکر کے بعد مولانا محمد شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں کہ جو چیز حلال یا حرام نہ ہو وہ مباح ہے، اور کسی مباح چیز کی عمومی اور ابدی تحریم درست نہیں ہے۔

۲—ایسے اعمال کو ترک کرنا حکمت ودانشمندی کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہے، کیونکہ اکثریت اس طرح ان کو بعض دینی امور کے ترک تک پہنچادے گی (مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۳—متوارث تہذیب جو شریعت سے متصادم نہیں، وہ ملی وحدت کا ذریعہ ہے، جسے ترک کرنے کی صورت میں ملت کے اندر پراگندی اور انتشار پیدا ہوگا (مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۴—یہ کفر کی بالادستی کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور مسلمان اپنی مرضی سے کفر کی بالادستی قبول نہیں کرسکتے، قرآن کریم میں ہے :"**لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا**"(سورۂ نساء :۱۴۱)۔

☆"الإسلام يعلو ولا يعلى" (الجامع الصحیح المختصر ۱/ ۴۵۴، حدیث نمبر :۷۸) (مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۵- یہ اسلام میں مکمل داخلہ کے منافی ہے، اللہ تعالی نے کسی حلال چیز کو حرام کرنے سے منع فرمایا ہے... اپنی مرضی سے کسی جائز عمل کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دینا یا اس کے ترک کی منظوری دینا بھی نتیجہ کے اعتبار سے تحریم حلال ہی کے زمرہ میں آتا ہے، قرآن پاک میں ہے :"يا أيها النبي لم تحرم ما أحل الله لك" (سورۃ تحریم :۱)، اس آیت کے ذیل میں مولانا اختر امام عادل صاحب اور مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی عثمان بستوی صاحب لکھتے ہیں : جبکہ حضور ﷺ نے کسی جائز چیز کی حرمت کا قانون نہیں بنایا تھا بلکہ صرف عملی طور پر بذات خود اس سے اجتناب کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، مگر قرآن نے اس کو تحریم کے دائرے میں شامل کر کے اس سے ممانعت کر دی۔

☆"يا أيها الذين آمنوا لا تحرموا طيبات ما أحل الله لكم ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين" (سورۃ مائدہ:۸۷) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

اس آیت کے پس منظر میں جو واقعہ نقل کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک یا چند اشخاص نے ترک لحم، ترک، نکاح، ترک نوم وغیرہ کا ارادہ کیا تھا اور اس کو اپنی ذات تک محدود رکھا تھا، لیکن قرآن نے اسے بھی تحریم حلال قرار دیا اور اس طرح کے اقدام پر ممانعت عائد کر دی (صحیح مسلم ۱۲۹/۴، حدیث نمبر ۳۴۶۹) (مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی عثمان بستوی)۔

۶- باہمی ہم آہنگی کے لئے آج ایک جائز چیز کے ترک پر اتفاق رائے کر لیا جائے، لیکن آنے والی نسلیں اس عمل کو نظریہ بنا لیں گے اور اس کو واقعۃ ناجائز یا کم از کم ناپسندیدہ سمجھنے لگیں گے، یہ امت کا زبردست علمی وقومی نقصان ہوگا (مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۷-"یا ایها الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة" کے شان نزول کو پیش کیا جا سکتا ہے، اونٹ کا گوشت کھانا مباح ہے، واجب نہیں، لیکن جب حضرت عبد اللہ بن سلام نے اس کے نہ کھانے کا فیصلہ کیا تو اسے مکمل دخول اسلام کے منافی قرار دیا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی، اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ مباح چیزوں کے ترک کا عزم درست نہیں ہے (مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی عبد الرحیم کشمیری)۔

۸- دراصل جس تھوڑے سے نفع (ہم آہنگی یا وقتی فتنہ وفساد سے تحفظ وغیرہ) کے لئے محبت کی قربانی دی جاتی ہے، اس کے نتائج کس قدر سنگین ہو سکتے ہیں اور آئندہ قوم وملت کو کیا نقصانات پہنچ سکتے ہیں، وہ پیش نظر رہنا ضروری ہے، حکم ان نتائج کے اعتبار سے لگے گا "دفع المفاسد مقدم علی جلب المصالح" (البحر المحیط فی اصول الفقہ ۱۹۹/۴) (مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۹- حضرت تھانوی اور دیگر علماء نے پوری شدت کے ساتھ ذبیحہ گاؤ یا کسی ایسے تہذیبی عمل سے دست بردار ہونے کی مخالفت کی ہے جو گو کہ مذہب میں واجب نہیں ہے، لیکن شعائر اسلامی کا حصہ ہے، امداد الفتاوی میں اس وقت کے اکابر علماء وفقہاء کے حوالے سے یہ رائے نقل کی گئی ہے یا جنہوں نے اس پر دستخط کئے، اور اس رائے کے خلاف کسی کی رائے معلوم نہیں ہے، اس

طرح گویا اس پر ایک عصر کے علماء کا اتفاق ہو چکا ہے (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۱۰—سن ۱۳۳۶ھ میں بہار کے بعض دیہاتوں میں غیر مسلموں کے ساتھ یہ مصالحت ہوئی کہ گائے کی قربانی ترک کردی جائے گی تو انجمن علماء بہار نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۵—۶ رشوال ۱۳۳۶ھ میں یہ تجویز پاس کی تھی:

''اضحیہ بقر شعائر اسلام وسنت نبویہ ہے، یہ ہمیشہ حسب دستور برقرار اور جاری رہے گی، اور مواضعات (دیہاتوں) میں مخالفین اسلام کے دباؤ سے ترک اضحیہ بقر پر جو مصالحت کی گئی ہے وہ بالکل باطل اور ناجائز ہے اور ایسے عقد مصالحت کا نقض واجب ہے (امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب ر ۴۹، جدید ایڈیشن) (مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی)۔

☆ مولانا اختر امام عادل اور مولانا ریاض ارمان قاسمی نے ذبیحہ بقر (گائے) کے شعائر اسلام میں ہونے پر بطور دلائل مختلف آیات، روایات اور عبارات پیش کئے ہیں۔

☆ مفتی محمد عثمان بستوی صاحب اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: ''جو چیزیں شرعاً شعائر اسلام میں شمار ہوتی ہیں مثلاً: اذان، نماز، ختنہ، داڑھی، ذبیحہ، ذبح بقر وغیرہ اور جو امور عادیہ قومی علامت سمجھے جاتے ہوں جن کے ترک سے قومی امتیاز ختم ہو جاتا ہو اور انسان دوسری قوم کا فرد معلوم ہونے لگے، قشقہ، زنار وغیرہ کو اختیار کرنے سے قومی امتیاز ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح اہل اسلام کی لازمی بود و باش اور پوشاک جس کے چھوڑنے سے قومی امتیاز ختم ہو جائے، تو اس کا بھی حکم شعار کا ہوگا، کیونکہ شعار کے معنی علامت کے ہیں، لہٰذا جو چیزیں کسی قوم کی علامت بن جائیں وہ اس قوم کا شعار بن جائیں گی، اور کسی بھی دینی اور قومی شعار کا کسی بھی مصلحت سے ترک کرنا جائز نہیں، شعائر خواہ ثقافتی ہوں خواہ وہ مذہبی ہوں یا عادی ان کی حفاظت بہرحال واجب ہے، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

☆ **"یا یها الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطان إنه لکم عدو مبین"** (سورۂ بقرہ: ۲۰۸)۔

☆ **"وکانوا یقولون ترک هذه الأشیاء (لحم الإبل) مباح فی الإسلام وواجب فی التوراة فنحن نترکها احتیاطاً فکره الله تعالی..."** (تفسیر الکبیر ۵ر۲۰۷)۔

☆ **"روی عبد الله بن عمرو بن العاص ﷺ قال: رای رسول الله ﷺ علي ثوبین معصفرین فقال: إن هذا ثیاب الکفار فلا تلبسها"** (صحیح مسلم)۔

☆ **"روی عن الحجاج بن حسان قال: دخلنا علی أنس بن مالک فحدثتنی أختی للمغیرة قالت: یومئذ أنت غلام ولک قرفان أو قستان فمسح رأسک وتبرک علیک وقال احلقوا هذین أو قصوهما فإن هذا زي الیهود"** (رواہ ابوداؤد)۔

☆ جبکہ مفتی جمال الدین قاسمی کی رائے ہے کہ ہاں انفرادی طور پر اگر کوئی شخص کسی صالح مقصد، دعوت دین یا دفع

B3

مضرت کے لئے کبھی کبھار کسی اسلامی تہذیب کو چھوڑ دے اور اس خاص موقع پر غیر قوموں کی موافقت کرے تو اس کی گنجائش ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

"ومثل ذلک اليوم لو أن المسلم بدار الحرب أو دار الكفر غير حرب لم يكن مامورا بالمخالفة فى الهدى الظاهر لما عليه فى ذلک من الضرر، بل قد يستحب للرجل أو يجب عليه أن يشاركهم أحيانا فى هديهم الظاهر إذا كان فى ذلک مصلحة دينية : من دعوتهم إلى الدين والإطلاع على باطن أمرهم لإخبار المسلمين بذلک أو دفع ضررهم عن المسلمين ونحو ذلک من المقاصد الصالحة" (اقتضاء الصراط المستقیم)۔

☆ مولانا قمر الزماں ندوی لکھتے ہیں : البتہ اگر مسلمانوں کے ان متوارث تہذیب ثقافت کے اختیار کرنے کی صورت میں یقینی فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہو اور غیر مسلم ممالک میں وہاں کی حکومت مسلمانوں کو ان کے چھوڑنے پر مجبور کرتی ہو اور وہاں کے ایوان میں اس کے خلاف قرارداد منظور کرلیا ہو تو ایسی صورت میں ایسے غیر مسلم ممالک میں جو کہ دار الحرب کے حکم میں ہے مسلمانوں کو وقتی طور پر ان متوارث تہذیب وثقافت (جو شرعا واجب نہ ہو) کا ترک کرنا جائز اور درست ہے، اس طرح کے مواقع کے لئے شریعت میں اصول موجود ہیں :

"إذا ضاق الأمر اتسع وإذا اتسع ضاق"، "الضرر يزال"، الضرورات تبيح المحظورات"، "الحرج مدفوع شرعا"، "الحاجة تنزل منزلة الضرورة"۔

جبکہ باقی مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے ایسے اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے جس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے (مولانا احسن عبد الحق ندوی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، ڈاکٹر مبین سلیم ازہری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبد الروف قاسمی، مولانا عبد المنان، مفتی عثمان بستوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی محمد مقصود فرقانی اور مولانا ذکاء اللہ شبلی صاحبان)۔

دوسری رائے رکھنے والوں کے دلائل :

۱ــ قاضی ثناء اللہ عثمانی مظہری نے **"لا تسبوا الذين يدعون..."** (انعام : ۱۰۸) کی تفسیر کرتے ہوئے بطور ضابطہ تحریر کیا ہے: **"وفيه دليل على أن الطاعة إذا أدت إلى معصية راجحة وجب تركها لأن ما يؤدى إلى الشر شر"** (تفسیر مظہری ۳۰۱/۳) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۲ــ کوئی بھی جائز فعل اگر ردعمل کے طور پر کسی محظور ومفسدہ کا ذریعہ ہو، اس کو روک دینے کا نام "سد ذرائع" ہے، چنانچہ :

الف—اگر مفسدہ کا لزوم اور فتنہ کا ظہور یقینی ہو تو اس کے ممنوع ہونے پر اتفاق ہے۔

ب—اگر لزوم مفسدہ کا ظن غالب ہو تب بھی جمہور علماء ممنوع قرار دیتے ہیں۔

ج—اگر اتفاقی طور پر مفسدہ کا لزوم ہو رہا ہو تو یہ صورت ممانعت کے دائرے میں نہیں آتی ہے۔

د—اگر بسا اوقات فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہے نہ تو اکثر ہوتا ہے اور نہ ہی صورت نادر کی ہے، یہ صورت حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک ممنوع نہیں، جبکہ مالکیہ اس کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔

اور اسلام میں سد ذرائع کا اعتبار رہے، اسی بنیاد پر فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ خانہ کعبہ کو بناء ابراہیم کے مطابق بنادیں مگر اس سے اندیشہ تھا کہ نئے مسلمانوں کے قلوب میں آباء واجداد کی موروثی تعمیر کو منہدم کرنے کے نتیجے میں شکوک وشبہات پیدا ہوں گے، اللہ کے رسول ﷺ کعبہ کو بناء ابراہیم کے مطابق کرنے سے باز رہے۔

امام بخاریؒ نے یہ عنوان قائم کیا ہے: "**باب من ترک بعض الاختیار مخافة أن یقصر فهم بعض الناس عنه فیقعوا فی أشد منه**" اس باب کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے:

"**قال النبی ﷺ یا عائشة! لو لا قومک حدیث عهدهم بکفرهم لنقضت الکعبة فجعت لها بابین: بابا یدخل الناس و بابا یخرجون**" (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۱۲۶)۔

☆ علامہ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مفسدہ اور برائی سے بچنے کے لئے کسی مصلحت اور اچھائی کو ترک کیا جاسکتا ہے، نیز کسی برائی پر نکیر نہ کرنا درست ہے جبکہ اس کی وجہ سے اس سے بڑی برائی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو (فتح الباری ۱/۲۲۵، نیز دیکھئے: اعلام الموقعین ۳/۱۱۰، فتاوی ابن تیمیہ ۲۲/۴۷)۔

☆ علامہ عینی نے ابن بطال کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کبھی امر بالمعروف کو ترک کردیا جاتا ہے، جبکہ اس کی وجہ سے کسی فتنہ کا اندیشہ ہو (عمدۃ القاری ۲/۲۰۴) (مذکورہ بالا تفصیلات مندرجہ ذیل حضرات کے مقالات سے نقل کی گئی ہیں: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ابوبکر قاسمی وغیرہ)۔

۳—ان چیزوں کو دفع مضرت کی خاطر ترک کرنا اولی ہی نہیں شرعاً مطلوب بھی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**الفتنة أشد من القتل**" (سورۂ بقرہ: ۱۹۱)۔

☆ مولانا عبید اللہ ندوی شافعی لکھتے ہیں: صلاۃ الخوف میں سہولت کا اختیار، مسافر کی نماز میں تخفیف، تأبیر نخل کے سلسلہ میں آپ ﷺ کی اجازت، صلح حدیبیہ کے معاہدہ میں "بسم اللہ اور رسول اللہ" کے لکھنے کا ترک کرنا، یہ اور اس جیسے دوسرے اصول وقواعد شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے تنگی اور نقصان کے پیش نظر واجبات میں تخفیف اور غیر واجبات میں ترک کی اجازت دی ہے، جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برادران وطن کے ساتھ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے اور فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے غیر

واجب اعمال کو ترک کرنے کی گنجائش ہے۔

لیکن اصل تو یہ ہے کہ مسلمان تہذیبی وتمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسروں کے سامنے ممتاز رکھے، بلکہ اپنی شناخت کو باقی رکھے، خاص طور پر ان امور میں جو شعائر اسلام تصور کئے جاتے ہیں۔

۴—اس لئے کہ زمین میں فساد کو ناپسند کیا گیا ہے اور آپس میں اخوت وبھائی چارہ کا حکم دیا گیا ہے، اور ایک دوسرے کے درمیان صلح صفائی کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے اگر کوئی ایسا عمل جس کا تعلق شرعاً فرض وواجب کے درجہ میں نہیں ہے تو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ باعث ثواب ہے (مولانا احسن عبدالحق ندوی)۔

۵—مولانا انور علی اعظمی صاحب لکھتے ہیں : ہندوستان کی جن ریاستوں میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی ہے اس کی قربانی پر اصرار کرنا ایک غیر ضروری کام ہے، مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح رمضان میں بعض جگہوں پر لاؤڈ اسپیکر کا غیر ضروری استعمال ہوتا ہے، اس لئے اس کا محدود استعمال کرنا جائز ہے (مولانا انور علی اعظمی)۔

۶—مولانا خورشید انور اعظمی کی رائے ہے کہ ایسے متوارث اعمال جو اسلامی شعائر بن چکے ہیں، ان کو تو کسی بھی حال میں ترک کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ان کے علاوہ ایسے متوارث طریقے جو فرض وواجب نہیں ہیں، تو فتنہ سے بچنے کے لئے انہیں چھوڑ دینا درست ہے، مفتی رشید احمد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: ”اگر کوئی کام شرعاً فرض ہے نہ واجب، بلکہ مباح یا مستحب ہے، اس کو کسی دینی مصلحت مثلاً عوام کو فتنہ یا معصیت یا تکلیف سے بچانے کے لئے چھوڑنا جائز ہے“ (احسن الفتاوی ۶ / ۳۷)۔

لاؤڈ اسپیکر پر اذان کا مسئلہ :

اذان ایک اعلان ہے، اذان میں تھوڑا سا وقت لگتا ہے، اذان سے ہندو مسلمان دونوں کوئی پریشانی نہیں محسوس کرتے، اذان دعوت عامہ اور دعوت تامہ ہے، اسلام کا سبق ہے، اس لئے ہمارا اپنی طرف سے اذان کے لئے مائک کے استعمال کی مخالفت کرنا درست نہیں ہے، اس وجہ سے مسلمانوں میں بھی ایک بڑا فتنہ پیدا ہو سکتا ہے اور فرقہ پرستوں کو ہمارے خلاف ایک بڑا ہتھیار مل سکتا ہے، اگر ان کی طرف سے کہیں مخالفت ہوتی ہے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کی مخالفت کی وجہ سے اسلام سے دشمنی تو نہیں ہے، وہ اپنے جلوس میں ڈی جے کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اور ایک ساتھ پچیس تیس اسپیکر لگا کر چلتے ہیں، سب کے کان پھٹنے لگتے ہیں، سرکار نے ڈی جے کے استعمال کو غیر قانونی قرار دیا ہے لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے، اس ماحول میں اگر ہم مساجد سے مائک ہٹانے کی بات کریں گے تو عام مسلمانوں کے لئے اس کا قبول کرنا بہت مشکل ہوگا اور ہمارے لئے پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے، جبکہ اذان میں استعمال کیا جانے والا اسپیکر معتدل ہوتا ہے، اور اذان ایسے وقت میں نہیں ہوتی کہ لوگوں کی نیند میں عمومی خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہو (مفتی انور علی اعظمی)۔

سوال– : ۵ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام کی نظر میں اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کی گنجائش نہیں ہے، اس جہت سے شرک پر اور معبودان باطل پر تنقید کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے؛ لیکن بعض دفعہ شائستہ تنقید بھی دل آزاری کا سبب بن جاتی ہے اور بعض اوقات زبان کی بے احتیاطی کی وجہ سے واقعۃً تنقید دل آزار بن جاتی ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کی کیا حدود ہیں، اوران مسائل پر اظہار خیال میں کن آداب کی رعایت کی جانی چاہئے؟

مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کے حدود مندرجہ ذیل ہیں :

۱– محترم مذہبی شخصیات کو سب وشتم، گالی گلوج دینے اور برا بھلا کہنے سے پرہیز کیا جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :
”ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ، فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم“ (سورۂ انعام : ۱۰۸) (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عبد المنان، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا احسن عبد الحق ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی عبد الرحیم کشمیری، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبید اللہ شافعی وغیرہ)۔

۲– بہتر انداز میں گفتگو ہو اور پسندیدہ اسلوب میں بحث ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”ادع إلی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن“ (سورۂ نحل : ۱۲۵) (مذکورہ علماء کے علاوہ مفتی انور علی اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی ازہری، مفتی عبد الروف قاسمی، مفتی محمد مقصود فرقانی اور مولانا ریاض ارمان قاسمی وغیرہ)۔

۳– ابن کثیر لکھتے ہیں : ”فلیکن بالوجه الحسن برفق ولین وحسن خطاب کما قال تعالی : ”ولا تجادلوا أهل الکتاب إلا بالتی هی أحسن إلا الذین ظلموا منهم“ (العنکبوت: ۴۶)، ”فأمره تعالی بلین الجانب، کما أمر موسی علیه السلام و هارون علیه السلام، حین بعثهما إلی فرعون، فقال : فقولا له قولا لینا لعله یتذکر أو یخشی“ (طہ : ۴۴– ابن کثیر ۲ / ۲۰۷) (مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ولی اللہ قاسمی وغیرہ)۔

۴– آیت مذکورہ کے تحت علامہ قرطبی لکھتے ہیں : ”فإذا کان موسی أمر بأن یقول لفرعون قولا لینا، فمن دونه أحری بأن یقتدی بذلک فی خطابه، وأمره بالمعروف فی کلامه وقد قال اللہ تعالی: ”وقولوا للناس حسناً“... وحینئذ یحصل الآمر أو الناهی علی مرغوبه ویظفر بمطلوبه“ (تفسیر قرطبی ۱۱ / ۲۰۰) (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۵– مثبت اور معقول دلائل پیش کئے جائیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے : ”قل هاتوا برهانکم إن کنتم صادقین“ (سورۂ بقرہ : ۱۱۱)۔

☆ ”أم اتخذوا من دونه آلهة قل هاتوا برهانکم، هذا ذکر من معی وذکر من قبلی“ (سورۂ انبیاء : ۲۴)۔

☆ ”قل هاتوا بالتوراة فاتلوها إن کنتم صادقین“ (آل عمران: ۹۳) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد

شاہجہاں ندوی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالروف قاسمی وغیرہ)۔

۶—ان مسلمات کا سہارا لیا جائے جن کو تمام ادیان والے مانتے ہیں، مثلاً سچائی اچھی چیز ہے، جھوٹ قبیح ہے، احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جانا چاہئے اور مجرم کو سزا ملنی چاہئے وغیرہ، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے :"**قل یا أهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا الله ولا نشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله، فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون**" (آل عمران : ۶۴) (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد مقصود فرقانی)۔

۷—اخلاص، دلسوزی اور تعصب سے دور رہ کر مذاہب باطلہ پر تنقید کی جائے، تاکہ مخالفین کے سامنے یہ حقیقت کھل کر آئے کہ تنقید کرنے والا مخلص ہے اور معقول دلائل سے حق کو ظاہر کرنا اس کا مقصود ہے، اس کے اندر ذاتی دشمنی نہیں ہے، بلکہ غلط افکار وخیالات اور عقائد کو منطقی انداز میں پیش کرنا اس کا ہدف ہے (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی)۔

۸—قرآن کریم کے مطابق تنقید میں منفی طریقہ کار اختیار کرنا خود اسلام اور ملت اسلامیہ کو بالواسطہ نقصان پہنچانے کے مترادف ہے، علماء کا قول ہے :"**وحکمها علی کل حال باق فی الأمة، فلا یحل لمسلم أن یتعرض إلی ما یؤدی إلی سب الإسلام أو النبی أو الله عز و جل وعبر عن الأصنام بالذین وهی لا تعقل وذلک علی معتقد الکفرة فیها**" (الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن ۱/ ۴۹۴)۔

۹—علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں : اس آیت میں ان تمام چیزوں کو برا بھلا کہنے اور گالی دینے سے منع کیا گیا ہے جسے دوسرے مذہب کے لوگ مقدس اور قابل احترام سمجھتے ہوں، اور امت مسلمہ کے لئے یہ حکم ہر حال میں باقی ہے، اور ایسا کرنا بطور تعظیم کے نہیں ہے بلکہ حکمت عملی اور دل جوئی اور غیر مسلموں کو قریب کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔۔۔لہذا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ عیسائیوں کے صلیب، ان کے مذہب اور ان کے عبادت خانوں کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کرے، بلکہ ان چیزوں تک لے جانے والا بھی کوئی کام نہ کرے، اس لئے کہ ایسا کرنے میں دوسرے کو معصیت کے لئے اکسانا ہے۔۔۔اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق پر قائم رہنے والے کے لئے بھی کبھی حق کہنے سے بچنا چاہئے جبکہ اس کی وجہ سے کوئی دینی ضرر لاحق ہو (الجامع لاحکام القرآن ۷/ ۶۱)۔

۱۰—اور اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور حضر ابوموسی اشعری کو دعوتی مقصد سے یمن روانہ کرتے ہوئے فرمایا :"بشروا ولا تنفروا، یسروا ولا تعسروا" (صحیح بخاری حدیث نمبر :۶۹، مسلم حدیث نمبر :۱۷۳۲) (خوش کن بات کہو، نفرت انگیز لہجہ اور طریقہ اختیار مت کرو، آسانی پیدا کرو، اور لوگوں کو دشواری میں مت ڈالو) (مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

۱۱—کسی مذہب میں موجود حقائق کو نقل کرنا برا نہیں ہے، بلکہ تحقیر آمیز انداز میں بیان کرنا برا ہے (روح المعانی ۵/ ۴۷۵) (مقالہ : مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد مقصود فرقانی اور مولانا عبید اللہ شافعی)۔

۱۲—کفر وشرک اور معبودان باطل پر تنقید کرتے وقت مداہنت کو رواہ نہ دی جائے اور حق و باطل کے اختلاط سے گریز کیا جائے ''ولاتلبسوا الحق بالباطل وتكتموا الحق وأنتم تعلمون'' (سورۂ بقرہ: ۴۲) (مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی)۔

۱۳—فتاوی ہندیہ میں ہے: ''لوقال ليهودی أو مجوسی يا كافر يأثم إن شق عليه''، اس مسئلہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کی دلجوئی اور ان کے خلاف نفرت انگیز اور ناگوار بات کہنے کے سلسلے میں ہمارے فقہاء کس درجہ حساس ہیں (مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مفتی محمد عثمان بستوی وغیرہ)۔

اس کے آداب مندرجہ ذیل ہیں:

۱—داعی اور مخاطب دونوں کے سامنے مذاکرے کا مقصد واضح ہونا چاہئے (مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

۲—بحث میں اصل نکتہ سے انحراف نہ کیا جائے (مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۳—چیلنج کا اسلوب نہ اختیار کیا جائے، بلکہ بحث ومباحثہ اور گفتگو میں عمدہ کلام کی پابندی کی جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہی: ''وجادلهم بالتی هی احسن'' (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

۴—''قل لعبادی يقولوا التی هی احسن'' (سورۂ اسراء: ۵۳) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۵—''ادفع بالتی هی أحسن السيئة، نحن أعلم بما يصفون'' (سورۂ مومنون: ۹۶) (مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

۶—طعن وتشنیع، تمسخر واستہزاء، تحقیر وتذلیل اور اشتعال دلانے اور برانگیختہ کرنے والے اسلوب سے پرہیز کیا جائے، چنانچہ مذاہب باطلہ کے بطلان کے واضح ہونے اور ان کی دلیل کے ناقابل قبول ہونے کے باوجود اللہ تعالی نے اپنے نبی کو دلنشیں اسلوب میں بات کرنے کو فرمایا ہے: ''وإنا أو إياكم لعلى هدى أو فی ضلال مبين'' (سورۂ سبا: ۲۴) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ثناء الہدی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی وغیرہ)۔

☆''فإنما عليك البلاغ وعلينا الحساب'' (سورۂ رعد: ۴۰) (مولانا ثناء الہدی قاسمی)۔

☆''وإن جادلوك فقل الله أعلم بما تعملون'' (سورۂ حج: ۶۸) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

☆''قل يجمع بيننا ربنا ثم يفتح بيننا بالحق وهو الفتاح العليم'' (سورۂ سبا: ۲۶) (مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۷—پیغمبرانہ دعوت کی یہی شان تھی، لوگوں کی طرف سے خواہ کتنا بھی مذاق اڑایا گیا، دین ومذہب پر فقرے کسے گئے، ذاتیات تک پر حملہ کیا گیا، قوم نوح اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ رہی ہے: ''إنا لنراك فی ضلال مبين''، مگر پیغمبر کا جواب بس یوں ہوتا ہے: ''يا قوم ليس بی ضلالة ولكنی رسول من رب العالمين'' (سورۂ اعراف: ۶۱)۔

☆ قوم ہود کا انداز کتنا دل آزار ہے: "إنا لنراک فی سفاھة وإنا لنظنک من الکاذبین" (سورۂ اعراف: ٦٦)، لیکن پیغمبر خدا کہہ رہے ہیں: "یا قوم لیس بی سفاھة ولکنی رسول من رب العالمین" (سورۂ اعراف: ٦٧)، دیگر انبیاء کرام کا انداز بھی یہی تھا (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۸— دل کو جیتنے والا اسلوب اختیار کیا جائے، پوزیشن حاصل کرنے اور جیت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے یہ کوشش کی جائے کہ مخالف کو عقلی طور پر اطمینان حاصل ہوجائے اور وہ سر تسلیم خم کردے۔

البتہ اگر مخالف ہٹ دھرم، حدود سے تجاوز کرنے والا اور ظلم و زیادتی پر اترنے والا ہو تو ایسی صورت میں اس پر سخت حملہ کیا جاسکتا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے باطل کی شکست واضح ہوجائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "...إلا الذین ظلموا منھم" (سورۂ عنکبوت: ٤٦) (مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۹— وقت کی پابندی اور عہد و پیماں کی پاسداری کی جائے۔

۱۰— مذاکرہ اور تنقید کی مجلس میں ہر فریق کو دوسرے کے مقام و مرتبہ کا خیال رکھنا چاہئے، مناسب عبارت، صحیح اور بہتر لقب اور مہذب اسلوب کا لحاظ رکھنا چاہئے (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا انور علی اعظمی وغیرہ)۔

۱۱— مذاہب باطلہ پر تنقید کا مقصد اللہ تعالی کی رضا جوئی، نام و نمود سے دوری، شریعت کی حفاظت اور اس کا دفاع اور لوگوں کی ہدایت کی طرف رہنمائی ہو، تعصب سے دوری اور مخاطب کی تحقیر سے پرہیز لازم ہے (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا ذکاء اللہ شبلی وغیرہ)۔

☆ "وکان رسول اللہ ﷺ لا یحقر أحدا یبلغه رسالات اللہ تعالی" (ابونعیم فی دلائل النبوۃ) (مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی)۔

۱۲— مذاہب باطلہ پر تنقید کرتے وقت عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، لہذا مقصود صرف اور صرف حقیقت کا بیان ہو، اور دلائل قائم کرنے کا انداز منطقی اور سائنٹفک ہو (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی عبد الرؤف قاسمی وغیرہ)۔

البتہ مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی عبد الروف قاسمی اور مولانا ابوبکر قاسمی کی رائے ہے کہ ہم آہنگی اور فتنہ وفساد اور دل آزاری کے خوف سے کفر و شرک اور معبودان باطل کے خلاف گفت و شنید، اثبات توحید و رسالت یا ابطال شرک جو شرعاً واجب ہے، کو ترک نہیں کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ ضروریات دین میں سے ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں، البتہ تنقید کرتے وقت ان آداب کی رعایت ضروری ہے جو مذکور ہوئے۔

لیکن مفتی جمال الدین قاسمی کی رائے ہے کہ اصل میں اسلام کی حقانیت اور اس کے عقائد کی بے غبار تشریح مقصود ہے،

خواہ اس سے ضمنی طور پر کسی کی دل آزاری ہوتی ہو یا کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو، تاہم اگر دیگر مذاہب کے لوگ اسلامی تعلیمات پر بے جا اعتراضات کریں اور اسلامی احکام میں تشکیک پیدا کریں تو ان کے حملوں کا جواب جارحانہ انداز میں دیا جاسکتا ہے اور ان کے عقائد باطلہ پر تنقید کی جاسکتی ہے۔

سوال نمبر ٦ — مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر کیا مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے چاہئیں؛ تاکہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جدو جہد کریں؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ مشترک سماجی مسائل، جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، برائی، فحاشی، اخلاقی بگاڑ، جنسی بے راہ روی، خواتین، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ ظلم وزیادتی وغیرہ کے حل، ان کی اصلاح و تدبیر اور خاتمہ کے لئے مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مشترکہ لائحہ عمل، محاذ اور پلیٹ فارم بنانا جائز، درست اور مباح ہے۔

اہمیت وضرورت :

تاکہ سب ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہوکر ان سماجی مسائل کے حل کے لئے جدو جہد کریں اور ظلم وستم کے خلاف مشترکہ محاذ تیار کریں، اس سے جہاں ایک طرف ان مسائل کے حل کے لئے جدو جہد ہوگی، وہیں سماج میں بسنے والے مختلف مذاہب، طبقات اور جماعتوں کے درمیان پائی جانے والی نفرت اور دوریاں کم ہوں گی، پرامن اور پاکیز معاشرہ وجود پذیر ہوگا اور باہمی تعاون، ہمدردی، اخوت وبھائی چارگی اور انسانی احترام کا ماحول بنے گا (دیکھئے مقالہ : مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی، مولانا عبدالروف قاسمی، مفتی عبدالمنان قاسمی، مفتی عبدالرحیم کشمیری، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا ذکاء اللہ شبلی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی وغیرہ)۔

دلائل :

ا — اس کی واضح دلیل ''حلف الفضول'' ہے جو زمانہ جاہلیت میں مظلوموں کی مدد کے لئے معاہدہ ہوا تھا، جس میں نبی کریم ﷺ کافروں کے ساتھ اس معاہدہ میں شریک ہوئے اور فرمایا : اگر مجھے زمانہ اسلام میں بھی اس جیسے کسی معاہدہ کی دعوت دی جائے تو میں اسے ضرور قبول کروں گا ''لو دعیت إلی مثله فی الإسلام لأجبت'' (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۱/ ۲۹، الروض الأنف ۱/ ۲۴۱) (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا انور علی اعظمی،

مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عثمان بستوی ، مفتی عبدالرحیم کشمیری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ریاض ارمان قاسمی)۔

اس وقت معاہدہ کے تمام شرکاء نے اللہ تعالی کو گواہ بنا کر یہ عہد کیا "**ليكونن يداً واحدة مع المظلوم على الظالم حتى يؤدى إليه حقه ما بل بحر صوفة ومارسا حراء وثبير، مكانهما وعلى التآسى فى المعاش**" (الروض الأنف للسہیلی ۱/۵۶) (مفتی عثمان بستوی، مفتی عبدالرحیم کشمیری)۔

اس معاہدہ کی بنیاد پر علامہ سہیلی اور دوسرے علماء نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون اور اشتراک عمل نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر آج بھی مجھے اس قسم کے کسی معاہدہ کی طرف بلایا جائے گا تو میں اسے قبول کرلوں گا (مفتی عبدالرحیم کشمیری)۔

۲— مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد آپ ﷺ کا یہود مدینہ کے ساتھ معاہدہ جسے "میثاق مدینہ" کے نام سے جانا جاتا ہے، وہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مشترک سماجی مسائل پر گفتگو کی جاسکتی ہے اور ان کے ساتھ خیر کے امور پر معاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۳— "**ولا يجرمنكم شنآن قوم أن صدوكم عن المسجد الحرام أن تعتدوا وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**" (سورۂ مائدہ: ۲) (مولانا انور علی اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی عبدالرحیم کشمیری وغیرہ)۔

۴— ہندوستان میں اکابر نے ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا، جنگ آزادی میں شروع سے اخیر تک ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ رہے اور انہوں نے بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا، سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک میں جہاں مسلمان فرماں رواؤں کو خطوط لکھے، وہیں ہندو راجاؤں کو بھی خطوط لکھے، اور ان کی طرف سے ان خطوط کی پذیرائی بھی ہوئی، جلا وطن ہندوستانی حکومت کے قائم کرنے میں ہندو اور مسلمان رہنما برابر کے شریک تھے، شیخ الہند مولانا محمد حسن دیوبندیؒ کا گاندھی جی سے قریبی تعلقات تھے، جواہر لال نہرو اور اس عہد کے ہندو قائدین سے مولانا ابوالکلام آزادؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ وغیرہ کے قریبی تعلقات تھے، اگر علماء کا اس وقت کے ہندو مذہبی اور سیاسی قائدین سے قریبی ربط و تعلق نہ ہوتا تو ملک کے دستور میں فرقہ پرست عناصر آج جو تبدیلی چاہتے ہیں وہ بات ۱۹۴۷ء میں ہی ہو چکی ہوتی (کلیدی خطبہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی بموقع ۲۴واں فقہی سمینار ۱۶،۱۷) (مقالہ : مولانا ریاض ارمان قاسمی)۔

۵— صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا : "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر کفار مکہ مجھ سے کسی ایسے لائحہ عمل کا مطالبہ کریں گے جن میں اللہ تعالی کے محارم کی تعظیم ہو تو میں ان کے مطالبہ کو پورا کردوں گا" (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۲۷۳۱)۔

ان روایات کونقل کرنے کے بعد مولانا عبید اللہ ندوی شافعی لکھتے ہیں کہ مذکورہ دلائل کی روشنی میں فقہاء نے اس بات پر اتفاق نقل کیا ہے کہ دین اسلام کے قیام کے لئے غیر مسلموں سے تعاون لینے کی اجازت ہے، لہذا اسلام کی وہ تعلیمات جو دیگر مذاہب کی بھی تعلیمات یا ان مذاہب میں وہ امور محمود اور مستحسن ہیں جیسے غریبوں کا تعاون، ظلم کا خاتمہ وغیرہ ایسے مسائل پر غور وخوض کرنے اور ایک اچھا معاشرہ کو وجود میں لانے کے لئے دیگر مذاہب کے ساتھ مل کر کوشش کرنے کی نوبت آئے تو ان کے ساتھ اس موضوع پر مذاکرات کرنے کی اجازت ہے (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶۴۲۱/۸)۔

سوال نمبر: ۷—جمہوری ممالک کے اندر سیاست میں حصہ داری کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس کے لئے بھی بعض اوقات مذہب کی نمائندہ شخصیتوں یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت پیش آتی ہے، کیا ان کے ساتھ باہمی مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ جمہوری ممالک میں سیاسی حصہ داری کی غیر معمولی اہمیت ہے، خاص طور پر ہندوستان جیسے ملک میں اگر مسلمان اس میں اپنا مؤثر کردار ادا نہ کریں تو کوئی محاذ پر وہ برادران وطن سے پیچھے رہ جائیں گے، بلکہ بعض اوقات ان کے وجود وبقا بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے، ایسے حالات میں مسلمانان ہند کا دیگر اہل مذاہب کی نمائندہ شخصیات یا سیاسی جماعتوں کے ساتھ مذاکرہ، گفت وشنید اور اشتراک عمل کرنا درست ہے۔

مطلق دلائل:

۱—اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله إنه هو السميع العلم'' (سورۂ انفال: ۶۱)، امام ابوبکر جصاصؒ اس آیت کے منسوخ یا محکم ہونے سے متعلق علماء کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا یہ محاکمہ کیا ہے کہ اگر مسلمان غلبہ وقوت میں ہوں تو کفار سے مصالحت کی گفتگو مناسب نہیں اور اگر قلت اور ضعف میں ہوں تو ان سے مصالحت کی بات کی جاسکتی ہے، پھر چند مثالیں دینے کے بعد لکھتے ہیں: ''فهده أحكام، بعضها ثابت بالقرآن وبعضها بالسنة، وهي مستعملة في الأحوال التي أمر الله تعالى بها واستعملها النبي ﷺ فيها'' (احکام القرآن للجصاص ۲۵۴/۴، ۲۵۵) (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

☆اس آیت کے ذیل میں امام قرطبیؒ نے بھی تفصیل ذکر کرنے کے بعد ابن العربی کا قول نقل کیا ہے: ''وإن كان للمسلمين مصلحة في الصلح لنفع يجتلبونه أو ضرر يدفعونه فلا بأس أن يبتدئ المسلمون به إذا احتاجوا إليه'' (تفسیر قرطبی ۴۰/۸) (مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد مقصود فرقانی)۔

شرائط :

☆مسلمان مشترکہ بنیادوں پر مساوی حیثیت سے اس میں شریک ہوں اوران کا قومی وملی وقار مجروح نہ ہو، اگر ملک میں مختلف سیاسی جماعتیں ہوں تو ترجیح ان جماعتوں کو دی جانی چاہئے جو اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے معتدل اور رواداری نہ خیالات کی حامل ہوں اور اسلامی عقائد ونظریات سے ان کے خیالات متصادم نہ ہوں (مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ذکاء اللہ شبلی)۔

☆البتہ مذاکرہ کے نتیجہ میں جو معاہدہ ہو، اس میں کوئی دفعہ اسلام مخالف نہ ہو (مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا احسن عبد الحق ندوی)۔

☆یہ شرکت درج ذیل ضابطوں کے تحت ہونی چاہئے :

اول: یہ کہ اس پارلیمنٹری انتخابات میں شریک ہونے والے مسلمانوں کا مقصد اپنی شرکت سے مسلمانوں کے مصالح کے حصول اوران سے مفاسد اور ضرر کو دور کرنے میں عملی حصہ لینا ہو۔

دوم: یہ کہ مسلمانوں کے اس نمائندے کو یہ غالب گمان ہو کہ اس کی یہ نمائندگی مثبت نتائج تک پہنچائے گی اور اس ملک میں مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے گی، مثلاً مسلمانوں کے مراکز مستحکم ہوں گے اوران کے مطالبے فیصلہ لینے والے ذمہ داروں تک پہنچیں گے، اوران کے دینی ودنیاوی مصالح کی حفاظت ہوگی۔

سوم: یہ ان جیسے الیکشن میں مسلمانوں کی شرکت سے ایسے نتائج نہ مرتب ہوں جن سے ان کے دین میں کمی اور نقصان واقع ہو (المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے ر ۵۰۹، ۵۱۰) (مولانا ریاض ارمان قاسمی)۔

☆حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ غیر مسلم سے مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی (جو مذاکرات کے لئے لازمی شرط ہوتی ہے) تین حالتوں میں درست ہے :

۱— دفع ضرر کے واسطے۔

۲—غیر مسلم کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے۔

۳—اکرام ضیف کے لئے۔

”الا أن تتقوا منهم تقاة“ میں دفع ضرر ہی کا استثناء ہے، اور توقع ہدایت کے لئے مدارات کا ذکر سورۂ عبس کی آیت ”فأنت له تصدى“ میں اس کا ذکر ہے، اور اکرام ضیف کے لئے مدارات کا بیان اس حدیث میں ہے جس میں بنوثقیف کو مسجد میں ٹھہرانے کا ذکر ہے، لیکن کسی ذاتی نفع ومصلحت کے لئے غیر مسلم سے مدارات درست نہیں، خصوصا جبکہ دینی ضرر کا خوف ہو تو بدرجہ اولی یہ اختلاط حرام ہوگا (بیان القرآن ار ۱۰۸) (مفتی عثمان بستوی)۔

☆موجودہ حالات میں اس کی تین صورتیں ہیں :

ا— یہ کہ مسلمان اور کفار کی دو جماعتوں میں محض صلح یا تجارتی معاملات وغیرہ کے متعلق کوئی معاہدہ ہو، استعانت واستمداد یا شرکت عمل کچھ نہ ہو۔

۲— یہ کہ مسلم جماعت اپنے جماعتی نظام واستقلال کو باقی رکھتے ہوئے کسی تیسری قوم کا مقابلہ کرنے کے لئے یا نظام حکومت وغیرہ بنانے کے لئے باہم معاہدہ کے ساتھ اشتراک عمل کرے۔

۳— یہ کہ مسلمان انفرادی طور پر بلا کسی شرط ومعاہدہ کے کسی کافر قوم کے ساتھ شریک عمل ہوجائیں۔

مفتی عبدالرحیم کشمیری صاحب نے ان تینوں صورتوں کو مع قرآنی آیات وروایات تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اسلام مخالف جماعت سے اشتراک :

کیا اس جماعت کے ساتھ مذاکرہ اور اشتراک عمل ہوسکتا ہے جس کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں؟

اس کے جواب میں بعض مقالہ نگار کی رائے مندرجہ ذیل ہے :

ا— . . .ایسی جماعت کے ساتھ اتحاد کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا جو اسلام اور مسلمان کے بارے میں سخت گیر اور متشددانہ نظریات رکھتی ہو۔

البتہ سخت جماعت اگر اپنے سیاسی منشور سے مسلمانوں سے متصادم نظریات خارج کرنے اور صرف مشترکہ مسائل پر اتحاد کے لئے آمادہ ہو اور ملک میں کوئی نسبتاً اعتدال پسند جماعت موجود نہ ہو اور اس کے ساتھ اشتراک کئے بغیر مسلمانوں کے سیاسی یا سماجی استحکام کی کوئی صورت موجود نہ ہو، مسلمانوں کا اس کے ساتھ اشتراک بحیثیت مذہب اس کے فروغ کا باعث نہ بنے، نیز مسلمانوں کے قومی وملی وقار پر کوئی آنچ نہ آئے، تو ایسی جماعت سے بھی سیاسی تعاون عمل کی بدرجہ مجبوری گنجائش ہوگی، اس کا مآخذ آیت کریمہ ”**قل یا أهل الكتاب تعاولوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم**“ (سورۂ آل عمران: ۶۴) ہے (مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۲— حتی الامکان ایسی جماعتوں سے اعراض واحتراز کیا جائے گا اور اگر مسلمانوں کے مفاد میں ایسی جماعتوں سے گفت وشنید کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو مذہبی اور دینی تشخص میں کسی دباؤ کو قبول کرنا جائز نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ”**ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار ومالكم من دون الله أولياء ثم لا تنصرون**“ (سورۂ ہود: ۱۱۳)۔

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبی لکھتے ہیں : رکون کی حقیقت اعتماد کرنا اور سہارا لینا ہے اور کسی چیز پر اطمینان کرنا اور اس سے راضی ہونا ہے (تفسیر قرطبی ۹/۱۰۸) (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

اشتراک عمل ہوسکتا ہے، اگرچہ ان کے نظریات متصادم ہوں :

دوسرے بعض مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ کسی بھی مذہب کی نمائندہ شخصیت یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے

والی سیاسی جماعت یا گروہ کے ساتھ بوقت ضرورت باہمی مذاکرات ہوسکتے ہیں، خواہ اس جماعت یا گروہ کا نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا عبد المنان قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبید اللہ شافعی وغیرہ)۔

دوسری رائے رکھنے والوں کے دلائل :

۱- اس لئے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے اسلام کی مخالفت کرنے والے افراد اور جماعت سے باہمی مذاکرات کئے اور ان کو حق کی دعوت دی، اور ان کے حق میں ہدایت کی دعا کی (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۲- صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے اسلام کے کٹر دشمنوں سے مذاکرات کئے (دیکھئے: صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۱۱، ۲۷۱۲) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، ڈاکٹر مبین سلیم ازہری، مفتی عبد الرحیم قاسمی وغیرہ)۔

۳- کیونکہ ایسی جماعت کے ساتھ مذاکرات نہ کرنے کی صورت میں اس بات کا خطرہ بڑھ جاتا ہے کہ سخت گیر جماعت کی طرف سے ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔۔۔اور مسلم سیاستداں اپنے اثر ورسوخ سے اسلام مخالف ایجنڈوں کو نافذ ہونے سے روک سکتے ہیں (دیکھئے مقالہ : مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، ڈاکٹر مبین سلیم ازہری، مولانا قمر الزماں ندوی)۔

۴- اس طرح کے مذاکرات کے لئے "میثاق مدینہ" ایک بہترین نمونہ ہے، جس میں نسل و مذہب کے اختلاف کے باوجود سب کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی تھی، جس میں حضور ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ یہود اور مسلمان، دونوں ایک امت اور جماعت ہوں گے اور جو کوئی اس معاہدہ میں شامل لوگوں سے جنگ کرے تو سب لوگ مل کر اس کا مقابلہ کریں گے اور یہ معاہدہ نیکی اور باہمی خیر خواہی کے کاموں میں ہوگا، نہ کہ کسی گناہ کے کام میں اور مظلوم کی مدد کی جائے گی اور اس معاہدہ میں شامل لوگوں کے لئے آپس میں جنگ وجدال کرنا حرام ہوگا (دیکھئے : الوثائق السیاسیۃ ۵۷، ۶۴) (مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی جمال الدین قاسمی، ڈاکٹر مبین سلیم ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی شافعی وغیرہ)۔

۵- اسلام مخالف جماعت سے مذاکرات کے جواز وعدم جواز کا مدار مصالح مسلمین پر ہے، اگر مذاکرات میں اہل اسلام کی مصلحت مضمر ہو تو شرعاً اسمیں کوئی حرج نہیں، بلکہ بہتر ہے، لیکن اگر نقصان ہو اور مذاکرات میں مصالح مسلمین فوت ہوتے ہوں تو ان سے مذاکرات کی اجازت نہیں (مفتی محمد عثمان بستوی، نیز دیکھئے : مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۶- ۔۔۔خاص قسم کے حالات میں اگر مفاد عامہ وابستہ ہوں تو غیر شرعی نظاموں میں شرکت کی گنجائش ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں وزیر خزانہ بنا دیا جائے: "اجعلنی علی خزائن الأرض" (سورۃ

یوسف :۵۵)اور ظاہر ہے کہ اس وقت مصر میں قوانین الٰہیہ کے تابع حکومت نہیں تھی، اس کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام کی اس نظام میں شرکت پر قرآن شاہد ہے(مقالہ :مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی)۔

۷—جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونظیر وبنوقینقاع اور بنوقریظہ جو اسلام کے بڑے مخالفین میں سے تھے جو اسلام کے مٹانے کے درپے تھے اس کے باوجود بھی آپ ﷺ نے ان کے ساتھ بات چیت کی ہے، ان کے درمیان امن کا معاہدہ کیا اور یہ عہد لیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کسی کی مدد نہیں کریں گے، ''**كان قد عقد معهم العهود والمواثيق وجعل بينه وبينهم أمانا وشرط عليهم أن لا يظاهروا عليه أحداً**''(منار القاری ۴/۳۲۶)(مولانا عبیداللہ ندوی شافعی)۔

سوال نمبر :۸— پردے کا جو تصور اسلام میں ہے، دوسرے مذاہب بحالت موجودہ اس سے خالی ہیں، اس صورت حال میں جب بین مذہبی مذاکرات کی مجلسیں یا پروگرام ہوتے ہیں تو بہت سی دفعہ اسٹیج پر خواتین مقرر بھی موجود ہوتی ہیں، ایسے مواقع پر مسلمانوں کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے؟

تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ اس طرح کے مذہبی مذاکرات کی مجلسیں جہاں اسٹیج پر خواتین بھی ہوں تو مذاکرات کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر مسلمان مذہبی رہنماؤں کو ایسی مجلسوں میں شرکت کی گنجائش ہے، البتہ ایسی صورت میں کچھ حدود وآداب ہیں جن کی رعایت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔

حدود وآداب :

۱—مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اسلامی اخلاق ومعیار کا خیال رکھیں، اپنے دامن کو بچاتے ہوئے، عفت وپاکدامنی کے ساتھ غض بصر یعنی نیچی نگاہ رکھنے کا اہتمام کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''**قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم، ذلك أزكى لهم، إن الله خبير بما يصنعون...**''(سورۂ نور:۳۰)(مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا مبین سلیم ندوی ازہری، مولانا عبدالروف، مولانا عبدالمنان قاسمی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا ذکاء اللہ شبلی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مولانا عبیداللہ ندوی شافعی وغیرہ)۔

۲—اگر کسی کی اچانک اچٹتی ہوئی نگاہ پڑ جائے تو فوراً جھکالے، جیسا کہ حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:''**يا علي! لا تتبع النظرة فإن لك الأولى وليست لك الثانية**''(سنن ابی داؤد، حدیث نمبر :۲۷۰۹)(مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عبیداللہ ندوی شافعی وغیرہ)۔

۳—حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :''**إن النظر سهم من سهام إبليس مسموم، من تركها مخافتي أبدلته إيمانا يجد حلاوته في قلبه**''(کنز العمال بحوالہ طبرانی، حدیث نمبر ۱۳۰۶۸)(مولانا محمد

شاہجہاں ندوی، مفتی جمال الدین قاسمی وغیرہ)۔

۴—اگر اسٹیج پر موجود کسی خاتون سے گفتگو کی حاجت ہو تو بہ قدر ضرورت کلام کرے اور ان کی آواز سے لطف اندوز نہ ہو، بلکہ مقصود پیش نظر رکھے (مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ریاض ارمان قاسمی وغیرہ)۔

۵—ایسے موقع پر مسلمانوں کے دل خوف خدا سے معمور ہونا چاہئے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''یا أیها الذین آمنوا اتقوا الله حق تقاته'' (آل عمران: ۱۰۲) (مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۶—شریعت میں حسب ضرورت عورت کے چہرے اور ہتھیلی کے دیکھنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن علماء نے اس کے ساتھ اس کی بھی صراحت کی ہے کہ یہ اجازت اس صورت میں ہے جب شہوت کے ساتھ نہ دیکھا جائے اور اگر شہوت کے ساتھ ہو تو جائز نہیں ہے، جیسا کہ بدائع الصنائع میں ہے:

''ولا یحل النظر للأجنبی من الأجنبیة الحرة إلی سائر بدنها إلا الوجه والکفین... إنما یحل النظر إلی مواضع الزینة الظاهرة منها من غیر شهوة فأما عن شهوة فلا یحل'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۲۱، ۱۲۲) (مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۷—مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا احسن عبد الحق ندوی اور مولانا ریاض ارمان قاسمی لکھتے ہیں: ''رہ گیا اختلاط: تو اس سے حقیقتاً بچنا تو ممکن نہیں، البتہ حکماً بچا جاسکتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہو کہ اپنی نشست خواتین مقرر کے پہلو کے بجائے مردوں کے ساتھ رکھے، بین مذہبی مذاکرات میں اس قدر احتیاط کے ساتھ شرکت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، شیخ احمد حسن رقیط لکھتے ہیں: ''أما الاختلاط الذی سمع به الاسلام ومارسته المسلمات علی مر العصور فهو الاختلاط المؤدی إلی مصلحة مشروعة والمفضی إلی مشارکة نافعة بین الرجال والنساء ویتحقق من خلالها تکامل الأدوار والارتقاء بالمجتمع'' (قضایا معاصرة فی میزان الاسلام/ ۱۱۴)۔

۸—البتہ اگر مذاکرہ میں مسلم خواتین نمائندگی کر رہی ہوں تو ان کے لئے لباس شرعی، غض بصر اور دوسرے اسلامی احکام کا التزام ضروری ہوگا، جیسا کہ مجموعہ فتاوی شرعیہ کویت میں بھی اس طرح کے بعض سوالوں کا جواب مذکور ہے:

''یجوز اختلاط الرجال والنساء فی اللجان الهادفة والمشروعة (علمیة أو اجتماعیة أو غیرها) إذا دعیت إلی ذلک مصلحة وحاجة یعتبرهما الشرع وکانت المرأة ملتزمة بالضوابط الشرعیة لظهورها أمام الرجال من حیث لباسها وکلامها وبشرط غض البصر رجالا ونساء فی جمع الأحوال وامتناع الخلوة- والله أعلم'' (۲۳/ ۳۳۰) (مولانا انور علی اعظمی، نیز مقالہ: مولانا محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا احسن عبد الحق ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی وغیرہ)۔

مفتی عثمان صاحب بستوی لکھتے ہیں: ''بہت مجبوری کی صورت میں مقتدر شخصیات کی شرکت کی گنجائش ہے''، ''قال

الآلوسی البغدادی :إن الطاعة إذا أدت إلی معصیة راجحة واجب ترکها، فإن ما یؤدی إلی الشر شر بخلاف الطاعة فی موضع فیه معصیة لا یمکن دفعها۔۔۔" (روح المعانی ۷/۲۵۲) (مقالہ مولانا محمد عثمان بستوی)۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی صاحب کی رائے ہے کہ ایسی مجالس میں مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کو ہرگز شرکت نہیں کرنی چاہئے، اس لئے کہ یہ معصیت کے ساتھ اشتراک ہوگا اور معصیت والی محفلوں میں مذہبی قائدین کا اختیار ورضا کے ساتھ شریک ہونا مناسب نہیں، اس سلسلہ میں بعض آیات واحادیث سے استیناد کیا جاسکتا ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی کی رائے ہے کہ ایسے موقع پر مسلمانوں کا طرز عمل اس کی مخالفت میں ہونا چاہئے، اگر مسلم مما لک میں ایسا ہوتا ہے تو وہ ہمارے لئے حجت نہیں ہے، حجت تو صرف رسول اللہ ﷺ کا عمل بن سکتا ہے۔

خواتین سے مصافحہ حرام ہے :

اس طرح کی مجلسوں میں جہاں مرد وخواتین کا اختلاط ہوتا ہے، وہاں غیر مسلم خواتین اور بعض دفعہ مسلم خواتین بھی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیتی ہیں، تو اس سلسلہ میں حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا مختار اور پسندیدہ قول یہ ہے کہ آدمی کا اجنبی جوان عورت سے مصافحہ کرنا حرام ہے، علامہ ابن تیمیہؒ کی بھی یہی رائے ہے (موسوعہ فقہیہ ۳۷/۳۵۹) (مفتی جمال الدین قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ)۔

☆ ☆ ☆

عرض مسئلہ :

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب
(سوال نمبر ا — ۵)

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء وإمام المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے پچیسویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع ''بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب'' ہے۔

اکیڈمی نے اس موضوع کے سوال نمبر ا تا ۵ پر عرض مسئلہ کی ذمہ داری راقم پر ڈالی ہے۔ چنانچہ اکیڈمی کے توسط سے اس موضوع پر احقر کو کل ۲۳ رمقالات دستیاب ہوئے، مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی طوالت کی وجہ سے ترک کر رہا ہوں۔

اس موضوع کا پہلا سوال یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں سے جن امور پر مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، وہ بنیادی طور پر تین نوعیت کے مسائل ہوں گے۔ مذہبی، سماجی، اور سیاسی۔ کیا ان تمام پہلوؤں پر باہمی مذاکرات ہوسکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

پہلا نقطہ نظر :

پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان مذہبی، سماجی، اور سیاسی تینوں امور پر گفتگو کی گنجائش ہے۔ اس نقطہ نظر کے حاملین ہیں قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا محمد قمر الزمان ندوی، مفتی انور علی اعظمی، ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی، ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، مفتی عبد المنان، مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی، مفتی محمد جمال الدین قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبد الرؤف قاسمی، مفتی محمد عبد الرحیم قاسمی، ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی اور راقم الحروف محمد شاہجہان ندوی۔

ان حضرات کے نزدیک شرط یہ ہے کہ مذاکرہ کی بنیاد نہ تو وحدت ادیان کے نظریہ پر ہو اور نہ ہی اسلامی اور غیر اسلامی نظریات کے ملغوبہ کی تیاری پر ہو۔

اس نقطہ نظر کے دلائل درج ذیل ہیں :

☆ عمید کلیۃ القرآن، جامعہ اسلامیہ شانتاپورم مالاپورم کیرالہ انڈیا۔

۱— یہ دعوت دین کے پہچانے اور حقیقت اسلام کے سمجھانے کا مؤثر ذریعہ ہے (مقالہ: مولانا محمد قمر الزماں ندوی)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لا إكراه في الدين'' (سورۂ بقرۃ: ۲۵۶) (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے) چنانچہ بین مذہبی مذاکرات کے ذریعہ مذہبی آزادی کی قرآنی تعلیم عام ہوگی (مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی اور راقم الحروف)۔

۳۔ مذہبی مذاکرے قرآن میں بہت سے مقامات پر مذکور ہیں، مثلاً ارشاد باری ہے: ''قال له صاحبه وهو يحاوره اكفرت بالذى خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سواك رجلا'' (سورۂ کہف: ۳۶) (ایک کافر سے اس کے مومن دوست نے کہا جبکہ وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا کیا تم نے اس ذات کا کفر کیا جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پیدا کیا، پھر تمہیں ایک مکمل مرد بنایا) (مقالہ: مفتی انور علی اعظمی)۔

۴۔ مذہبی مذاکرات کے کل تین مقاصد ہوسکتے ہیں:

۱۔ آپسی رواداری کا فروغ ۲۔ دعوت و تبلیغ ۳۔ افہام و تفہیم، اور یہ تینوں مقاصد شرعاً مطلوب و مقصود ہیں، لہٰذا بین مذہبی مذاکرات ''الأمور بمقاصدها'' کے ضابطے سے شرعاً محمود ہوں گے (مقالہ: مفتی محمد عثمان بستوی)۔

۵۔ انفرادی، اجتماعی، ریاستی، ملکی، عالمی، مذہبی اور سیاسی ہر طرح کی کشمکش اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے مذاکرہ بہترین راستہ ہے (مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

۶۔ نبی کریم ﷺ نے نجران کے نصرانی وفد اور دیگر وفود کے ہمراہ توحید کے ساتھ مشترکہ مسائل پر بھی تبادلہ خیال فرمایا تھا، مقالہ: راقم الحروف بہ حوالہ (الطبقات الکبریٰ ۱۔۲۲۲۔۲۶۹)، و مقالہ مفتی محمد محبوب فروغ احمد قاسمی بہ حوالہ (فقہ السیرۃ للغزالی ۴۵۹۔۴۶۳)۔

۷۔ مذہبی مذاکرہ میں دوسرے کو دعوت کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے اور پیغام پہنچ جاتا ہے (مقالہ ڈاکٹر محمد مبین سلیم ازہری ندوی)۔

۸۔ علامہ قرطبیؒ آیت: ''ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم'' (سورۂ انعام: ۱۰۸) (اور ان لوگوں کو گالی مت دو، جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جہالت کی بنا پر دشمنی میں اللہ کی شان میں گستاخی کرنے لگیں) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: (اس آیت میں ان تمام چیزوں کو برا بھلا کہنے اور گالی دینے سے منع کیا گیا ہے، جسے دوسرے مذہب کے لوگ مقدس اور قابل احترام سمجھتے ہیں، اور امت مسلمہ کے لئے یہ حکم ہر حال میں باقی ہے، اور ایسا کرنا بطور تعظیم کے نہیں ہے، بلکہ حکمت عملی اور دلجوئی کے طور پر ہے، اور یہ غیر مسلموں کو قریب کرنے کا ذریعہ ہے) (مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، بہ حوالہ الجامع لاحکام القرآن ۷۔۶۱)۔

بین مذہبی مذاکرات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مذہبی شخصیات کو برا بھلا نہ کہا جائے، اور یہ قرآنی تعلیم سے ہم آہنگ ہے۔

۹۔ انسانیت کے لئے مفید کاموں میں آپ ﷺ نے ہمیشہ تعاون فرمایا، چنانچہ زمانہ جاہلیت میں ہونے والے حلف

الفضول (جس کا مقصد مظلوموں کی مدد کرنا تھا) کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا : "ولو دعیت به لاجبت" (ابن سعد،الطبقات الکبری ا۔۱۰۳) (اور اگر مجھے اسلام کے اندر بھی اس جیسے خیر کے معاہدہ کی دعوت دی جائے تو میں ضرور قبول کرلوں) (مقالہ: راقم الحروف، ومفتی محمد عثمان بستوی، وڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی، ومولانا ولی اللہ مجید قاسمی وغیرہم) اس سے سماجی اور سیاسی بین مذہبی مذاکرات کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا نقطہ نظر :

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مذہبی بنیادوں پر مذاکرات ممکن نہیں، کیونکہ عہد نبوت کے ابتدائی مکی دور میں رسول اللہ ﷺ کو مذہبی بنیادوں پر مصالحت کی پیش کش کی گئی تھی، لیکن اللہ پاک کے حکم پر آپ ﷺ نے اس کو مسترد کر دیا۔البتہ سماجی اور سیاسی بین مذہبی مذاکرات ہو سکتے ہیں جس کی دلیل میثاق مدینہ ہے جو مسلمان اور یہود کے درمیان پر امن بقاء باہم کے لئے مرتب ہوئی تھی۔اس نقطہ نظر کے حامل مولانا اختر امام عادل قاسمی ہیں۔

تیسرا نقطہ نظر :

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مذہبی مذاکرات اصلاممنوع ہیں البتہ مختلف مذاہب کے لوگوں سے درج ذیل مسائل پر مذاکرات ہو سکتے ہیں :

۱—اہل کتاب اور کفار کو توحید کی دعوت دی جائے۔

۲—اسلامی خصائص کے احترام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کے ساتھ گستاخانہ رویہ بند کیا جائے۔

۳—اسلامی تقدس اور جذبات کو مجروح کرنے والے ذرائع پر پابندی لگائی جائے۔

۴—مذاہب اور ان کے شعائر کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی پابندیوں کی تنفیذ کی جائے۔

اس نقطہ نظر کے حامل ہیں مفتی سید عبد الرحیم حسنی اور مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں :

۱—اللہ تعالی کا فرمان ہے: "قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم" (آل عمران: ۶۴) (آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے۔) اور یہ مشترک چیز توحید ہے، لہذا دعوتی نقطہ نظر سے مذاکرات کئے جاسکتے ہیں۔

۲—اللہ عزوجل کا ارشاد ہے : "ولن ترضی عنک الیهود ولا النصاری حتی تتبع ملتهم" (سورۂ بقرہ: ۱۲۰) (آپ سے یہود ونصاری اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے ہیں جب تک کہ آپ انکی ملت کے تابع نہ ہو جائیں)، اس آیت نے مذہبی مذاکرات کا دروازہ بند کر دیا کیونکہ آپ کوئی بھی طریقہ اپنالیں وہ اسلام دشمنی سے ہرگز باز نہیں آئیں گے۔

ترجیح :

بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے راجح معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ مذہبی مسائل پر مذاکرہ کا مطلب وحدت ادیان یا باطل مذاہب کی عبادت میں شرکت یا اسلامی تشخص سے دستبرداری یا دینی اقدار سے دوری ہر گز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد مذہب کے نام پر جبر واستبداد سے پرہیز اور مذہبی آزادی ہے۔ البتہ اگر بین مذہبی مذاکرات کا مقصد وحدت ادیان یا ہمہ مذہبیت ہو، جس میں اس بات کی کوشش کی جائے کہ تمام مذاہب کے عقیدہ اور نظریہ کو صحیح سمجھا جائے، اور عبادات کی تمام شکلوں کو درست قرار دیا جائے، مختلف مذاہب کے مذہبی اعمال و رسوم کو ایک ہی عبادت خانہ میں انجام دیا جائے، مختلف اور متضاد نظریات کو باہم جمع کیا جائے اور رواداری کی خاطر دوسرے مذاہب کی کچھ باتوں کو قبول کر لیا جائے، تو اس طرح کے بین مذہبی مذاکرات کسی مسلمان کے نزدیک درست نہیں ہوں گے۔

۲۔ اس موضوع کا دوسرا سوال یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان بہت سی تعلیمات میں اشتراک پایا جاتا ہے، کیا باہمی مذاکرات میں ایسی چیزوں کے بارے میں دوسرے مذاہب کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، اور ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریبا تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ باہمی مذاکرات میں مشترکہ تعلیمات کا حوالہ دینا اوران سے استفادہ کرنا درست ہے۔ اس موقف کے دلائل درج ذیل ہیں :

۱۔ خود اللہ تعالی نے ادیان منسوخہ و باطلہ والوں پر حجت قائم کرنے کے لئے ان کی کتابوں اور باتوں کا حوالہ دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل**" (جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں) (مقالہ راقم الحروف، ومولانا اختر امام عادل قاسمی، ومفتی انور علی اعظمی)

۲- نبی کریم ﷺ نے حضرت عدی بن حاتمؓ سے فرمایا کہ کیا تم اپنی قوم سے چوتھائی مال وصول نہیں کرتے، انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ نے سچ فرمایا (مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، بہ حوالہ السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۴۔ ۵۸۰)۔

۳- حق کے اثبات، اتمام حجت، نقطۂ اتفاق قائم کرنے اور مشترکہ کام کی تقویت کے لئے مخالف کی مذہبی کتاب سے حوالہ دینا مقصد کے حصول میں زیادہ معاون ہے (مقالہ: مفتی محمد عثمان بستوی ومفتی محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۴- فقہاء نے بھی الزام قائم کرنے کے لئے غیر مسلم کی مذہبی کتابوں سے حوالہ دینے کے جواز کی صراحت کی ہے، عالمگیری میں ہے : "**و اما استدلال العلماء فی اثبات رسالة سیدنا محمد ﷺ بالمذکور فی اسفار التوراة و صحف الانجیل فذلک للالزام علیهم بما عندهم**" (ہندیہ ۵۔ ۳۴۸) رہا علماء کا جناب رسول کریم ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے

کے سلسلہ میں توراۃ وانجیل سے استدلال کرنا تو یہ ان پرایسی چیزوں کے ذریعہ الزام کے لئے ہے جو ان کے نزیک مسلم ہیں۔

۵ — صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔حسب موقعہ دیگر مذہبی کتابوں کے حوالے دیا کرتے تھے اور اس کو معیوب نہیں جانتے تھے (مقالہ: مولانا اخترامام عادل قاسمی)۔

۳ — اس موضوع کا تیسرا سوال ہے کہ: کیا باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے دیگر اہل مذاہب کے بعض مذہبی رسوم و اعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کی جاسکتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ دوسرے مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں شرکت درست نہیں ہے۔اس موقف کے دلائل درج ذیل ہیں:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**واذا رایت الذین یخوضون فی آیاتنا فاعرض عنهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره**" (سورۃ انعام: ٦٨) (جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب جوئی کررہے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہوجاؤ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں) (مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔اس آیت سے واضح ہے کہ غلط کاروں کی ہم نشینی سے دوری لازم ہے۔

۲۔اللہ سبحانہ کا فرمان ہے:"**والذین لایشهدون الزور واذا مروا باللغو مروا کراما**" (سورۃ فرقان: ٧٢) (اور جو کسی باطل میں شریک نہیں ہوتے، اور اگر کسی بیہودہ چیز پر ان کا گزر ہوجائے، تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں)۔

اس آیت سے استدلال اس طرح ہے کہ بہت سے مفسرین نے باطل میں شرکت سے مراد مشرکین کے مذہبی تہوار میں شرکت بیان فرمائی ہے (مقالہ: راقم الحروف، بہ حوالہ تفسیر ابن کثیر ۳۔۲۰۹۷، و مقالہ: مولانا اخترامام عادل بہ حوالہ الدرالمنثور ۷۔۳۷۷)۔

۳۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرکین کے تہواروں کے موقع پر ان کے عبادت خانوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا کرتے تھے (مقالہ: مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، بہ حوالہ اعلاء السنن ۱۲۔۷۰۳)۔

۴۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار**" (سورۃ ہود: ١١٣) (اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں کہ تم کو چھوئے آگ) وجہ استدلال یہ ہے کہ مشرکین کے تہوار شرک کے پرچار اور اظہار ہی کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں، لہذا ان میں جانا اس آیت کا اولین مصداق ہے (مقالہ: مفتی انور علی اعظمی)۔

۵۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"**من کثر سواد قوم فهو منهم، ومن رضی عمل قوم کان شریکا فی عمله**" (مقالہ: مولانا اخترالامام عادل قاسمی، بہ حوالہ: المطالب العالیۃ ۵۔۱۸۲) (جو کسی قوم کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے، تو اس کا شمار اسی قوم کے ساتھ ہوگا اور جو کسی قوم کے عمل سے راضی ہوگا، وہ اس کے عمل میں شریک مانا جائے گا)۔

۶۔حدیث شریف میں ہے کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے (بوانہ) میں اونٹ قربان کرنے کی منت مانی،اور نبی کریم ﷺ کے پاس آکر دریافت کیا کہ میں نے منت مانی ہے کہ بوانہ میں اونٹ کی قربانی کروں،اس پر نبی کریم ﷺ نے پوچھا: کیا وہاں جاہلیت کے بتوں میں سے کسی بت کی پوجا ہوتی تھی؟ صحابہ نے عرض کیا،نہیں، پھر آپ ﷺ نے پوچھا: کیا وہاں ان کا کوئی تہوار منایا جاتا تھا؟ صحابہ نے عرض کیا نہیں،تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی منت پوری کرو،کیونکہ اللہ کی معصیت کی نذر قابل وفا نہیں اور نہ ہی اس چیز کی نذر پورا کرنا لازم ہے جس کا ابن آدم مالک نہ ہو)(ابوداؤد حدیث نمبر ۳۳۱۳،اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)،اس حدیث سے واضح ہے کہ غیر مسلمین کے مذہبی رسوم کی جگہ میں شرکت درست نہیں ہے تو پھر ان کے مذہبی رسوم اعمال میں شرکت کیوں کر درست ہوگی؟ (مقالہ: راقم الحروف)۔

۷۔غیر مسلموں کے مذہبی رسوم واعمال ان کے مشرکانہ اعتقادات پر مبنی ہوتے ہیں،اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے شرک سے براءت اور بے تعلقی کا اظہار ضروری ہے،اس لئے ان مذہبی رسوم واعمال میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز نہیں ہے (مقالہ: مولانا محمد قمر الزمان ندوی)۔

۸۔مذہبی رسوم میں شرکت تشبہ میں داخل ہے،جو ممنوع ہے،لہذا اگر یہ شرکت بہ نظر استحسان ہو،تو فقہاء کی تصریح کے مطابق کفر میں داخل ہے، فتاوی بزازیہ میں ہے: "**الخروج الی نیروز المجوس والموافقة معهم فیما یفعلونه فی ذلک الیوم کفر**" (آتش پرستوں کے جشن نوروز میں جانا اور اس دن کے ان کے اعمال میں شرکت کفر ہے) (مقالہ: مفتی محبوب فروغ قاسمی ومولانا محمد قمر الزمان ندوی)۔

دوسری رائے :

دوسری رائے یہ ہے کہ بعض غیر شرکیہ وغیر کفریہ مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کی جاسکتی ہے،اس رائے کے حاملین ہیں: مولانا ریاض ارمان قاسمی،مفتی محمد مقصود فرقانی،مولانا عبدالرؤف قاسمی۔

مولانا محمد ریاض ارمان قاسمی نے فتاوی دار العلوم سے ایک فتوی نقل کیا ہے جو اس طرح ہے: اگر ضرورت اسلامی سے کفار کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور ان کی میت کی تعزیت کی جاوے اور جنازہ کے ساتھ جایا جاوے تو یہ درست ہے،لیکن جے وغیرہ پکارنے سے اور شعار کفار میں شرکت کرنے سے احتراز کیا جاوے (مقالہ: مولانا محمد ریاض ارمان قاسمی،بہ حوالہ فتاوی دار العلوم ۴۰۲-۱۶)۔

تیسری رائے :

تیسری رائے کے حامل ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری ہیں وہ لکھتے ہیں: خوشگوار تعلقات اور باہمی مذاکرات کے لئے دیگر مذاہب کے ان مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کر سکتے ہیں جن میں مسلمان کا تعلق کام

یا عقیدہ کے اعتبار سے صرف باہر کے کام سے رہے، اور دعوتی مقصد سے تجربہ کار دینداروں کی نگرانی میں ہو، جیسے پانی کی سبیل لگانا، غریبوں کو کھانا کھلانا، پریشان حال لوگوں کی مدد کرنا، مسافروں کا تعاون کرنا، وغیرہ۔

اگر یہ شرک، کفر یا گمراہی تک پہنچ جائے یا صرف چند دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لئے ہو تو شرعا جائز نہیں (مقالہ: ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری)۔

ترجیح :

بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے راجح معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ غیر مسلمین کے مذہبی رسوم و اعمال مشرکانہ خیالات پر مبنی ہوتے ہیں اوران میں شرکت کرنے سے بہ تدریج ان کی شناعت وقباحت ذہن سے نکل جائیگی۔

۴۔ اس موضوع کا چوتھا سوال یہ ہے کہ: ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے کیا کچھ ایسے اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے جو شرعا واجب نہیں ہیں، یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے؟

اس سوال کے جواب میں دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں جو درج ذیل ہیں :

۱ — پہلا نقطہ نظر :

پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے صرف ان اعمال کا ترک جائز ہے جن کا تعلق شعائر اسلام اور مقاصد شریعت سے نہ ہو، نیز ایسی تہذیب وثقافت سے نہ ہو جس کی وجہ سے مسلمان پہچانے جاتے ہوں، لہذا گائے کے ذبیحہ کا ترک درست نہیں ہے۔

اس نقطہ نظر کے حاملین ہیں: مولانا محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا محمد قمر الزمان ندوی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا عبید اللہ ندوی شافعی، مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی سید عبد الرحیم حسنی، مفتی عبد المنان، مفتی محمد جمال الدین قاسمی اور راقم الحروف محمد شاہجہان ندوی۔

اس نقطہ نظر کے دلائل درج ذیل ہیں :

۱۔ ذبح گاؤ نے شعائر کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور شعائر کا ترک درست نہیں۔

۲۔ اصولی اعتبار سے مباح پر عمومی اور دائمی پابندی عائد کرنا درست نہیں ہے (مقالہ، راقم الحروف)۔

۳۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں : حاصل یہ ہے کہ اصولی طور پر اس (ذبح گائے) کو ممنوع تسلیم کرلینا تو قطعا درست نہیں ہوگا، البتہ فتنہ کے اندیشہ سے وقتی طور پر کسی کام سے مصلحتا رک جانا جائز ہے، جیسے کسی آبادی میں کسی خاص موقع

پر اس کی وجہ سے سخت فساد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو، اور وہاں وقتی طور پر اس سے رک جایا جائے، مگر اس کی حیثیت جزوی اور انفرادی ہے (مقالہ: مولانا محمد ریاض ارمان قاسمی، بہ حوالہ: جدید فقہی مسائل ا۔۲۷۸۔۲۷۹)۔

۴۔ مسلمانوں کے ذبیحہ کو حلال سمجھنے اور کھانے کو اسلام کی علامت اور نشان کی حیثیت دی گئی ہے، چونکہ ہندوستان میں ہندو مذہبی اور اعتقادی حیثیت سے گاؤ کشی کو حرام سمجھتے ہیں، اب اگر یہاں اس پر پابندی تسلیم کر لی جائے، تو یہ نہ صرف یہ کہ اسلام کے ایک شعار کو کھونا ہوگا، بلکہ ایک غیر اسلامی شعار کو قبول کر لینے کے مترادف بھی ہوگا) (مقالہ: مولانا محمد ریاض، بہ حوالہ: مولانا رحمانی)۔

۵۔ اونٹ کا گوشت کھانا مباح ہے واجب نہیں ہے، لیکن جب حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس کے نہ کھانے کا فیصلہ کیا تو اسے مکمل دخول اسلام کے منافی قرار دیا گیا، اور یہ آیت: "**يا أيها الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة**" (سورۂ بقرۃ: ۲۰۸) (اے ایمان والو اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) نازل ہوئی اس کا سیدھا مطلب ہے کہ مباح چیزوں کے ترک کا دائمی عزم درست نہیں ہے (مقالہ: مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی)۔

۶۔ ایسے اعمال کو ترک کرنا حکمت و دانشمندی کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہے، کیونکہ اکثریت اس طرح ان کو بعض واجبی دینی امور کے ترک تک پہنچا دے گی (مقالہ: راقم الحروف)۔

۷۔ یہ کفر کی بالادستی کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور مسلمان اپنی مرضی سے کفر کی بالادستی قبول نہیں کر سکتے ہیں، قرآن کریم میں ہے: "**لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا**" (سورۂ نساء: ۱۴۱) (اللہ تعالیٰ ہرگز کافروں کو مومنوں پر راہ نہیں دیگا) (مقالہ: مولانا اختر الامام عادل قاسمی)۔

دوسرا نقطہ نظر:

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے بعض ایسے اعمال ترک کئے جاسکتے ہیں جو شرعاً واجب نہیں، یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین ہیں: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی انور علی اعظمی البتہ ان کے نزدیک اذان کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو چھوڑا نہیں جاسکتا ہے، مفتی محمد مقصود فرقانی، ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالرؤف قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی اور قاضی ذکاء اللہ شبلی۔

اس موقف کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ کے رسول ﷺ کعبہ کو بنائے ابراہیمی کے مطابق کرنے سے رک گئے، اور ارشاد فرمایا: "**يا عائشة لولا قومك حديث عهدهم بكفرهم لنقضت الكعبة فجعلت لها بابين، بابا يدخل الناس، وبابا يخرجون**" (صحیح البخاری حدیث نمبر۔۱۲۶۔۱۵۸۵) (اے عائشہ اگر تیری قوم نئی نئی اسلام نہ لائی ہوتی، تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اس کے دو دروازے کر دیتا

،ایک دروازہ سے لوگ داخل ہوتے، اور ایک دروازہ سے باہر آتے)۔

۲۔علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مفسدہ اور برائی سے بچنے کے لئے کسی مصلحت اوراچھائی کو ترک کیا جاسکتا ہے (فتح الباری ۱۔ ۲۲۵) (مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی وغیرہ)۔

۳۔اس میں اعلیٰ مصلحت عامہ کے لئے کمتر مصلحت کا ترک ہے (مقالہ: ڈاکٹر مبین سلیم ندوی)۔

۴۔منزل تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں تو کسی ایک کی شرط کو چھوڑا جاسکتا ہے (مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

ترجیح :

پہلا نقطہ نظر راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ مباح پر شرعاً عمومی اور دائمی پابندی نہیں لگائی جاسکتی ہے، نیز مسلمانوں کی صحیح متوارث تہذیب اور شعائر الگ الگ شئے نہیں۔

۵-اس موضوع کا پانچواں سوال یہ ہے کہ: یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام کی نظر میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کی گنجائش نہیں ہے، اس جہت سے شرک پر اور معبودان باطل پر تنقید کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے، لیکن بعض دفعہ شائستہ تنقید بھی دل آزاری کا سبب بن جاتی ہے اور بعض اوقات زبان کی بے احتیاطی کی وجہ سے واقعتاً تنقید دل آزار بن جاتی ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کے کیا حدود ہیں، اور ان مسائل پر اظہار خیال میں کن آداب کی رعایت کی جانی چاہئے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کی تحریروں کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے :

مذاہب باطلہ پر تنقید کے حدود درج ذیل ہیں :

۱۔اہانت آمیز و دل آزار قول وعمل سے احتراز لازم ہے، تنقید برائے توہین وتذلیل درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وجادلهم بالتي هي أحسن“ (سورۂ نحل :۱۲۵) (اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے)۔اور پسندیدہ طریقہ یہی ہے کہ سختی اور درشتی کی بجائے نرمی اور ملاطفت سے گفتگو کی جائے، علامہ ابوحیان لکھتے ہیں :”من الرفق من غير فظاظة ولا تعنيف“ (البحر المحیط ۶۔ ۶۱۳)۔

اور پسندیدہ طریقہ میں یہ بھی داخل ہے کہ ان مسلمات کا سہارا لیا جائے جن کو تمام ادیان والے مانتے ہیں، مثلاً سچائی اچھی چیز ہے، جھوٹ قبیح ہے، احسان کرنے والے کا شکر ادا کیا جانا چاہئے اور مجرم کو سزا ملنی چاہئے، وغیرہ۔

۲۔مذہبی شخصیات کو سب وشتم، گالی گلوج دینے اور برا بھلا کہنے سے پرہیز کیا جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

”ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم“ (سورۂ انعام :۱۰۸) (اور اللہ کے سوا وہ جن کو پکارتے ہیں،

ان کو گالی نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں)۔

علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں :

''اس آیت میں ان تمام چیزوں کو برا بھلا کہنے اور گالی دینے سے منع کیا گیا ہے، جسے دوسرے مذہب کے لوگ مقدس اور قابل احترام سمجھتے ہیں'' (الجامع لاحکام القرآن ۷۔۱۶)۔

اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ مخالف کے احساسات وجذبات اور مذہبی نظریات کا پاس ولحاظ رکھا جائے، اور ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے جس سے باہمی کشمکش اور نفرت پیدا ہو۔

فقہائے کرام نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے، عالمگیری میں ہے : ''**لو قال لیهودی او مجوسی :یا کافریاثم ان شق علیه**'' (ہندیہ ۵۔۳۴۸) (اگر کوئی کسی یہودی اور نصرانی کو کافر کہہ کر مخاطب کرے تو اگر یہ جملہ اسے ناگوار گزرے، تو کہنے والا گنہگار ہوگا)۔

۳۔ ناگزیر حالت میں ہی تنقید کا پہلو اختیار کیا جائے، ورنہ عام حالات میں منفی پہلو کو ترک کر کے مثبت پہلو اختیار کیا جائے، مثلاً غیر مسلموں کو اسلام کے محاسن اور اس کی خوبیوں کو بیان کر کے متاثر کیا جائے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے :''**ولا تجادلوا اهل الکتاب الا بالتی هی احسن الا الذین ظلموا منهم**'' (سورۂ عنکبوت : ۴۶) (اور اہل کتاب سے نہ بحث کرو، مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے، بجز ان کے جو ظالم ہیں)، علامہ طبری اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں : اگر وہ لوگ بری بات کہیں اور بدتمیزی کریں، تو تم ان کے جواب میں اچھی بات کہو (جامع البیان ۲۱۔۱)۔

۴۔ مذاہب باطلہ کے حاملین کے تنقیدی اور اہانت آمیز رویہ پر صبر وسکون، متانت وسنجیدگی اور حسن اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ تھا، چنانچہ ایک بار نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ ﷺ سے حضرت عیسی علیہ السلام کی الوہیت اور ابنیت پر مباحثہ کیا، آپ ﷺ نے ان کو اطمینان بخش جوابات دئے، پھر انہوں نے مسجد نبوی میں اپنے مذہب کے مطابق الٹی سمت نماز پڑھی، صحابہ نے روکنا چاہا، مگر آپ ﷺ نے انہیں روکنے سے منع فرمایا (سہیلی، الروض الانف ۳۔۱۶،۳)۔

۵۔ مثبت اور معقول دلائل پیش کئے جائیں، جواب برائے جواب میں بھی کوئی غیر حقیقی بات زبان سے نہ نکالی جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :''**قل هاتوا برهانکم ان کنتم صادقین**'' (سورۂ بقرۃ: ۱۱۱) (کہو اس بات پر اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم سچے ہو)۔

خلاصہ یہ کہ دلائل و براہین کے ذریعہ مخالفین کو مطمئن کرنے کی حتی الامکان سعی کی جائے، اور اس میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا جائے۔

بین مذہبی مسائل پر اظہار خیال کے آداب درج ذیل ہیں :

۱۔مذاہب باطلہ پر تنقید حسن نیت اور مخاطب کی خیر خواہی کے قصد سے ہو، اس میں نام ونمود اور شہرت طلبی جیسی اغراض فاسدہ شامل نہ ہوں، چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے :"**انما الاعمال بالنیات**"(صحیح البخاری حدیث نمبر ۱)(عمل کا دار ومدار نیت پر ہے)۔

۲۔معروضی، سنجیدہ، حکمت آمیز اور محبت ریز اسلوب اختیار کیا جائے، جیسا کہ قرآن میں ایک موقع پر کہا گیا ہے : "**انااو ایا کم لعلی هدی او فی ضلال مبین**"(سورۂ سباء: ۲۴)(اور ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں)۔اس کی تفسیر میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو یقینی طور پر معلوم تھا کہ وہ راہ راست پر اور مشرکین گمراہ ہیں لیکن خطاب میں نرمی پیدا کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا (الجامع لاحکام القرآن ۲۔ ۱۴)۔

اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے :"**قل ان کان للرحمن ولدفانا اول العابدین**"(سورۂ زخرف: ۱۸)(کہہ دو کہ اگر اللہ رحمن کی کوئی اولاد ہوتو سب سے پہلا اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں گا)، امام طبری اس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں: یہ جملہ شک کے طور پر نہیں ہے بلکہ گفتگو میں نرمی اور حسن خطاب کے لئے یہ انداز اپنایا گیا ہے (جامع البیان ۲۵۔ ۱۰۳)۔

۳۔چیلنج کا اسلوب اختیار نہ کیا جائے، کسی کی ذاتیات پر حملہ نہ کیا جائے اور بحث میں اصل نکتہ سے انحراف نہ کیا جائے۔

اس طرز عمل کے باوجود بھی دوسری طرف سے ہٹ دھرمی اور ضد کا مظاہرہ کیا جائے، تو خوبصورت انداز میں گفتگو کو ختم کر دیا جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :"**وان کذبوک فقل لی عملی ولکم عملکم، انتم بریئون مما اعمل، وانا بریءمما تعملون**"(یونس: ۴۱)(اور اگر وہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے، تم بری ہو میرے عمل کی ذمہ داری سے اور میں بری ہوں تمہارے عمل کی ذمہ داری سے)۔

۴—وقت کی پابندی :

گفتگو کے لئے طے شدہ وقت کی پابندی کی جائے، مخالف کی پوری بات سننے کے بعد ہی اپنی گفتگو کا آغاز کرے، ایسا نہ ہو کہ بیچ میں قطع کلام کردے، اگر چہ اس نے تھوڑی ہی گفتگو سے پوری بات اور مکمل مقصود سمجھ لیا ہو، کیونکہ عہد کی پابندی مؤمن کا شیوہ ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :"**والذین هم لاماناتهم وعهدهم راعون**"(سورۂ مومنون :۸)(اور جو اپنی امانتوں اور عہد کا لحاظ رکھتے ہیں)۔

۵—مخالف کے ساتھ انصاف :

مذاہب باطلہ پر تنقید کرتے وقت عصبیت، بغض وعناد، ظلم وزیادتی اور تشدد سے کلی طور پر بچنے کی کوشش کی جائے،

نظریاتی اختلاف ذاتی مراسم اور باہمی تعلقات پر اثر انداز نہ ہو، فریق مخالف کے مقام ومرتبہ کا لحاظ رکھا جائے اور لب ولہجہ ناصحانہ اور انداز بیان شفقت سے لبریز ہو، چنانچہ قرآن میں عام طور پر یہود ونصاری کو "**یا اهل الکتاب**" جیسے معزز اور شفقت آمیز لقب سے خطاب کیا گیا ہے، اور حضرت موسی وہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے حکم دیا گیا کہ "**وقولا له قولا لینا**" (سورۃ طہ :٤٤) (اس سے نرمی سے بات کرنا)، اس لئے مذاکرہ کار کے ذہن میں یہ رہنا چاہئے کہ وہ حضرت موسی وہارون علیہما السلام سے افضل نہیں، اور نہ ہی اس کا مخاطب فرعون سے زیادہ بدتر ہے۔

لہذا مقصود صرف اور صرف حقیقت کا بیان ہو، اور دلائل قائم کرنے کا انداز منطقی اور سائنٹفک ہو، اس لئے ہر ایسے طریقہ سے پرہیز کرے جس سے ظلم کی بو آتی ہو، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**ولا یجرمنکم شنئان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا، هو اقرب للتقوی**" (سورۃ مائدہ :٨) (اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی تقوی سے قریب تر ہے)۔

عرض مسئلہ :

بین مذہبی مذاکرات پر معاصر علماء کی آراء — تنقیح وتجزیہ
سوال نمبر (۶ تا ۸)

مولانا اختر امام عادل قاسمی ☆

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب کے موضوع پر سوال نمبر (۶ – ۸) کے عرض مسئلہ کی ذمہ داری اس حقیر کو دی گئی ہے، اس موضوع پر اکیڈمی کی طرف سے مجھے ۲۲ اصحاب علم اور ارباب افتاء کے مقالات موصول ہوئے، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

مفتی محمد جمال الدین قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد مقصود فرقانی، ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری، مولانا عبدالرؤف قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد عثمان بستوی، مفتی عبدالمنان قاسمی (آسام)، ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی عبدالرحیم الحسینی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، ڈاکٹر مشتاق احمد تجاروی اور راقم الحروف اختر امام عادل قاسمی۔

ان میں ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی اور ڈاکٹر مشتاق تجاروی صاحبان نے سوالات کی ترتیب کے بجائے مذاکرات بین المذاہب کی تاریخ، اصطلاح، موجودہ عالمی حالات میں ان کی افادیت اور ہندوستانی پس منظر میں اس کے تسلسل وغیرہ عنوانات کے تحت فکر انگیز، معلوماتی اور اصولی تحریریں مرتب کی ہیں، جن سے اس موضوع کا بڑی حد تک تعارف ہوتا ہے، اور جس سے حکم شرعی کی تطبیق میں آسانی ہوتی ہے۔

سوال نمبر :۶ — مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر کیا مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے چاہئیں؛ تاکہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جدو جہد کریں؟

تمام مقالہ نگاروں نے اس کے جواز کی رائے پیش کی ہے، بلکہ کئی حضرات نے موجودہ حالات میں اس کو مستحسن اور وقت کی ضرورت قرار دیا ہے، اس کے لئے عام طور پر درج ذیل دلائل سے استفادہ کیا گیا ہے :

☆ مہتمم جامعہ ربانی منورہ شریف، سمستی پور، بہار۔

☆ یہ انسانیت کی ہمدردی اور بھلائی کے کام ہیں اور قرآن کریم نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون کا حکم دیا ہے، خواہ اس کا تعلق دوست جماعت سے ہو یا دشمن سے۔

"ولا یجرمنکم شنآن قوم أن صدوکم عن المسجد الحرام أن تعتدوا وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب" (سورۂ مائدہ :۲)۔

☆ نبی کریم ﷺ نبوت سے قبل بھی خدمت انسانی کے ان کاموں سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، جیسا کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے :

"إنک لتصل الرحم وتصدق في الحدیث وتحمل الکل وتقري الضیف وتعین علی نوائب الحق"

(الجامع الصحیح المختصر المؤلف: محمد بن اسماعیل ابوعبداللہ بخاری جعفی، ناشر: دار ابن کثیر یمامہ، بیروت، طبع سوم)۔

☆ علاوہ ازیں حلف الفضول، صلح حدیبیہ، میثاق مدینہ، حلف خزاعہ کی تجدید وغیرہ عہد نبوت کے کئی معروف معاہدات سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔

سوال نمبر ۷— جمہوری ممالک کے اندر سیاست میں حصہ داری کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس کے لئے بھی بعض اوقات مذہب کی نمائندہ شخصیتوں یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت پیش آتی ہے، کیا ان کے ساتھ باہمی مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں؟

اس سوال کے جواب میں بھی تقریباً تمام علماء نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ غیر مسلم سیاسی شخصیت یا جماعت کے ساتھ سیاسی مذاکرات کرنا حسب ضرورت جائز ہے، خواہ اس کے نظریات اسلام مخالف ہی کیوں نہ ہوں، بعض حضرات نے کچھ شرطوں کی وضاحت بھی کی ہے کہ :

۱— یہ عام مسلمانوں کے مفاد میں ہو، ۲— مذاکرہ کی کوئی شق خلاف شرع نہ ہو، ۳— اس سے اسلام یا مسلمانوں کی خفت یا توہین نہ ہوتی ہو، ۴— کسی غیر مذہب کو بحیثیت مذہب اس مذاکرہ سے قوت نہ پہنچتی ہو۔

عام طور پر اس سلسلے میں جن دلائل سے استشہاد کیا گیا ہے وہ یہ ہیں؛

☆ میثاق مدینہ: رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچ کر چند انسانی اور سماجی بنیادوں پر مدینہ کے قبائل سے معاہدہ فرمایا جن میں شدت پسند یہود بھی شامل تھے، قصہ معروف ہے۔

☆ صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی اس سلسلے میں بڑا مستدل ہے جس میں حضور ﷺ نے مکہ اور اطراف کے قبائل سے معاہدہ فرمایا، اور قرآن کریم نے اسے فتح مبین قرار دیا۔

☆ حضور ﷺ نے مختلف مواقع پر بنونظیر، بنوقینقاع اور بنو قریظہ وغیرہ سے معاہدات فرمائے (احکام القرآن ۸۶/۲، الوثائق السیاسیۃ ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادیؒ ص ۲۷۳—۲۷۴)۔

☆ قرآن کی نگاہ میں غیر مسلموں سے زیادہ قربت پسندیدہ نہیں ہے، الا یہ کہ دفع ضرر کے لئے یہ قربت اختیار کی جائے، یعنی قربت مسلمانوں کے قومی مفاد میں ہو تو گنجائش ہے، دیکھئے آیت کریمہ: **"لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين ومن يفعل ذلك فليس من الله في شئ إلا أن تتقوا منهم تقاة ويحذركم الله نفسه وإلى الله المصير"** (سورۂ آل عمران: ۲۸)۔

☆ اکثر فقہاء نے غیر مسلموں سے سیاسی اتحاد کو مسلمانوں کے عمومی مفاد کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے:

"وإذا رأى الإمام أن يصالح أهل الحرب أو فريقا منهم وكان في ذلك مصلحة للمسلمين فلا بأس به"

(ہدایہ شرح بدایۃ المبتدی ۲/ ۱۳۸، ابی الحسن علی بن ابی بکر بن عبدالجلیل الرشدانی المرغینانی، ناشر المکتبۃ الاسلامیہ)۔

البتہ مفتی عبدالرحیم الحسینی صاحب نے مسئلہ کی تین صورتیں کی ہیں:

پہلی صورت — محض صلح یا تجارتی معاملات سے متعلق مذاکرات ومعاہدات جن میں کفار سے کسی قسم کی استعانت یا شرکت عمل مطلوب نہ ہو یہ صورت مسلمانوں کے مفاد عامہ کی شرط کے ساتھ درست ہے۔

دوسری صورت — معاہدہ کے ساتھ غیر مسلموں سے استعانت اور شرکت عمل بھی مطلوب ہو (جو ہمارے سوال کا مدعا ہے) اس صورت میں اتحاد کے جواز کے لئے غلبہ کی قید ضروری ہے، یعنی اگر مسلمان حالت مغلوبی میں کسی طاقتور سیاسی جماعت کے ساتھ اتحاد کریں یا مذاکرات کی میز پر بیٹھیں تو یہ جائز نہیں، بلکہ اس صورت میں مساویانہ حیثیت سے بھی اتحاد ناجائز ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کی توہین ہے، نیز یہ اس حدیث کے خلاف ہے: **"الإسلام يعلو ولا يعلى"** ()۔

مفتی عبدالرحیم صاحب نے اس ضمن میں متعدد فقہی عبارات بھی نقل کی ہیں جن میں کفار سے استعانت کو غلبہ اسلام ومسلمین کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، **"إذا كان حكم الإسلام هو الظاهر الغالب الخ"** (مبسوط للسرخسی ۱۰/ ۱۳۸)۔

تجزیہ: ہمارے فقہاء کا یہ معروف نظریہ ہے جو تقریباً تمام کتب فقہ میں مذکور ہے، حالانکہ فقہاء نے اضطرار اور ضرورت کی صورتوں کا استثناء کیا ہے (بدائع الصنائع للکاسانی ۷/ ۱۰۱) جس کا محمل مفتی صاحب موصوف نے ہلاکت جان کو قرار دیا ہے، لیکن اس فقہی نظریہ کے تعلق سے ہمیں چند بنیادی باتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے:

☆ اولاً: قبائلی یا بین الاقوامی تعلقات ومعاہدات کے بارے میں یہ جزئیات غلبہ اسلام کے زمانہ میں دائرہ تحریر میں آئیں، جب مسلمان کسی ایک ملک میں نہیں، بلکہ ساری دنیا میں سب سے بڑی عالمی طاقت تصور کئے جاتے تھے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء اپنی تعبیرات میں غیر مسلم اقوام سے مدد لینے کو کتوں سے تشبیہ دینے سے بھی نہیں ہچکچاتے (مبسوط للسرخسی ۱۰/ ۱۳۸)، اس لئے اس وقت آج کی مشکلات کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا، اور نہ اس وقت کی تمام جزئیات کو من وعن آج منطبق کیا جاسکتا ہے، اس لئے فقہاء نے جو اضطرار کی اصطلاح استعمال کی ہے اس میں تھوڑی توسیع کرکے ضرورت کو بھی اس میں شامل کیا جانا چاہئے، کہ اجتماعی ضرورت چند اشخاص کی انفرادی ہلاکت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء حنفیہ نے اس کو بالکلیہ شجر ممنوعہ قرار نہیں دیا

ہے، بلکہ مشکل حالات میں بدرجہ مجبوری غلبہ کی شرط کے بغیر بھی غیر مسلموں سے استعانت کی بکراہت گنجائش دی ہے، کراہت کی تعبیر ظاہر کرتی ہے کہ اگر قوم اجتماعی وجود وبقا کی کشمکش سے دو چار ہوتو یہ کراہت قابل تحمل ہے :

"**والذي روي أن النبي ﷺ يوم أحد رأى كتيبة حسناء قال :من هؤلاء فقيل :يهود بني فلان حلفاء ابن أبي فقال :إنا لا نستعين بمن ليس على ديننا تأويله أنهم كانوا أهل منعة، وكانوا لا يقاتلون تحت راية رسول الله ﷺ، وعندنا إذا كانوا بهذه الصفة، فإنه يكره الاستعانة بهم**"(شرح السیر الکبیر للسرخسی ۴/۱۹۷)۔

☆ ثانیا: اس مسئلہ پر ہمارے لئے زیادہ مرکز توجہ وہ ہدایات وواقعات ہیں جو مسلمانوں کے عہد غلبہ کی نہیں، بلکہ عہد مغلوبیت کی نمائندگی کرتے ہیں، مثلاً :

☆ حلف الفضول جس میں نبی کریم ﷺ نے قبل از بعثت شرکت فرمائی، اور جس کی تحسین کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ :"**لودعیت به لأجبت**"(طبقات ابن سعد ۱/۱۰۷) ظاہر ہے کہ اس معاہدہ میں تمام قبائل نے مساویانہ شرکت کی تھی، کسی فریق کو بالادستی حاصل نہیں تھی، حضور ﷺ اس مساویانہ شرکت کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

☆ اسی طرح صلح حدیبیہ مسلمانوں کی طرف سے بظاہر ایک مغلوبانہ مصالحت تھی، لیکن مسلمانوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا اور یہ صلح برائے صلح نہیں، بلکہ اس میں بہت سی ایسی اقدامی دفعات بھی تھیں جو فتح مبین کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

☆ مسلمانوں کے قیام حبشہ کے دوران نجاشی کے خلاف ایک بغاوت کی استیصالی مہم میں رفقاء صحابہ کے مشورہ سے حضرت زبیرؓ نے شرکت فرمائی، جس کی وجہ سے مؤرخین کے مطابق نجاشی کی نگاہ میں ان کی وقعت کافی بڑھ گئی تھی، یہ بجائے خود ایک بہت بڑی بنیاد ہے، علاوہ ازیں اس واقعہ کی سب سے مستند اور چشم دید راوی ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ ہیں جو اس وقت حضرت ابوسلمہؓ کے نکاح میں تھیں، وہ مسلمانوں کے مشکل حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ اس قدر غم انگیز اور مشکل لمحہ کبھی ہماری زندگی میں نہیں آیا، ہمیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ حبشہ کا نیا سربراہ نہ معلوم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے، یعنی ہماری جماعتی زندگی کے وجود و بقا کا سوال تھا (الروض الأنف ۲/۱۱۴، المؤلف :ابوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ بن احمد السہیلی م:۵۸۱ھ)۔

حضرت ام سلمہؓ ان غم انگیز لمحات کو کبھی فراموش نہ کرسکیں، ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی زوجیت میں جانے کے بعد انہوں نے اس واقعہ کا ذکر آپ ﷺ سے ضرور کیا ہوگا، وہ اس واقعہ کو حضور ﷺ کی نکیر کے بغیر نقل کرتی ہیں، جو اس کے استناد میں اضافہ کرتا ہے۔

☆ فقہاء نے اس واقعہ کے تحت دو احتمالات کا ذکر کیا ہے :

۱— ممکن ہے نجاشی اس وقت تک مسلمان ہو چکا ہو۔

۲— دوسرا احتمال یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا ہو، یعنی مسلمانوں نے یہ فیصلہ انتہائی مشکل حالات میں کیا ہو، اور یہ نکتہ فقہاء نے بجا طور پر حضرت ام سلمہؓ کے مذکورہ بالا بیان سے سمجھا ہے : B5

”فبظاهر هذا الحديث يستدل من يجوز قتال المسلمين مع المشركين تحت رأيتهم، ولكن تأويل هذا من وجهين عندنا أحدهما : أن النجاشي كان مسلما يومئذ كما روي، فلهذا استحل الزبير القتال معه، والثاني : أنه لم يكن للمسلمين يومئذ ملجأ غيره على ما روي عن أم سلمة رضى الله تعالى عنها قالت : لما اطمأننا بأرض الحبشة فكنا في خير دار عند خير جار نعبد ربنا إلى أن سار إلى النجاشي عدو له فما نزل بناقط أمر عظيم منه“ (شرح السیر الکبیر للسرخسی ۴؍۱۹۷)۔

☆ حضرت یوسف علیہ السلام کی سنت تو بہت معروف ہے کہ انہوں نے فرعون کی بالادستی میں کام کرنے کو قبول فرمایا جس کو قرآن نے بلانکیر نقل کیا ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

”وكذلك يوسف الصديق كان نائبا لفرعون مصر وهو وقومه مشركون وفعل من العدل والخير ماقدر عليه“ (وظیفۃ الحکومۃ الاسلامیۃ؍۱۳)۔

☆ دراصل فقہ اسلامی کے بہت سے قوانین زمانہ قوت سے وابستہ ہیں، جبکہ کئی قوانین زمانہ ضعف کے لئے ہیں، اگر کسی ایک زمانہ کے قانون کو دوسرے زمانہ کے پس منظر میں دیکھا جائے گا تو یقینا دشواریاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوں گی، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ غزوہ احزاب کے موقعہ پر مسلمانوں کی کمزوری دیکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ غطفان سے مدینہ کی ایک تہائی پیداوار دینے کا معاہدہ فرمایا، جو حملہ آور کفر کی طاقت کو توڑنے کے لئے بظاہر ایک مغلوبانہ حکمت عملی تھی، لیکن صحابہ (حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ) نے جب اپنی قوت وعزیمت کا یقین دلایا تو حضور ﷺ نے یہ معاہدہ منسوخ فرمادیا (طبقات ابن سعد ۲؍۵۲، ۵۳)۔

”شرح السیر الکبیر“ میں ہے :

”وقد هم رسول الله ﷺ بذلك حين أحس الضعف ببعض المسلمين يوم الخندق، فلما أحس بهم القوة كما قاله السعدان رضي الله عنهما امتنع منه فصار ذلك أصلا في الجواز عند الخوف على ذراري المسلمين“ (شرح السیر الکبیر للسرخسی ۴؍۱۳۳)۔

تیسری صورت ہے بلا معاہدہ شرکت عمل، اس کو مفتی عبدالرحیم صاحب نے بالاجماع ممنوع قرار دیا ہے کہ یہ موالات اور متابعت میں داخل ہے، یہ صورت یہاں زیر بحث نہیں ہے۔

سوال نمبر ۸— پردے کا جو تصور اسلام میں ہے، دوسرے مذاہب بحالت موجودہ اس سے خالی ہیں، اس صورت حال میں جب بین مذہبی مذاکرات کی مجلسیں یا پروگرام ہوتے ہیں تو بہت سی دفعہ اسٹیج پر خواتین مقرر بھی موجود ہوتی ہیں، ایسے مواقع پر مسلمانوں کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے؟۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اکثر مقالہ نگاروں نے قلب ونظر کی احتیاط کے ساتھ ایسی مجالس میں شرکت کی اجازت دی

ہے، اس لئے کہ غیر مسلم فروعات کے مکلف نہیں ہیں، ہم انہیں پردہ کا پابند نہیں بنا سکتے، البتہ خود محتاط طریقہ پر شرکت کر سکتے ہیں، تا کہ مسلم نمائندگی کا خلا واقع نہ ہو، شریعت اسلامی میں ایسے مواقع پر نظر نیچی کرنے کا حکم ہے، بلکہ حسب ضرورت دیکھنے اور بات کرنے کی بھی گنجائش ہے، البتہ مصافحہ کی گنجائش نہیں ہے، اسی طرح اختلاط سے بچنا بھی ضروری ہے، فقہاء نے قاضی اور شاہد وغیرہ کو فیصلہ اور شہادت کے وقت حسب ضرورت متعلقہ خواتین کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔

جبکہ پانچ مقالہ نگار حضرات اس رائے سے علی الاطلاق اتفاق نہیں رکھتے، ان کا رجحان ممانعت کی طرف ہے، بعض نے کچھ حدود و قیود کا بھی ذکر کیا ہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی عبدالرحیم صاحب الحسینی، اور مولانا اختر امام عادل قاسمی۔

تنقیح: دراصل یہ خیر میں شر کی آمیزش کا مسئلہ ہے اور یہ تجزیہ طلب موضوع ہے، شریعت نے منکرات و مباحات کی تفصیلات بیان کی ہیں، اور شریعت نے جن اعمال کا مطالبہ کیا ہے، اصل یہ ہے کہ حتی الامکان ان کو منکرات و مشتبہات سے پاک انجام دیا جائے، لیکن اگر کہیں جائز اعمال کے ساتھ منکرات کی آمیزش ہوتی ہو تو علی الاطلاق ان پر جواز یا عدم جواز کا حکم نہیں لگایا جائے گا، بلکہ سب سے پہلے خود اس جائز عمل کی شرعی حیثیت دیکھنی ہوگی کہ وہ طاعت مطلوبہ ہے یا محض مباحات کے دائرے میں آتا ہے، اگر محض مباح ہے تو مباح کے لئے منکرات کا ارتکاب کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، بلکہ منکرات سے بچنے کے لئے اس مباح کو ترک کرنے کا حکم دیا جائے گا:

☆اس کی مثال علماء نے یہ بیان کی ہے کہ بتوں اور معبودان باطل کو برا بھلا کہنا فی نفسہ مباح ہے، لیکن اگر اس کی بنا پر کوئی منکر رونما ہونے کا اندیشہ ہو (مثلاً غیر مسلم بھی جواب میں اللہ پاک کو گالیاں دینے لگیں) تو منکر سے بچنے کے لئے مباح کو ترک کر دیا جائے گا، اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے:

☆اسی طرح غیر مسلموں کے ساتھ سماجی تعلقات کی بنیاد پر نشست و برخاست رکھنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر وہاں اسلام یا قرآن کا استہزاء شروع ہو جائے تو بیٹھنا جائز نہیں ہوگا، ارشاد باری تعالی ہے:

"وقد نزل عليكم في الكتاب أن إذا سمعتم آيات الله يكفر بها ويستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا في حديث غيره إنكم إذا مثلهم إن الله جامع المنافقين والكافرين في جهنم جميعا" (سورۂ نساء: ۱۴۰)

(اللہ پاک نے تم پر کتاب میں نازل کیا ہے جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر و استہزاء کیا جا رہا ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو، جب تک کہ وہ دوسری بات نہ شروع کر دیں، ورنہ تم انہی کے مثل ہو جاؤ گے، بے شک اللہ پاک منافقوں اور کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والے ہیں)۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے منقول ہے کہ اس میں ہر بدعت اور منکر شامل ہے، یعنی مسلمانوں کو بدعات و منکرات والی مجالس میں بیٹھنا درست نہیں (لباب التأویل فی معانی التنزیل ۲/۱۹۴: علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بن عمر الشیحی

أبوالحسن، المعروف بالخازن—م: ۷۴۱ھ)۔

☆ بازار اور دنیوی مجالس میں بلا ضرورت بھی جانا مباح ہے، لیکن لہو ولعب موجود ہوتو پرہیز ضروری ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک محفل کے پاس سے گذرے، جہاں لہو ولعب کا بازار گرم تھا تو خاموشی سے گذر گئے، اور اس کی طرف رخ بھی نہ کیا، اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لقد أصبح ابن مسعود و أمسى كريما“ (رواه ابن عساکر کما فی المختصر لابن منظور ۱۴/ ۵۵ من طریق ابراہیم بن میسرۃ بہ، جامع البیان فی تاویل القرآن ۱۹/ ۳۱۶، المؤلف: محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب ال آملی، ابوجعفر الطبری م: ۳۱۰ھ) (ابن مسعودؓ کی صبح بھی کریم اور شام بھی کریم ہے)۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے دسترخوان پر شرکت سے منع فرمایا جہاں شراب کا دور چل رہا ہو: ”ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يجلس على مائدة يدار عليها الخمر قال الشيخ الألباني: حسن“ (الجامع الصحیح سنن الترمذی ۵/ ۱۱۳) (جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جہاں شراب کی گردش جاری ہو)۔

البتہ اس سے مجبوری کے حالات کا استثنا ہے، یعنی عدم شرکت سے فتنہ کا اندیشہ ہوتو ناگواری خاطر کے ساتھ گناہوں سے بچتے ہوئے شرکت کی گنجائش ہے، علامہ خازنؒ نے آیت استہزاء کے تحت علماء کا فتوی نقل کیا ہے، جس میں مجبوری کی صورت میں منکرات والی مجلسوں میں بادل نخواستہ شرکت کی گنجائش دی گئی ہے، بشرطیکہ خود کسی منکر کا مرتکب نہ ہو:

”قال العلماء: وهذا يدل على أن من رضي بالكفر فهو كافر ومن رضي بمنكر أو خالط أهله كان في الإثم بمنزلتهم إذا رضي له، وإن لم يباشره، فإن جلس إليهم، ولم يرض بفعلهم بل كان ساخط له، وإنما جلس على سبيل التقية والخوف، فالأمر فيه أهون من المجالسة مع الرضا، وإن جلس مع صاحب بدعة أو منكر ولم يخض في بدعته أو منكره، فيجوز الجلوس معه مع الكراهة، وقيل: لا يجوز بحال والأول أصح“ (لباب التأویل فی معانی التنزیل ۲/ ۱۹۴، المؤلف: علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بن عمر الشیحی أبوالحسن، المعروف بالخازن: م—۷۴۱ھ)۔

(علماء نے کہا ہے کہ جو کفر پر راضی ہو وہ کافر ہے اور جو منکر پر راضی ہو اور ایسے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھے، تو گناہ میں دونوں برابر ہیں، اگرچیکہ خود گناہ کا ارتکاب نہ کرے، البتہ اگر ان کے اعمال سے راضی نہ ہو اور محض خوف یا کسی اندیشہ کی بنا پر ان کے ساتھ بیٹھ گیا ہو تو معاملہ رضامندی والوں کی بہ نسبت آسان ہے، ایسی حالت میں اہل بدعت یا اہل منکر کے ساتھ بیٹھنا کراہت کے ساتھ درست ہے، بشرطیکہ خود منکر کا مرتکب نہ ہو، جبکہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ کسی حال میں ان کے ساتھ نشست جائز نہیں، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے)۔

☆ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عمل شریعت میں مطلوب ہو اور طاعت کا درجہ رکھتا ہو، مثلاً جنازہ میں عورتوں کی شرکت یا ولیمہ میں عورتوں اور مردوں کا اختلاط وغیرہ، علماء متقدمین کا طرز عمل اس صورت میں مختلف رہا ہے، امام ابن سیرینؒ اس صورت میں بھی منکرات کو نظر انداز کرنے کے قائل نہ تھے، ایک بار وہ کسی جنازہ میں تشریف لے گئے وہاں عورتوں کی موجودگی دیکھ کر شریک نہیں

ہوئے (روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع الثانی ۵/۴۷۴، المؤلف : شہاب الدین محمود بن عبد اللہ الحسینی ال آلوسی —م :١٢٧٠ھ)۔

اس کے برعکس امام حسن بصریؒ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ منکرات کی وجہ سے طاعات اور شریعت کے مطلوب اعمال ترک نہیں کئے جائیں گے، ورنہ لوگوں کی بے اعتدالیوں کی بنا پر دین کی ایک ایک چیز ترک کرنی پڑے گی (حوالہ بالا)۔

بعد کے فقہاء نے دونوں طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے جو نقطہ عدل تجویز کیا وہ یہ ہے کہ منکرات کی وجہ سے مباحات کو ترک کیا جائے گا، طاعات اور اعمال مطلوبہ کو نہیں، بلکہ منکرات کے باوجود ان میں شرکت کی گنجائش ہے، البتہ ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی (حوالہ بالا)۔

پھر فقہاء نے ایسی مجالس میں شرکت کا حکم شرعی واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

☆اگر ان منکرات کا پہلے سے علم ہو اور احسان ہو کہ وہ اسے روک سکتا ہے تو اصلاح کی غرض سے ضرور شرکت کرنی چاہئے اور اگر روکنے کی طاقت نہ ہو تو تب بھی شرکت کی گنجائش ہے، اس لئے کہ منکرات کی بنا پر طاعات کو ترک نہیں کیا جائے گا، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ایسے باوقار اور معزز علماء جن کی شرکت سے یہ مجالس منکرات سے پاک ہوسکتی ہوں ان کو بارادہ اصلاح ضرور شرکت کرنی چاہئے، لیکن اگر وہ کسی بڑی تبدیلی پر قادر نہ ہوں تو احتیاط اور اولی یہ ہے کہ شرکت نہ کی جائے۔

☆اگر منکرات کا پہلے سے علم نہ ہو، بلکہ ناگہانی طور پر اس میں مبتلا ہو جائے، تو عام مسلمانوں کے لئے ناگواری قلب اور منکرات سے تحفظ کے ساتھ شرکت کی گنجائش ہے، لیکن مذہبی قائدین اور علماء ومشائخ کو اس میں شرکت سے پرہیز کرنا چاہئے، اس لئے کہ اس سے دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے غلط پیغام جائے گا۔

☆اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کی دعوت پر ان کے گھر تشریف لے گئے، لیکن گھر میں تصاویر دیکھ کر واپس ہو گئے (سنن ابن ماجہ ۲/۱۱۱۴، حدیث نمبر:٣٣٥٩)۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کو اہل کنیسہ نے دعوت دی، مگر تصاویر کی بنا پر آپؓ نے عذر فرما دیا (مصنف عبد الرزاق ۱/۴۱۱، حدیث نمبر :١٦١١)۔

نیز اس سلسلے میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کا طرز عمل بھی ایک بہترین نمونہ ہے، جس کا تذکرہ ہماری تمام کتب فقہ میں موجود ہے، ہمارے مذہبی طبقے کو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، اس میں بڑی مصلحتیں ہیں، ہماری اکثر کتابوں میں یہ عبارت تھوڑے فرق کے ساتھ موجود ہے :

”رجل دعي إلى وليمة أو طعام وهناک لعب أو غناء جملة الكلام فيه أن هذا في الأصل لا يخلو من أحد وجهين : إما أن يكون عالما أن هناک ذاک، وإما إن لم يكن عالما به، فإن كان عالما، فإن كان من غالب رأيه أنه يمكنه التغيير يجيب؛ لأن إجابة الدعوى مسنونة، قال النبي عليه الصلاة والسلام :{إذا دعي أحدكم إلى وليمة فليأتها}وتغيير المنكر مفروض فكان في الإجابة إقامة الفرض ومراعاة السنة، وإن كان في غالب رأيه

أنه لا يمكنه التغيير لا بأس بالإجابة، لما ذكرنا أن إجابة الدعوة مسنونة، ولا نترك السنة لمعصية توجد من الغير، ألا ترىٰ أنه لا يترك تشييع الجنازة وشهود المأتم، وإن كان هناك معصية من النياحة وشق الجيوب ونحو ذلک؟ كذا ههنا-وقيل : هذا إذا كان المدعو إماما يقتدى به بحيث يحترم ويحتشم منه، فإن لم يكن فترک الإجابة والقعود عنها أولى، وإن لم يكن عالما حتى ذهب فوجد هناک لعبا أو غناء، فإن أمكنه التغيير غير، وإن لم يمكنه ذكر في الكتاب وقال : لا بأس بأن يقعد ويأكل، قال أبو حنيفة رضي الله عنه : ابتليت بهذا مرة لما ذكرنا أن إجابة الدعوة أمر مندوب إليه، فلا يترک لأجل معصية توجد من الغير، هذا إذا لم يعلم به حتى دخل، فإن علمه قبل الدخول يرجع ولا يدخل، وقيل : هذا إذا لم يكن إماما يقتدي به، فإن كان لا يمكث بل يخرج : لأن في المكث استخفافا بالعلم والدين وتجرئة لأهل الفسق، على الفسق وهذا لا يجوز وصبر ابي حنيفة رحمه الله محمول على وقت لم يصر فيه مقتدى به على الإطلاق ولو صار لما صبر'' (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۵ / ۱۲۷، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۶ / ۱۳)۔

مگر یہ مقتدا اور غیر مقتدا یا قدرت اصلاح رکھنے نہ رکھنے کی ساری بحث اعمال مطلوبہ اور طاعات شرعیہ کے لئے ہے، اس لئے کہ طاعات کو منکرات سے پاک کرنا بجائے خود مطلوب ہے، یہ حکم عام مباحات کے لئے نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ بین مذہبی مذاکرات کو تمام علماء نے عام حالات میں زیادہ سے زیادہ مباحات کے دائرے میں رکھا ہے، اس کو طاعات شرعیہ یا اعمال مطلوبہ کا مقام حاصل نہیں ہے، اس لئے عام حالات میں منکرات کے ساتھ ان میں شرکت کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

☆ الا یہ کہ کسی کے لئے سخت مجبوری یا فتنہ کا اندیشہ ہو، تو اس کے لئے معصیت سے بچتے ہوئے بقدر ضرورت گنجائش ہوسکتی ہے۔

☆ البتہ بعض حالات میں اسلام کی ترجمانی یا مسلمانوں کے حقوق کے دفاع کے لئے ان مذاکرات کی واقعی ضرورت محسوس ہو اور منکرات سے بچنے کی کوئی صورت موجود نہ ہو تو مسلمانوں کے غیر مذہبی طبقہ کو ان میں نمائندگی کرنی چاہئے، لیکن مذہبی طبقہ کو اس میں ملوث نہیں ہونا چاہئے، الا یہ کہ بعض مسائل کے لئے ان کی شرکت بالکل ناگزیر ہو جائے تو بقدر ضرورت قلب ونظر کی حفاظت کے ساتھ اس میں شرکت کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

☆ مذاکرات میں مردوں کے ساتھ خواتین کی بے پردہ شرکت ایک امر ممنوع ہے، جو خود غیر مسلموں کے مذہبی تصورات کے بھی خلاف ہے، عیسائیوں کے یہاں مریم صدیقہ اور ہندؤں کے یہاں سیتا کو عفت وعصمت اور حیات اور پردہ کی علامت تصور کیا جاتا ہے، مگر انہوں نے کوتاہ عملی کی بنا پر اسے مذہبی تصورات کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، اب اگر مسلمان (بالخصوص مذہبی قائدین) بھی اسی طرح کی مجلسوں میں بے تکلف شرکت کرنے لگیں تو مسلمانوں کا امتیاز کیا باقی رہ جائے گا؟...دنیا ان کے بارے

میں بھی یہی خیال کرے گی کہ مذہب کا طوق انہوں نے بھی گردن سے نکال پھینکا ہے، یہ ایک غلط تعارف ہوگا، اس طرح ان مواقع پر نرمی اختیار کرنا بحیثیت ملت نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

☆درست ہے کہ غیر مسلم فروعات اسلامی کے پابند نہیں ہیں، اور نہ ہم ان پر اپنا مذہب مسلط کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، لیکن خود ہمارے لئے اپنے فروعات کی پابندی تو بہر حال ضروری ہے، منکرات کے ساتھ صلح کر کے ہم قوم وملت کی کچھ اچھی شبیہ پیش نہیں کر سکتے، کیونکہ جب ہم عملی زندگی میں ایک نظریہ سے دستبردار ہوسکتے ہیں تو دوسرے اسلامی نظریات بھی مذاکرات کی میز پر زیر بحث کیوں نہیں آسکتے؟

☆اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ بازار، عدالت یا دیگر مقامات ضرورت پر فقہاء نے مردوں کو احتیاط نظر کا حکم دیا ہے، بلکہ حسب ضرورت عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں کو دیکھنے اور اس سے بات کرنے کی بھی اجازت دی ہے، لیکن یہ انسان کی بنیادی ضروریات ہیں، جن پر حیات انسانی کا مدار ہے، بین مذہبی مذاکرات جیسے مباحات کو ان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ان کے لئے اسلام کے معروف تصورات اور مسلمہ نظریات سے دستبرداری قبول کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

باب دوم

تفصیلی مقالات

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

مولانا خورشید انور اعظمی ☆

آج مختلف ادیان ومذاہب سے وابستہ اصحاب علم ودانش کی خواہش ہوتی ہے کہ مذہبی، سماجی اور سیاسی مسائل پر باہم مذاکرہ کیا جائے، اور اس کے واسطے سے ایک دوسرے کے افکار ونظریات اور ذہن ومزاج کو قریب سے جاننے اور سمجھنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے، تاکہ آپس کی غلط فہمیاں دور ہوں اور باہمی روابط وتعلقات اس درجہ خوشگوار اور استوار رہیں کہ معاشرہ میں امن وسکون کی فضا قائم ہو، ایک دوسرے کا احترام عام ہو، نہ کسی کو کسی سے بدگمانی ہو اور نہ کسی طرح کی شکایت، ہر شخص اطمینان وسکون کے ماحول میں زندگی بسر کرے، اگر اس میں نیت صاف اور جذبہ نیک ہو تو بظاہر یہ بہت مستحسن کوشش اور دیگر ادیان وملل کے حاملین کے سامنے حق واضح کرنے کا بہترین موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں اسلام اور اہل اسلام کے تعلق سے پھیلی ہوئی بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے وہیں دوسروں کو اسلام کی زریں تعلیمات سے روشناس بھی کرایا جاسکتا ہے، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کو دعوت دینے کے لئے خیبر تو ان سے فرمایا:

”لأن یھدی اللہ بک رجلا واحدا خیر لک من حمر النعم“ (صحیح بخاری ۴/۴۷)۔

(اللہ تعالی تمہارے ذریعہ کسی ایک آدمی کو ہدایت دے، یہ تمہارے لئے سرخ اونٹ سے زیادہ بہتر ہے)۔

نیز نبی اکرم ﷺ نے دوسروں کو اچھی بات بتانے اور کار خیر کی رہنمائی کرنے کی تاکید فرمائی ہے:

”من دل علی خیر فلہ مثل أجر فاعلہ“ (صحیح مسلم ۳/۱۵۰۶)۔

(جو شخص کسی کار خیر کی رہنمائی کرے تو اس کو بھی اس کے کرنے والے ہی کی طرح ثواب ملتا ہے)۔

مذکورہ احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے حسب ضرورت ومصلحت ایسے مذاکرے کی اجازت دی ہے جس سے اسلام کے افکار ونظریات کی صحیح ترجمانی کی جاسکے، علامہ ابن حجر عسقلانی نے اہل نجران کے واقعہ کے ذیل میں اس کے جواز کی بات کہی ہے اور اگر کوئی خاص مصلحت ہو تو اس کو واجب قرار دیا ہے، فتح الباری میں ہے:

”وفیھا جواز مجادلۃ أھل الکتاب وقد تجب إذا تعینت المصلحۃ“ (فتح الباری ۸/۹۵)۔

(اس واقعہ میں اہل کتاب سے مجادلہ کا جواز معلوم ہوتا ہے، اور اگر خاص مصلحت ہو تو واجب ہے)۔

☆ صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم بنارس۔

مذاکرات، مختلف مسائل پر کئے جاسکتے ہیں، لیکن ہر ایک کے کچھ اصول وآداب ہیں جن کا لحاظ کرنا ازبس ضروری ہے۔

مذہبی مسائل پر مذاکرہ :

اسلام دین برحق ہے، اس کی حقانیت پورے طور پر حقیقت پسند افراد پر واضح ہوچکی ہے، اس لئے اس مذہبی مذاکرے کا مقصد تلاش حق کے بجائے اثبات حق ہونا چاہئے، اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ دوسروں کے سامنے اپنا موقف رکھ کر انہیں ہر طرح مطمئن کرنے کی سعی محمود کرنی چاہئے، جیسا کہ اسلام کا دعوتی اسلوب ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :

"أدع إلى سبيل ربک بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتى هى أحسن إن ربک هو أعلم بمن ضل عن سبيله وهو أعلم بالمهتدين" (النحل ر ١٢٥)۔

(آپ اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے اچھے طریقے گفتگو کیجئے، یقینا آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بخوبی جانتا ہے اور راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے)۔

نیز اللہ تعالی نے فرمایا :

"ولا تجادلوا أهل الكتاب إلا بالتى هى أحسن إلا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذى أنزل إلينا وأنزل إليكم وإلهنا وإلهكم واحد ونحن له مسلمون" (العنکبوت:٤٦)۔

(اور اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو، مگر ان کے ساتھ جو ان میں ظالم ہیں، صاف اعلان کردو کہ ہمارا تو کتاب پر بھی ایمان ہے جو ہم پر اتاری گئی اور اس پر بھی جو تم پر اتاری گئی، ہمارا تمہارا معبود ایک ہی ہے، ہم سب اسی کے حکم بردار ہیں)۔

علامہ نسفی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھا ہے :

"والآية تدل على جواز المناظرة مع الكفرة فى الدين" (تفسیر نسفی ٢ر ٦٨٠)۔

(اس آیت سے دینی امور میں کفار کے ساتھ بحث ومباحثہ کے جواز کا پتہ چلتا ہے)۔

لیکن مذاکرہ میں حصہ لینے والے کے لئے ضروری ہے کہ علم شریعت سے پوری طرح واقف اور اس کے اظہار پر کامل عبور رکھتا ہو، تاکہ بوقت مذاکرہ اسلام کی صحیح ترجمانی کرسکے، اس لئے کہ کم علمی کے سبب ناقص نمائندگی ہونے کی وجہ سے نفع کے بجائے نقصان ہوگا جس کے مضر نتائج سامنے آئیں گے اور اس کے اثرات بد سے پوری امت کو دوچار ہونا پڑے گا، علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں :

"وقد ينهون عن المجادلة والمناظرة إذا كان المناظر ضعيف العلم بالحجة وجواب الشبهة، فيخاف عليه أن يفسده ذلک المضل، كما ينهى الضعيف فى المقاتلة أن يقاتل علجا قويا من علوج الكفار، فإن ذلک يضره ويضر المسلمين بلامنفعة" (درء تعارض العقل والنقل ٧ر ١٧٣-١٧٤)۔

(مجادلہ اور مناظرہ سے اس وقت منع کیا جائے گا جب کہ مناظر، استدلال اور جواب شبہ کے علم میں کمزور ہو، اس لئے کہ اس بات کا اندیشہ رہے گا کہ گمراہ شخص اسکو نا کام بنادے، جس طرح لڑائی میں کمزور شخص کو طاقتور کافر سے لڑنے سے منع کیا جائے گا، اس وجہ سے کہ یہ اس کے لئے اور مسلمانوں کے لئے بلا وجہ نقصان دہ ہوگا)۔

سماجی مسائل پر مذاکرہ:

نبی اکرم ﷺ نے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل اور اس کی برائیوں کے انسداد پر کافی زور دیا ہے، اور ایسی ہر کوشش کو پسند فرمایا ہے، جس سے سماج بہتر سے بہتر ہو سکے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حلف الفضول میں شرکت فرمائی اور اسے بے حد پسند فرمایا، سیرت ابن ہشام میں ہے:

"لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم ولو أدعى به في الإسلام لأجبت" (سیرت ابن ہشام ۱/ ۱۳۵)۔

(میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں حلف الفضول میں شریک ہوا، اگر اس معاہدے کے بدلے مجھے سرخ اونٹ دیئے جاتے تو بھی میں نہ لیتا اور آج بھی اس قسم کا معاہدہ ہو تو میں اس میں شرکت کے لئے تیار ہوں)۔

علامہ سہیلی "الروض الانف" میں لکھتے ہیں:

"أما دعوة الجاهلية فقد رفعها الإسلام إلا ما كان من حلف الفضول كما قدمنا، فحكمه باق والدعوة به جائزة" (الروض الانف ۲/ ۵۴)۔

(اسلام نے جاہلیت کی باتوں کو ختم کر دیا ہے بجز حلف الفضول کے، کہ اس کا حکم باقی ہے اور اس کی دعوت دینا جائز ہے)۔

سیاسی مسائل پر مذاکرہ:

شریعت اسلامی میں سیاست کی یہ تعریف کی جاتی ہے:

"السياسة ما كان فعلا يكون معه الناس أقرب إلى الصلاح وأبعد عن الفساد وإن لم يصنع الرسول ولا نزل به وحي" (الطرق الحکمیۃ بحوالہ "احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت" ۱۰۶)۔

(سیاست ایسا عمل ہے جس سے لوگ اچھائی سے قریب اور برائی سے دور ہوں اگر چہ نبی اکرم ﷺ نے اسے نہ بنایا ہو اور نہ اس سلسلے میں کوئی وحی نازل ہوئی ہو)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ میں خیر وصلاح کا عام کرنا اور اس سے شر وفساد کا قلع قمع کرنا ہی اسلامی سیاست ہے، لہذا انسانوں کے لئے جو کام مفید ہو اس کا اختیار کرنا اور جو مضر ہو اس کا ازالہ کرنا اور اس تعلق سے باہم مذاکرہ کرنا بہتر عمل ہے، تا کہ

وقت کی ضرورت ومصلحت کے پیش نظر سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال کر کے ملک وملت کے لئے مفید ونفع بخش راہ کا تعین کیا جا سکے، آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے ذریعہ اور مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ لکھوا کر یہ ذہن دیا کہ جس کام میں انسانوں کے لئے فلاح وبہبود نظر آئے اسے اپنانا اچھی بات ہے اور اس سلسلے کی ہر کوشش میں حصہ لینا مستحسن عمل ہے، لہذا سیاسی مسائل پر مذاکرہ کرنا ازروئے شرع درست ہوگا۔

دوسرے مذاہب کی کتابوں کے حوالے کا مسئلہ:

مختلف مذاہب کے درمیان بہت سی تعلیمات مشترک ہیں، بوقت مذاکرہ اپنے موقف کی تائید میں دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے حسب ضرورت ومصلحت استفادہ کیا جا سکتا ہے، اور ان کی کتابوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمران بن حصین، حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث بیان فرما رہے تھے کہ آپ نے فرمایا: ''**الحياء لا يأتي إلا بخير**'' (حیا سے صرف اچھائی ہی آتی ہے)، اس پر بشیر بن کعب نے کہا: ''**إنه مكتوب في الحكمة أن منه وقارا وسكينة**'' (حکمت کی باتوں میں ہے کہ اس سے وقار وسکینت حاصل ہوتی ہے)۔ عمران نے کہا: ''**أحدثك عن رسول الله** ﷺ **وتحدثني عن صحفك**'' (صحیح مسلم) (میں حضور اکرم ﷺ کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم اپنے صحیفوں کی بات کرتے ہو)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے ''فتح الملہم شرح صحیح مسلم'' میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے واضح فرمایا ہے کہ بشیر بن کعب کا مقصد حضرت عمران بن حصین کی حدیث کی تائید کرنا تھا نہ کہ اس کے بالمقابل ان باتوں کا پیش کرنا، تاہم بہتر یہ ہے کہ کلام حکماء کی تائید نبی اکرم ﷺ کے قول مبارک سے کی جائے، نہ کہ اس کے برعکس، البتہ بوقت ضرورت ومصلحت حکماء کی باتوں سے بطور تائید استفادہ کیا جا سکتا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''اگر ہم فرض کرلیں کہ بشیر بن کعب کا مقصد صرف حدیث عمران کی تائید کرنا تھا، کسی بھی طرح اسکا معارضہ کرنا مقصود نہیں تھا تب بھی حکماء کے کلام سے نبی اکرم ﷺ کے قول کی تائید کے بالمقابل نبی اکرم ﷺ کے قول سے حکماء کے کلام کی تائید کرنا، حسن ادب کے زیادہ موافق، نیز خیر اور پختگی عقل کے زیادہ قریب ہے، الا یہ کہ ضرورت ہو، ضرورتیں بقدر ضرورت ہوا کرتی ہیں''۔ (فتح الملہم ۱/ ۲۱۲)۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے اہل کتاب کی کتابوں کے پڑھنے اور ان میں غور وفکر کرنے کے سلسلے میں علماء کے اختلاف پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اپنا موقف ظاہر کیا ہے کہ جو شخص راسخ فی الایمان نہیں ہے، اس کے لئے تو اجازت نہیں ہوگی لیکن جو شخص راسخ فی الایمان ہے اس کے لئے اجازت ہوگی کہ ان کتابوں کو پڑھے اور ان میں غور وفکر کرے، بطور خاص اسوقت جب کہ ان کے ذریعہ مخالف کا جواب دینا مقصود ہو، ائمہ کرام نے ہمیشہ یہود کو مسکت جواب دینے کے لئے نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو توریت سے ثابت کیا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے موقف کے اثبات کے لئے دوسرے مذاہب کی کتابوں سے استفادہ کرنا اور ان کا حوالہ کرنا

درست ہے، فتح الباری میں ہے:

"والأولی فی ھذہ المسئلة التفرقة بین من لم یتمکن ویصر من الراسخین فی الإیمان فلا یجوز له النظر فی شئ من ذلک بخلاف الراسخ فیجوز له ولاسیما عند الاحتیاج إلی الرد علی المخالف ویدل علی ذلک نقل الأئمة قدیما وحدیثا من التوراة وإلزامھم الیھود بالتصدیق بمحمد ﷺ بما یستخرجونه من کتابھم ولولا اعتقادھم جواز النظر فیه لما فعلوہ وتواردوا علیه" (فتح الباری ۱۳/ ۵۲۶)۔

(اس مسئلے میں بہتر یہ تفصیل ہے کہ جو شخص ایمان میں راسخ نہ ہو، اس کے لئے اس میں غور کرنا جائز نہ ہو اور جو شخص ایمان میں راسخ ہو، اس کے لئے جائز ہو، خاص طور پر جب کہ مخالف کو جواب دینے کی ضرورت ہو، اس کا ثبوت اس سے بھی ہوتا ہے کہ ائمہ نے ماضی وحال ہر زمانے میں توریت سے نقل کیا ہے اور اس سے اخذ کی ہوئی باتوں سے یہود پر لازم کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی تصدیق کریں، اگر وہ لوگ اس میں غور وفکر کو جائز نہ سمجھتے تو ایسا نہ کرتے اور نہ اسے دیکھتے)۔

فتاوی ہندیہ میں بھی یہی بات لکھی ہوئی ہے:

"آدمی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ یہود ونصرانی سے توریت، انجیل اور زبور کے بارے میں دریافت کرے، اور نہ اسے لکھے اور نہ سیکھے، اپنے مقصد کے اثبات کے لئے ان کتابوں کی باتوں سے استدلال نہیں کیا جائے گا، اور علماء جو توریت وانجیل کی باتوں سے استدلال کرتے ہیں وہ انہیں کی باتوں سے ان کو قائل کرنے کی غرض سے کرتے ہیں" (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۸)۔

نیز اگر سابقہ شریعت کی کوئی بات اسلامی شریعت کے خلاف نہیں ہے اور اس پر نکیر نہیں کی گئی ہے تو اس کو تسلیم کیا جاتا ہے، اس سے بھی زیر بحث مسئلے کے سمجھنے میں رہنمائی ملتی ہے، البنایہ شرح الہدایہ میں ہے:

"والأصل فیه أن شرائع من قبلنا تلزمنا ما لم ینص الله تعالی علی إنکارہ" (البنایہ ۸/ ۴۳۹)۔

(اس میں اصل یہ ہے کہ ہم سے ماقبل کی شریعت ہم پر لازم ہے تاآنکہ اللہ تعالی نے اس کے انکار کی صراحت نہ کی ہو)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موقف کی تائید میں دیگر مذاہب کی کتابوں سے ضرورت کے بقدر حوالہ دینا درست ہے۔

دیگر مذاہب کے بعض مذہبی رسوم واعمال میں شرکت کا مسئلہ:

دیگر مذاہب کے ایسے پروگرام میں شرکت کرنا جو حسن سلوک اور بھائی چارہ کے قبیل سے ہے، درست ہے، مثلاً ان کو دعوت بھی دی جاسکتی ہے اور ان کے یہاں جاکر دعوت بھی کھائی جاسکتی ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

"لا بأس بأن یضیف کافرا لقرابة أو لحاجة، ولا بأس بالذھاب إلی ضیافة أھل الذمة" (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۷)۔

(کسی ضرورت اور رشتہ داری کے سبب کافر کی ضیافت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور نہ ذمی کی دعوت میں جانے

ہی میں کوئی حرج ہے)۔

اسی طرح ان کی عیادت کی بھی اجازت ہے، المحیط البرہانی میں ہے:

"عن أبی حنیفة: ولا بأس بعیادة الیهودی والنصرانی لأن العیادة من باب البر والصلة ولا بأس بالبر فی حقهم وقد صح أن رسول الله علیه السلام عاد یهودیا فی جواره قد مرض" (المحیط البرہانی ۳۶۶/۵)۔

(امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ یہودی اور نصرانی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں ہے، اس وجہ سے کہ عیادت حسن سلوک کے باب سے ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، خود نبی کریم ﷺ نے اپنے پڑوس کے یہودی کی عیادت کی ہے)۔

لیکن ایسے مذہبی رسوم واعمال جن میں مشرکانہ اعمال ہوتے ہوں ان میں شریک ہونا درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اچھے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

"والذین لا یشهدون الزور وإذا مروا باللغو مروا کراما" (الفرقان: ۷۲)۔

(اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب گذرتے ہیں کھیل کی باتوں پر نکل جائیں بزرگانہ)۔

مفسر قرآن حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں "زور" سے مراد مشرکین کی عید ہے، تفسیر قرطبی میں ہے:

"وفی روایة عن ابن عباس أنه أعیاد المشرکین" (تفسیر قرطبی ۷۹/۱۳)۔

(ابن عباس کی ایک روایت اس سے مراد مشرکین کی عید ہے)۔

اس لئے کہ ہر قوم کی عید ہوتی ہے اور وہ لوگ اپنے عقائد ونظریات کے مطابق مناتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ولکل أمة جعلنا منسکا هم ناسکوه" (الحج: ۶۷)۔

(ہر امت کے لئے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے)۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد عید ہے:

"وروی أنه قال عیدا" (تفسیر مظہری ۳۴۵/۶)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مذاہب کے رسوم واعمال میں شرکت درست نہیں ہے، اس لئے کہ ان میں بہت سارے ایسے امور ہوں گے جو منشاء شریعت کے مخالف ہوں گے، لہذا اس میں شرکت کرنا درست نہیں ہوگا۔

البتہ اگر ان کے مشرکانہ رسوم واعمال میں شرکت سے گریز کرتے ہوئے صرف ان کی عید کے بازار میں برائے خرید وفروخت شریک ہوتا ہے تو اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے، امام احمد سے اس طرح کے مسئلے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے کہا کہ اگر ان کے عبادت خانے میں نہ جائے، صرف خرید وفروخت کی حد تک شریک ہو تو کوئی حرج نہیں ہے:

"قیل للإمام أحمد: هذه الأعیاد التی تکون بالشام مثل طوریا نور ودیر أیوب وأشباهه یشهده

المسلمون، يشهدون الأسواق، ويجلبون فيها الغنم والبقر والدقيق والبر وغير ذلک، إلا أنه إنما يكون فى الأسواق يشترون ولا يدخلون عليهم بيعهم وإنما يشهدون الأسواق قال:إذا لم يدخلوا عليهم بيعهم وإنما يشهدون السوق فلا بأس"(اقتضاء الصراط المستقیم ۲/۱۳)۔

حاصل یہ کہ دیگر مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں شرکت کرنا درست نہیں ہے، ان کے تہوار کی جگہوں پر خرید وفروخت کی غرض سے جایا جاسکتا ہے، البتہ اگر کسی جگہ کے حالات کا تقاضا یہ ہو کہ ان کے ساتھ اس طرح کی جگہوں میں بھائی چارگی کے اظہار کے لئے یا خدمت کے لئے جانا ناگزیر ہو تو مشرکانہ اعمال سے اجتناب کرے، اور اسلامی اخلاق وآداب کا اس درجہ مظاہرہ کرے کہ دوسرے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

فتنے سے بچنے کے لئے غیر واجب متوارث طریقہ کا ترک:

ایسے متوارث اعمال جو اسلامی شعار بن چکے ہیں، ان کو تو کسی بھی حال میں ترک کرنا جائز نہیں ہے البتہ ان کے علاوہ ایسے متوارث طریقے جو فرض یا واجب نہیں ہیں تو فتنہ سے بچنے کے لئے انہیں چھوڑ دینا درست ہے، مفتی رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اگر کوئی کام شرعاً نہ فرض ہے نہ واجب، بلکہ صرف مباح یا مستحب ہے، اس کو کسی دینی مصلحت مثلاً عوام کو فتنہ یا مصیبت یا تکلیف سے بچانے کے لئے چھوڑ دینا جائز ہے"(احسن الفتاوی ۶/۳۷)۔

علامہ ابن قیم نے "اعلام الموقعین" میں وضاحت فرمائی ہے کہ بہت سے جائز امور کو محض اس وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے کہ اس سے دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور اس کے لئے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں، ایک مثال کے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"**وهذا كالتنبيه بل كالتصريح على المنع من الجائز لئلا يكون سببا فى فعل مالا يجوز**"(اعلام الموقعین ۳/۱۱۰)۔

(یہ جائز کام سے روکنے پر تنبیہ بلکہ تصریح ہے، تاکہ وہ ناجائز کام کا سبب نہ بن جائے)۔

علامہ ابن تیمیہ نے تحریر فرمایا:

"**ويستحب للرجل أن يقصد إلى تأليف القلب بترك المستحبات لأن المصلحة التأليف فى الدين أعظم من مصلحة فعل مثل هذا، كما ترک النبى ﷺ تغيير بناء البيت لما فى إبقائه من تاليف القلوب**"(فتاوی ابن تیمیہ ۲۲/۴۷)۔

(آدمی کے لئے مستحب یہ ہے کہ مستحبات کو ترک کرکے تالیف قلب کا ارادہ کرے، اس لئے کہ دین میں تالیف کی مصلحت اس طرح کے فعل سے کہیں بہتر ہے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے خانہ کعبہ کی تعمیر میں تبدیلی ترک کردیا اس وجہ سے کہ اس

B6

کے باقی رکھنے میں تالیف قلب ہے)۔

معلوم ہوا کہ جو عمل ہمارا شعار و شناخت ہے، اس کا ترک کرنا درست نہیں ہے، لیکن فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے غیر واجب اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے۔

مذاکرہ کے دوران سنجیدہ اسلوب اختیار کیا جائے:

مذاکرہ کے ذریعہ اپنے موقف کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے سامنے ایسے موثر اور اطمینان بخش انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، اسی لئے اسلامی دعوت کے سلسلے میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ اس کا اسلوب نہایت سنجیدہ اور مبنی برحکمت ہونا چاہئے، اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے :

"ادع إلی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن إن ربک هو أعلم بمن ضل عن سبیله وهو أعلم بالمهتدین" (النحل:۱۲۵)۔

(آپ اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے اچھے طریقے گفتگو کیجئے، یقینا آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بخوبی جانتا ہے اور راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے)۔

اسی لئے جب اللہ تعالی نے حضرت موسی اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہم السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو ان سے نرم گفتاری کی تاکید فرمائی اور کہا:

"اذهبا إلی فرعون إنه طغی ، فقولا له قولا لینا لعله یتذکر أو یخشی" (طہ:۴۳،۴۴)۔

(فرعون کی طرف جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا سو اس سے نرم بات کہو شاید وہ سوچے یا ڈرے)۔

اس صورت حال میں مذاکرہ کے دوران اس بات کا بطور خاص لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے جذبات کو کسی بھی حال میں ٹھیس نہ پہونچنے پائے اور نہ ان کے معبود و پیشوا کی تحقیر کا کوئی پہلو سامنے آئے، جس سے انہیں ذہنی اذیت پہنچے، اللہ تعالی نے دوسروں کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا ہے:

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم" (الانعام:۱۰۸)۔

(اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بدون سمجھے)۔

اسلامی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ دیگر مذاہب کے معبود و پیشوا کو برا بھلا کہنا کسی بھی حال میں درست نہیں ہے، لہذا دعوت و تبلیغ، مذاکرہ ومباحثہ یا کسی بھی موقع پر محتاط انداز، شائستہ اسلوب اور سنجیدہ گفتگو ہی سے کام لیا جائے، اور دوسروں کی دل آزاری سے ہر ممکن اجتناب کیا جائے۔

مشترکہ سماجی مسائل کے لئے دیگر اصحاب مذاہب کے ساتھ اتحاد:

معاشرے کے بہت سے مسائل مشترک ہیں، جن سے سماج میں رہنے والے سبھی افراد کو کسی نہ کسی حیثیت سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے مشترکہ کوشش عمل میں لائی جائے، اس لئے اگر غربت وافلاس، ظلم وزیادتی، جرائم وفسادات، اور دیگر معاشرتی گندگیوں کے انسداد وازالہ کے لئے مل بیٹھ کر باہم مذاکرہ کیا جائے تو ایک مستحسن قدم ہے اور اس میں حصہ لینا ازروئے شرع صحیح ودرست ہے، اللہ تعالی نے اچھے کاموں میں تعاون کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد فرمایا:

"وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان، واتقوا الله إن الله شديد العقاب" (المائدہ:۲)۔

(اور نیکی اور تقوی پر تعاون کرو اور گناہ وزیادتی پر تعاون نہ کرو، اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے)۔

جنگ فجار کے تباہ کن نتائج کے بعد آنحضرت کے چچا زبیر بن عبد المطلب کی تحریک پر بنی زہرہ اور بنی تمیم نے آپس میں معاہدہ کیا کہ ملک میں امن وامان قائم کرنے کی کوشش کریں گے، مسافروں اور غریبوں کی امداد کریں گے اور مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑائیں گے، آنحضرت ﷺ بھی اس معاہدے میں بنفس نفیس شریک ہوئے اور اس کو پسند فرمایا، سیرۃ ابن ہشام میں ہے:

"لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم ولو ادعى به في الإسلام لأجبت" (سیرت ابن ہشام ۱/ ۱۳۵)۔

(میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں حلف الفضول میں شریک ہوا، اگر اس معاہدے کے بدلے مجھے سرخ اونٹ دیئے جاتے تو بھی میں نہ لیتا اور آج بھی اس قسم کا معاہدہ ہو تو میں اس میں شرکت کے لئے تیار ہوں)۔

یہی وجہ ہے کہ یہ حکم آج بھی باقی ہے اور اگر اسطرح کا کوئی معاہدہ ہوتا ہے یا کوئی تنظیم بنتی ہے تو اس میں شریک ہونا از روئے شرع مستحسن عمل ہوگا، علامہ سہیلی "الروض الانف" میں لکھتے ہیں:

"أما دعوى الجاهلية فقد رفعها الإسلام إلا ما كان من حلف الفضول كما قدمنا، فحكمه باق والدعوة به جائزة" (الروض الانف ۲/ ۵۴)۔

(اسلام نے جاہلیت کی باتوں کو ختم کر دیا ہے بجز حلف الفضول کے، کہ اس کا حکم باقی ہے اور اس کی دعوت دینا جائز ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ سماج کے مشترکہ مسائل کے لئے دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مذاکرہ کرنا درست اور بہتر ہے اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لینا بہت ہی مستحسن عمل ہے۔

سیاست میں حصہ لینا:

ملکی سیاست میں گونا گوں مصالح کی بنا پر حصہ لینا ازبس ضروری ہوتا ہے، اس تعلق سے بعض دفعہ سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال کی ضرورت پیش آتی ہے، اور ایسے افراد اور تنظیموں کے ساتھ، کہ ان کے عقائد ونظریات اسلام اور اہل اسلام کے تئیں منفی ہوتے ہیں، لیکن مصلحت وقت کے تقاضے کے تحت اس کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے، لہذا اگر حدود شرع، مذہبی تشخص اور قومی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا کیا جائے تو اس کی گنجائش ہوگی، نبی اکرم ﷺ نے اہل نجران کے یہود ونصاری سے گفتگو فرمائی اور انہیں اسلام کی دعوت دی، جس سے اس بات کی روشنی ملتی ہے کہ ایسے افراد سے مذاکرہ کرنے میں کوئی کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی خاص مصلحت پیش نظر ہوتو وہ لازم وضروری ہے، علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس واقعہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

”**وفيها جواز مجادلة أهل الكتاب وقد تجب إذا تعينت مصلحة**“(فتح الباری ۸/۹۵)۔

(قصہ نجران سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب سے مجادلہ کرنا جائز ہے اور اگر کوئی خاص مصلحت ہوتو واجب ہے)۔

یہ قائد اور نمائندے کی ذمہ داری ہے کہ وہ مصالح مسلمین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس طرح کے پروگرام میں شریک ہو چناچہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کے مذاکرے میں حصہ لینا مسلمانوں کے لئے مفید ہے تو اس میں حصہ لینا بہتر ہوگا، جیسا کہ ابن العربی کی مندرجہ ذیل صراحت سے اس کی جانب اشارہ ملتا ہے:

”**وإن كان للمسلمين مصلحة في الصلح لنفع يجتلبونه، أو ضرر يدفعونه فلا بأس أن يبتدئ المسلمون به إذا احتاجوا إليه**“(تفسیر قرطبی ۸/۴۰)۔

(اگر جلب منفعت یا دفع مضرت کے پیش نظر مسلمانوں کی مصلحت صلح میں ہو، تو حسب ضرورت اس میں مسلمانوں کے پہل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی مذہب کی نمائندہ شخصیت یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ بوقت ضرورت گفت وشنید کی جاسکتی ہے، اگر چہ ان کا نصب العین اسلام مخالف ہی کیوں نہ ہو۔

مذاکرہ میں بے پردہ غیر مسلم خواتین کے ساتھ شرکت:

اسلام میں اجنبی عورت کو دیکھنا ممنوع ہے، اللہ نے فرمایا:

”**قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك أزكى لهم إن الله خبير بما يصنعون**“ (النور: ۳۰)۔

(مومنین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ ہے، بلاشبہ جو وہ کرتے ہیں اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے)۔

لیکن ضرورت کے تحت اجنبی عورت کو بعض حالات میں دیکھنا جائز ہے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے جس عورت سے شادی کا ارادہ ہو اس کو دیکھنے کی اجازت دی ہے، آپ نے فرمایا:

"انظر إليها فإنه أحرى أن يودم بينكما" (شرح معانی الآثار ۲/۸)۔

(اس کو دیکھ لو اس سے آپس میں الفت ومحبت زیادہ ہوگی)۔

اسی طرح شریعت میں حسب ضرورت عورت کے چہرے اور ہتھیلی کے دیکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے، علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

"ولا يحل النظر للأجنبي من الأجنبية الحرة إلى سائر بدنها إلا الوجه والكفين" (بدائع ۵/۱۲۱)۔

(اجنبی شخص کے لئے اجنبی عورت کے چہرے اور ہتھیلی کے ماسوا تمام بدن کا دیکھنا جائز نہیں ہے)۔

لیکن علماء نے اسی کے ساتھ اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ یہ اجازت اسی صورت میں ہے جب کہ شہوت کے ساتھ نہ دیکھا جائے اور اگر شہوت کے ساتھ ہو تو جائز نہیں ہے بدائع الصنائع میں ہے:

"إنما يحل النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منها من غير شهوة فأما عن شهوة فلا يحل" (بدائع ۵/۱۲۲)۔

(عورت کی ظاہری زینت کی جگہوں (چہرہ اور ہاتھ) کا بغیر شہوت کے دیکھنا جائز ہے لیکن شہوت کے ساتھ دیکھنا جائز نہیں ہے)۔

لیکن بوقت ضرورت شہوت کے ساتھ بھی دیکھا جاسکتا ہے، علامہ جصاص رازی لکھتے ہیں:

"وإذا كان ذلك جاز للأجنبي أن ينظر من المرأة إلى وجهها ويديها بغير شهوة فإن كان يشتهيها إذا نظر إليها جاز أن ينظر لعذر مثلا اين يريد تزويجها أو الشهادة عليها أو حاكم يريد أن يسمع إقرارها" (احکام القرآن للجصاص ۵/۱۷۲)۔

(اور جب اس صورت حال میں اجنبی کے لئے بغیر شہوت کے عورت کا چہرہ اور ہاتھ دیکھنا جائز ہے تو بدرجہ مجبوری شہوت کے ساتھ دیکھنا بھی جائز ہوگا مثلاً شادی کا ارادہ ہو یا گواہی دینے کا موقع ہو یا کوئی حاکم اس کے اقرار کو سننا چاہتا ہو)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے لکھا ہے:

"لا يحل لغير الزوج والمحرم القريب النظر إلى شئ منها إلا لضرورة كالمعالجة والتعليم والمعاملة وتحمل الشهادة" (التفسیر المنیر ۱۸/۲۱۱)۔

مذکورہ تفصیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاضرورت اجنبی عورت کو دیکھنا درست نہیں ہے، اس لئے اگر مذاکرہ میں بے پردہ خواتین ہوں تو اس میں جانے سے حتی الامکان اجتناب کرنا چاہئے، اور اگر اس میں شرکت ناگزیر ہو تو غض بصر کے ساتھ اپنے موقف کی وضاحت کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بین مذہبی مذاکرات – احکام وآداب

مولانا اختر امام عادل قاسمی ☆

مختلف قومیں جب ایک مقام پر رہتی ہیں تو کوئی سیاسی یا سماجی مسائل کے لئے باہم ایک دوسرے سے مذاکرات اور گفت وشنید کی ضرورت پڑتی ہے، جن کی بنیاد ایک دوسرے کے جذبات اور تقاضوں کے احترام اور رعایت پر ہوتی ہے، قیام امن، بقائے باہم اور فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے شریعت مطہرہ میں اس کی گنجائش ہے، بلکہ اس کی عملی مثالیں بھی عہد نبوت میں موجود ہیں، ایک مقام پر رہنے والے شہریوں کے درمیان بھی اور دیگر علاقوں اور قبائل کے مابین بھی۔

مذہبی بنیادوں پر مذاکرات ممکن نہیں:

عہد نبوت کے بعد بھی ملکوں اور قوموں کے درمیان ہر دور کے اپنے معیار کے مطابق اس قسم کے معاہدات ومذاکرات ہوتے رہے ہیں، لیکن عموماً یہ معاہدات سماجی یا سیاسی نوعیت کے ہوتے تھے، ان میں کبھی مذہبی بنیادوں کو شامل نہیں کیا گیا، اس لئے کہ مذاکرات کے لئے مشترکہ بنیادوں کی ضرورت ہے، اور کوئی قوم بالخصوص امت مسلمہ کسی حال میں اپنی مذہبی بنیادوں پر صلح نہیں کرسکتی، چنانچہ عہد نبوت کے ابتدائی مکی دور میں رسول اللہ ﷺ کو مذہبی بنیادوں پر مصالحت کی پیش کش کی گئی تھی، لیکن اللہ پاک کے حکم پر آپؐ نے اس کو مسترد کردیا، روایات میں آتا ہے کہ کافر اکثریت جب مسلمانوں کے عزم واستقلال میں جنبش پیدا نہ کرسکی تو انہوں نے بعض مصالحانہ پیش کشیں کی تھیں، ان میں ایک یہ تھی کہ ایک سال آپ ہمارے خداؤں کی پرستش کریں اور ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں کہ قریش مکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا:

”فإنا نفرض عليك خصلة واحدة ولك فيها صلاح قال وما هي قال تعبد إلهنا سنة اللات والعزى ونعبد إلهك سنة قال حتى أنظر ما يأتيني من ربي فجاء الوحي من عند الله عز و جل من اللوح المحفوظ“ (الروض الدانی، المعجم الصغیر ۲/ ۴۴ حدیث نمبر: ۷۵۱، مؤلف: سلیمان بن احمد بن ایوب ابو القاسم الطبرانی الناشر: المکتب الاسلامی، دار عمار، بیروت، عمان الطبعۃ الاولی، ۱۴۰۵-۱۹۸۵ تحقیق: محمد شکور محمود الحاج امریر، عدد الاجزاء: ۲)۔

(ہم آپ کے پاس ایک تجویز پیش کرتے ہیں جس میں آپ کے لئے بھلائی ہے، آپ نے دریافت فرمایا، کیا

☆ مہتمم جامعہ ربانی منورا شریف، سمستی پور، بہار۔

ہے؟انہوں نے کہا: ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات وعزیٰ وغیرہ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں (یعنی بقائے باہم کے اصول پر ہم ایک دوسرے کو تسلیم کریں اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں)، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں حکم الٰہی کا انتظار کروں گا، پھر جواب دوں گا، آخر لوح محفوظ سے اللہ پاک کی طرف سے وحی نازل ہوئی، سورہ کافرون)، اور قرآن کریم نے اس نظریہ کو بالکل ناقابل قبول قرار دیا

"**قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ، لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ، وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ، وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ، وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ، لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ**"(سورہ کافرون)۔

(آپ کہہ دیجئے: اے کافرو! جس کی تم عبادت کرتے ہو اس کی میں عبادت نہیں کرسکتا، اور نہ تم اس کی عبادت کرسکتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں، اور نہ میں عبادت کروں گا ان خداؤں کی جن کی تم کرتے ہو اور نہ تم کبھی میرے معبود کی عبادت کروگے، تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے)۔

بعض تفسیری روایات میں ہے کہ انہوں نے مذہبی ہم آہنگی کی پیشکش کی تھی، یعنی ہمارے دین میں جو مثبت چیزیں ہیں وہ آپ قبول کرلیں اور آپ کے یہاں جو اچھی چیزیں ہیں وہ ہم قبول کرلیتے ہیں:

"**فإن كان الذي جئت به خيرا كنا قد شركناك فيه، وأخذنا حظنا منه، وإن كان الذي بأيدينا خيرا كنت قد شركتنا في أمرنا، وأخذت بحظك منه فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: معاذ الله أن أشرك به غيره**"(لباب التاویل فی معانی التنزیل ۶/۳۱۹، المولف: علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بن عمر الشیحی ابوالحسن، المعروف بالخازن (المتوفی: ۷۴۱)۔

یہ پیش کش ایسے وقت ہوئی، جب مسلمان انتہائی کمزور اقلیت میں تھے، ہر طرف سے مخالفتوں اور فتنوں کی یلغار تھی، ان کو اپنے تحفظ کی سخت ضرورت تھی، اور کہیں سے کسی حمایت کی کوئی کرن موجود نہیں تھی، ان کے لئے یہ بظاہر اچھا موقع تھا کہ وہ بقائے باہم اور قیام امن کے اصول پر اس حصار کو قبول کرلیں، لیکن ان نازک حالات میں بھی قرآن نے مذہبی بنیادوں پر کسی مذاکرہ کی اجازت نہیں دی، اور ایک ہی مضمون کے لئے مکرر آیات لاکر اس اتحاد کی جڑ کاٹ کر رکھ دی، تاکہ معلوم ہو کہ یہ مذاکرہ نہ آج ممکن ہے اور نہ کبھی آئندہ اس قسم کا مذاکرہ قابل قبول ہوسکتا ہے (تفسیر القرآن العظیم ۸/۵۰۸، المولف: ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی الدمشقی (المتوفی: ۷۷۴ھ) المحقق: سامی بن محمد سلامۃ الناشر: دار طیبۃ للنشر والتوزیع الطبعۃ: الثانیۃ: ۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء، عدد الاجزاء: ۸)۔

امت کی تہذیبی شناخت کو خطرہ:

مذہبی بنیادوں پر مذاکرات کا سب سے زیادہ مضرت انگیز پہلو یہ ہے کہ اس سے امت کی مذہبی شناخت اور تہذیبی وحدت ختم ہوجاتی ہے، ظاہر ہے کہ امتِ مسلمہ اقوام عالم کے درمیان اپنی ایک شناخت رکھتی ہے، اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی حال میں اپنے دینی اور ملی امتیازات ترک نہیں کئے، اقتدار میں رہی تب بھی، اور اقتدار سے محروم

ہوئی جب بھی، دنیا کی کسی قوم اور مذہب کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے، ان کی قومی اور سیاسی زندگیوں میں مذہب کبھی طاقتور عنصر کی حیثیت سے نہیں رہا، کلیسا کا عبوری دور، مذہب کا دور مانا جاتا ہے مگر اس کی شدت پسندی نے مذہب کو فائدہ پہنچانے کے بجائے، نقصان ہی پہنچایا، نیز اس کی مدّت اتنی مختصر رہی کہ اس کو شمار میں نہیں لایا جاسکتا۔

اس لیے وہ تمام طاقتیں جن کو امتِ مسلمہ کا یہ امتیاز آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہے، چاہتی ہیں کہ مذہب اس امت کی زندگی سے بھی نکل جائے، اور اس کے لیے ان کے یہاں مختلف تدابیر اور منصوبے زیرِ عمل اور زیرِ غور ہیں، عالمی طور پر ثقافتی انجذاب اور تمدنی وحدت کی تحریک بھی اسی کا ایک حصہ ہے کہ ایک ایسی وحدت قائم کی جائے جس میں کسی مذہب کا اپنا وجود نہ ہو، سب مل کر کام کریں اور تمام کی اچھی اور لائق اتفاق باتوں کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے، جو اس وحدت جدیدہ کا لائحۂ عمل ہو، اس لیے کہ تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہے، صرف راستے الگ الگ ہیں۔

تاریخی جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ تمدنی اور ثقافتی وحدت و انجذاب کا یہ تصور بہت قدیم ہے اور ہر دَور میں اہلِ کفر، اہلِ ایمان سے یہی خواہش کرتے رہے ہیں کہ اپنا امتیاز ترک کر کے ہماری وحدت میں شامل ہو جائیں خود قرآن کا بیان ہے: ''وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ'' (نساء:۸۹)۔

(اہلِ کفر خواہش رکھتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کفر قبول کرلو تا کہ تم ان کے برابر ہو جاؤ مگر ان کی خواہش پر ہرگز عمل نہ کرو اور ان سے دوستانہ وحدت قائم نہ کرو)۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے ہر دَور میں اہلِ دنیا کے لیے بعض بنیادیں ایسی موجود رہی ہیں جو ان کو ایک وحدت و انجذاب سے منسلک رکھتی تھیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے حوالہ سے قرآن نے بیان کیا ہے:

''إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِ اللهِ أَوْثَانًا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا'' (عنکبوت:۲۵)۔

(تم لوگوں نے اللہ کے علاوہ چند بُت بنا رکھے ہیں، جو دنیوی زندگی میں تمہاری باہم وحدت و محبت کا ذریعہ ہیں)۔

یہ بت ہر دور کے لحاظ سے مختلف ہوتے رہتے ہیں، لیکن بُت خواہ جو شکل بھی اختیار کرلے وہ بت ہی رہے گا، قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے قبل پوری انسانیت ایک وحدت پر رواں تھی، پیغمبروں اور رسولوں کے سلسلے نے ہی اس وحدت کو توڑا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ رسولوں کی تعلیمات صحیح طور پر ہمارے پاس موجود ہوں اور عہدِ جاہلیت کی وہ وحدت دوبارہ لوٹ کر آجائے، قرآن کہتا ہے:

''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ'' (البقرہ:۲۱۳)۔

(تمام لوگ پہلے ایک ہی امّت تھے، پھر اللہ نے نبیوں کو مبشر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا)۔

تہذیبی تحفظ کی ہدایات:

نیز نبی اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر غیر مسلموں کی مخالفت کرنے کے جو احکام دیئے ہیں، ان کی روح بھی یہی تہذیبی و تمدنی اختلاط سے پرہیز ہے، اس لئے کہ بہت زیادہ سماجی قربت سے تہذیبی اختلاط کا سخت اندیشہ ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (سنن ابی داؤد ۴/۷۸ حدیث نمبر: ۴۰۳۳، ناشر: دار الکتاب العربی، بیروت، مسند الامام احمد بن حنبل ۹/۱۲۶ حدیث نمبر: ۵۱۱۵، المحقق: شعیب الارنؤوط۔ عادل مرشد، وآخرون، ناشر: مؤسسۃ الرسالۃ الطبعۃ: الأولی، ۱۴۲۱ھ۔ ۲۰۰۱ء) (جو کسی قوم کی نقل اُتارے اس کا شمار اسی کے ساتھ ہوگا)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے میرے اوپر دو زعفرانی رنگ کے کپڑے دیکھے تو ارشاد فرمایا:

"إِنَّ هَذِهِ مِنْ ثِيَابِ الْكُفَّارِ فَلاَ تَلْبَسْهَا" (صحیح مسلم ۶/۱۴۳، حدیث نمبر: ۵۵۵۵، ناشر: دار الجیل بیروت) (یہ کفار کا لباس ہے اس کو مت پہنو)۔

حضرت رُکانہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ فَرْقَ مَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُشْرِكِينَ الْعَمَائِمُ عَلَى الْقَلاَنِسِ قَالَ أَبُو عِيسَى هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ وَإِسْنَادُهُ لَيْسَ بِالْقَائِمِ وَلاَ نَعْرِفُ أَبَا الْحَسَنِ الْعَسْقَلاَنِيَّ وَلاَ ابْنَ رُكَانَةَ" (ترمذی ۴/۲۴۷ حدیث نمبر: ۱۷۸۴، ناشر: دار احیاء التراث العربی، بیروت) (ہمارے اور مشرکین کے عماموں میں فرق یہ ہے کہ ہمارا عمامہ ٹوپیوں پر ہوتا ہے ان کا نہیں)۔

حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إن اليهود والنصارى لا يصبغون فخالفوهم" (الجامع الصحیح المختصر ۳/۱۲۷۵ حدیث نمبر: ۳۰۸۴، ناشر: دار ابن کثیر، بیروت)۔

(یہود ونصاریٰ بالوں میں خضاب نہیں لگاتے تم ان کی مخالفت کرو)۔

حضرت ابوہریرۃ ہی کی روایت ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"غيروا الشيب ولا تشبهوا اليهود" (ترمذی ۴/۲۳۲، ناشر: دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

(سفیدی کو بدلو اور یہود کی نقل نہ اتارو)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو اس کا حکم دیا، تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہود ونصاریٰ اس دن کا بہت احترام کرتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَئِنْ بَقِيتُ إِلَى قَابِلٍ لأَصُومَنَّ التَّاسِعَ" (صحیح مسلم ۳/۱۵۱ حدیث نمبر: ۲۷۲۳، ناشر: دار الجیل بیروت)۔

(آئندہ سال اگر میں زندہ رہا تو نویں محرم کا بھی روزہ رکھوں گا)۔

حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کے دن بطورِ خاص روزہ رہتے تھے اور فرماتے :

"إنهما يوما عيد للمشركين فأنا أحب أن أخالفهم" (نسائی ۲/۱۴۶ حدیث نمبر:۲۷۷۶، ناشر: دار الکتب العلمیہ)۔

(یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان کی مخالفت کروں)۔

حضرت شداد بن اوسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"یہود کی مخالفت کرو وہ اپنے جوتوں اور خف میں نماز نہیں پڑھتے" (ابوداؤد ۱/۲۴۷ حدیث نمبر: ۶۵۲، ناشر: دار الکتاب العربی بیروت)۔

حضرت عتبہ بن عویم بن ساعدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک میں ایک عربی کمان تھی، آپ نے ایک شخص کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو آپ نے فرمایا: "لعنت ہو، اس طرح کی کمان لو" (سنن بیہقی ۱۰/۱۴ حدیث نمبر:۱۹۵۱۹، ناشر: مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ)۔

حضور ﷺ کو اپنی امت کے تہذیبی اختلاط کا شدید اندیشہ تھا، ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"عن أبي سعيد رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وآله وسلم قال لتتبعن سنن من قبلكم شبرا بشبر وذراعا بذراع حتى لو سلكوا جحر ضب لسلكتموه قلنا يا رسول الله اليهود والنصارى فمن؟" (ابوداؤد ۴/۲۱۰ حدیث نمبر: ۳۷۸۰، ناشر: دار الکتاب العربی بیروت)۔

(تم اپنے سے پہلے والوں کی پوری طرح پیروی کروگے بالشت در بالشت، ہاتھ در ہاتھ، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں داخل ہوں گے تو ان کی دیکھا دیکھی تم بھی اس بل میں گھس پڑوگے، لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ﷺ آپ کی مراد پہلے والوں سے یہود و نصاریٰ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا پھر اور کون؟)۔

کتبِ احادیث میں اس طرح کی بہت سی روایات موجود ہیں جن میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ تہذیبی اور تمدنی اختلاط سے منع کیا گیا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ ان میں کون سا حکم کس درجہ کا ہے؟ ان احادیث میں جو بنیادی روح ہے وہ ہے مسلمانوں کی تہذیبی اور سماجی تطہیر کا حکم۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب اسلام کو تہذیبی اختلاط گوارہ نہیں تو مذہبی بنیادوں پر مذاکرات کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے، یہ تو اس سے بھی زیادہ حساس مسئلہ ہے۔

سیاسی یا سماجی مسائل پر مذاکرات ہوسکتے ہیں:

البتہ سیاسی یا سماجی بنیادوں پر مختلف اقوام و مذاہب اور جماعتوں کے درمیان مذاکرات ہوسکتے ہیں، اور کسی خاص معاہدہ پر اتفاق رائے بھی کیا جاسکتا ہے، خواہ دوسری جماعت سخت گیر اور متعصّبانہ نظریات ہی کی حامل کیوں نہ ہو، بشرطیکہ مسلمانوں

کا قومی تشخص اور ملی وقار مجروح نہ ہو، اور معاہد جماعت اس اتفاقی منشور میں ان سخت گیر اور متعصّبانہ نظریات کو خارج کرنے پر آمادہ ہو جو مسلمانوں کے مفادات سے متصادم ہوں، اور مشترکہ بنیادوں پر اتحاد کے لئے تیار ہو، اس سلسلے میں یہ آیتِ کریمہ بنیاد بن سکتی ہے۔

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" (آل عمران: ۶۴)۔

(کہئے، اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بنیاد پر جمع ہو جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے)۔

اس آیتِ کریمہ میں یہودیوں کو ایک مشترکہ بنیاد پر مسلمانوں کے ساتھ جمع ہونے کی دعوت دی گئی ہے، گوکہ اس آیت میں اہل کتاب کی ترغیب کے لئے چند ایسی بنیادیں بھی ذکر کردی گئی ہیں جو مذہبی طور پر دونوں میں پہلے سے مشترک ہیں، یہود کے ساتھ اتحاد کی دعوت اس بات کی علامت ہے، سخت گیر اور متشدد جماعت کے ساتھ مشترکہ بنیادوں پر مذاکرہ ومعاہدہ کی گنجائش ہے، اس لئے کہ قرآن نے ہی یہود کی عداوت وشدت کا ذکر کر کے ان کی عصبیت وتنگ نظری پر دائمی مہر لگا دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا" (المائدہ: ۸۲)۔

(یقیناً تم کو (عملی زندگی میں) مسلمانوں کے سب سے بدترین دشمن یہود اور مشرکین ملیں گے)۔

لیکن اس کے باوجود مشترکہ بنیادوں پر ان کو متحد ہونے کی دعوت دی گئی، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اگر مسلمانوں پر ایسے حالات آئیں جن میں ملی مفادات کے تحفظ اور وسیع سطح پر امن عالم کے قیام کے لئے سخت گیر عناصر سے مشترکہ بنیادوں پر معاہدہ کی ضرورت پڑے تو اس کی گنجائش ہوگی، اور حالت مغلوبی میں اکثر اس قسم کے مذاکرات اور معاہدات کی ضرورت پڑتی ہے۔

عہدِ نبوی میں بین الاقوامی اتحاد کے نمونے:

اس کی کئی عملی مثالیں خود رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں موجود ہیں:

میثاق مدینہ میں یہود کی شمولیت:

(۱) تاریخی طور پر اس سلسلے کا سب سے اہم اتحاد جس کو مذاکرات کے بعد خود رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا، وہ ہجرتِ مدینہ کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کا اتحاد ہے، اور اس کے لئے جو دستور مرتب کیا گیا اس میں اکثر ان بنیادوں کو جگہ دی گئی جن پر دونوں فریقوں کا اتفاق ممکن تھا، تاریخ الکامل، البدایۃ والنہایۃ، اور سیرت ابنِ ہشام وغیرہ میں یہ معاہدہ پوری تفصیل کے ساتھ درج ہے، یہاں بطورِ مثال صرف چند مشترکہ بنیادوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن پر میثاق کی اساس تھی:

☆ یہود اور مسلمانوں کا ایک اتحاد ہوگا۔

☆ جو شخص اس میثاق کی مخالفت کرے گا، دونوں مل کر کاروائی کریں گے۔

☆ان کے درمیان باہم ہمدردی اور خیر خواہی اور نیکی کا رشتہ ہوگا، کسی ظلم و گناہ کا نہیں۔

☆مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

☆مدینہ منورہ پر جو حملہ کرے گا اس کے خلاف دونوں مل کر کاروائی کریں گے۔

☆اگر یہود کو کسی ایسے معاہدہ کی پیش کش کی جائے جس پر اتفاق ممکن ہو تو وہ اس پیش کش کو قبول کریں گے اور اس طرح کے معاہدات میں جو طے ہوگا وہ مسلمانوں پر بھی نافذ ہوگا، الا یہ کہ خلافِ دین کوئی چیز طے کر لی جائے (یعنی مشترکہ بنیاد کے بجائے کوئی امتیازی بنیاد اختیار کر لی جائے تو معاہدہ کا اطلاق اس پر نہیں ہوگا) وغیرہ تقریباً ۴۷ دفعات ہیں جن کا تذکرہ میثاق مدینہ میں کیا گیا ہے (الروض الانف ۲/۳۴۵، مؤلف: ابوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ بن احمد السہیلی، السیرۃ النبویہ ۲/۳۲۲ مؤلف: ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی الدمشقی، السیرۃ النبویہ ۱/۵۰۳ ابو محمد عبدالملک بن ہشام البصری، عیون الاثر ۱/۲۶۱ محمد بن عبداللہ بن یحییٰ بن سید الناس)۔

البتہ اس اتحاد میں مسلمانوں کی حیثیت ایک بالادست قوت کی تھی اور متعدد اختلافی معاملات میں اللہ اور رسول کے فیصلہ کو آخری فیصلہ قرار دیا گیا تھا، اس لئے کہ یہ اتحاد مدنی دور میں قائم کیا گیا تھا اور مدنی دور مسلمانوں کے غلبہ کا دور ہے، لیکن فی الجملہ اس سے مشترکہ انسانی، سماجی اور سیاسی بنیادوں پر غیر مسلموں کے ساتھ مذاکرات اور اتحاد کا جواز ملتا ہے۔

حلف الفضول:

اسی قسم کا ایک بین القبائلی اتحاد (جس کو آج ہم بین الاقوامی یا بین المذاہبی اتحاد بھی کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ اس وقت ہر قبیلہ اپنے سیاسی اور اقتصادی معاملات میں خود مختار تھا، اور ہر ایک کے مذہبی تصورات دوسرے سے مختلف تھے) بعثتِ نبویؐ سے تقریباً بیس (۲۰) سال قبل جنگ فجار کے چار ماہ بعد مکہ میں ہوا تھا، جب حضور ﷺ کی عمر مبارک بیس (۲۰) سال تھی، آپ ﷺ اس معاہدہ میں شعوری طور پر شریک تھے، اس کو ''حلف الفضول'' کہا جاتا ہے، ایک مخصوص واقعہ کے تناظر میں امن و سلامتی، انسانی ہمدردی، مظلوموں کی مدد، ظالموں کا مقابلہ اور اس جیسی بعض مشترکہ سماجی اور سیاسی مسائل پر بنو ہاشم، زہرہ، تیم بن مرۃ، وغیرہ قبائل کے درمیان یہ اتحاد قائم ہوا، جو تاریخ اسلامی میں کافی معروف ہے (تفصیل کے لئے دیکھا جائے البدایہ والنہایہ ۲/۳۵۵ باب شہود النبی ﷺ حلف الفضول، البدء والتاریخ ۱/۲۲۶، الکامل فی التاریخ ۱/۲۵۱، الاوائل ۱/۱۳)۔

ہمارے لئے زیر بحث مسئلہ میں اس اتحاد کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد اصل اہمیت رکھتا ہے، جو حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوفؓ سے مروی ہے:

''**لقد شهدت فى دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لى به حمر النعم ولو أدعى به فى الإسلام لأجبت**'' (بیہقی ۶/۳۶۷ حدیث نمبر: ۱۲۸۵۹، ناشر: مکتبہ دار باز مکہ مکرمہ، تہذیب الآثار ۱/۱۷)۔

(میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس معاہدہ میں شریک تھا، یہ معاہدہ مجھے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے، اگر مجھے آج عہدِ اسلامی میں بھی اس قسم کے کسی معاہدہ کی دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا)۔

یہ عہدِ اسلامی سے قبل کا معاہدہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس میں شریک قبائل مسلمان نہیں تھے، اور حضور ﷺ کا اس وقت نوعمری مگر مکمل شعور کا دور تھا، اس معاہدہ میں کسی معاہد فریق کی بالادستی کا بھی سوال نہیں اٹھتا تھا، ایسے معاہدہ اور ایسے اتحاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرکارِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس قسم کے اتحاد کی دعوت مجھے آج بھی دی جائے تو میں بخوشی اس کو قبول کرنے کے لئے تیار رہوں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان ملی تشخص اور مفادات کے تحفظ کی شرط کے ساتھ قیام امن، بقائے باہم اور بدگمانیوں کے خاتمہ وغیرہ نیک مقاصد کے لئے دیگر اہل مذاہب سے مشترکہ بنیادوں پر (جن میں کوئی بات خلافِ شریعت نہ ہو) مذاکرات اور معاہدات کر سکتے ہیں، بالخصوص اس وقت جب مسلمان حالت مغلوبی میں ہوں، اور اس طرح کے معاہدات سے ان کو قومی تحفظ اور دعوت دین وغیرہ کے مواقع زیادہ فراہم ہو سکتے ہوں۔

حلف خزاعہ کی تجدید:

اسی طرح کا ایک معاہدہ عہدِ جاہلیت میں بنو عبد المطلب اور خزاعہ کے درمیان ہوا تھا، جس کو حلفِ خزاعہ کے نام سے جانا جاتا ہے، تاریخِ طبری اور بغدادی وغیرہ میں واقعہ کی پوری تفصیل موجود ہے، اس معاہدہ کی اساس باہم نصرت و محبت اور امن و سلامتی پر تھی، اس کی یہ دفعہ بطورِ خاص بہت اہم تھی:

"وأن عبد المطلب وولده ومن معهم ورجال خزاعة متكافئون متظاهرون متعاونون، فعلى عبد المطلب النصرة لهم بمن تابعه على كل طالب، وعلى خزاعة النصرة لعبد المطلب وولده ومن معهم على جميع العرب في شرق أو غرب أو حزن أو سهل، وجعلوا الله على ذلك كفيلاً، وكفى بالله جميلاً" (المنمق فی أخبار قریش ۱/۲۱)۔

(عبد المطلب اور ان کی اولاد اور ان کے رفقاء اور قبیلہ خزاعہ کے لوگ باہم مساوی اور ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے، عبد المطلب پر ان کی مدد ہر اس شخص کے مقابلے میں لازم ہوگی جن کے لئے ان کو مدد کی ضرورت ہو، اس طرح خزاعہ پر عبد المطلب اور ان کی اولاد اور رفقاء کی مدد لازم ہوگی پورے عرب کے مقابلے میں، خواہ وہ مشرق و مغرب میں، سخت زمین یا نرم زمین کہیں بھی ہوں، اور اس پر اللہ کو کفیل بناتے ہیں اور اس سے بہتر کوئی ضمانت نہیں)۔

اس معاہدہ کا علم رسول اللہ ﷺ کو تھا، صلح حدیبیہ کے موقع پر قبیلۂ خزاعہ کے لوگ خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے اور معاہدہ نامہ کی ایک کاپی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کی، حضرت اُبی بن کعبؓ نے اس کا مضمون پڑھ کر سنایا، حضور ﷺ نے فرمایا تمہارا یہ معاہدہ برقرار رہے گا، اسلام عہدِ جاہلیت کے معاہدوں کو منسوخ نہیں کرتا، آپ نے اس معاہدہ کی تجدید فرمائی اور اس میں ایک دفعہ کا اضافہ فرمایا:

"أن لا یعین ظالما و إنما ینصر مظلوما" (تاریخ طبری ر ۱۰۸۴، الیعقوبی ۱ر ۲۷۸،۲۷۹ بحوالہ الوثائق السیاسیۃ ر ۲۷۳۔۲۷۴)۔
(ظالم کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی بلکہ مدد صرف مظلوم کی کی جائے گی)۔
اہمیت محض معاہدہ کی نہیں ہے، عہدِ جاہلیت میں اس طرح کے قبائلی معاہدے ہوتے رہتے تھے، اہمیت اس کی ہے کہ حضور ﷺ نے نیک مقاصد پر مبنی اس معاہدہ کی توثیق فرمائی، آپ کی توثیق کے بعد یہ شریعت کا حصہ بن گیا۔

غیر مسلموں سے دفاعی اتحاد:

حضور ﷺ نے بعض جنگی مواقع پر غیر مسلموں سے جو دفاعی اتحاد قائم فرمائے، مثلاً بنو قریظہ کے مقابلے میں یہود بنو قینقاع سے فوجی مدد لی، صفوان بن اُمیہ نے حُنین و طائف میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کی جبکہ وہ مشرک تھا، اس کو بھی سیاسی مذاکرات کے لئے ایک نظیر بنایا جاسکتا ہے، اگر چہ کہ بعض مواقع پر آپ نے مشرکین سے فوجی مدد لینے سے انکار بھی فرمایا ہے (السنن الکبری وفی ذیلہ الجوہر النقی ۹ر ۳۶ حدیث نمبر: ۱۸۳۳۴، ناشر: مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ الکائنۃ فی الہند بحیدر آباد)، آپ ﷺ کے ان دونوں طرح کے طرزِ عمل سے جمہور فقہاء نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کفار سے فوجی اتحاد مشروط طور پر قائم کیا جاسکتا ہے، جس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا ملی وقار مجروح نہ ہو، تفصیلات کتب فقہ میں موجود ہیں (شرح السیر ۳ر ۱۸۶، ردالمحتار ۶ر ۲۴۲ کتاب الام ۴ر ۸۹۔۹۰)۔

اہل مذاہب کی قربت ممنوعہ موالات کے دائرے میں داخل نہ ہو:

البتہ اس طرح کے مذاکرات میں اس امر کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ سماجی یا سیاسی بنیادوں پر ہماری قربت ممنوعہ موالات کے دائرے میں داخل نہ ہو، اس لئے کہ پھر امت کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کا سوال پیدا ہو جائے گا، یہ بحث بہت معروف ہے کہ اسلام میں غیر مسلموں سے گہرے دوستانہ تعلقات سے روکا گیا ہے، جس کو موالات کہتے ہیں، البتہ وہ غیر مسلم جو مسلمانوں سے صرف عقیدہ کا اختلاف رکھتے ہوں، حربی خیالات نہ رکھتے ہوں ان کے ساتھ محدود سماجی تعلقات اور خیر خواہانہ مراسم رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، جس کو مداراۃ یا مواساۃ کہتے ہیں، قرآن کریم میں ان دونوں رخوں پر واضح ہدایات موجود ہیں:

"لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً" (آل عمران: ۲۸)۔

(ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں، جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کچھ بھی تعلق نہ ہوگا، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو)۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ" (توبہ: ۲۳)۔

(اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو لوگ ان سے دوستی رکھیں گے تو وہی حد سے گذرنے والے ہوں گے)۔

ان آیات کو ان کے نزول کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ حکم جنگ اور کشیدگی کے حالات کے لئے ہے، اور ان غیر مسلموں کے لئے ہے جو اسلام اور مسلمانوں سے مختلف محاذوں پر مصروف پیکار ہیں۔

قرآن پاک میں اس طرح کی متعدد آیات موجود ہیں، جن میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اور حدود پر روشنی ڈالی گئی ہے، ایک آیت اس سلسلے میں بہت ہی زیادہ واضح ہے :

"لَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ، إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ" (الممتحنہ: ۸۔۹)۔

(خدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے، اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں، خدا انصاف والوں کو پیار کرتا ہے، وہ صرف ایسے لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے سے منع کرتا ہے، جو تم سے تمہارے مذہب کے بارے میں جنگ کریں، اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار ہوں، جو ان سے دوستی کا دم بھریں گے وہی بے انصاف ہوں گے)۔

مسلمانوں کے اس اخلاق اور رواداری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ باہمی عداوت میں کمی پیدا ہوگی، قرآن اس نتیجہ کی طرف اشارہ کرتا ہے :

"عَسَى اللهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوَدَّةً وَاللهُ قَدِيرٌ وَاللهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ" (الممتحنہ: ۷)۔

(اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان محبت پیدا کردے اور اللہ بڑی قدرت والا ہے)۔

دیگر مذاہب کی کتابوں کا حوالہ اور ان سے استفادہ:

(۲) مختلف مذاہب کے درمیان بہت سی تعلیمات میں اشتراک پایا جاتا ہے، اصول سیاست، اصول اخلاق، سماجی قواعد بلکہ بہت سے مذہبی تصورات میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، خاص طور پر آسمانی مذاہب میں اس طرح کی نظیریں بہت ملتی ہیں، مذاکرات کے درمیان کسی نقطۂ اتفاق تک پہنچنے، کسی مشترکہ کاز کو قوت پہنچانے کے لئے، یا اتمام حجت کے لئے دیگر مذاہب کی کتابوں کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں اور ان سے محدود استفادہ بھی کیا جاسکتا ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ بعض دفعہ فریق ثانی کے لئے یہ زیادہ مؤثر اور قابل قبول ثابت ہوتا ہے، خود قرآن کریم نے مختلف مناسبتوں سے کئی مقامات پر دیگر مذاہب کی کتابوں اور ان کی تعلیمات کے حوالے دیئے ہیں، جن کا مقصد کہیں عقیدہ ونظریہ کی اصلاح ہے تو کہیں دیگر اہل مذاہب کے بعد کو کم کرنا ہے، مثلاً:

قرآن کریم میں دیگر مذہبی کتابوں اور شخصیات کے حوالے:

☆ قرآن مجید زمینی وراثت اور خلافت وحکومت کو صالحین کا حق قرار دیتا ہے، بدکرداری یا ظلم کے ساتھ زمین پر اچھی حکمرانی قائم نہیں ہوسکتی، قرآن نے یہ بات اہل کتاب کی مشہور کتابوں تورات اور زبور کے حوالے سے بیان کی ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی تھیں، جب کہ یہ بات بغیر کسی حوالہ کے بھی کہی جاسکتی تھی، لیکن پھر یہ معنویت پیدا نہ ہوتی کہ یہ تمام مذاہب کا مشترکہ نظریہ ہے، صرف قرآن کا نہیں :

"وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ، إِنَّ فِي هَذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ" (الانبیاء:۱۰۶)۔

(اور ہم نے زبور میں تورات کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے، بیشک اس میں نصیحت ہے عبادت گذار لوگوں کے لئے)۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت کریمہ میں الذکر سے مراد تورات ہے، بعض حضرات نے الزبور کو لغوی معنیٰ میں لیتے ہوئے تمام سچی آسمانی کتابوں تورات، زبور، انجیل اور قرآن کو اس کا مصداق قرار دیا ہے (شرح مشکل الآثار ۱۴؍۳۰۳ حدیث نمبر: ۵۶۳۳، ناشر: موسسۃ الرسالۃ، الدر المنثور فی التاویل بالماثور ۷؍۱۱۰)۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن نے صرف حضرت موسیٰؑ کے حوالے سے یہ بات بیان کی ہے:

"قَالَ موسی لِقَوْمِهِ استعینوا بالله و اصبروا إِنَّ الأرض لله يُورِثُهَا مَن يَشَاء مِنْ عِبَادِهِ" (الاعراف:۱۲۸)۔

(حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے فرمایا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے)۔

اس طرح قرآن پاک نے کئی مذہبی کتابوں اور شخصیات کے حوالے دے کر اس کو ایک متفقہ نظریہ قرار دیا۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت ایک واضح صداقت ہے، جس کے لئے بے شمار شواہد و براہین موجود ہیں، لیکن قرآن کریم نے اس کو ایک بین الاقوامی عقیدہ اور مذاہب عالم کے متفقہ نظریہ کے طور پر پیش کیا ہے، اس کے لئے قرآن نے مختلف مذہبی شخصیات اور کتابوں کے حوالے دیئے ہیں، اور یہ ثابت کیا ہے کہ تمام سابقہ رسولوں اور آسمانی مذاہب کو حضور ﷺ کی نبوت کبریٰ اور آخری زمانے میں آپ کی آمد کا علم تھا، اور اپنے اپنے دور میں انہوں نے اس حقیقت کا اعلان بھی کیا، دنیا کو بشارت بھی سنائی، اور آپ کا اجمالی یا تفصیلی تعارف بھی پیش کیا (تفسیر القرآن الکریم ۸؍۱۱۱، ناشر: دار طیبہ للنشر والتوزیع)۔

چنانچہ اس بات سے حضور ﷺ کے زمانے کے انصاف پسند اور صاحب علم اہل کتاب بھی خوب واقف تھے، اور اہل مکہ میں ان پیشگوئیوں کی بازگشت موجود تھی، خود صحابہ میں کئی لوگ جو تورات وانجیل کے عالم تھے مثلاً حضرت عبد اللہ بن سلامؓ اور حضرت

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ وغیرہ وہ بھی اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے (الجامع الصحیح المختصر ۲/۷۴۷حدیث نمبر:۲۰۱۸، ناشر: دار ابن کثیر یمامہ بیروت، مسند الامام احمد بن حنبل ۳۸/۷۷۴حدیث نمبر:۲۳۴۹۲، ناشر: موسسۃ الرسالۃ)۔

چنانچہ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے ارشاد ہے:

''وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُبِينٌ'' (الصّف:۶)۔

(اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، سابقہ کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں، اور ایک ایسے رسول کی بشارت سناتا ہوں جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، پھر جب ان کے پاس وہ رسول آ گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے)۔

ایک دوسرے مقام پر تورات وانجیل کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کی صفات وخدمات پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

''الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ'' (الاعراف:۱۵۷)۔

(جو لوگ رسول نبی امی کی اتباع کرتے ہیں وہ ان کو اپنے پاس تورات اور انجیل میں صاف تحریر شدہ پاتے ہیں، کہ وہ لوگوں کو بھلائیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے، پاک چیزوں کو حلال کریں گے، گندی چیزوں کو حرام قرار دیں گے، ان کے بوجھ اور سابقہ پابندیوں کو ختم کریں گے، پس جو لوگ ایمان لائیں، ان کی حمایت ونصرت کریں، اور ان پر نازل شدہ روشنی کی پیروی کریں، وہی لوگ کامیاب ہیں)۔

بلکہ حضور ﷺ کے صحابہ کی صفات وامتیازات کا تذکرہ بھی پچھلی کتابوں میں موجود ہے، علامہ ابن کثیرؒ نے امام مالک کے بلاغات کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب صحابہ نے شام کے علاقوں کو فتح کیا، اور نصرانیوں نے ان کی زیارت کی، تو بے ساختہ بول پڑے کہ یہ ہمارے حواریین سے بہتر لوگ ہیں، اس لئے کہ ان صحابہ کی صفات پچھلی کتابوں میں موجود تھیں، انہوں نے ان کو اسی آئینے میں دیکھا (تفسیر القرآن العظیم ۷/۳۶۲، ناشر: دار طیبہ للنشر والتوزیع)۔

دیکھئے قرآن اس حوالے سے کہتا ہے:

''مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ'' (الفتح:۲۹)۔

B7

(محمد اللہ کے رسول ہیں اور آپ کے صحابہ کافروں پر سخت اور آپس میں نرم ہیں، آپ ان کو رکوع وسجدہ میں مصروف پائیں گے، وہ اللہ سے فضل اور رضا کے طلبگار رہتے ہیں، ان کے چہروں پر سجدہ کی نشانیاں چمک رہی ہیں ، ان کی مثالیں تورات اور انجیل میں موجود ہیں)۔

اسی لئے اہل کتاب کی طرف روئے تخاطب کر کے بار بار کہا گیا کہ اگر تم قرآن پر نہیں، اپنی کتابوں پر بھی یقین رکھتے تو تم محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ضرور ایمان لے آتے ،لیکن جب اہل تورات تو ارات کو اور اہل انجیل انجیل کو اپنی زندگی میں جاری نہ کر سکے تو ان کے عدل اور قبول حق کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

”وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللّهُ فِيهِ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ“ (المائدہ: ۴۷)۔

(چاہئے کہ اہل انجیل انجیل میں نازل شدہ حکم الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں، جو اللہ کے نازل شدہ حکم کو فیصلہ کن نہیں مانتا وہ فاسق ہے)

ایک جگہ کہا گیا :

”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّى تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ“ (المائدہ: ۶۸)۔

(آپ کہہ دیجئے :اے اہل کتاب! تم کسی دین پر قائم نہیں جب تک کہ تم تورات وانجیل اور اپنے رب کے نازل کردہ احکام کو قائم نہ کرو)۔

☆ بلکہ قران کریم نے سابقہ کتابوں کے حوالے سے بعض تعلیمات کو مذہب اسلام کا حصہ بھی قرار دیا ہے، مثلاً تعزیرات اسلامی میں قانون قصاص تورات کے حوالے سے لیا گیا ہے :

”إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ .... وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ“ (المائدہ: ۴۴۔۴۵)۔

(ہم نے تورات نازل کی، جس میں ہدایت ونور ہے، اس سے انبیاء فیصلے کرتے رہے ہیں ....اور ہم نے اس میں بنی اسرائیل پر فرض کیا کہ جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، ناک کا بدلہ ناک، کان کا بدلہ کان، دانت کا بدلہ دانت اور زخموں کا قصاص لیا جائے گا، جو صدقہ کرے اس کے لئے کفارہ ہوگا، اور جو اللہ کے نازل کردہ احکام پر عمل نہیں کرے گا وہی لوگ ظالم ہیں)۔

☆ قانون جزاوسزا میں دنیا میں انسان کی دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ کے بدلے خدا کی طرف سے وعدۂ جنت ہے، اس پر تورات، انجیل اور قرآن سب متفق ہیں، قرآن میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے :

”إِنَّ اللّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَلِك

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ "(التوبہ:۱۱۱)۔

(بے شک اللہ پاک نے مومنوں کی جان ومال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے، وہ اللہ کے راستے میں جہاد کریں، جان لیں اور جان دیں، یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے تورات، انجیل اور قرآن میں، جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرے گا تو اسے اس کے عہد کی بشارت ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے)۔

☆اسی طرح قانون جزا وسزا ہی کے تحت حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کے حوالے سے قرآن کریم نے ان شقوں کو جگہ دی ہے :

☆کسی کے جرم کا بار دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا، ☆انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کیا ہے، ☆انسان کے آگے اس کا نتیجۂ عمل ضرور آئے گا، ☆اور اس کے مطابق اس کو پورا پورا بدلہ ملے گا، وغیرہ:

"أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَى، وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى، أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى، وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَى "(النجم:۳۶۔۴۱)۔

☆قرآن کی سورۂ اعلیٰ میں خلقت انسانی کے مدارج ومصالح، قدرت خداوندی کے مظاہر، انسان کے نفع وضرر کے اصول اور اس کی طبعی کمزوریوں کی نشاندہی وغیرہ مضامین بیان کئے گئے ہیں، پھر ان سب کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں کی طرف محول کردیا گیا ہے، یہ بات خود سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمائی (نسائی ۶/ ۵۱۳ حدیث نمبر: ۱۱۶۶۸، ناشر : دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

"إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى، صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى "(الاعلیٰ:۱۸۔۱۹)۔

(بلاشبہ یہ تمام مضامین سابقہ صحیفوں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں موجود ہیں)۔

یہ تو کلام الٰہی سے چند مثالیں پیش کی گئیں، اب کلام نبوت سے بھی چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

کلام نبوت میں دیگر مذہبی کتابوں کے حوالے:

☆زنا کی سزا میں اسلام کا جو قانون رجم ہے، یہ خود تورات میں موجود ہے، اس کا علم اس وقت ہوا جب نبی کریم ﷺ کی خدمت عالیہ میں یہود کی طرف سے ایک مقدمۂ زنا پیش ہوا اور آپ نے تورات کے حوالے سے قانون رجم کی بابت ان سے دریافت فرمایا، انہوں نے ازراہ شرارت توریت میں اس قانون کا انکار کیا، لیکن وہ اپنے اس انکار کو ثابت نہ کرسکا اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے ان کی علمی خیانت کا پردہ فاش کردیا، تفصیل کتب حدیث میں موجود ہے (الجامع الصحیح المختصر ۳/ ۱۳۳۰، حدیث نمبر: ۳۴۳۶، ناشر دار ابن کثیر، الیمامہ بیروت طبع ثالث ۱۴۰۷، ۱۹۸۷، تحقیق: د. مصطفی دیب البغا)۔

☆ایک بار اہل کتاب کا ایک عالم دربار رسالت میں حاضر ہوا اور اپنی مذہبی کتابوں کی روشنی میں اس نے روز قیامت کی کچھ منظر کشی کی: کہ اللہ پاک ایک انگلی پر آسمانوں کو، ایک انگلی پر زمینوں کو، ایک انگلی پر درختوں کو، ایک انگلی پر پانی وغیرہ کو اور

ایک انگلی پر ساری خلائق کو اٹھالے گا اور کہے گا کہ میں مالک ہوں، یہ سن کر حضور ﷺ اس قدر خوش ہوئے کہ آپ کے دندان مبارک نظر آنے لگے، اس لئے کہ یہ اسلامی تعلیمات سے بہت ہم آہنگ تھی، پھر آپ ؐ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی :

”وما قدروا الله حق قدره والأرض جميعا قبضته يوم القيامة والسماوات مطويات بيمينه سبحانه وتعالى عما يشركون“ (الزمر:٦٧)۔

(انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جو اس کا حق تھا، اور ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے، اللہ کی ذات ان کی شرکیات سے پاک ہے) (الجامع الصحیح المختصر ۴/۱۸۱۲ حدیث نمبر: ۴۵۳۳، ناشر: دار ابن کثیر، الیمامہ بیروت)۔

☆حضرت عقبیٰ بن عامرؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ قرآن میں تین سورتیں ایسی ہیں جو تورات وانجیل میں بھی موجود تھیں، قل ھواللہ، اور معوذتین، حضور ﷺ نے روزانہ رات میں پڑھنے کی ان کو تلقین فرمائی (مسند الامام احمد بن حنبل ۴/۱۴۸ حدیث نمبر: ۱۷۳۷۲، ناشر: موسسۃ قرطبۃ القاہرہ)۔

کئی صحابہ تورات کے عالم تھے:

☆صحابہ میں کئی حضرات تورات پڑھنا جانتے تھے اور وہ اس کا مطالعہ بھی کرتے تھے جس کی خبر حضور ﷺ کو تھی، لیکن آپ نے ان کو منع نہیں فرمایا، دراصل تہذیبی اختلاط اور مصدر قانون سمجھ لئے جانے کے اندیشہ سے آپ ﷺ نے ابتدا میں دیگر مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے سخت ممانعت فرمائی تھی ،لیکن جب لوگوں کے قلب میں راسخ ہوگیا کہ مصدر قانون صرف قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے تو محض علمی اضافہ یا اتمام حجت کے لئے ان کو گاہ بگاہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

☆حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا کہ کھانے سے قبل ہاتھ دھونا سبب برکت ہے، میں نے اس کا تذکرہ سرکار دوعالم ﷺ سے کیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کھانے سے قبل اور بعد میں دھونا سبب برکت ہے (ترمذی ۴/۲۸۱ حدیث نمبر: ۱۸۴۶، ناشر: داراحیاء التراث العربی بیروت، ابوداؤد ۳/۴۰۵ حدیث نمبر: ۳۷۶۳، ناشر: دارالکتاب العربی)۔

☆حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ بھی تورات کے بڑے عالم تھے، اور اس کا مطالعہ کرتے تھے، ایک دن انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کی ایک انگلی میں گھی اور دوسری میں شہد ہے اور وہ دونوں کو اپنی زبان سے چاٹ رہے ہیں، انہوں نے اس خواب کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا، آپ ﷺ نے فرمایا تم قرآن اور تورات دونوں کتابیں پڑھتے ہو (مسند امام احمد ۲/۲۲۲ حدیث نمبر: ۷۰۶۷، ناشر: موسسۃ قرطبہ قاہرہ)۔

☆ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت کعب احبار وغیرہ بھی توریت وانجیل کے علماء میں تھے، اور کئی مسائل پر ان کے درمیان مذاکرات بھی ہوتے تھے۔

☆حضرت کعب احبارؒ بیان کرتے ہیں کہ تورات میں لکھا ہے کہ اللہ کے نبی حضرت داؤدعلیہ السلام نماز سے فارغ ہوتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

"اللهم أصلح لي ديني الذي جعلته لي عصمة و أصلح لي دنياي التي جعلت فيها معاشي اللهم إني أعوذ برضاك من سخطك و أعوذ بعفوك من نقمتك و أعوذ بك منك لا مانع لما أعطيت و لا معطي لما منعت و لا ينفع ذا الجد منك الجد"۔

اور پھر فرمایا کہ مجھ سے حضرت صہیب نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا بھی یہی معمول تھا (المجتبی من السنن ۳/ ۷۳ حدیث نمبر:۱۳۴۶، ناشر: مکتب المطبوعات الاسلامیہ حلب)۔

☆ایک بار حضرت ابوہریرہؓ نے فضائل جمعہ پر نبی کریم ﷺ کی تفصیلی حدیث سنائی، اس میں ایک جزو یہ تھا کہ ہر جمعہ کو ایک ساعت ایسی آتی ہے جس میں ہر دعا قبول ہوتی ہے، حضرت کعب نے سنا تو کہا: یہ ساعت سال میں ایک بار آتی ہے، حضرت ابوہریرہؓ نے پوری طاقت سے اس کورد کیا اور کہا کہ ہر جمعہ کو یہ ساعت آتی ہے، حضرت کعب نے تورات دیکھی اور کہا کہ نبی ﷺ نے سچ فرمایا، حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میری ملاقات عبداللہ بن سلامؓ سے ہوئی تو میں نے کعب کے ساتھ اپنی نشست کا تذکرہ کیا، عبداللہ بن سلام نے مجھ سے پوچھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ جمعہ کے دن وہ ساعت کب آتی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا، انہوں نے کہا: دن کے آخری وقت میں آتی ہے، میں نے کہا یہ کیونکر ممکن ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، عبداللہ بن سلامؓ نے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو نماز کے انتظار میں بیٹھتا ہے وہ بھی نماز کے حکم میں ہے، میں نے کہا بے شک آپؐ نے فرمایا ہے (ابوداؤد ۱/ ۴۰۴ حدیث نمبر: ۱۰۴۸، ناشر: دار الکتاب العربی)۔

اس طرح کے بڑے واقعات اور مثالیں ہیں جن میں حضور ﷺ اور صحابۂ کرام حسب موقع دیگر مذہبی کتابوں کے حوالے دیا کرتے تھے، اور اس کو معیوب نہیں جانتے تھے، اسی لئے بعد کے ادوار میں بھی متعدد علماء نے اپنی تفاسیر قرآن، تشریحات حدیث اور کتب سیرت میں بے تکلف دیگر مذاہب کی کتابوں کے حوالے استعمال کئے ہیں اور کم از کم فریق ثانی کو مطمئن کرنے کی حد تک ان سے استفادہ کیا ہے، وکفیٰ بہ حجۃ۔

خوشگوار تعلقات کے لئے غیر مسلموں کے مذہبی اعمال میں شرکت کرنا:

(۳) غیر مسلموں سے مذاکرات یا خوشگوار تعلقات بنانے کے لئے ان کے مذہبی اعمال اور تقریبات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ قرآن نے شدید لہجہ میں کہا ہے کہ کفر تم سے اس وقت راضی نہ ہوگا جب تک کہ تم ان کی ملت کی اتباع نہ کرلو اور ان کے رنگ میں نہ رنگ جاؤ، اور یہ انسان کی ضلالت اور ایک مؤمن کے خسارہ کے سوا کچھ نہیں ہے:

"وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ "(المائدہ:۱۲۰)۔

(آپ سے یہود ونصاریٰ ہرگز راضی نہ ہونگے جب تک کہ آپ ان کی ملت کی اتباع نہ کرلیں، آپ فرمادیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے، اوراگرآپ علم آنے کے بعدان کی خواہشات کی اتباع کریں گےتو اللہ سے کوئی آپ کو بچانے والا اور مددگار نہ ہوگا)۔

یہ مسلمان کی تہذیبی شکست ہے کہ وہ غیرمسلموں کے مذہبی رسوم کی رونق میں اضافہ کرے، جبکہ ہمیں ان کی مشابہت سے بچنے بلکہ مخالفت کاحکم دیا گیاہے، تفصیل گذرچکی ہے، قرآن نے صریح طور پر مقام زور پر جانے سے منع کیاہے:

"وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ"(الفرقان:۷۲)(یہ لوگ جھوٹ کی جگہوں پر حاضر نہیں ہوتے)۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہاں الزور سے مراد مشرکین کے مذہبی مواقع اور مقامات ہیں (الدرالمنثور فی التاویل بالماثور ۷/۷۷۳)۔

ابوالعالیہ، طاؤس، محمد بن سیرین، ضحاک اور ربیع بن انس وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے، بہت سے علماء نے تمام منکرات کے مقامات کو اس کا مصداق قرار دیاہے (تفسیر القرآن العظیم ۶/۱۳۰، ناشر: دارطیبہ للنشر والتوزیع)۔

حضرت عمر بن الخطابؓ غیرمسلموں کی مذہبی تقریبات میں شرکت سے سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے، اور اس کو غضب الٰہی کا باعث قرار دیتے تھے:

"ولا تدخلوا على المشركين فى كنائسهم يوم عيدهم فإن السخطة تنزل عليهم"(السنن الکبریٰ وفی ذیلہ الجوہر النقی، ناشر: مجلس دائرۃ المعارف النظامیہ الکائنۃ فی الہند ببلدۃ حیدرآباد، مصنف عبدالرزاق ۱/۴۱۱ حدیث نمبر: ۱۶۰۹، ناشر: المکتب الاسلامی بیروت)(مشرکین کے تہواروں میں ان کے عبادت خانوں میں داخل ہونے سے بچو، اس سے اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے)۔

"عن عبد الله بن عمرو قال:من بنى ببلاد الأعاجم وصنع نيروزهم ومهرجانهم وتشبه بهم حتى يموت وهو كذلك حشر معهم يوم القيامة، قال الشيخ الإمام رحمه الله قال الشيخ أبوسليمان رحمه الله تنى هو الصواب"(السنن الکبریٰ وفی ذیلہ الجوہر النقی ۹/۲۳۴ حدیث نمبر: ۱۹۳۳۵، ناشر: مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ)۔

(حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں: جو غیرمسلموں کے علاقے میں گھر بنائے اور ان کے تہواروں کی نقل اتارے، ان میں شریک ہو اور اسی حالت میں مرجائے، تو قیامت کے دن اس کا حشر انہی کے ساتھ کیا جائے گا....)۔

اس سلسلے میں بعض عمومی احادیث سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے، جن میں معصیت کی محفلوں میں شرکت کو باعثِ گناہ قرار دیا گیاہے۔

ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے جائز اعمال کا ترک:

(۴) قیام امن اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے ایسے اعمال کا ترک جائز نہیں، جو شرعاً واجب نہیں ہیں، لیکن ان کا تعلق

مذہب سے ہو، یا مسلمانوں کے قومی یا تہذیبی شعار کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہو، اس میں وہ عمل بھی داخل ہے جو کہ مذہب کا حصہ نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت کی شناخت بن چکا ہو، اور اس کے ترک سے ترک شعائر کی طرح کفر اپنی بالادستی اور خوشی محسوس کرتا ہو، اس لئے کہ:

☆ یہ کفر کی بالادستی کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے، اور مسلمان اپنی مرضی سے کفر کی بالادستی قبول نہیں کرسکتے، قرآن کریم میں ہے: "لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا" (النساء:۱۴۱) (اللہ تعالیٰ ہرگز کافروں کو مؤمنوں پر راہ نہیں دے گا)۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: " الإسلام يعلو ولا يعلى " (الجامع الصحیح المختصر ۱/ ۴۵۴ حدیث نمبر: ۷۸) (اسلام بلند رہے گا، اس پر کسی کو بالادستی حاصل نہیں ہوگی)۔

☆ اسی طرح یہ اسلام میں مکمل داخلہ کے منافی ہے، اللہ پاک نے قرآن کریم میں کسی حلال چیز کو حرام کرنے سے منع فرمایا ہے، صاحب شریعت کے علاوہ کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے، اپنی مرضی سے کسی جائز عمل کو ہمیشہ کے لئے ترک کردینا یا اس کے ترک کی منظوری دینا بھی نتیجہ کے اعتبار سے تحریم حلال ہی کے زمرہ میں آتا ہے، اور قرآن نے اس کو بھی ممنوع قرار دیا ہے:

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكَ" (التحریم:۱) (اے نبی! جس چیز کو اللہ پاک نے حلال کیا اسے آپ حرام کیوں کرتے ہیں)۔

جب کہ حضور ﷺ نے کسی جائز چیز کی حرمت کا قانون نہیں بنایا تھا بلکہ صرف عملی طور پر بذات خود اس سے اجتناب کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، مگر قرآن نے اس کو تحریم کے دائرے میں شامل کرکے اس سے ممانعت کردی۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ" (المائدہ:۸۷)۔

(اے ایمان والو! ان پاک چیزوں کو حرام نہ کرو جن کو اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ پاک حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے)۔

اس آیت کے پس منظر میں جو واقعہ نقل کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک یا چند اشخاص نے ترک لحم، ترک نکاح، ترک نوم وغیرہ کا ارادہ کیا تھا، اور اس کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھا تھا، نہ اس کی تشہیر کی تھی اور نہ دوسروں کو تشکیل، لیکن قرآن نے اسے بھی تحریم حلال قرار دیا اور اس طرح کے اقدامات پر ممانعت عائد کردی (صحیح مسلم ۴/ ۱۲۹ حدیث نمبر: ۳۴۶۹، ناشر: دار الجیل بیروت)۔

دراصل کسی چیز کو جب انسان اپنے لئے حرام کرلیتا ہے، تو رفتہ رفتہ اس کی شناعت دل میں بسنے لگتی ہے، اور پھر اس سے متأثر ہوکر دوسرے لوگ یا کم از کم خود اس کی نسل اس شئی کے ترک کو بہتر تصور کرنے لگتی ہے، جبکہ اللہ نے اس کو بہتر نہیں بتایا، اسی لئے قرآن نے اس کی جڑ کاٹ دی، اس لئے کہ جو چیز نتیجہ کے اعتبار سے مضرت رساں ہو، شریعت میں وہ عمل اول مرحلے میں ہی ممنوع قرار پاتا ہے، باہمی ہم آہنگی کے لئے آج ایک جائز چیز کے ترک پر اتفاق رائے کرلیا جائے، یعنی جائز سمجھتے ہوئے اسے

چھوڑ دیا جائے لیکن آنے والی نسلیں اس عمل کو نظریہ بنالیں گی، اور اس کو واقعۃً ناجائز یا کم از کم ناپسندیدہ سمجھنے لگیں گی، یہ امت کا زبردست علمی اور قومی نقصان ہوگا، اور پھر اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کو سخت جدوجہد کرنی ہوگی، بلاوجہ اس طرح کی آزمائش اپنے سر لینے کی کیا ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا چیزیں (ترک لحم وغیرہ) گوکہ کسی خاص مذہب سے تعلق نہیں رکھتیں لیکن بعض مذاہب میں یہ رہبانیت کی تہذیبی علامت سمجھی جاتی ہیں، اور کسی قوم کی تہذیبی شناخت عملی طور پر مذہبی شعار کے درجہ میں ہوتی ہے، اسی لئے اسلام نے تشبہ سے جو ممانعت کی ہے اس میں مذہبی اور تہذیبی دونوں طرح کے امور داخل ہیں۔

☆ نیز اس سے تہذیبی موت کا اندیشہ ہے، کیونکہ جب قوم کسی دوسری قوم کے لئے یکطرفہ طور پر اپنی تہذیب چھوڑ دیتی ہے، تو آہستہ آہستہ اس کی تہذیبی غیرت اور قومی حسیت کمزور ہونے لگتی ہے اور اس کا نتیجہ موت ہے۔

☆ پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ معاملہ ایک ہی چیز کے ترک تک محدود رہے گا اور آئندہ کسی دوسری چیز کے ترک کا مطالبہ سامنے نہیں آئے گا؟..... اس کے بعد کیا ہوگا ہر صاحب بصیرت اس کا اندازہ کرسکتا ہے،...... اپنی چیزوں سے دستبردار ہونے والی قوم کبھی زندہ تصور نہیں کی جاسکتی۔

☆ اسی لئے قرآن نے کفر سے اتفاق رائے یا ان سے بعض منافع کے حصول کے لئے یک طرفہ محبت کی پیشکش کو ممنوع قرار دیا ہے، کہ یہ کسی زندہ اور غیور قوم کے شایان شان نہیں:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ" (الممتحنہ:۱)۔

(اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ، کہ ان کی طرف محبت کی پیشکش کرنے لگ جاؤ، جبکہ وہ تمہارے پاس موجود حقائق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں)۔

یہ آیت کریمہ جس پس منظر میں نازل ہوئی وہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کا واقعہ ہے، انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ والوں کو قافلۂ اسلام کی پیش قدمی سے آگاہ کرنے کے لئے ایک خط بھیجا تھا، تاکہ وہاں موجود ان کے اہل وعیال قریش کی انتقامی کارروائیوں سے محفوظ رہیں، یہ سچے پکے مسلمان اور بدری صحابی ہیں، خود قرآن نے ان کے ایمان کی شہادت دی ہے، ان کو رسول اللہ ﷺ کی کامیابی، کفار کی ذلت وشکست کا پورا یقین تھا، اور ان کے خط لکھنے کے پیش نظر ہرگز مسلمانوں کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ محض اپنے اہل وعیال کا محدود مفاد تھا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس اطلاع کے باوجود کوئی طاقت ان کو ذلت آمیز شکست سے بچا نہیں سکتی، لیکن بظاہر یہ قومی غداری تھی، اور ایک زندہ اور غیور قوم اس طرح کی حرکتوں کو گوارا نہیں کرسکتی تھی، اس لئے اللہ پاک نے ان کو متنبہ فرمایا، مگر ان کے حسن نیت کی بنا پر حضور ﷺ نے ان کو معاف فرمادیا (تفسیر القرآن العظیم ۸/ ۸۲، ناشر: دار طیبہ للنشر والتوزیع)۔

☆ دراصل جس تھوڑے سے نفع (ہم آہنگی، یاوقتی فتنہ وفساد سے تحفظ وغیرہ) کے لئے محبت کی قربانی دی جاتی ہے، اس کے نتائج کس قدر سنگین ہوسکتے ہیں، اور آئندہ قوم وملت کو اس سے کیا نقصانات پہنچ سکتے ہیں، وہ پیش نظر رہنا ضروری ہے، حکم ان نتائج کے اعتبار سے لگے گا، فقہی ضابطہ ہے:

"**دفع المفاسد مقدم علی جلب المصالح**" (البحر المحیط فی اصول الفقہ ۴/۱۹۹، ناشر: دار الکتب العلمیہ، الابہاج ۳/۶۵) (مفاسد کو دور کرنا مصالح کے حصول سے مقدم ہے)۔

اس مضمون کے متعدد فقہی ضابطے کتب اصول فقہ میں موجود ہیں۔

ان مباحث سے اس نتیجہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں کہ مذاہب واقوام سے مذاکرات اور باہمی اتفاق رائے کے لئے کسی ایسے جائز عمل کے ترک پر معاہدہ نہیں کیا سکتا، جس کا تعلق مذہب سے ہو یا مسلمانوں کی متوارث تہذیب سے، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں ذبیحۂ گاؤ سے دستبرداری کے معاملے پر متعدد علماء وفقہاء عصر کے جو مباحث پیش کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قریب کے تقریباً تمام علماء کی یہی رائے ہے کہ مذہبی اور تہذیبی شعائر میں حکم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، مذہب اور تہذیب وتمدن دو جداگانہ الفاظ ہیں، لیکن دونوں کا نتیجہ ایک ہے، الفاظ کا سہارا لیکر فرق کرنا محض کج بحثی ہے، جس کی تھوڑی سی وضاحت یہ ہے کہ:

ذبیحۂ گاؤ ایک تہذیبی اور قومی مسئلہ:

گائے کا ذبیحہ اسلام میں واجب نہیں، جائز ہے، قرآن کریم اور احادیث صحیحہ دونوں سے اس کا جواز ثابت ہے، قرآن میں حرام وحلال جانوروں کی تفصیلات کے لئے پوری سورۃ الانعام موجود ہے، اور اس میں اونٹ اور گائے کو بھی بالتصریح حلال جانوروں میں شمار کیا گیا ہے:

"وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ" (الانعام: ۱۴۴)۔

قرآن نے ان دونوں جانوروں کا نام خاص طور پر اس لئے لیا کہ اونٹ یہود کے یہاں حرام تھا، اسی طرح بنی اسرائیل کے ایک طبقہ نے گائے کا مجسمہ بنا کر تعلیمات یہود سے الگ ہٹ کر اس کی پرستش شروع کردی تھی، اس طرح اس کے یک گونہ تقدس کا احساس لوگوں میں پیدا ہوگیا تھا، جس کا تذکرہ قرآن پاک (سورہ اعراف: ۱۳۸) میں موجود ہے: مفسرین نے لکھا ہے کہ سامری نے گائے کے بچہ کا بت بنایا تھا (الدر المنثور ۴/۳۰۲)، قرآن نے ان دونوں جانوروں کو حلال کرکے ان کی حرمت بھی ختم کی اور تقدس کا طلسم بھی چاک کردیا۔

نیز احادیث سے بھی ذبیحۂ گاؤ کا جواز ملتا ہے، حضرت جابرؓ کی روایت ہے:

"نَحَرَ رَسُولُ اللهِ -صلی اللہ علیہ وسلم- عَنْ نِسَائِهِ وَفِي حَدِيثِ ابْنِ بَكْرٍ عَنْ عَائِشَةَ بَقَرَةً فِي حَجَّتِهِ" (صحیح مسلم ۴/۸۸ حدیث نمبر: ۳۲۵۴)۔

(رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ازواج مطہرات کی طرف سے اور بعض روایتوں کے مطابق حضرت عائشہؓ کی طرف سے گائے کی قربانی فرمائی)۔

بلکہ عہد نبوت میں گائے کی قربانی کا عام رواج تھا، اور ایک گائے سات آدمی کی طرف سے کافی سمجھی جاتی تھی، حضرت جابر بن عبداللہؓ ہی کی روایت ہے :

"فَنَذْبَحُ الْبَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةٍ نَشْتَرِكُ فِيهَا" (صحیح مسلم ۴/۸۸ حدیث نمبر: ۳۲۵۲) (کہ ہم سات آدمی کی طرف سے ایک گائے ذبح کرتے تھے)۔

اس مضمون کی متعدد روایات و آثار کتب حدیث میں موجود ہیں، البتہ جس تناظر میں گائے کے ذبیحہ کی اجازت دی گئی جیسا کہ ابھی ذکر آیا، اس نے اس کو شعار اسلامی میں تبدیل کر دیا، اور یہ مخصوص اسلامی تہذیب کا حصہ بن گیا، چنانچہ حضور ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا :

"من صلى صلاتنا و استقبل قبلتنا و أكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذي له ذمة الله و ذمة رسوله فلا تحقروا الله في ذمته" (الجامع الصحیح المختصر ۱/۱۵۳ حدیث نمبر: ۳۸۴)۔

(جو ہماری نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے، اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے اور اسے اللہ اور رسول کا ذمہ حاصل ہے، پس اس ذمہ کو نہ توڑو)۔

شارحین حدیث نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے اکل ذبیحہ کو شعائر اسلام میں شمار کیا ہے کہ جس طرح عبادات میں ہر مذہب کا ایک شعار ہوتا ہے، اسی طرح اشیاء خورد ونوش میں بھی ہر مذہب کا ایک خاص امتیاز ہوتا ہے، اور انہی امتیازات سے مذہب کو پہچانا جاتا ہے، مثلاً یہود مسلمانوں کا ذبیحہ (اونٹ، اور ہنود گائے) نہیں کھاتے، تو جب تک ان شعائر کو انسان دل سے قبول نہ کرلے اور ان کا عملی اظہار نہ کرے وہ مؤمن نہیں ہوسکتا اور نہ اسے اللہ اور رسول کا ذمہ حاصل ہوسکتا ہے (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ۶/۳۳۵)۔

اسی لئے حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ چند اہل کتاب صحابہ نے اسلام لانے کے بعد احتیاطاً اونٹ کا گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا، کہ اسلام میں واجب نہیں، اور یہود میں حرام تھا لیکن قرآن کریم میں اس پر تنبیہ کی گئی اور اس طرح کے مخلوط اسلام یا مخلوط تہذیب کو مسترد کر دیا گیا۔

امداد الفتاویٰ میں یہ بحث تقریباً ۱۲ صفحات میں ہے، اور حضرت تھانویؒ اور دیگر علماء نے پوری شدت کے ساتھ ذبیحۂ گاؤ یا کسی ایسے تہذیبی عمل سے دستبردار ہونے کی مخالفت کی ہے جو گو کہ مذہب میں واجب نہیں ہے لیکن شعائر اسلامی کا حصہ ہے، امداد الفتاویٰ میں جن اکابر علماء وفقہاء کے حوالے سے یہ رائے نقل کی گئی ہے، یا جنہوں نے اس پر دستخط کئے ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں :

☆حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ ☆حضرت مولانا عبدالحلیم لکھنویؒ ☆حضرت مولانا عبدالوہاب لکھنویؒ ☆حضرت مولانا ابوالغنا محمد عبدالمجید لکھنویؒ ☆حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ☆حضرت مولانا ابوالانوار محمد عبدالغفار الحنفی النقشبندی الاعظمیؒ ☆حضرت مولانا حبیب احمد الکیرانویؒ ☆حضرت مولانا انوار الحق امروہویؒ ☆حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ ☆اور حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ، تلک عشرۃ کاملۃ (امداد الفتاوی ۳/۵۷۵)۔

اور اس رائے کے خلاف کسی کی رائے معلوم نہیں ہے، اس طرح گویا اس پر ایک عصر کے علماء کا اتفاق ہو چکا ہے۔

نظریات باطلہ پر تنقید کے حدود:

(۵) اسلام ایک سچا مذہب ہے، جس نے حق کو کھول کھول کر بیان کیا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اس نے جھوٹے عقائد اور باطل نظریات کا طلسم بھی چاک کیا ہے، یہاں نفی اور اثبات دونوں ہیں، امر بالمعروف کی طرح نہی عن المنکر بھی ایک اہم ترین فریضہ ہے، اس لحاظ سے باطل افکار و نظریات کے خلاف تنقید کرنے میں مضائقہ نہیں، بلکہ بعض اوقات اس کے بغیر کام ہی نہیں چلتا، اگر سوال کا جواب نہ دیا جائے تو یہ ایک طرح کی شکست سمجھی جاتی ہے، تنقید و تردید نظریاتی جنگ کا لازمی حصہ ہے، اور ہتھیار کی جنگ سے زیادہ اس کی اہمیت ہے، یہ جسموں پر نہیں دلوں اور دماغوں پر یلغار کرتی ہے، یہ قریب سے نہیں دور سے وار کرتی ہے، اور یہاں فتح و شکست آج نہیں کل کے لئے ہوتی ہے، ایسے ہی موقع پر قرآن نے جدال کی اجازت دی ہے:

"وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" (النحل: ۱۲۵) (ان کے ساتھ بہتر طریق سے جدال کرو)۔

☆اس کی ایک بہترین مثال عہد نبوت میں معرکۂ احد میں دیکھنے میں آئی، مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہتھیار کی جنگ کے بعد تھوڑی دیر کے لئے زبانی جنگ ہوئی، جس میں مسلمانوں کی طرف سے حضرت عمر بن الخطابؓ نے ابوسفیان (جو اس جنگ میں کافروں کے نمائندہ تھے) کے سوالوں کے مسکت جوابات دیئے، اور خود سرِ دو عالم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو جوابات تلقین فرمائے، کتب حدیث و سیر میں یہ واقعہ معروف ہے (الجامع الصحیح المختصر ۴/۱۴۸۶ حدیث نمبر: ۳۸۱۷)۔

☆اسی طرح ایک بار نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور ابنیت پر مباحثہ کیا، آپ ﷺ نے ان کو اطمینان بخش جوابات دیئے، انہوں نے مسجد نبوی میں اپنے مذہب کے مطابق الٹی سمت نماز پڑھی، صحابہ نے روکنا چاہا مگر آپ نے روکنے سے منع فرمایا، جس کا تذکرہ کتب سیر وغیرہ میں تفصیلاً موجود ہے (الروض الانف ۳/۳، ۱۶، شرح المواہب ۴/۴۳، السیرۃ النبویہ ۱/۵۷۸)۔

ان دونوں مواقع پر نبی کریم ﷺ نے جس صبر و سکون، متانت و سنجیدگی اور حسن اخلاق کا مظاہرہ فرمایا، اور مسلمانوں کو بھی اس کی تلقین فرمائی، وہ تنقید و مناظرہ کے لئے مثالی لائحۂ عمل ہے، حضور ﷺ کے طرز عمل، معاملہ کی فہم اور جواب کے لئے الفاظ اور جملوں کے انتخاب سے تنقید کے حدود و آداب پر روشنی پڑتی ہے، اسی چیز کو قرآن مجادلۂ احسن کہتا ہے، تنقید کے وہ نکات جو طرز نبوت سے مستفاد ہیں، یہ ہیں:

☆ بحث میں اصل نکتہ سے انحراف نہ کیا جائے۔

☆ کسی کی ذاتیات پر حملہ نہ کیا جائے۔

☆ جبر کا طریق اور جارحانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے۔

☆ لب ولہجہ میں متانت وشائستگی کا لحاظ رکھا جائے، اور طعن وتشنیع سے گریز کیا جائے۔

☆ جواب برائے جواب میں بھی کوئی غیر حقیقی بات زبان سے نہ نکالی جائے۔

☆ فریق مخالف کی اشتعال انگیز کاروائی کے باوجود تحمل اختیار کیا جائے۔

☆ فریق مخالف کی شخصیات اور مذہبی جذبات وتصورات کا ہر ممکن احترام کیا جائے۔

☆ نظریاتی اختلاف ذاتی مراسم اور باہمی تعلقات پر اثر انداز نہ ہو اور ہر طرح حسن اخلاق اور بشاشت کا مظاہرہ کیا جائے وغیرہ۔

اگر تنقیدات میں ان حدود کی رعایت نہ برتی جائے، تو وہ تنقید نہیں نزاع اور بحث نہیں سب وشتم بن جائے گی، جس سے قرآن کریم نے حکمت آمیز لہجے میں منع کیا ہے، اس لئے اس سے کوئی نفع ہونے کے بجائے منفی ردعمل پیدا ہوتا ہے اور بسا اوقات انسان اس نفسیات سے اس درجہ مغلوب ہوجاتا ہے کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ اس کا تیر ہدف کن کن لوگوں کو شکار کررہا ہے، علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ میں نے بہت مرتبہ شیعہ سنی کی بحث میں جاہل سنیوں کو دیکھا ہے کہ جب شیعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں تو جاہل سنی ان کے جواب میں حضرت علیؓ کے لئے نازیبا کلمات استعمال کرنے لگتے ہیں (معاذ اللہ) (روح المعانی ۵ / ۲۷۳)۔

یہ مذہبی مباحثات کی جھوٹی نفسیات ہیں جو تنقید وبحث کے حدود وآداب سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں، اسی لئے قرآن نے اس طرح کی تنقیدوں پر روک لگائی، اور کہا کہ جو لوگ دیگر اقوام کے مذہبی جذبات کا احترام نہیں کرتے، ردعمل کی بنیاد پر اسلامی شخصیات یا عقائد کے خلاف فریق مخالف کی جانب سے جو بھی منفی کاروائیاں ہوں گی یہ لوگ اس کے ذمہ دار قرار پائیں گے، اس لئے کہ ہم جس چیز کو غلط سمجھتے ہیں ضروری نہیں کہ دوسرے بھی اسے غلط سمجھیں، ایسے لوگوں کے لئے معارضانہ طریق کے بجائے داعیانہ طریق زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے:

”وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ “(الانعام: ۱۰۸)۔

(اللہ کے سوا جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں، ان کو گالیاں نہ دو کہ وہ بھی اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت کی بنیاد پر گالیاں دینے لگیں، اسی طرح ہر جماعت کے لئے ان کے اعمال کو ہم نے خوبصورت بنادیا ہے، آخر ان کو اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ ان کو بتائے گا جو یہ کرتے تھے)۔

اس آیت کے پس منظر کے بارے میں مفسرین نے حضرت قتادہؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ مسلمان بتوں کو گالیاں دیتے تھے، جواب میں کافر اللہ پاک کو گالیاں دیتے، اللہ پاک نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اس طرح اللہ کو گالیاں سنوانے والے خود تم ہو، ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی گئی ہے کہ کفار نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ ہمارے بتوں کو برا بھلا کہنے سے باز آجائیں ورنہ ہم آپ کے اللہ کو برا بھلا کہیں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (تفسیر القرآن العظیم ۳/۳۱۵، الدر المنثور ۴/۱۵)۔

اس طرح کے مواقع پر جو نتائج سامنے آتے ہیں اس کی ذمہ داری خود مسلمانوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔

قرآن کے مطابق تنقید میں منفی طریق کار اختیار کرنا خود اسلام اور ملت اسلامیہ کو بالواسطہ نقصان پہنچانے کے مترادف ہے، علماء اور مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن کریم کی یہ نص محکم ہے اور ملت اسلامیہ کے لئے یہ حکم آج بھی بدستور باقی ہے (دیکھئے: جواہر الحسان فی تفسیر القرآن ۱/۴۹۴، الجامع لأحکام القرآن ۷/۶۱)۔

کسی مذہب میں موجود حقائق کو نقل کرنا برا نہیں ہے، بلکہ تحقیر آمیز انداز میں بیان کرنا برا ہے (روح المعانی ۵/۴۷۵)۔

مشترکہ سماجی مسائل پر دیگر اہل مذاہب کے ساتھ اشتراک:

(۶) مشترکہ سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر دیگر اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات میں اشتراک درست ہے، اور ان چیزوں کے خاتمہ یا اصلاح کے لئے مشترکہ جدو جہد کی جاسکتی ہے، عہد نبوت میں اس کی بہترین مثالیں حلف الفضول، تجدید حلف خزاعہ اور میثاق مدینہ وغیرہ موجود ہیں، جن میں مختلف اقوام اور قبائل نے چند مشترکہ سماجی اور سیاسی مسائل پر معاہدے کئے تھے، ان میں غریبوں اور مظلوموں کی مدد، ظالموں کا مقابلہ اور برائیوں کا خاتمہ وغیرہ جیسے مسائل بھی شامل تھے۔

گذشتہ صفحات میں اس پر تفصیل سے گفتگو آچکی ہے۔

دیگر اہل مذاہب کے ساتھ سیاسی اشتراک:

(۷) جمہوری ممالک میں سیاسی حصہ داری کی بڑی اہمیت ہے، اگر مسلمان اس میں اپنا کردار ادا نہ کریں تو کئی محاذوں پر وہ برادران وطن سے بہت پیچھے رہ جائیں گے، اور جس ملک میں مختلف قومیتوں کے لوگ رہتے ہوں وہاں کسی ایک قوم کا تنہا اپنے بل بوتے سیاسی استحکام حاصل کرنا آسان نہیں ہے، ایسے حالات میں دیگر اہل مذاہب کی سیاسی جماعتوں سے اشتراک عمل کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ مسلمان مشترکہ بنیادوں پر مساوی حیثیت سے اس میں شریک ہوں اور ان کا قومی اور ملی وقار مجروح نہ ہو، اگر ملک میں مختلف سیاسی جماعتیں ہوں تو ترجیح ان جماعتوں کو دی جانی چاہئے جو اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے معتدل اور روادارانہ خیالات کی حامل ہوں، اور اسلامی عقائد و نظریات سے ان کے خیالات متصادم نہ ہوں، ان کے مقابلے میں ایسی جماعت کے ساتھ اتحاد کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے سخت گیر اور متشددانہ نظریات رکھتی ہو، البتہ سخت جماعت اگر اپنے سیاسی منشور سے مسلمانوں سے

متصادم نظریات خارج کرنے اور صرف مشترکہ مسائل پر اتحاد کے لئے آمادہ ہو اور ملک میں کوئی نسبتاً اعتدال پسند جماعت موجود نہ ہو اور اس کے ساتھ اشتراک کئے بغیر مسلمانوں کے سیاسی یا سماجی استحکام کی کوئی صورت موجود نہ ہو، مسلمانوں کا اس کے ساتھ اشتراک بحیثیت مذہب اس کے فروغ کا باعث نہ بنے، نیز مسلمانوں کے قومی اور ملی وقار پر کوئی آنچ نہ آئے تو ایسی جماعت سے بھی سیاسی تعاون عمل کی بدرجۂ مجبوری گنجائش ہوگی، اس کا ماٗخذ وہ آیت کریمہ ہے جس میں اہل کتاب کو مشترکہ بنیادوں پر اتحاد کی دعوت دی گئی ہے:

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" (آل عمران: ۶۴)۔

(اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بنیاد پر جمع ہو جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے)۔

جبکہ ان میں یہود بھی تھے، اور یہود کی اسلام دشمنی پر خود قرآن نے مہر لگادی ہے:

" لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا" (المائدہ: ۸۲)۔

(یقیناً تم کو (عملی زندگی میں) مسلمانوں کے سب سے بدترین دشمن یہود اور مشرکین ملیں گے)۔

اس کے باوجود خود نبی کریم ﷺ نے ان کو میثاق مدینہ میں شامل فرمایا، گوکہ مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کی حیثیت ایک بالادست قوت کی تھی، لیکن کتاب اللہ کے عموم سے حالت مغلوبی میں بھی اس سے استفادہ کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مسلمان مساوی حصہ دار کی حیثیت سے ان کے ساتھ شریک ہوں اور مذکورہ بالا شرائط کی تکمیل ہوتی ہو۔

مذاکرات میں اگر خواتین نمائندے بھی شریک ہوں:

(۸) دوسرے اہل مذاہب سے مذاکرات کے وقت اگر نمائندگی کے لئے خواتین شریک ہوں، یا اسٹیج پر بحیثیت مقرر موجود ہوں، تو مسلمانوں کی مذہبی نمائندگی کرنے والوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے؟ یہ اس دور کا بہت حساس مسئلہ ہے، اس لئے کہ بے پردگی اور صنفی اختلاط کے اس دور میں اکثر اہل مذاہب نے پردہ کو اپنے نظام سے خارج کردیا ہے، یہ مسلمانوں کے لئے بہت آزمائشی مقام ہے، خاص طور پر مذہبی طبقہ کے لئے، اس لئے کہ اس کا ہر عمل مذہب کے آئینے میں دیکھا جائے گا، اور وہ مسلمانوں کے لئے بھی نمونۂ عمل بنے گا اور دوسروں کے لئے بھی مثال،..... اس معاملے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ کم از کم مسلمانوں کو اس معاملے میں سپرانداز نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ قرآن وحدیث اور خیر القرون میں کہیں بے پردہ سیاست یا بے پردہ مذاکرات کی کوئی مثال ہمیں نظر نہیں آتی، یہ موجودہ زمانے کا فتنہ ہے، مذاکرات کی خاطر اسلام کے مذہبی تصورات اور معروف نظریات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، میری رائے میں ایسی مجالس میں مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کو ہرگز شرکت نہیں کرنی چاہئے، اس لئے کہ یہ معصیت کے ساتھ اشتراک ہوگا، اور معصیت والی محفلوں میں مذہبی قائدین کا اختیار ورضا کے ساتھ شریک ہونا مناسب نہیں، اس سلسلے میں بعض آیات واحادیث اور آثار سلف سے استیناس کیا جاسکتا ہے، البتہ علامہ خازنؒ نے آیت استہزاء کے تحت علماء کا فتویٰ

نقل کیا ہے، جس سے مجبوری کی صورت میں منکرات والی مجلسوں میں بادل ناخواستہ شرکت کی گنجائش دی گئی ہے، بشرطیکہ خود کسی منکر کا مرتکب نہ ہو:

''علماء نے کہا ہے کہ جو کفر پر راضی ہو وہ کافر ہے اور جو منکر پر راضی ہو اور ایسے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھے، تو گناہ میں دونوں برابر ہیں، اگرچہ کہ خود گناہ کا ارتکاب نہ کرے، البتہ اگر ان کے اعمال سے راضی نہ ہو اور محض خوف یا کسی اندیشہ کی بنا پر ان کے ساتھ بیٹھ گیا ہو تو معاملہ رضامندی والوں کی بہ نسبت آسان ہے، ایسی حالت میں اہل بدعت یا اہل منکر کے ساتھ بیٹھنا کراہت کے ساتھ درست ہے بشرطیکہ خود منکر کا مرتکب نہ ہو، جبکہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ کسی حال میں ان کے ساتھ نشست جائز نہیں، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے'' (لباب التاویل ۲/ ۱۹۴)۔

لیکن قائدین اور علماء کے لئے قباحت پھر بھی برقرار رہے گی، اس لئے کہ اس سے ساری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے غلط پیغام جائے گا، اس سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا طرز عمل ایک بہترین نمونہ ہے، جس کا تذکرہ ہماری تمام کتب فقہ میں ہے، ہمارے مذہبی طبقے کو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، اس میں بڑے منافع ہیں، علامہ کاسانیؒ وغیرہ کئی فقہاء حنفیہ نے لکھا ہے کہ مجلس خیر (مثلاً ولیمہ، جنازہ وغیرہ) میں بھی اگر شرکی آمیزش ہو جائے تو بڑی شخصیت کو جو اس پر اثر انداز ہو سکتی ہو اس میں اصلاح کے ارادے سے ضرور شرکت کرنی چاہئے، مگر وہ قائدین جو اصلاح کی قدرت نہ رکھتے ہوں ان کا شریک ہونا درست نہیں، البتہ عام لوگ دل کی ناپسندیدگی کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں، مگر شریک نہ ہونا بہتر ہے، اور یہ حکم اس وقت ہے جب پہلے سے معلوم نہ ہو، اگر معلوم ہو تو شرکت نہیں کرنی چاہئے، خاص طور پر علماء اور فقہاء کو بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/ ۱۲۸ طبع بیروت، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۴/ ۱۳)، واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم۔

مختلف مذاہب کے مابین مذاکرات — اصولی وشرعی نقطہ نظر

مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی ☆

الحمدلله رب العلمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على آله و صحبه أجمعين و على من تبعهم إلى يوم الدين۔

۱۔ بین مذہبی مذاکرات کا جواز:

مذاکرہ کا معنی ہے، باہم ذکر کرنا، آپس میں بات چیت کرنا، مباحثہ (فیروز اللغات)، کسی مسئلہ پر بات چیت کرنا (القاموس الوحید)۔

اس کے ہم معنی الفاظ: مکالمہ ومباحثہ، حوار وگفتگو اور جدال ومناظرہ بھی ہیں (مراد وہ مناظرہ نہیں جو موجودہ دور میں معروف ہے جس میں حق پر نظر کئے بغیر محض مخالف پر غالب آنا مقصود ہوتا ہے)، بین مذہبی مذاکرات کا مفہوم ہے: مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا کسی موضوع پر طلب حق یا مفاہمت کے لئے باہم تبادلۂ خیال اور گفتگو کرنا، موجودہ دور جس میں آج کا انسان زندگی بسر کررہا ہے، تہذیب وثقافت اور افکار ونظریات کے اختلاط اور تداخل کا دور ہے، وسائل اعلام اور ذرائع ابلاغ نے وسیع وعریض دنیا کو ایک گاؤں میں سمیٹ دیا ہے، اور ہفت اقالیم میں منتشر انسانی معاشرہ کے مابین حواجز وموانع کو توڑ کر انھیں ایک میز پر کر دیا ہے، کل جو اقوام عالم ایک دوسرے کے احوال سے کبھی برسہا برس تک لاعلم رہا کرتی تھیں آج پلک جھپکتے ایک افق سے دوسرے افق تک کے پیش آئے واقعات وحوادث سے باخبر ہوجاتی ہیں، اور ایک دوسرے کے افکار ونظریات اور تجربات سے مستفید ہوتی ہیں۔

اسلام عالمگیر مذہب ہے اور دعوت وتبلیغ کا مذہب ہے، اس کا پیغام ہے: **"قل يأيها الناس إني رسول الله إليكم جميعا"** (سورۃ الاعراف: ۱۵۸) (آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی جانب اللہ کا رسول ہوں)، اور اس کے نبی کو یہ حکم ہے: **"يأيها الرسول بلغ ما أنزل إليك من ربك، و إن لم تفعل فما بلغت رسالته"** (سورۃ المائدۃ: ۶۸) (اے رسول! جو بھی آپ کے رب کی طرف سے آپ کی جانب اتارا گیا ہے، اسے پہنچائیے، اور اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو آپ نے اس کے پیغام کو نہیں

☆ استاذ جامعہ عربیہ تعلیم الدین مئو۔

پہنچایا)، یہ تعلیم وتعلم اور سیکھنے وسکھانے کا مذہب ہے، جو تعلیم کے فروغ کا حکم کرتا ہے، اور کتمان علم کو جرم اور گناہ قرار دیتا ہے، اس کے نبی کا اپنے متبعین کو حکم ہے: "**بلغوا عنی و لو آیة....**" (مشکاۃ المصابیح بحوالہ بخاری) (میری طرف سے پہنچاؤ، اگرچہ ایک آیت ہی ہو)۔ اس مذہب کے ماننے والے مسلمانوں کے لئے تو یہ ایک بہترین موقع ہے کہ وہ دوسری اقوام اور دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ روابط قائم کریں، ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کریں اور دنیا والوں تک اپنا پیغام پہنچائیں، اپنی تعلیمات سے عالم کو روشناس کرائیں اور دوسروں کے مفید تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

بین مذہبی مذاکرات کی مشروعیت کے دلائل:

(۱) بین مذہبی مذاکرات کی مشروعیت اور اس کے جواز پر قرآن کریم کی یہ آیت صراحۃً دلالت کرتی ہے: "**ادع إلى سبیل ربک بالحکمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتی هی أحسن**" (سورۃ النحل: ۱۲۵) (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلائیے، اور ان سے اس نہج پر جدال کیجئے جو زیادہ اچھا ہو)۔

(۲) تمام انبیاء کرام کی اپنی قوم کو دین کی دعوت اور توحید ورسالت اور بعث وآخرت کے موضوعات پر منکرین ومشرکین سے مباحثہ وگفتگو، سیدنا نوح علیہ السلام کی اپنی قوم سے گفتگو اور ان کا مباحثہ (سورہ ہود، آیات ۲۵ تا ۳۱)، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ اپنے وقت کے ظالم وکافر حکمراں کے ساتھ (سورۃ البقرۃ، ۲۵۸)، ان کی گفتگو اپنے کافر باپ کے ساتھ (سورہ مریم، ۴۲) اور ان کا مباحثہ اپنی قوم کے ساتھ (سورۃ الانبیاء، ۵۱ تا ۷۰)۔

(۳) رسول اللہ ﷺ کا مشرکین مکہ کے ساتھ حوار: "**أن عتبة بن ربیعة، و کان سیداً، قال یوماً و هو جالس فی نادی قریش، و رسول الله ﷺ جالس فی المسجد وحده: یا معشر قریش! ألا أقوم إلى محمد فأکلمه و أعرض علیه أموراً لعله یقبل بعضها فنعطیه أیها شاء....**" (سیرۃ ابن ہشام، ۱/ ۲۹۳، ۲۹۴) (عتبہ بن ربیعہ جو اپنی قوم کا سردار تھا، ایک دن قریش کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، اور رسول اللہ ﷺ بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے تو اس نے کہا: کیا میں محمد ﷺ کے پاس جا کر بات نہ کروں اور ان کے سامنے کچھ تجاویز نہ رکھوں، شاید کہ وہ ان میں سے بعض کو قبول کرلیں، اور جو وہ چاہیں ہم انھیں دیدیں، چنانچہ وہ آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی باتیں رکھیں، اور آپ ﷺ نے اس کے سامنے سورۃ فصلت کی آیات تلاوت کیں، اور اپنی باتیں رکھیں)۔

(۴) آپ ﷺ کا نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مناظرہ جو سورہ آل عمران آیت نمبر: ۵۹، ۶۰، ۶۱ میں موجود ہے۔

(۵) بہت سارے مذہبی امور میں رسول اللہ ﷺ کی یہود مدینہ کے ساتھ گفتگو۔

ان کے علاوہ متعدد دلیلیں ہیں جو دوسرے مذہب والوں کے ساتھ مکالمہ وحوار اور مباحثہ وتبادلۂ خیال کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ B8

سماجی امور میں مذاکرہ کی دلیل:

اس کی دلیل ''سورۃ الکافرون'' کا سبب نزول بھی ہے، جب کفار مکہ نے آپ ﷺ کے سامنے ایک تجویز رکھی، کہ آپ اللہ کی عبادت کے ساتھ کبھی ہمارے دیوی، دیوتاؤں کی بھی عبادت کرلیں، اور ہم بھی اپنے دیوی دیوتاؤں کی عبادت کے ساتھ کبھی آپ کے معبود کی عبادت کرلیں، دین میں مشترک رہیں "**فقالوا یا محمد! هلم فلنعبد ما تعبد، وتعبد ما نعبد، فنشترک نحن وأنت في الأمر**" (سیرت ابن ھشام ۱/۳۶۲)، اس موقع پر سورہ ''الکافرون'' نازل ہوئی، جس میں سب سے پہلے مشرکین کے معبودان باطلہ کی عبادت سے واضح طور پر براءت ولاتعلقی کا اظہار واعلان کیا گیا، اور یہ بھی واضح کردیا گیا کہ اپنے باطل معبودوں کی عبادت کے ساتھ تم میرے معبود ایک اللہ کی عبادت کرنے والے ہو ہی نہیں سکتے، اس لئے کہ مطلوب تو غیروں سے براءت کے ساتھ ایک اللہ کی عبادت ہے، اور دین ومذہب کا مدار شک اور تردد پر نہیں بلکہ پختہ یقین اور قلبی اطمینان پر ہے، البتہ پرامن معاشرت اور باہم زندگی کے لئے ایک صورت یہ ہے کہ "**لکم دینکم ولی دین**" تم اپنے دین پر عمل کرو اس کی جزا تم بھگتو گے، اور ہم کو اپنے دین (اسلام) پر آزادی کے ساتھ عمل کرنے دو، اس میں رکاوٹ نہ ڈالو، اس کا بدلہ ہمیں ملے گا، اس طرح ہر ایک کو اپنے مذہب پر عمل کی آزادی کے ساتھ ایک پرامن معاشرہ قائم ہوگا، اور اختلاف دین کے باوجود سماجی تعلقات قائم رہیں گے، اور اگر مشرکین مکہ نے اس تجویز کو مان لیا ہوتا تو ہجرت کی نوبت ہی نہ آتی، اس سے اس مسئلہ پر استدلال کیا جاسکتا ہے کہ آبادی مخلوط ہو، اور مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کی اجازت ہو اور غیر مسلموں کی طرف سے کوئی رکاوٹ درپیش نہ ہو تو ان کے ساتھ معاشرتی وسماجی زندگی اختیار کی جاسکتی ہے اور اس موضوع پر ان سے بات کی جاسکتی ہے۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں قبائل قریش ایک معاہدہ کے لئے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے "**فتعاقدوا وتعاهدوا علی أن لایجدوا بمکة مظلوماً من أهلها وغیرهم ممن دخلها من سائر الناس إلا قاموا معه وکانوا علی من ظلمه حتی ترد إلیه مظلمته، فسمت قریش ذلک الحلف حلف الفضول**"، اس معاہدہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ بیان محفوظ ہے: "**لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفاً ما أحب أن لي به حمر النعم ولو أدعی به في الإسلام لأجبت**" (سیرت ابن ہشام ۱/۱۳۵) (عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے معاہدہ میں، میں شریک رہا ہوں کہ مجھے اس کے بدلہ میں سرخ اونٹ بھی دیئے جائیں تو (اس کا توڑنا) مجھے پسند نہیں، اور اگر (زمانۂ) اسلام میں بھی مجھے اس کے لئے پکارا جائے تو اس پر لبیک کہونگا)، اس سے بھی اس امر پر استدلال واضح ہے کہ سماجی امور پر بھی بوقت ضرورت دیگر مذاہب والوں سے بات کی جاسکتی ہے، اور کوئی مشترکہ تنظیم قائم کی جاسکتی ہے۔

سیاسی امور میں بھی دیگر مذاہب والوں کے ساتھ بات کی جاسکتی ہے، مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین اور یہود کی بھی آبادی تھی، جو اگرچہ بقول علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ نسلاً یہودی نہیں تھے، بلکہ قبیلہ جذام کے عرب تھے جنھوں نے یہودی

مذہب اختیار کرلیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ بھی ایک معاہدہ کیا تھا، علامہ شبلی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہوجائیں، آپ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا، یہ معاہدہ ابن ھشام میں پورا مذکور ہے (سیرت النبی ﷺ ۱/ ۱۹۵، نیز دیکھئے: سیرت ابن ہشام)۔

نیز مشرکین مکہ کے ساتھ صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی اس کی دلیل ہے جو مشرکین مکہ کے متعدد نمائندوں، مکرز بن حفص، حلیس بن علقمہ، عروۃ بن مسعود اور اخیر میں سہیل بن عمرو سے گفتگو اور بحث ومباحثہ کے بعد ظہور میں آیا، اور جس کا سیاسی فائدہ فتح مکہ، شاہان عالم کو دین کی دعوت، اور قبائل عرب کی اسلام کی طرف رغبت اور دیگر بہت ساری صورتوں میں سامنے آیا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**لقد رضی اللہ عن المؤمنین إذ یبایعونک تحت الشجرۃ، فعلم ما فی قلوبھم، فأنزل السکینۃ علیھم و أثابھم فتحا قریبا★ و مغانم کثیرۃ یأخذونھا و کان اللہ عزیزاً حکیماً**'' (سورہ فتح: ۱۸، ۱۹) (اللہ مومنین سے راضی ہوگیا، جب کہ وہ درخت کے نیچے آپ سے عہد کر رہے تھے، تو اللہ نے جان لیا جو ان کے دلوں میں تھا، تو اتارا ان پر سکینت کو اور ان کو بدلہ دیا فتح قریب کا، اور بہت ساری غنیمتوں کا جس کو وہ حاصل کریں گے، اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے)، ''**یقول الزھری: فما فتح فی الإسلام فتح قبلہ کان أعظم منہ**''، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اسلام میں اس سے پہلے کوئی فتح نہیں ہے جو اس سے بڑی رہی ہو، ابن ہشام رحمہ اللہ، امام زہری رحمہ اللہ کے مذکورہ قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''امام زہری رحمہ اللہ کے قول پر دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ حدیبیہ کی جانب جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق چودہ سو افراد کے ساتھ گئے تھے، پھر اس کے دو سال بعد فتح مکہ کے موقع سے دس ہزار صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے'' (سیرۃ ابن ہشام ۳/ ۳۲۲)۔

۲۔ دوسرے مذاہب کی کتابوں کا حوالہ:

مختلف مذاہب کے درمیان بہت سی تعلیمات میں اشتراک پایا جاتا ہے، یعنی وہ باتیں اسلامی شریعت میں بھی موجود ہیں تو باہمی مذاکرات میں خود صاحب مذہب مخاطب کو قائل کرنے اور اتمام حجت کے لئے بوقت ضرورت اس کے مذہب کی کتاب کا حوالہ بلا شبہ دیا جاسکتا ہے، قرآن کریم میں سابقہ شرائع کی بعض تعلیمات و امور کا ذکر کیا گیا ہے، اور سابقہ شرائع کے بعض احکام کو اِس شریعت میں بھی باقی رکھا گیا ہے، جیسے محصن زانی کے رجم کا حکم ہے، کتب حدیث میں مذکور ہے: ''**إن الیھود جاءوا إلی رسول اللہ ﷺ فذکروا لہ أن رجلا منھم و امرأۃ زنیا، فقال لھم رسول اللہ ﷺ ما تجدون فی التوراۃ فی شأن الرجم؟ فقالوا نفضحھم و یجلدون، قال عبد اللہ بن سلام کذبتم إن فیھا الرجم....**'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ۱۲/ ۱۶۶، کتاب الحدود، باب: ۳۷، احکام اہل الذمہ، حدیث: ۶۸۴۱) (رسول اللہ ﷺ کے پاس یہود آئے، اور انھوں تذکرہ کیا کہ ان کے ایک مرد اور عورت نے زنا کرلیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ رجم کے بارے میں توریت میں کیا پاتے ہو، ان لوگوں نے

کہا کہ ہم انھیں رسوا کرتے ہیں، اور وہ کوڑے مارے جاتے ہیں، عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے جھوٹ کہا، اس میں رجم موجود ہے ....)۔

البتہ دیگر مذاہب کی تعلیمات کو باہمی مذاکرات میں تائید وتحسین اور استعجاب واستحسان کے طور پر ذکر کرنا مناسب نہیں، رسول اللہ ﷺ نے بھی اسے پسند نہیں فرمایا، اور صحابۂ کرام نے بھی اسے گوارا نہیں کیا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: **"أن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه أتی رسول الله ﷺ بنسخة من التوراة فقال یا رسول الله هذه نسخة من التوراة، فسکت، فجعل یقرأ ووجه رسول الله ﷺ یتغیر، فقال أبو بکر رضی اللہ عنه :ثکلتک الثواکل، ما تری ما بوجه رسول الله ﷺ، فنظر عمر إلی وجه رسول الله ﷺ فقال :أعوذ بالله من غضب الله وغضب رسوله، رضینا بالله ربا وبالإسلام دینا وبمحمد نبیا، فقال رسول الله ﷺ: والذی نفس محمد بیده لو بدا لکم موسیٰ فاتبعتموه وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل، ولو کان حیًا وأدرک نبوتی لاتبعنی"** (رواہ الدارمی، مشکاۃ المصابیح ۳۲) (حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ توریت کی ایک نقل لیکر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول، یہ توریت کی ایک نقل ہے، آپ ﷺ خاموش رہے، تو عمر رضی اللہ عنہ اسے پڑھنے لگے اور رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور بدلنے لگا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: رونے والیاں تم پر روئیں (یعنی تمھاری ہلاکت ہو)، رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کی طرف نہیں دیکھتے؟ عمر رضی اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے روئے مبارک کی طرف دیکھا تو بول پڑے: میں اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، ہم سب اللہ سے راضی ہیں رب ہونے پر، اور اسلام سے دین ہونے پر، اور محمد ﷺ سے نبی ہونے پر، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر موسیٰ تمھارے لئے ظاہر ہوجائیں اور تم ان کی اتباع کر بیٹھو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھے راستہ سے بہک جاؤگے، اور اگر وہ زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پاتے تو میری اتباع کرتے)، اور ایک روایت میں مذکور ہے: **"عن جابر عن النبی ﷺ حین أتاه عمر فقال إنا نسمع أحادیث من یهود تعجبنا، أفتری أن نکتب بعضها؟ فقال أمتهوکون أنتم کما تهوکت الیهود والنصاری، لقد جئتکم بها بیضاء نقیة، ولو کان موسیٰ حیا، ما وسعه إلا اتباعی"** (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان، مشکاۃ المصابیح ۳۰) (حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے نبی ﷺ سے جب کہ عمر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم یہود سے کچھ باتیں سنتے ہیں جو ہمیں اچھی لگتی ہیں، کیا ہم ان میں سے کچھ لکھ لیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ متردد و پریشان ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ حیرت وتردد میں رہے، میں تمھارے پاس اس شریعت کو بالکل واضح اور صاف ستھری لایا ہوں، اور اگر موسیٰ علیہ السلام باحیات ہوتے تو ان کے لئے میری اتباع کے سوا گنجائش نہ ہوتی)۔

لہذا ان کو خوش کرنے کے لئے، ان کی تالیف قلب کے لئے یا بطور استحسان واستعجاب، دیگر مذاہب کی ان تعلیمات کا ذکر مناسب نہیں جن کی تصدیق اسلامی شریعت سے نہ ہوتی ہو۔

۳۔ دیگر مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں شرکت:

دیگر مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال، عموماً ان کی مذہبی مناسبات سے متعلق ہوتے ہیں اوران کے مشرکانہ وکفریہ عقائد سے جڑے ہوتے ہیں، اس لئے ان میں شرکت جائز نہیں، بھائی چارہ اورانسانی خدمت کے پہلو سے بھی اس میں شرکت کی اجازت دینے کا سب سے سنگین خطرہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ مرور ایام کے ساتھ وہ رسوم واعمال اسلامی معاشرہ کا ایک حصہ بن جائیں گے، اوران کے اندرغیر مذہب کے رسوم واعمال کا پہلومغلوب ہوجائے گا، جیسا کہ بہت سی غیر شرعی رسمیں مسلم معاشرہ میں محض مخلوط آبادی کی وجہ سے رائج ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے اوران کی مخالفت کا حکم دیا ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے: **"من تشبه بقوم فهو منهم"** (سنن ابوداؤد، ۴/ ۴۴، کتاب اللباس، باب فی لبس الشہرۃ، حدیث: ۴۰۳۱) (جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ اسی قوم سے ہے)، مصنف ابن ابی شیبہ میں اس اضافہ کے ساتھ منقول ہے: **"إن الله جعل رزقي تحت رمحي و جعل الذلة و الصغار على من خالف أمري، من تشبه بقوم فهو منهم"** (مصنف ابن ابی شیبۃ، ۴/ ۲۱۷، حدیث: ۳۳۰۱۶) (اللہ نے میرا رزق میرے نیزہ کے نیچے رکھا ہے اورجس نے میرے امر کی مخالفت کی اس پر ذلت ورسوائی کو مسلط کردیا ہے، جس نے کسی قوم کی مشابہت اپنائی، وہ انھیں میں سے ہے)، اورامام ترمذی علیہ الرحمۃ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے: **"ليس منا من تشبه بغيرنا، لا تشبهوا باليهود ولا بالنصارى، فإن تسليم اليهود الإشارة بالأصابع، وتسليم النصارى الإشارة بالأكف"** (سنن الترمذی ۵/ ۵۶، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی کراہیۃ اشارۃ الید بالسلام، حدیث: ۲۶۹۵) (جس نے ہمارے غیر کی مشابہت اختیار کی وہ ہم میں سے نہیں ہے، یہود ونصاری کی مشابہت مت اختیار کرو، اس لئے کہ یہود کا سلام کرنا انگلیوں کے اشارہ سے ہے اور نصاری کا سلام، ہتھیلیوں کے اشارہ سے ہے)، اوراس سے مراد یہ ہے کہ سلام کے الفاظ زبان سے کہے بغیر محض اشارہ پر اکتفا کرنا ان کی مشابہت ہے، اور بوقت ضرورت ہاتھ کے اشارہ سے اپنے سلام کرنے کی اطلاع دینا جائز ہے (فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۱۷)، نیز آپ ﷺ نے بعض دیگر امور صوم یوم عاشوراء، صلاۃ فی النعال میں بھی یہود ونصاری کی مخالفت کا حکم دیا ہے (سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ وکتاب الصوم)، نیز مجوس ومشرکین کی مخالفت کا بھی حکم دیا ہے: مثلاً **"خالفوا المشركين، ووفروا اللحى وأحفوا الشوارب"** (صحیح بخاری مع الفتح ۱۰/ ۳۴۹، کتاب اللباس، باب تقلیم الاظفار، حدیث: ۵۸۹۲)، اور مسلم کی روایت میں ہے: **"جزوا الشوارب وأرخوا اللحى، خالفوا المجوس"** (صحیح مسلم مع شرح النووی ۳/ ۱۴۷، باب خصال الفطرۃ)۔

علامہ ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ نے اس موضوع پر بہت تفصیل سے لکھا ہے، ایک مقام پر لکھتے ہیں: **"فجميع الأدلة الدالة من الكتاب والسنة والإجماع على قبح البدع وكراهتها تحريما أو تنزيها: تندرج هذه المشابهات فيها، فيجتمع فيها**

أنها بدعة محدثة، و مشابهة للكافرين و كل واحد من الوصفين يوجب النهى، إذ المشابهة منهى عنها فى الجملة ولو كانت فى السلف، و البدعة منهى عنها ولو لم يفعلها الكفار، فإذا اجتمع الوصفان صارا علتين مستقلتين فى القبح والنهى" (اقتضاء الصراط المستقیم/۱۸۰) (بدعات کی قباحت اوراس کی تحریمی یا تنزیہی کراہت پر، کتاب وسنت اوراجماع سے دلالت کرنے والے تمام دلائل میں یہ مشابہات داخل ہیں توجمع ہوجاتی ہیں اس میں (یعنی کفار کے تیوہار یا زیر بحث مذہبی رسوم واعمال میں)، ایک تو یہ کہ وہ بدعت محدثہ ہیں، دوسری یہ کہ کفار کی مشابہت ہے، اوران دونوں اوصاف میں سے ہر ایک نہی کو واجب کرتا ہے، اس لئے کہ فی الجملہ مشابہت سے روکا گیا ہے، اگرچہ ماضی میں رہی ہو، اور فی الجملہ بدعت سے بھی روکا گیا ہے اگرچہ کفار نے اسے نہ کیا ہو، لہذا جب دونوں وصف جمع ہوگئے تو قباحت اور نہی دو مستقل علت ہوگئے)۔

پھر انھوں نے کتاب وسنت اوراجماع سے اس کے ممنوع ہونے کی متعدد دلیلیں ذکر کی ہیں، اجماع سے ایک دلیل اس طور پر نقل کیا ہے: "**أحدها: ما قدمت التنبيه عليه من أن اليهود و النصارى و المجوس ما زالوا فى أمصار المسلمين بالجزية يفعلون أعيادهم التى لهم، و المقتضى لبعض ما يفعلونه قائم فى كثير من النفوس، ثم لم يكن على عهد السلف من المسلمين من يشركهم فى شئ من ذلک....**" (ایضاً/۱۹۸) (اس میں سے ایک یہ ہے جس پر میں پہلے متنبہ کر چکا ہوں کہ یہود ونصاریٰ اور مجوس، ہمیشہ مسلم شہروں میں جزیہ کے ساتھ رہے ہیں، اوران کے جو تیوہار ہیں مناتے رہے ہیں اور بعض وہ اعمال جسے وہ کرتے رہے ہیں اس کا تقاضا بہت سے نفوس میں رہا ہے اس کے باوجود عہد سلف میں مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا جو اسمیں سے کسی میں بھی شریک ہوتا ہو)، اس لئے دیگر مذاہب کے کسی بھی مذہبی رسوم واعمال میں اگرچہ انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے ہو، یا خوشگوار تعلقات کی غرض سے ہو شرکت جائز نہیں، یہ تعاون علی الاثم کی قبیل سے ہوگا۔

۴۔غیر مذہبی رسوم واعمال کا ترک :

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: "**ألم ترى أن قومک حين بنوا الكعبة اقتصروا عن قواعد إبراهيم عليه السلام، فقلت يا رسول الله ألا تردها على قواعد إبراهيم عليه السلام؟ قال: لو لا حدثان قومک بالكفر**" (آپ دیکھتی نہیں؟ آپ کی قوم نے جب کعبہ کی تعمیر کیا تو ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں سے کچھ کم کر دیا، فرماتی ہیں کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ، کیا آپ اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر نہیں لوٹائیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر آپ کی قوم زمانۂ کفر سے قریب نہ ہوتی) (سنن النسائی ۵/ ۲۱۴)۔

۵۔سلیقۂ تنقید:

رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں، اورآپ کی رسالت تمام عالم کے لئے ہے اور قیامت تک کے لئے ہے، اس لئے اس دین اسلام میں تبلیغ ودعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کی بڑی اہمیت ہے، اللہ تعالی نے اس امت کے

بارے میں ارشاد فرمایا ہے: ''کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتؤمنون باللہ'' (سورہ آل عمران، ۱۱۰)، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''بلغوا عني ولو آية'' (مشکاۃ المصابیح ۲/۳۲، بحوالہ صحیح بخاری، سنن الترمذی، کتاب العلم، حدیث: ۲۶۶۹) (میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہی ہو)، نیز ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے: ''الجهاد ماض منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال، لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل'' (سنن ابوداؤد ۳/۱۸، کتاب الجهاد، باب الغزو مع ائمۃ الجور، حدیث: ۲۵۳۲) (جہاد جاری رہنے والا ہے جب سے مجھے اللہ نے مبعوث فرمایا ہے یہاں تک کہ قتال کرے گا میری امت کا آخری فرد دجال سے، نہ اس کو ظالم کا ظلم باطل کرے گا، نہ عادل کا انصاف)، لہذا اس دین کی صداقت وحقانیت کو بیان کرنا، اسے غیروں تک پہنچانا، مسلمانوں کا فریضہ ہے، اور اس مقصد کیلئے مختلف وسائل ہیں، باہمی گفتگو ومذاکرہ، بحث ومناظرہ، جدال وجہاد فی سبیل اللہ، اور ان سب وسائل کے استعمال میں حد سے تجاوز، ظلم وتعدی، جبر واکراہ اور ناحق دل آزاری سے بچتے ہوئے، انسانیت کا احترام کرتے ہوئے، اسلام کی حقانیت اور دیگر مذاہب کے بطلان کو اجاگر کرنا ہے، لہذا دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مکالمہ ومذاکرہ اور مباحثہ ومناظرہ میں درج ذیل اصول کی رعایت ملحوظ ہوگی۔

۱۔ بدزبانی اور سب وشتم سے اجتناب:

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: ''ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدواً بغير علم، كذلك زينا لكل أمة عملهم ثم إلى ربهم مرجعهم فينبئهم بما كانو يعملون'' (سورۃ الانعام: ۱۰۸) (اور یہ کفار اللہ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہیں تم ان کو گالیاں مت دو کہ وہ نادانی میں آگے بڑھ کر اللہ کو گالیاں دینے لگیں، ہم نے ایسے ہی ہر امت اور گروہ کے لئے ان کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے، پھر انھیں اپنے رب کی طرف ہی پلٹنا ہے، تو وہ انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں)، اس آیت کے تحت امام قرطبی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''قال العلماء حكمها باق في هذه الأمة على كل حال، فمتى كان الكافر في منعة وخيف أن يسب الإسلام أو النبي عليه السلام أو الله عز و جل فلا يحل لمسلم أن يسب صلبانهم و لا دينهم و لا كنائسهم، و لا يتعرض إلى ما يؤدي إلى ذلك لأنه بمنزلة البعث على المعصية'' (تفسیر قرطبی ۷/۶۱) (علماء نے کہا ہے کہ اس کا حکم اس امت میں ہر حال میں باقی ہے، لہذا جب کافر طاقت میں ہوں اور اس کا خوف ہو کہ وہ اسلام کو برا کہیں گے، یا نبی علیہ السلام کی شان میں گستاخی کریں گے یا اللہ کو گالی دیں گے تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کی صلیبوں کو یا انکے گرجا گھر کو یا ان کے دین کو گالی دے، اور نہ یہ جائز ہے کہ ایسے کسی بھی امر سے تعرض کرے جو ان مفاسد کا باعث ہو، کیونکہ یہ معصیت پر ابھارنے کے درجہ میں ہے)، نیز لکھتے ہیں: ''في هذه الآية أيضاً ضرب من الموادعة، و دليل على وجوب الحكم بسد الذرائع، وفيها دليل على أن المحق قد يكف عن حق له إذا أدى إلى ضرر يكون في الدين'' (ایضا)، (نیز اس آیت میں ایک قسم کی مصالحت ہے، ذرائع کو بند کرنے کے وجوب کے حکم پر دلیل ہے، اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ صاحب حق بعض احوال میں اپنے حق سے باز رہے، جبکہ اس کا طلب کرنا دین میں کسی ضرر کا باعث ہو)۔

لہذا کسی بھی دوسرے مذہب یا فرقہ پر سنجیدہ اور مہذب الفاظ میں ہی نقد کیا جائے گا جو اس کے لئے زیر بحث موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کا باعث بنے، کرخت لہجہ، سخت الفاظ اور طنز واستہزاء، بجائے غور وفکر اور قبولیت کے، تنفر، بغض اور بعد کا سبب بنیں گے۔

۲۔نرم کلامی:

مخاطب کے ساتھ نرم کلامی سے پیش آنا، اس لئے کہ بسا اوقات نرم کلامی مضبوط دلائل سے بھی زیادہ کارگر ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالی نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون علیہما السلام کو اپنے وقت کے سرکش وجابر حکمراں، فرعون کے پاس بھیجتے وقت اس کی خاص طور سے نصیحت فرمائی :"اذهبا إلى فرعون إنه طغى، فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشى" (سورۃ طہ: ۴۳، ۴۴) (فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے، اور اس سے نرم بات کہنا، تاکہ وہ نصیحت قبول کرے یا خوف کھائے)، اس آیت کے تحت امام قرطبی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:"فإذا كان موسىٰ أمر بأن يقول لفرعون قولا لينا، فمن دونه أحرى بأن يقتدى بذلك في خطابه، وأمره بالمعروف في كلامه، وقد قال الله تعالى:"وقولوا للناس حسنا"(تفسیر قرطبی ۱۱/ ۲۰۰) (تو جب موسی علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ فرعون سے نرم بات کریں تو جو ان سے ادنی ہیں وہ زیادہ لائق ہیں کہ اپنے خطاب میں اور معروف کا حکم کرنے میں اپنے کلام میں اس کی اقتدا کریں، اور اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے لوگوں سے اچھی بات کہو)، نیز لکھتے ہیں"وحينئذ يحصل الآمر أو الناهي على مرغوبه، ويظفر بمطلوبه"(اور تب حکم کرنے والا اور نہی کرنے والا اپنے مقصد کو حاصل کر پائے گا، اور اپنے مطلب میں کامیاب ہوگا)۔

رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:"إن الله رفيق، يحب الرفق، ويعطي على الرفق ما لا يعطي على العنف، وما لا يعطي على ما سواه"(اللہ نرم ہیں اور نرمی کو پسند کرتے ہیں، اور نرمی پر وہ عطا فرماتے ہیں جو سختی پر نہیں دیتے، اور جو اس کے علاوہ پر نہیں دیتے)، نیز آپ ﷺ نے فرمایا :"إن الرفق لا يكون في شئ إلا زانه ولا ينزع من شئ إلا شانه"(صحیح مسلم مع شرح النووی ۱۶/ ۱۴۶، کتاب البر والصلۃ) (نرمی نہیں ہوتی کسی شئے میں مگر اس میں زینت پیدا کرتی ہے، اور نہیں سلب کی جاتی کسی بھی شئے سے مگر اسے عیب دار بنا دیتی ہے)، اس کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:"قال القاضي: معناه يتأتى به من الأغراض ويسهل من المطالب ما لا يتأتى بغيره"(ایضاً ص ۱۴۵) (قاضی عیاض نے کہا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اغراض حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ مقاصد آسان ہو جاتے ہیں جو اس کے علاوہ سے حاصل نہیں ہوتے)۔

۳۔حکمت اور موعظۂ حسنہ:

اسی طرح دیگر مذاہب پر نقد اور ان کے عیوب کو ظاہر کرنے میں حکمت اور حسن سلیقہ کا لحاظ بھی ضروری ہے، جس سے

مخاطب کو یہ محسوس ہو کہ یہ تنقید نہیں بلکہ میری خیر خواہی کررہا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:"ادع إلى سبيل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتي هي أحسن إن ربك هو أعلم بمن ضل عن سبيله وهو أعلم بالمهتدين" (سورۃ النحل:۱۲۵) (حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ اپنے رب کے راستہ کی طرف بلائیے، اوران سے اس طرز پر جدال وبحث کیجئے جوزیادہ اچھا ہو، آپ کا رب ہی جانتا ہے اس کو جواس کے راستہ سے گمراہ ہے، اور وہی جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو)، اس آیت کے تحت امام قرطبی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں :

"اور اللہ تعالی نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی طرف ملاطفت اور نرمی سے بلائیں نہ کہ روکھے پن اور سختی کے ساتھ، اور چاہئے کہ مسلمانوں کو اسی طور پر تا قیامت نصیحت کی جائے، چنانچہ یہ اہل توحید عاصیوں کے بارے میں محکم ہے، اور کفار کے حق میں آیت قتال کے ذریعہ منسوخ ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کفار کے ساتھ ایسے احوال پیش آجائیں اور بغیر قتال کے ان کے ایمان کی امید ہو تو ان کے حق میں بھی محکم ہے" (تفسیر قرطبی ۱۰/۲۰۰)۔

اور ظاہر ہے کہ عصر حاضر کے احوال میں یہی مناسب ہے کہ حکمت عملی، نرمی و ملاطفت اور حسن تدبیر کے ساتھ باہمی مذاکرہ اور بات چیت کے ذریعہ ہی دین کی باتیں اغیار کے سامنے رکھی جائیں، نیز اللہ تعالی کا یہ بھی ارشاد ہے:"ولا تستوى الحسنة ولا السيئة ادفع بالتي هي أحسن فإذا الذي بينك و بينه عداوة كأنه ولي حميم" (سورۃ فصلت:۳۴) (اچھائی اور برائی یکساں نہیں ہوتیں، آپ برائی کو اس سے دور کیجئے جو اس سے اچھی ہو، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شخص جس کے اور آپ کے درمیان عداوت ہے وہ جگری دوست ہوگا)، اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے متنبہ کیا ہے کہ اچھائی غالب رہتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن گہرا دوست ہوجاتا ہے، حسنہ اور سیئۃ کے بارے میں متعدد اقوال ہیں، مثلاً حسنہ سے مراد مدارا ۃ اور سیئہ سے مراد سختی ہے، اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:"أي ادفع بحلمك جهل من يجهل عليك" (دیکھئے تفسیر قرطبی ۱۵/۳۶۱) (جو آپ کے ساتھ نادانی کرے، آپ اس کی نادانی کو اپنی بردباری اور ضبط وبرداشت کے ذریعہ ختم کیجئے)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ باہمی مذاکرہ یا دیگر مذاہب پر نقد میں متانت وسنجیدگی، خوش کلامی، ضبط وتحمل، لہجہ کی استواری اور حسن ادائیگی کے ساتھ اپنی بہتر تہذیب وثقافت اور اخلاق کی عمدگی کا مظاہرہ کرنا چاہئے، خاص طور سے ایسے ماحول میں جبکہ منصوبہ کے تحت مسلمانوں کو غیر مہذب، سریع الغضب، ناشائستہ قوم باور کرانے کی کوششیں عمل پیرا ہیں۔

۶۔مشترک سماجی مسائل کے لئے دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اتحاد:

مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی کو دور کرنے اور عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ کو روکنے کیلئے، نیز باہمی تعاون، ہمدردی، اخوت وبھائی چارگی اور معاشرہ میں اچھائی کو عام کرنے کے لئے مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:"وتعاونوا على البر و التقوى ولا تعاونوا على

الإثم و العدوان، و اتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب‘‘ (سورۃ المائدۃ: ۲) (اور نیکی اور تقوی پر ایک دوسرے کا تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کا ساتھ مت دو، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ سخت گرفت والا ہے)، اس آیت کے تحت امام قرطبی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ’’وھو أمر لجمیع الخلق بالتعاون علی البر و التقوی، أی لیعن بعضکم بعضا، و تحاثوا علی ما أمر اللہ تعالی و اعملوا بہ، و انتھوا عما نھی اللہ عنہ و امتنعوا امنہ‘‘ (تفسیر قرطبی ۶/۴۶) (اور یہ تمام مخلوق کو حکم ہے باہم تعاون کرنے کا نیکی اور تقوی پر، یعنی چاہئے کہ بعض، بعض کی مدد کریں، اور ابھارو ایک دوسرے کو اس پر جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور اس پر عمل کرو، اور اس سے باز آجاؤ جس سے اللہ نے منع کیا ہے)۔

اور صاحب تفسیر منار اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: ’’و قلما تری أحدا فی ھذا العصر یعینک علی عمل من البر ما لم یکن مرتبطا معک فی جمعیۃ الفت لعمل معین‘‘ (اور اس زمانہ میں بہت کم کسی کو پاؤ گے کہ وہ کسی خیر کے کام پر تمھاری مدد کرے، جب تک وہ تمھارے ساتھ کسی جمعیت یا تنظیم میں کسی معین کام پر جڑا نہ ہو)، نیز لکھتے ہیں: ’’فالذی یظھر أن تالیف الجمعیات فی ھذا العصر مما یتوقف علیہ امتثال ھذا الأمر و إقامۃ ھذا الواجب‘‘ (تفسیر المنار، سورۃ المائدۃ) (لہذا ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جمعیات کی تنظیم اور ان کا ایک دوسرے سے مربوط ہونا ان امور میں سے ہے جن پر اس امر کا بجالانا اور اس واجب کا قائم کرنا موقوف ہے)، صاحب منار کے کلام سے ظاہر یہ ہے کہ انھوں نے یہ بات مسلم جمعیات کے بارے میں کہی ہے، لیکن معاشرہ میں انصاف کے قیام اور دفع ظلم کے لئے مخلوط و مشترک آبادی میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ ان امور پر باہم معاہدہ اور گفتگو یا ان سے تعاون لینا یا کرنا، مستحسن اور مفید ہوگا۔

زمانۂ جاہلیت میں قبائل قریش ایک معاہدہ کے لئے عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے: ’’فتعاقدوا و تعاھدوا علی أن لا یجدوا بمکۃ مظلوما من أھلھا و غیرھم ممن دخلھا من سائر الناس إلا قاموا معہ و کانوا علی من ظلمہ حتی ترد إلیہ مظلمتہ، فسمت قریش ذلک الحلف حلف الفضول‘‘ (اور باہم اس بات پر عقد و معاہدہ کیا، کہ نہیں پائیں گے مکہ میں کسی بھی مظلوم کو، اہل مکہ سے ہو یا ان کے علاوہ عام لوگوں سے جو مکہ آیا ہو، مگر اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے اور جس نے بھی اس پر ظلم کیا ہوگا اس کے سر پر سوار رہیں گے یہاں تک کہ وہ اس کا حق ادا کردے، اور قریش نے اس معاہدہ کو حلف الفضول نام دیا)، اس معاہدہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ بیان محفوظ ہے: ’’لقد شھدت فی دار عبد اللہ بن جدعان حلفاً ما أحب أن لی بہ حمر النعم و لو أدعی بہ فی الإسلام لأجبت‘‘ (سیرت ابن ہشام ۱/۱۳۵) (عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے معاہدہ میں ، میں شریک رہا ہوں کہ مجھے اس کے بدلہ میں سرخ اونٹ بھی دیئے جائیں تو (اس کا توڑنا) مجھے پسند نہیں، اور اگر (زمانۂ) اسلام میں بھی مجھے اس کے لئے پکارا جائے تو اس پر لبیک کہونگا)۔

مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد آپ ﷺ کا یہود مدینہ کے ساتھ معاہدہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مشترک سماجی مسائل پر گفتگو کی جاسکتی ہے، اور ان کے ساتھ خیر کے امور پر معاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ سیاست میں حصہ داری:

جمہوری ممالک کے اندر سیاست میں حصہ داری کے لئے کسی سیاسی جماعت کے ساتھ مذاکرات اور گفت وشنید کی جاسکتی ہے، جیسا کہ سماجی امور میں دیگر مذاہب (جن کے عقائد ہی اسلام مخالف ہوتے ہیں) کے لوگوں سے مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، مذاکرات کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اختلافات کے باوجود کسی نقطہ پر اتفاق ہوجائے، لہذا حتی الامکان تو ایسی جماعتیں جن کے نصب العین میں ہی اسلام مخالف باتیں موجود ہیں ان سے اعراض واحتراز کیا جائے گا، اور مسلمانوں کے مفاد میں ایسی جماعتوں سے گفت وشنید کی ضرورت پیش آہی جائے تو اپنے مذہبی اور دینی تشخص میں کسی دباؤ کو قبول کرنا جائز نہ ہوگا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار ومالكم من دون الله أولياء ثم لا تنصرون'' (سورۃ ھود: ۱۱۳) (اور نہ اعتماد کرو (نہ مائل ہو) ان لوگوں کی طرف جنھوں نے ظلم کیا، کہ جلائے تم کو آگ اور نہ ہو تمھارے لئے کوئی مددگار، پھر تم مدد ہی نہ کئے جاؤ)، اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''الركون حقيقة الاستناد والاعتماد والسكون إلى الشئ والرضا به'' (تفسیر قرطبی ۹/ ۱۰۸) (رکون کی حقیقت اعتماد کرنا اور سہارا لینا ہے، اور کسی چیز پر اطمئنان کرنا اور اس سے راضی ہونا ہے)، اور اگر مذاکرات کا نتیجہ ایسے مفاد پر مشتمل ہو جس میں کوئی مذہبی ودینی نقصان نہ ہو تو ان سے حوار وگفتگو اور مذاکرہ ومکالمہ جائز ہوگا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله إنه هو السميع العليم'' (سورۃ الانفال: ۶۱) (اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہوجائیں، اور اللہ پر بھروسہ کیجئے، بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے)۔

امام ابوبکر جصاص علیہ الرحمۃ اس آیت کے منسوخ یا محکم ہونے سے متعلق علماء کے اقوال نقل کرنے، اور اپنا یہ محاکمہ کہ اگر مسلمان غلبہ اور قوت میں ہوں تو کفار سے مصالحت کی گفتگو مناسب نہیں اور اگر قلت اور ضعف میں ہوں تو ان سے مصالحت کی بات کی جاسکتی ہے، پھر اس کی چند مثالیں دینے کے بعد لکھتے ہیں: ''فهذه أحكام، بعضها ثابت بالقرآن وبعضها بالسنة، وهي مستعملة في الأحوال التي أمر الله تعالى بها، واستعملها النبي صلى الله عليه وآله وسلم فيها'' (احکام القرآن للجصاص ۴/ ۲۵۴، ۲۵۵) (تو یہ چند احکام ہیں، جن کے بعض قرآن سے ثابت ہیں اور بعض سنت سے، اور یہ قابل عمل ہیں ان احوال میں جن میں اللہ نے ان کا حکم دیا ہے، اور جن احوال میں اللہ کے رسول نے ان پر عمل کیا ہے)، اور اس آیت کے تحت امام قرطبی علیہ الرحمہ نے بھی تفصیل ذکر کرنے کے بعد ابن العربی علیہ الرحمہ کا قول نقل کیا ہے: ''وإن كان للمسلمين مصلحة في الصلح لنفع يجتلبونه، أو ضرر يدفعونه فلا بأس أن يبتدئ المسلمون به إذا احتاجوا إليه'' (تفسیر قرطبی ۸/ ۴۰) (اور اگر صلح میں مسلمانوں کی کوئی مصلحت ہو، کسی نفع کے لئے جسے وہ حاصل کرسکیں یا کسی ضرر کی وجہ سے جسے وہ دور کرسکیں، تو کوئی حرج نہیں ہے کہ مسلمان صلح کا اقدام کریں جبکہ وہ اس کے ضرورتمند ہوں)۔

۸۔ بے پردہ غیر مسلم عورتوں کے ساتھ پروگرام میں شرکت:

بین مذہبی مذاکرات کی مجالس یا پروگرام میں غیر مسلم خواتین بھی شریک ہوں تو مومنین کو جو قرآن کریم کا حکم ہے غض بصر

کا، ایک مسلمان اس مجلس میں بھی اس کا مکلف ہوگا، حتی الوسع ان کی طرف دیکھنے سے پرہیز کرے گا، "**قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم و يحفظوا فروجهم ذلك أزكى لهم إن الله خبير بما يصنعون**" (سورۃ النور: ۳۰) (مومنین سے کہئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ ہے، بلا شبہ جو وہ کرتے ہیں اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے)، اور چونکہ اجنبیہ عورت کے چہرہ اور ہتھیلی پر نظر مباح ہے، "اور اجنبی خواتین کی طرف نظر ڈالنا، تو ہم کہیں گے کہ جائز ہوگا دیکھنا ان کی ظاہری زینت کے مواضع کی جانب، اور یہ مواضع چہرہ اور ہتھیلی ہیں ظاہر روایت میں، ایسا ہی ذخیرہ میں ہے ....اور یہ سب جبکہ شہوت کے ساتھ نظر نہ ہو، ایسا ہی محیط میں ہے ....اور اگر عورت کے اوپر کپڑا ہو تو اس کے بدن کی جانب نظر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ دیکھنا اس کے کپڑے کی طرف ہوا، نہ کہ اس کے جسم کی جانب، تو یہ ایسے ہی ہے کہ عورت گھر کے اندر ہو اور اس نے اس کی دیوار کی جانب دیکھا، یہ اس صورت میں ہے جبکہ کپڑے اس کے بدن سے اس طور پر چپکے ہوئے اور تنگ نہ ہوں کہ اپنے ماتحت (اعضاء عورت کی ساخت کی) ترجمانی کریں....اور کافر عورت، مسلم عورت کی طرح ہے، اور یہ بھی روایت ہے کہ کافرہ عورت کے بال کی طرف نظر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں" (الفتاوی الہندیہ ۳۲۹/۵، البحر الرائق ۳۵۱/۸، ۳۵۲)۔

درمختار میں ہے: "(**والقدمين) على المعتمد و صوتها على الراجح**" اور دونوں قدم عورت نہیں ہیں معتمد قول کے مطابق اور اس کی آواز راجح قول کے مطابق، (۷۸/۲) اس کے تحت علامہ شامی علیہ الرحمہ نے ابو العباس القرطبی علیہ الرحمہ کا قول نقل کیا ہے: "اور کوئی ناسمجھ یہ گمان نہ کرے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خاتون کی آواز عورت ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس سے کلام کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ہم ضرورت کے وقت اجنبی عورتوں سے بات کرنے، ان سے گفتگو کرنے کو جائز کہتے ہیں، اور ان (عورتوں) کے لئے نہیں جائز کہتے اپنی آواز اونچی (بلند) کرنے کو، اور نہ اس کے کھینچنے کو، اور نہ اس کے نرم کرنے کو، اس لئے کہ اس میں مردوں کو اپنی طرف مائل کرنا ہے، اور ان کی شہوت کو ابھارنا ہے اور اسی وجہ سے جائز نہیں ہے کہ عورت اذان کہے" (ردالمحتار علی الدر المختار ۷۸/۲، ۷۹)۔

اس لئے بوقت ضرورت مذاکرہ میں شریک غیر مسلم خواتین سے مواجہہ وخطاب اور تبادلۂ خیال جائز ہوگا، مصافحہ کرنا جائز نہیں۔

ہندوستان میں بین مذہبی مذاکرات — اصول اور طریقہ کار

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی ☆

تمہید:

اکیسویں صدی بہ ظاہر امن وامان، آزادی رائے، حریت فکر وعمل اور حریت دعوت وتبلیغ کا دور سمجھا جاتا ہے، جس میں ہر انسان آزادی کا متوالا، مساوات کا طلبگار اور عدل وانصاف کا نعرہ لگانے والا نظر آتا ہے۔

تو دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں انسانیت کو جس قدر امن وسکون کی تلاش ہے، ویسی تلاش کبھی نہیں رہی ہے، موجودہ عہد کا انسان نفرتوں، عصبیتوں اور غلط فہمیوں کی فضا میں سانسیں لے رہا ہے، روحانی بے چینی کا شکار ہے، عدل وانصاف سے محروم ہے اور اخلاقی پستی کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے، اور انسان کے ایک جم غفیر کو نام نہاد دہشت گردی، تشدد پسندی اور قدامت پرستی کا لیبل لگا کر بدنام اور ذلیل کیا جارہا ہے، اور اکثریت اقلیت کے حقوق ہضم کرنے پر تلی ہوئی ہے، چنانچہ موجودہ عہد میں بین مذہبی مذاکرات کی سخت ضرورت اور بڑی اہمیت ہے؛ تا کہ دنیائے انسانیت کے اندر حقیقی امن وامان اور آزادی رائے وفکر قائم ہو۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ہیں:

۱۔(سوال نمبر ا کا جواب):

مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان مذہبی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر باہمی مذاکرات کی گنجائش ہے۔

چنانچہ مذہبی امور میں درج ذیل مسائل آئیں گے:

ا۔مذہبی آزادی:

ہر شخص کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کی آزادی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: **"لا إكراه في الدين"** (البقرہ: ۲۵۶) (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے) اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"ولو شاء ربك لآمن من في الأرض**

☆ عمید کلیۃ القرآن، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، کیرالہ۔

كلهم جميعاً أفأنت تكره الناس حتى يكونوا مؤمنين"(یونس:۹۹) (اور اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین پر جتنے لوگ بھی ہیں سب ایمان قبول کر لیتے، تو کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مومن بن جائیں)۔

لہذا مذہب کے نام پر کسی کو جبر وتشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے، کیونکہ مذہب کی بنا پر اذیت پہنچانا اور مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے ظلم وستم کا نشانہ بنانا ایک سنگین فتنہ ہے جو قتل وقتال سے بھی بڑا جرم ہے، ارشاد الٰہی ہے:"**والفتنة أشد من القتل**"(البقرہ:۱۹۱) (اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے)۔

۲۔دعوت وتبلیغ کی آزادی:

دعوت وتبلیغ کی واقعی آزادی ہو، ایسا نہ ہو کہ دستور میں تو آزادی کی صراحت ہو، اور عملاً اس کا دروازہ بند کردیا جائے، یا دعوت کا کام کرنے والوں کو پریشان کیا جائے، یا خفیہ ایجنسیاں ان کو اپنے نشانہ پر لے لیں، یا حکومت دستور کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسی پالیسیاں بنائے کہ دعوت کے کام میں رکاوٹ کھڑی ہو، یا اقلیت کی آبادی میں اضافہ کا رونا روکر دعوت کے کام میں رخنے ڈالے جائیں۔

البتہ دعوت کا کام کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ پرامن طریقہ پر اس کام کو انجام دیں، مال وزر کی حرص دینے سے باز رہیں، یا جبر سے کام لینے سے پرہیز کریں، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن**"(النحل:۱۲۵) (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے)۔

اور سماجی امور میں درج ذیل مسائل آئیں گے:

ا۔تعلیم وتعلم پر کسی طبقہ کی اجارہ داری نہ ہو، ہر شخص کے لیے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں، ایسی پالیسی نہ بنائی جائے کہ مالدار طبقہ کے بچے ہی اعلی تعلیم حاصل کر پائیں، امتحان اور کامیاب ہونے کا معیار سب کے لیے یکساں ہوں، ارشاد باری تعالی ہے:"**قل هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون**"(الزمر:۹) (پوچھو، کیا علم وبصیرت رکھنے والے، اور وہ جو علم وبصیرت نہیں رکھتے دونوں برابر ہوں گے)، اور اللہ عزوجل کا فرمان ہے:"**وقل رب زدني علما**"(طہ:۱۱۴) (اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب میرے علم میں افزونی فرما)۔

ان آیات میں بلا تفریق تمام لوگوں کو علم کی تحصیل کے لیے کوشش پر آمادہ کیا گیا ہے۔

۲۔خواتین کا احترام:

خواتین کا احترام کیا جائے، ان کو ظلم واستبداد سے بچایا جائے، جہیز اور تلک کے سماجی ناسور کا خاتمہ کیا جائے، اور جہیز کے نام پر ان پر ہونے والے تشدد سے ان کا تحفظ کیا جائے، ان کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ برتاؤ کیا جائے کہ وہ اصل انسانیت

میں مساوی مقام رکھتی ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**يأيها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرا ونساء**" (النساء:۱) (اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں)، چنانچہ جس طرح ان خواتین کی ذمہ داریاں ہیں اسی طرح ان کے حقوق ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: "**ولهن مثل الذى عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة والله عزيز حكيم**" (البقرہ:۲۲۸) (اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں، ہاں مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے)۔

خود حضور اکرم ﷺ نے عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت فرمائی ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "**استوصوا بالنساء خيراً**" (صحیح البخاری حدیث نمبر:۳۳۳۱، صحیح مسلم حدیث نمبر:۱۴۶۸) (میں تم کو عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں)۔

بیٹی، بہن، ماں اور بیوی ہر حالت میں ان کے حقوق ہیں، چونکہ عام طور سے بیوی کی حالت میں ان پر زیادہ ظلم ہوتا ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس حالت میں خاص طور پر ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "**خياركم خياركم لنسائهم خلقا**" (سنن ترمذی حدیث نمبر:۱۱۶۲، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (تم میں سے سب سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی خواتین کے ساتھ اچھا اخلاقی برتاؤ کرتے ہیں) اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "**خياركم خياركم لنسائهم**" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر:۱۹۷۸، اور یہ صحیح درج کی حدیث ہے) (تم میں سے سب سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی خواتین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں)۔

اور نبی کریم ﷺ نے مرد وعورت کے دائمی نباہ کے لیے زریں اصول بیان فرمایا ہے کہ عورت کی اچھائی کا استحضار رکھو تاکہ اس کے اندر جو کمیاں ہیں ان کی تمہارے دل کے اندر اتنی زیادہ اہمیت نہ رہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے: "**لا يفرك مؤمن مؤمنة، إن كره منها خلقا رضى منها آخر**" (صحیح مسلم حدیث نمبر:۱۴۶۹، مسند احمد حدیث نمبر:۸۳۶۳) (کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بالکلیہ بغض نہ رکھے، اگر اس کی کوئی عادت ناپسند ہوگی، تو اس کی دوسری کوئی عادت پسند بھی ہوگی)۔

خود قرآن کریم نے بھی عورت کے اچھے اوصاف پر نگاہ رکھنے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے: "**وعاشروهن بالمعروف، فإن كرهتموهن فعسى أن تكرهوا شيئاً ويجعل الله فيه خيراً كثيراً**" (النساء:۱۹)۔

(اور ان کے ساتھ معقول طریقے کا برتاؤ کرو اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو بعید نہیں کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو اور اللہ تمہارے لیے اس میں بہت بڑی بہتری پیدا کردے)۔

نبی کریم ﷺ نے مردوں کو بدسلوکی سے روکتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ خواتین پر صرف ان کا اتنا حق ہے کہ وہ ان کے پاس رہیں، جیسا حضرت عمرو بن الاحوص الجشمیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**ألا واستوصوا بالنساء**

خیراً، فإنما هن عوان عندکم، لیس تملکون منهن شیئا غیر ذلک، إلا أن یأتین بفاحشة مبینة" (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۶۳، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (خوب سن لو، میں تمھیں عورتوں کے ساتھ بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں، تم اس نصیحت کو قبول کرلو، اس لیے کہ یہ خواتین تمہارے پاس محبوس ومقید رہتی ہیں، اس کے علاوہ شرعاً ان پر تمہارا کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں)۔

نیز نبی کریم ﷺ نے بیوی کے ساتھ مار پیٹ کرنے والوں کو برے لوگ قرار دیا، جیسا کہ ایاس بن عبداللہ بن ابی ذبابؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**لا تضربوا إماء الله، فجاء عمر إلی رسول الله ﷺ فقال: ذئرن النساء علی أزواجهن، فرخص فی ضربهن، فأطاف بآل رسول الله نساء کثیر، یشکون أزواجهن، فقال رسول الله ﷺ: لقد طاف بآل محمد نساء کثیر یشکون أزواجهن، لیس أولئک بخیارکم**" (سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی ضرب النساء، حدیث نمبر: ۲۱۴۶، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (اللہ کی بندیوں کو مت مارا کرو، سو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمرؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ یہ خواتین تو اب اپنے شوہروں پر بہت شیر ہوگئیں، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے (ناگزیر حالت میں) مارنے کی اجازت دے دی، سو اس اجازت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے گھر بہت سی خواتین نے چکر لگایا، جو اپنے شوہروں کی شکایت کر رہی تھیں، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس صورت حال کو دیکھ کر فرمایا کہ محمد (ﷺ) کے گھر بہت سی خواتین نے آکر اپنے شوہروں کی شکایت کیں (لہذا خوب اچھی طرح سن لو) یہ مار پیٹ کرنے والے تم میں اچھے لوگ نہیں ہیں)۔

۳۔ کرپشن کا خاتمہ:

کرپشن کا استعمال عام طور پر سرکاری منصب وعہدہ، اقتدار واختیار اور حکومتی وسائل کے غلط استعمال کے لیے ہوتا ہے، لیکن عمومی مفہوم میں کرپشن میں مالی بدعنوانی، رشوت ستانی، اقرباء پروری، تجارت کے لیے سرکاری حیثیت کا استعمال، ناجائز سرپرستی، انتخابی دھوکہ دہی، رزق کی غیر فطری تقسیم، بے راہ روی، مفاد پرستی، سودخوری اور لوٹ کھسوٹ وغیرہ سب شامل ہیں۔

چونکہ اس وقت پوری دنیا کرپشن کی چکی میں پس رہی ہے اور خاص طور سے ہندوستان کرپشن اور بدعنوانی کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے، وزراء اور آفیسر سے لے کر معمولی چپراسی تک کرپشن میں ڈوبا ہوا ہے، حتی کہ ملک کا وزیر اعظم تک اس کی چھینٹوں سے محفوظ نہیں ہے۔

لہذا تمام ادیان کو مل کر اس سماجی لعنت کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور ہمہ گیر مہم چلانی چاہئے، تاکہ ملک سے کرپشن اور بدعنوانی کا بڑھتا ہوا ناسور ختم ہو۔

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ عہدہ داروں، آفیسروں اور ملازموں کے دلوں میں اللہ تعالی کا خوف بٹھایا جائے اور جوابدہی کا

احساس پیدا کیا جائے، اور ملک کے شہریوں اور عام انسانوں کو جائز آمدنی اور ناجائز کمائی کے سلسلہ میں حساس اور باشعور بنایا جائے، اور محنت ومشقت سے کمائی دولت کی اہمیت اور ناجائز آمدنی سے بال بچوں پر پڑنے والے منفی اثرات سے آگاہ کیا جائے، ساتھ ہی ہر آفیسر، عہدہ دار اور ملازم کو باور کرایا جائے کہ وہ ملکی قانون کے سامنے بھی جوابدہ ہے، اور اللہ تعالی کے سامنے بھی، ہوسکتا ہے کہ وہ ملکی قانون سے بچ جائے، لیکن اللہ تعالی کی نگاہ سے نہیں بچ سکتا ہے، جہاں تک کہ اسلام کا تعلق ہے تو اس نے کرپشن، بدعنوانی اور رشوت ستانی کی سخت مذمت کی ہے، اور لوگوں کو اس سے دور رہنے کی سخت ہدایت کی ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے :"**ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون**"(البقرہ:۱۸۸)(اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ، اور اس کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کرکے ہڑپ کرسکو، درآں حالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو)۔

اور اللہ تعالی نے حرام خوری پر یہودیوں کو سخت تنبیہ کی ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے :"**وترى كثيرا منهم يسارعون في الإثم والعدوان وأكلهم السحت لبئس ما كانوا يعملون**"(المائدہ:۶۲)(تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ حق تلفی، زیادتی اور حرام خوری کی راہ میں گرم رو ہیں، کیا ہی برا ہے جو کچھ یہ کررہے ہیں)۔

اور اس کے بعد والی آیت میں اہل علم ومعرفت کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ یہودیوں کو ناجائز کمائی استعمال کرنے سے باز کیوں نہیں رکھتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے :"**لولا ينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الإثم وأكلهم السحت لبئس ما كانوا يصنعون**"(المائدہ:۶۳)(ان کے علماء اور فقہاء ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں، کتنی بری ہے یہ حرکت جو یہ کررہے ہیں)۔

اور ایک مقام پر ان کی اس بری خصلت پر یوں تنبیہ کی ہے :"**سماعون للكذب أكّالون للسحت**"(المائدہ:۴۲) (یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے حرام خور ہیں)۔

آلوسیؒ تحریر فرماتے ہیں :"**أي الحرام من سحته إذا استأصله، وسمي الحرام سحتا ....لأنه لا بركة فيه لأهله فيهلك هلاک الاستئصال غالباً ....والمراد هنا على المشهور:الرشوة في الحكم**"(الوسی، روح المعانی ۹۳/۴، ط: موقع التفاسیر)(یعنی "سحت" سے مراد حرام ہے، یہ لفظ "سحتہ" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں جڑ سے اکھاڑنا، اور حرام کا نام "سحت" اس لیے رکھا گیا کہ ....اس میں حرام خور کے لیے برکت نہیں ہوتی ہے، تو عام طور سے وہ مال "گویا" بالکل برباد ہوجاتا ہے ....اور "سحت" سے اس جگہ مراد فیصلہ کے لیے رشوت ستانی ہے)۔

اور نبی کریم ﷺ نے بھی حرام خوری کو سخت سزا کا سبب قرار دیا ہے، چنانچہ کعب بن عجرہ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا :"**إنه لا يدخل الجنة لحم نبت من سحت، النار أولى به**"(مسند احمد حدیث نمبر:۱۴۴۴۱، مسند عبد بن حمید حدیث نمبر:۱۱۳۸، صحیح ابن حبان حدیث نمبر:۵۱۴۴، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)(یقینا ایسا شخص جنت میں داخل نہ ہوگا، جس کا گوشت

B9

حرام سے بنا ہو، جہنم اس کی زیادہ حقدار ہے)۔

اور رسول کریم ﷺ نے رشوت لینے، رشوت دینے اور رشوت کا واسطہ بننے والے سب کو مجرم قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے: "لعن رسول اللهﷺ الراشي والمرتشي والرائش يعني: الذي يمشي بينهما" (مسند احمد حدیث نمبر: ۲۲۳۹۹، اور یہ صحیح لغیرہ حدیث ہے) (رسول کریم ﷺ نے رشوت دینے والے، رشوت لینے والے اور ان کے درمیان واسطہ بننے والے سب پر لعنت فرمائی ہے)۔

حتی کہ نبی کریم ﷺ نے اس عہدیدار اور آفیسر اور ملازم کو بھی مجرم گردانا ہے جو کسی سرکاری کام اور عوامی کام کے لیے کسی فرد یا ایجنٹ سے مالی عوض یا تحفہ قبول کرتا ہے، یا کوئی آفیسر کسی کا جائز کام کر کے مالی منفعت یا تحفہ لیتا ہے، چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "هدايا الأمراء غلول" (طبرانی، المعجم الاوسط، حدیث نمبر: ۴۹۶۹، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (حکام کو دیئے جانے والے تحفے خیانت ہیں)۔

اور حضرت مسروق سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ سے پوچھا: "أرأيت الرشوة في الحكم، من السحت هي؟ قال: لا، ولكن كفر، إنما السحت أن يكون للرجل عند السلطان جاه ومنزلة، ويكون للآخر إلى السلطان حاجة، فلا يقضي حاجته، حتى يهدي إليه هدية" (ابن المنذر، بہ حوالہ کنز العمال حدیث نمبر: ۱۴۴۹۰) (رشوت لے کر فیصلہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، کیا یہ حرام خوری میں سے ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں، یہ حرام خوری میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ کفر ہے، حرام خوری تو یہ ہے کہ کسی شخص کو حاکم کے پاس جاہ و مرتبہ حاصل ہو، اور دوسرے شخص کو حاکم کے پاس کوئی حاجت ہو، سو یہ ہدیہ لیے بغیر اس کی حاجت پوری نہ کرے)۔

اسی لیے حکم یہ ہے کہ اگر پہلے سے آفیسر یا ملازم اور دوسرے شخص کے درمیان تحفہ کے تبادلہ کا سلسلہ ہو، یا سلسلہ ہو، لیکن کسی وقت ہدیہ دینے والا اس کے ذریعہ ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے، تو یہ بھی حرام خوری میں داخل ہے، چنانچہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے قبیلہ اسد کے ایک شخص کو جس کا نام "ابن لتبیہ" تھا، صدقہ کا مال وصول کرنے کے لیے عامل مقرر کیا، جب وہ شخص مال وصول کر کے آیا تو اپنے ساتھ دو طرح کا مال لایا، ایک کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ تو آپ کا یعنی بیت المال کا ہے، اور دوسرے کے بارے میں کہا کہ یہ میرا ہے، مجھے ہدیہ میں ملا ہے، یہ سن کر نبی کریم ﷺ بہت ناراض ہوئے، منبر پر تشریف لائے، خطبہ دیا، اور فرمایا: "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ میں ان کو عامل مقرر کرتا ہوں، تو وہ کہتا ہے یہ تو آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے، وہ کیوں نہیں اپنے والدین کے گھر بیٹھتا اور دیکھتا کہ کون اسے ہدیہ دیتا ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "ومن يغلل يأت بما غلّ يوم القيامة" (آل عمران: ۱۶۱) (جو شخص خیانت کرے گا وہ خیانت کردہ سامان کے ساتھ قیامت میں حاضر ہوگا)، اگر کسی نے اونٹ لیا ہوگا تو اونٹ کی آواز آئے گی، اور اگر کسی نے بکری لی ہوگی تو بکری کی آواز آئے گی (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۵۹۷، ۶۹۷۹)۔

اور فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے، چنانچہ سرخسیؒ لکھتے ہیں: "والرشوة حرام، وهذا بمنزلة الرشوة في

الحكم، وهو من السحت"(سرخسی، المبسوط ۵/۹۹ ۳، تحقیق: خلیل المیس، بیروت، دارالفکر، ط:۱، ۱۴۲۱ھ) (اور رشوت حرام ہے، اور یہ یعنی شوہر کو کچھ دے کر عورت کا اپنی باری میں اضافہ کرانا، رشوت لے کر فیصلہ کرنے کے درجہ میں ہے، اور یہ حرام خوری میں داخل ہے)۔

۴۔ فردیت اور جماعتیت کے درمیان توازن قائم کرنا:

فرد کو جائز دائرہ میں رہتے ہوئے آزادی حاصل ہے، لیکن یہ بے لگام آزادی نہیں ہے، اسی طرح جماعت کی مصلحت فرد کی مصلحت پر مقدم ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرد کی آزادی سلب کر لی جائے، چنانچہ اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ماضی میں دو انتہاؤں نے جنم لیا، ایک انتہا اشتراکیت تھی جس نے فرد کے مرتبہ کا بالکل خاتمہ کر دیا، اور دوسری انتہا سرمایہ داری تھی جو فرد کی بے لگام آزادی پر مبنی ہے۔

لہذا تمام ادیان کو مل کر فردیت اور جماعتیت کے درمیان صحیح توازن پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس نے فرد کی آزادی کا اعتراف کیا ہے، لیکن آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں کی دل آزاری کی جائے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**والذين يؤذون المؤمنين والمؤمنات بغير ما اكتسبوا فقد احتملوا بهتانا وإثما مبينا**"(الاحزاب:۵۸) (اور جو لوگ مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ان چیزوں کے باب میں ایذا دیتے ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب نہیں کیا، انہوں نے اپنے سر صریح بہتان اور گناہ کا بار لیا)۔

یا غریبوں اور کمزوروں کا حق مارا جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلماً، إنما يأكلون في بطونهم نارا وسيصلون سعيرا**"(النساء:۱۰) (جو لوگ ظلم وانصافی سے یتیموں کے مال ہڑپ کر رہے ہیں، وہ تو بس اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں، اور وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے)۔ اور ارشاد ہے:"**والذين في أموالهم حق معلوم، للسائل والمحروم**"(المعارج:۲۴-۲۵) (اور وہ جن کے مالوں میں ایک معین حق ہوتا ہے سائلوں اور محروموں کا)۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"**أعط الأجير أجره قبل أن يجف عرقه**" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۴۴۳، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو)۔

اور نہ جماعت کی مصلحت کے مقدم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سماج کے درمیان نامنصفانہ برابری قائم کی جائے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:"**أهم يقسمون رحمت ربک نحن قسمنا بينهم معيشتهم في الحياة الدنيا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات ليتخذ بعضهم بعضا سخريا**"(الزخرف:۳۲) (کیا تیرے رب کے فضل کو یہی تقسیم کرتے ہیں، دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کا سامان تو ہم نے تقسیم کیا ہے، اور ایک کے درجہ دوسرے پر بلند کیے ہیں، تا کہ وہ باہم دیگر ایک دوسرے سے کام لے سکیں)۔

۵۔شراب کا خاتمہ:

شراب نوشی تمام برائیوں، گندگیوں اور خباثتوں کی جڑ ہے، لہذا تمام ادیان کو مل کر اس کا خاتمہ کرنا چاہیئے۔ جہاں تک کہ اسلام کا تعلق ہے تو اس نے بڑی تاکید کے ساتھ اس نجاست کو حرام قرار دیا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”**یاأیها الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون، إنما یرید الشیطان أن یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر الله وعن الصلاة فهل أنتم منتهون**“ (المائدہ:۹۰۔۹۱) (اے ایمان والو! شراب، جوا، تھان اور پانسے کے تیر بالکل نجس شیطانی کاموں میں سے ہیں، تو ان سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ، شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں شراب اور جوئے میں لگا کر تمہارے درمیان دشمنی اور کینہ ڈالے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روکے، تو بتاؤ کیا اب تم ان سے باز آتے ہو؟

اور حضرت ابو درداءؓ کو جو آپ نے نصیحت فرمائی ان میں سے ایک یہ ہے: ”**ولا تشربنّ الخمر فإنها مفتاح کل شر**“ (بخاری، الادب المفرد حدیث نمبر:۱۸، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) اور شراب مت پیو کہ یہ تمام برائیوں کی کنجی ہے)۔

اور حضرت عثمان غنیؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ شراب سے بچو اس لیے کہ وہ تمام خباثتوں کی جڑ ہے، چنانچہ پہلی امتوں میں ایک زاہد و عابد شخص تھا، جس پر ایک خوبصورت بدکار عورت فریفتہ ہوگئی، اور اس نے ان کو اپنی کنیز بھیج کر گواہی دینے کے بہانے بلوایا، اور جب وہ گھر میں داخل ہو گئے، تو کنیز تمام دروازوں کو بند کرتی گئی، یہاں تک کہ وہ زاہد و عابد شخص ایک خوبصورت خاتون کے پاس پہنچا، جس کے پاس ایک نوجوان لڑکا اور شراب کا پیالہ تھا، اس وقت اس خاتون نے ان سے کہا کہ میں نے تمہیں گواہی کے لیے نہیں بلایا ہے، لیکن اس لیے بلایا ہے تا کہ میرے ساتھ زنا کرو، یا شراب پیو، یا اس لڑکے کو قتل کردو، تو اس نے کہا کہ مجھے شراب پلادو، چنانچہ اسے شراب پلائی گئی، تب اس نے ایک جام کے بعد مزید جام کا مطالبہ کیا، یہاں تک کہ اس کی شہوت بھڑک اٹھی، اور اس نے اس عورت سے منہ سیاہ کیا، اور لڑکے کو بھی قتل کردیا، ”**فاجتنبوا الخمر، فإنها والله لا یجتمع الإیمان وإدمان الخمر إلا لیوشک أن یخرج أحدهما صاحبه**“ (سنن نسائی، حدیث نمبر:۵۶۶۶، اور یہ صحیح درجہ کی اثر ہے) (لہذا شراب سے بچو، کیونکہ اللہ کی قسم! ایمان اور شراب کی لت جمع نہیں ہو سکتے ہیں، مگر ایک دوسرے کو نکال دے گی)۔

(ج) سیاسی مسائل میں یہ امور آئیں گے:

ا۔عدل وانصاف کا قیام:

تمام مذاہب کو مل کر حکومت پر زور دینا چاہیئے کہ وہ ہر حالت میں انصاف کو قائم کرے، اور دوست و دشمن سب کے لیے یکساں پیمانہ عدل اختیار کرے۔ مختلف بہانوں سے لوگوں کو ٹارچر کرنا بند کرے، تمام باشندگان ملک کے لیے یکساں نظام بنائے، اہلیت اور لیاقت کو پیش نظر رکھے، کسی کے منصب یا ذات پات کی بنیاد پر تفریق کو روا نہ رکھے، نوکری، امتحان اور تعلیمی اداروں میں

داخلہ کا نظام سب کے لیے یکساں ہو۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس کی تعلیمات بالکل واضح ہیں، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”**یاأیھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا اعدلوا ھو أقرب للتقوی**“(المائدہ:۸) (اے ایمان والو! عدل کے علم بردار بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے رہو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی تقوی سے قریب تر ہے)۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالی فرماتا ہے: ”**یا عبادی إنی حرمت الظلم علی نفسی، وجعلتہ بینکم محرما، فلا تظالموا**“(صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۵۷۷) (اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام ٹھہرایا ہے، اور تمہارے درمیان بھی اسے حرام قرار دیا ہے، لہذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو)۔

اور ماہر سماجیات ابن خلدون لکھتے ہیں: ”**الظلم مؤذن بخراب العمران**“(ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون ص/۲۸۶، بیروت، دارالقلم، ۱۹۸۴ء) (ظلم آبادی کے ویران ہونے کی آگاہی دیتا ہے)۔

دلائل:

۱۔ کفار ومشرکین کے ساتھ مختلف مسائل پر باہمی مذاکرات کی دعوت خود قرآن کریم نے دی ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”**قل یا أھل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً أربابا من دون اللہ فإن تولوا فقولوا اشھدوا بأنا مسلمون**“(آل عمران: ۶۴) (کہہ دو، اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے، اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں)۔

اس آیت میں نصاری کو یکساں مشترک، مسلم اور جانے پہچانے مسائل کی دعوت دی گئی ہے، اور یہ امر مخفی نہیں کہ توحید بھی مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان یکساں مشترک ومسلم موضوع ہے، قرآن کریم نے اسی مشترک کلمہ کو بنیاد بنا کر یہود ونصاری سے بحث کا آغاز کیا ہے کہ جب توحید ہمارے اور تمہارے درمیان ایک مشترک حقیقت ہے تو غور کرو کہ اس قدر مشترک کے معیار پر قرآن اور اسلام پورے اترتے ہیں یا یہودیت اور نصرانیت؟

۲۔ نبی کریم ﷺ نے نجران کے نصرانی وفد اور دیگر وفود کے ساتھ دعوت توحید کے ساتھ مشترکہ مسائل پر بھی تبادلہ خیال فرمایا(دیکھئے: ابن سعد، الطبقات الکبری ۱/۲۲۲، ۲۶۹، ط: ۲، بیروت، العلمیہ، تحقیق: محمد عبدالقادر عطا، ۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء)۔

۳۔ جاہلیت کے زمانہ میں جبکہ آپ ﷺ کی عمر بیس سال تھی، بنو ہاشم، زہرہ اور تیم نے عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں مظلوم کے ساتھ دینے کا معاہدہ ذوالقعدہ میں کیا، اور آپ ﷺ اس میں شریک ہوئے، اور فرمایا: ”**ولو دعیت بہ لأجبت**“

(مرجع سابق ۱/ ۱۰۳) (اورا گر مجھے اسلام کے اندر بھی اس جیسے خیر کے معاہدہ کی دعوت دی جائے تو میں ضرور قبول کرلوں)، اس معاہدہ کا نام حلف الفضول ہے۔

ان دلائل سے واضح ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان مشترکہ مذہبی، سماجی اور سیاسی مسائل پر باہمی مذاکرات کی گنجائش ہے۔

۲۔(سوال نمبر ۲ کا جواب):

باہمی مذاکرات میں مشترکہ تعلیمات کا حوالہ دینا اوران سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، خود اللہ تعالی نے منسوخہ ادیان والوں پر حجت قائم کرنے کے لیے ان کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، ارشاد ہے: "**الذين يتبعون الرسول النبى الأمى الذى يجدونه مكتوبا عندهم فى التوراة والإنجيل يأمرهم بالمعروف وينهاهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ويضع عنهم إصرهم والأغلال التى كانت عليهم**" (الاعراف:۱۵۷) (جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے، اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے، اور خبیث چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں)۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے فرمایا: "**إنه لموصوف فى التوراة ببعض صفته فى القرآن: "يا أيها النبى إنا أرسلناک شاهدا ومبشرا ونذيرا"** (الاحزاب:۴۵) **وحرزا للأميين، أنت عبدى ورسولى، سميتک المتوكل، ليس بفظّ ولا غليظ ولا سخّاب فى الأسواق، ولا يدفع بالسيئة السيئة، ولكن يعفو ويغفر، ولن يقبضه الله حتى يقيم به الملة العوجاء بأن يقولوا: لاإله إلا الله، ويفتح بها أعينا عميا وآذانا صما وقلوبا غلفا**" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۱۲۵) (قرآن کی بعض صفات کے ساتھ رسول کریم ﷺ تورات میں بھی متصف ہیں: (اے نبی ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے) اور وہ ناخواندہ قوم کے افراد کے لیے پناہ گاہ ہوں گے، (اللہ ان سے فرمائے گا) تو میرا بندہ اور رسول ہے، تیرا نام میں نے "توکل کرنے والا" رکھا، وہ بد خلق اور سخت مزاج نہیں ہوں گے، اور نہ بازاروں میں چیخیں گے، اور برائی کے ذریعہ برائی کو دور نہیں کریں گے، لیکن معاف فرمادیں گے اور غلطی کو نظر انداز کریں گے، اور اللہ تعالی ان کو دنیا سے اس وقت اٹھائے گا، جبکہ ان کے ذریعہ کج ملت کو درست کردے، اس طرح کہ وہ لوگ اللہ کے سوا کسی معبود کے نہ ہونے کی گواہی دینے لگیں، اور اس کے ذریعہ بند آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھول دے)۔

یعنی کہ اللہ تعالی نے باطل ادیان والوں پر بھی حجت قائم کرنے کے لیے ان کی صحیح بات نقل کی ہے، ارشاد ہے: "**ولئن سألتهم من خلق السموات والأرض وسخر الشمس والقمر ليقولن الله فأنى يؤفكون**" (العنکبوت:۶۱) (اور اگر تم ان

سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور کس نے مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے، تو وہ کہاں اوندھے ہو جاتے ہیں؟)۔

۳(سوال نمبر ۳ کا جواب):

بین مذہبی مذاکرات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ امت اپنی خصوصیات اور تشخصات کو چھوڑ بیٹھے، یا باطل کو باطل نہ کہے یا تمام ادیان کو صحیح قرار دے، اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے، تو یہ محض اس کی نادانی ہی نہیں، بلکہ اس طرح کا بین مذہبی مذاکرات حرام ہے۔

لہذا باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لیے دیگر اہل مذاہب کے بعض مذہبی رسوم و اعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت سخت گناہ، شدید حرام اور اللہ تعالی کے غضب کو دعوت دینے والی چیز ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”**لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادّون من حادّ الله ورسوله ولو كانوا آباءهم أو أبناءهم أو إخوانهم أو عشيرتهم**“ (المجادلہ: ۲۲) (تم کوئی ایسی قوم نہیں پاسکتے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو، اور وہ دوستی رکھے ان سے جو اللہ اور اس کے رسول سے برسر مخالفت ہوں، اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا اہل کنبہ ہی کیوں نہ ہوں)۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ بیک وقت انسان مومن اور کافر دونوں نہیں ہوسکتا ہے، یا تو وہ حزب اللہ میں شامل رہے یا حزب الشیطان سے ناطہ جوڑے۔

یقیناً اسلام توحید خالص کا دین ہے، وہ شرک کی بو کو بھی ناپسند کرتا ہے، اور شرک کے سایہ سے بھی دور بھاگتا ہے، اور شرک کو ظلم عظیم قرار دیتا ہے، ارشاد باری ہے: ”**إن الشرك لظلم عظيم**“ (لقمان: ۱۳) (یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے)۔

اور کفار کے مذہبی خصائص کی مشابہت کو کفر نہیں، تو حرام ضرور قرار دیتا ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”**من تشبه بقوم فهو منهم**“ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۰۳۱، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، تو وہ ان ہی میں سے ہے)۔

لہذا غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں میں شرکت حرام ہے، کیونکہ اس سے ان کے مشرکانہ اعمال و رسوم اور مشرکانہ مظاہر کی شان و شوکت میں اضافہ ہوتا ہے، ارشاد الہی ہے: ”**والذين لا يشهدون الزور وإذا مرّوا باللغو مرّوا كراماً**“ (الفرقان: ۷۲) (اور جو کسی باطل میں شریک نہیں ہوتے، اور اگر کسی بے ہودہ چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں)۔

اس آیت سے استدلال اس طرح ہے کہ بہت سے مفسرین نے باطل میں شرکت سے مراد مشرکین کے مذہبی تہوار میں شرکت بیان فرمائی ہے (دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۳/۲۰۹۷، بیروت، دار ابن حزم، ط:۱، ۲۰۰۲ء)۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے ”بوانہ“ میں اونٹ قربان کرنے کی منت مانی، اور

نبی کریم ﷺ کے پاس آکر دریافت کیا کہ میں نے منت مانی ہے کہ ''بوانہ'' میں اونٹ کی قربانی کروں، اس پر نبی کریم ﷺ نے پوچھا: ''کیا وہاں جاہلیت کے بتوں میں سے کسی بت کی پوجا ہوتی تھی؟ صحابہ نے جواب دیا، نہیں، پھر آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا وہاں ان کا کوئی تہوار منایا جاتا تھا''، صحابہ نے عرض کیا، نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی منت پوری کرو، چونکہ اللہ کی معصیت کی نذر قابل وفا نہیں، اور نہ ہی اس چیز کی نذر کو پورا کرنا لازم ہے، جس کا آدم کا بیٹا مالک نہ ہو) (ابوداؤد حدیث نمبر: ۳۳۱۳، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مشرکین کی جشن گاہ میں منت کے جانور کو ذبح کرنا ممنوع ہے، تو پھر خود تہوار میں موافقت اور شرکت کیوں کر درست ہوگی؟

چنانچہ غیر مسلم کے مذہبی تہواروں، دینی معاملات میں ان کی موافقت اور ان کے خصائص میں ان کی مشابہت کے حرام ہونے پر علماء اسلام، ائمہ متبوعین اور تمام فقہاء کا ہے (دیکھئے: ابن تیمیہ، اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ أصحاب الجحیم ص/۱۱۸، بیروت، دار ابن حزم، ۲۰۰۴ء)۔

اسی بنا پر ابوحفص کبیر حنفی کا قول ہے: **''لو أن رجلاً عبد الله تعالى خمسين سنة، ثم جاء النيروز، وأهدى إلى بعض المشركين بيضة، يريد تعظيم ذلك اليوم، فقد كفر، وحبط عمله''** (ابن نجیم، البحر الرائق ۸/۵۵۵، بیروت، دار المعرفہ) (اگر کوئی شخص پچاس سال تک اللہ کی عبادت کرتا رہے، پھر نوروز کی آمد پر کسی مشرک کو اس دن کی تعظیم کے قصد سے ایک انڈے کا بھی ہدیہ دے تو وہ کافر ہو گیا اور اس کا عمل رائیگاں گیا)۔

اور اس میں شک نہیں کہ مذہبی رسوم واعمال میں شرکت اس دن کی سراپا تعظیم ہے۔

اور شیخ سلیمان جمل شافعیؒ لکھتے ہیں: **''يعزز من وافق الكفار في أعيادهم''** (حاشیۃ الجمل ۱۰/۱۳۴، بیروت، دار الفکر) (اس شخص کو تعزیراً سزا دی جائے گی جو کفار کی ان کے تہوار میں موافقت کرے)۔

۴۔(سوال نمبر ۴ کا جواب):

ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے ایسے اعمال کو ترک کرنا درست نہیں ہے، جو شرعاً واجب نہیں ہے، یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ہر نفع بخش چیز میں اصل اباحت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **''هو الذى خلق لكم مافى الأرض جميعا''** (البقرہ: ۲۹) (وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے)۔

امام جصاص رازیؒ لکھتے ہیں: **''الأشياء على الإباحة مما لا يحظره العقل''** (جصاص، احکام القرآن ۱/۳۳، تحقیق: قمحاوی، بیروت، دار الاحیاء ۱۴۰۵ھ) (جن چیزوں کو عقل (اور شرع) ممنوع نہ قرار دے وہ اباحت پر ہیں)۔

اورحضرت سلمانؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشادفرمایا :"**الحلال ماأحل الله فی کتابه، والحرام ما حرم الله فی کتابه، وما سکت عنه فهو مما عفی عنه**"(حاکم،المستدرک علی الصحیحین حدیث نمبر:۷۱۱۵،اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)(حلال وہ ہے جسے اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں حلال ٹھہرایا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے،اور جس سے ان نے خاموشی اختیار کی،وہ ان چیزوں میں سے ہے جو معاف ہیں)۔

یعنی جوحلال یا حرام نہ ہو،وہ مباح ہے،اور کسی مباح چیز کی عمومی اور ابدی تحریم درست نہیں ہے۔

۲۔ایسے اعمال کوترک کرنا حکمت ودانشمندی کے لحاظ سے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے،کیونکہ اکثریت اس طرح ان کوبعض دینی امور کے ترک تک پہنچادے گی۔

۳۔متوارث تہذیب جوشریعت سے متصادم نہیں،وہ ملی وحدت کا ذریعہ ہے،جسے ترک کرنے کی صورت میں ملت کے اندر پراگندگی اور انتشار پیدا ہوگا۔

۵۔(سوال نمبر ۵ کا جواب):

مذاہب باطلہ پرتنقید کے حدود درج ذیل ہیں:

۱۔محترم مذہبی شخصیات کے سب وشتم،گالی گلوچ دینے اور برا بھلا کہنے سے پرہیز کیا جائے،اللہ تعالی کا ارشاد ہے :

"**ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوا بغیر علم**"(الانعام:۱۰۸)(اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں،ان کو گالی نہ دو،کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں)۔

۲۔بہتر انداز میں گفتگو ہو اور پسندیدہ اسلوب میں بحث ہو،اللہ تعالی کا ارشاد ہے :"**ادع إلی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن**"(النحل:۱۲۵)(اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے)۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:"**فلیکن بالوجه الحسن برفق ولین وحسن خطاب، کما قال:"ولا تجادلوا أهل الکتاب إلابالتی هی أحسن إلا الذین ظلموا منهم**"(العنکبوت:۴۶)**فأمره تعالی بلین الجانب، کما أمر موسی وهارون علیهما السلام حین بعثهما إلی فرعون، فقال:"فقولا له قولاً لینا لعله یتذکر أو یخشی**"(طٰہٰ:۴۴)(ابن کثیر،تفسیر القرآن العظیم ۲/۲۰۷،بیروت،دار الفکر،۱۴۱۴ھ)(سو بحث بہتر طریقہ پر نرمی اور عمدہ کلام کے ذریعہ ہو،جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے :(اور اہل کتاب سے نہ بحث کرو،مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں)،چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے رسول کریم ﷺ کو رحمدلی،نرمی اور خوش اخلاقی کا حکم دیا،جس طرح موسی اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجنے کے وقت اس کا حکم دیا،سو فرمایا :(سو اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو،شاید وہ یاددہانی حاصل کرے یا ڈرے))۔

۳۔مثبت اور معقول دلائل پیش کیے جائیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"**قل ھاتوا برھانکم إن کنتم صادقین**" (البقرہ:۱۱۱)(کہو اس بات پر اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو)۔اور ایک جگہ ارشاد ہے :"**أم اتخذوا من دونه آلھة قل ھاتوا برھانکم، ھذا ذکر مع معی وذکر من قبلی**"(الانبیاء:۲۴)(کیا انہوں نے اللہ کے ماسوا دوسرے معبود ٹھہرا رکھے ہیں؟ ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو، یہ تعلیم ہے ان لوگوں کی جو میرے ساتھ ہیں، اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے)۔ اور ایک موقع سے ارشاد ہے:"**قل فأتوا بالتوراۃ فاتلوھا إن کنتم صادقین**"(آل عمران:۹۳)(کہہ دو لاؤ توراۃ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو)۔

۴۔ان مسلمات کا سہارا لیا جائے، جن کو تمام ادیان والے مانتے ہیں، مثلاً سچائی اچھی چیز ہے، جھوٹ قبیح ہے، احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جانا چاہئے، اور مجرم کو سزا ملنی چاہئے، وغیرہ۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :"**قل یا أھل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا اللہ ولا نشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضنا أربابا من دون اللہ فإن تولوا فقولوا اشھدوا بأنا مسلمون**"(آل عمران:۶۴)(کہہ دو اے اہل کتاب! اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے، اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں)۔

۵۔اخلاص، دلسوزی اور تعصب سے دور رہ کر مذاہب باطلہ پر تنقید کرنے والا مخلص ہے، معقول دلائل سے حق کو ظاہر کرنا اس کا مقصود ہے، اس کے اندر ذاتی دشمنی نہیں ہے، بلکہ غلط افکار و خیالات اور عقائد کو منطقی انداز میں بیان کرنا اس کا ہدف ہے۔

مذاہب باطلہ پر وہ تنقید کرے جن کے اندر اہلیت ہو، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:"**یاأبت إنی قد جاء نی من العلم ما لم یأتک فاتبعنی أھدک صراطاً سویاً**"(مریم:۴۳)(اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے، تو آپ میری پیروی کریں میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا)۔

اور بین مذہبی مسائل پر اظہار خیال میں درج ذیل آداب کی رعایت ہونی چاہئے:

۱۔چیلنج کا اسلوب نہ اختیار کیا جائے، بلکہ بحث و مباحثہ اور گفتگو میں عمدہ کلام کی پابندی کی جائے، جیسا کہ ارشاد ہے : "**وجادلھم بالتی ھی أحسن**"(النحل:۱۲۵)(اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے) اور فرمان الٰہی ہے : "**وقل لعبادی یقولوا التی ھی أحسن**"(الاسراء:۵۳)(اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے)۔اور ایک موقع سے ارشاد ہے:"**ادفع بالتی ھی أحسن السیئة نحن أعلم بما یصفون**"(المومنون:۹۶)(ان کی شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو، یہ جو کچھ ہرزہ سرائی کر رہے ہیں، ہم اس سے اچھی طرح واقف ہیں)۔

طعن و تجریح، تمسخر و استہزاء، تحقیر و تذلیل، اشتعال دلانے اور برانگیختہ کرنے والے اسلوب سے پرہیز کیا جائے، چنانچہ مذاہب باطلہ کے بطلان کے واضح ہونے اور ان کی دلیل کے ناقابل قبول ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دلنشیں

اسلوب میں بات کہنے کو فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہے :"وإنا أو إیاکم لعلی هدی أو فی ضلال مبین"(سبا:۲۴)(اور ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں)، نیز فرمایا :"وإن جادلوک فقل الله أعلم بما تعملون" (الحج:۶۸)(اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو)۔نیز فرمایا :"قل یجمع بیننا ربنا ثم یفتح بیننا بالحق وهو الفتاح العلیم" (سبا:۲۶)(کہہ دو، ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان بالکل انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا، اور وہی فیصلہ فرمانے والا اور علم والا ہے)۔

خلاصہ یہ کہ دل کو جیتنے والا اسلوب اختیار کیا جائے، پوزیشن حاصل کرنے اور جیت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے یہ کوشش کی جائے کہ مخالف کو عقلی طور پر اطمینان حاصل ہو جائے، اور وہ سر تسلیم خم کر دے۔

البتہ اگر مخالف ہٹ دھرم، حدود سے تجاوز کرنے والا اور ظلم و زیادتی پر اترنے والا ہو تو ایسی صورت میں اس پر سخت حملہ کیا جا سکتا ہے، اور اس کی نادانی اور رائے کی کمزوری کا پردہ سخت اسلوب میں فاش کیا جا سکتا ہے، تاکہ لوگوں کے سامنے باطل کی شکست واضح ہو جائے، جیسا کہ ارشاد ہے:"ولا تجادلوا أهل الکتاب إلا بالتی هی أحسن إلا الذین ظلموا منهم" (العنکبوت:۴۶)(اور اہل کتاب سے نہ بحث کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں)۔

۲۔وقت کی پابندی:

گفتگو کے لیے طے شدہ وقت کی پابندی کی جائے، چنانچہ مخالف کی پوری بات سننے کے بعد اپنی گفتگو کا آغاز کرے، ایسا نہ ہو کہ بیچ میں قطع کلام کر دے، اگرچہ اس نے تھوڑی ہی گفتگو سے پوری بات اور مکمل مقصود سمجھ لیا ہو، کیونکہ عہد کی پابندی مومن کا شیوہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"والذین هم لأماناتهم وعهدهم راعون" (المؤمنون:۸)(اور جو اپنی امانتوں اور عہد کا لحاظ رکھتے ہیں)۔

۳۔مخالف کا احترام:

مذاکرہ اور تنقید کی مجلس میں ہر فریق کو دوسرے کے مقام و مرتبہ کا خیال رکھنا چاہئے، اور مناسب عبارت، صحیح اور بہتر لقب اور مہذب اسلوب کا لحاظ رکھنا چاہئے؛اس لئے کہ باہمی احترام قبول حق کا ذریعہ، نفس پرستی اور انتقام سے دوری کا سبب ہے۔

البتہ باہمی احترام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چاپلوسی یا جھوٹی تعریف کی جائے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسئلہ پر پوری توجہ دی جائے، مسئلہ رکھنے والی ذات پر نظر نہ رکھی جائے، اور اسے ہدف لعن وطعن نہ بنایا جائے، علامہ شوکانی لکھتے ہیں:"فإن المجتهد هو الذی لا ینظر إلی من قال، بل إلی ما قال" (شوکانی، ادب الطلب ر ۴۳)(سو مجتہد وہی ہے جو قائل کو نہیں بلکہ قول کو دیکھے)۔

۴۔اخلاص:

مذاہب باطلہ پر تنقید کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، نام و نمود سے دوری، شریعت کی حفاظت اور اس کا دفاع اور لوگوں کی

ہدایت کی طرف رہنمائی ہو، لہذا تعصب سے دوری اور مخالف کی تحقیر سے پرہیز لازم ہے، اور اپنی ذات کے لیے حمیت وغیرت سے اجتناب ضروری ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء**" (البینہ: ۵) (اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ بالکل یکسو ہو کر)۔

۵۔مخالف کے ساتھ انصاف:

مذاہب باطلہ پر تنقید کرتے وقت عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، لہذا مقصود صرف اور صرف حقیقت کا بیان ہو، اور دلائل قائم کرنے کا انداز منطقی اور سائنٹفک ہو، اس لیے ہر ایسے طریقہ سے پرہیز کرے جس سے ظلم کی بو آتی ہو، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**يا أيها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله، ولو على أنفسكم أو الوالدين والأقربين إن يكن غنيا أو فقيرا فالله أولى بهما فلا تتبعوا الهوا أن تعدلوا وإن تلووا أو تعرضوا فإن الله كان بما تعملون خبيراً**" (النساء: ۱۳۵)۔

(اے ایمان والو! حق پر جمے رہو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگر چہ یہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے والدین، اور تمہارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے، کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ حق دار ہے، تو تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ، اور اگر کج کرو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے)۔

۶۔(سوال نمبر ۶ کا جواب):

مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، برائی، فحاشی، اخلاقی بگاڑ، برتاؤ کی خرابی، جنسی بے راہ روی، خواتین مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ ظلم وزیادتی وغیرہ پر مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنا مباح ہے، تاکہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جدوجہد کریں، اور ظلم وستم کے خلاف مشترکہ محاذ تیار رہو، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ "حلف الفضول" جو زمانہ جاہلیت میں مظلوموں کی مدد کے لیے معاہدہ ہوا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "**لو دعيت إلى مثله في الإسلام لأجبت**" (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ ۱/۲۹، سہیلی، الروض الآنف ۱/۲۴۱، ط: موقع الاسلام، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۶۵۵، ۱۶۷۶، اور اس کی سند صحیح ہے) (اگر مجھے زمانۂ اسلام میں بھی اس جیسے کسی معاہدہ کی دعوت دی جائے، تو میں اسے ضرور قبول کروں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ کفار ومشرکین کے ساتھ مشترکہ پلیٹ فارم تیار کرنا درست ہے؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ کافروں کے ساتھ مظلوموں کی مدد کے معاہدہ میں شریک ہوئے اور اسلام کے بعد بھی ایسے مشترکہ معاہدہ کی خواہش ظاہر فرمائی۔

۷۔(سوال نمبر ۷ کا جواب):

کسی بھی شخص یا جماعت یا گروہ کے ساتھ باہمی مذاکرات ہو سکتے ہیں، خواہ اس جماعت یا گروہ کے نصب العین میں

اسلام مخالف باتیں موجود ہوں، چنانچہ تمام انبیاء کرام علیہم وعلی نبینا الصلاۃ والسلام نے اسلام کی مخالفت کرنے والے افراد اور جماعت سے باہمی مذاکرات کیے، ان کو حق کی دعوت دی، اوران کے حق میں ہدایت کی دعا کی، جیسا کہ حضرت موسی اور ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے مجرم، جابر اور الوہیت وربوبیت کے دعویدار شخص سے مذاکرہ کے لیے بھیجا گیا، جیسا کہ ارشاد ہے: "**اذهبا إلى فرعون فإنه طغى**" (طٰہٰ: ۴۳) (تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ بہت سرکش ہوگیا ہے)۔ نیز فرمایا: "**فأتياه فقولا إنا رسولا ربک فأرسل معنا بني إسرائيل ولا تعذبهم قد جئناک بآية من ربک، والسلام على من اتبع الهدى، إنا قدأوحي إلينا أن العذاب على من كذّب وتولى**" (طٰہٰ: ۴۷۔۴۸) (سواس کے پاس جاؤ، اور اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے، اوران کو عذاب میں مبتلا نہ رکھ، ہم تیرے پروردگار کے پاس سے ایک بڑی نشانی بھی لے کرآئے ہیں، اور سلامتی ان لوگوں پر ہے جو ہدایت کی پیروی کریں، ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ہے جو جھٹلائیں اوراعراض کریں)۔ نیز ارشاد فرمایا: "**وإلى مدين أخاهم شعيبا قال يا قوم اعبدوا الله مالكم من إله غيره، ولا تنقصوا المكيال والميزان إني أراكم بخير وإني أخاف عليكم عذاب يوم محيط، ويا قوم أوفوا المكيال والميزان بالقسط ولا تبخسوا الناس أشياءهم ولا تعثوا في الأرض مفسدين، بقيت الله خير لكم إن كنتم مؤمنين، وما أنا عليكم بحفيظ**" (ہود: ۸۴۔۸۶) (اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، میں تمہیں فارغ البالی کی حالت میں دیکھ رہا ہوں، اور تم پر ایک گھیرنے والے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں، اور اے میری قوم کے لوگو! عدل کے ساتھ ناپ اور تول کو پورا رکھو اور لوگوں کی چیزوں میں حق تلفی نہ کرو، اور زمین میں فساد پھیلانے والے بن کر نہ ابھرو، اللہ کے بخشے ہوئے منافع ہی تمہارے لیے بہت ہیں، اگر تم سچے ایمان والے ہو، اور میں تم پر نگراں نہیں ہوں)۔

اور صلح حدیبیہ کے موقع سے نبی کریم ﷺ نے اسلام کے کٹر دشمنوں سے مذاکرات کئے (دیکھئے: صحیح البخاری، کتاب الشروط، باب مایجوز من الشروط فی الاسلام والاحکام والمبایعہ، حدیث نمبر: ۲۷۱۱، ۲۷۱۲)۔

۸۔ (سوال نمبر ۸ کا جواب):

جب بین مذہبی مذاکرات کی مجلسیں یا پروگرام ہوں اور اسٹیج پر خواتین مقرر بھی موجود ہوں تو ایسے مواقع پر مسلمانوں کا طرز عمل درج ذیل امور پر مشتمل ہونا چاہئے:

۱۔ ان کے دل خوف الٰہی سے معمور ہوں، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "**ياأيها الذين آمنوا اتقوا الله حق تقاته**" (آل عمران: ۱۰۲) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے)۔ اور ایک جگہ ارشاد ہے: "**واتقوا الله إن الله خبير بما تعملون**" (الحشر: ۱۸) (اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو)۔

۲۔ نگاہیں پست ہوں، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك أزكى لهم إن الله خبير بما يصنعون، وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها، وليضربن بخمرهن على جيوبهن" (النور: ۳۰۔۳۱) (مومنوں کو ہدایت کر کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی پردہ پوشی کریں، یہ طریقہ ان کے لیے پاکیزہ ہے، بے شک اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں۔ اور مومنہ عورتوں کو کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں، مگر جو ناگزیر طور پر ظاہر ہو جائے، اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے پلّو (آنچل) مار لیا کرو)۔

اور اگر کسی کی اچانک اچٹتی ہوئی نگاہ پڑ جائے تو فوراً جھکا لے، جیسا کہ حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "ياعلى لا تتبع النظرة، فإن لك الأولى، وليست لك الثانية" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۲۱۴۹، سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۷۷۷، سنن دارمی حدیث نمبر: ۲۷۰۹، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (اے علی، مسلسل اور لگاتار نظر مت ڈالو، کیونکہ تمہارے حق میں پہلی اچٹتی ہوئی نگاہ معاف ہے، اور دوسری نگاہ معاف نہیں ہے)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إن النظر سهم من سهام إبليس مسموم، من تركها مخافتي أبدلته إيمانا يجد حلاوته في قلبه" (کنز العمال بہ حوالہ طبرانی، حدیث نمبر: ۱۳۰۶۸) (نگاہ ابلیس کے تیروں میں سے زہر آلود تیر ہے، جو اسے میرے خوف سے چھوڑ دے تو میں اس کے بدلہ اسے ایمان کی ایسی کیفیت سے نوازوں گا جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا)۔

۳۔ بہ قدر ضرورت کلام:

اگر اسٹیج پر موجود کسی خاتون سے گفتگو کی حاجت ہو تو بہ قدر ضرورت کلام کرے، اور ان کی آواز سے لطف اندوز نہ ہو، بلکہ مقصود پیش نظر رکھے، چنانچہ حضرت ام عطیہ کہتی ہیں: "بايعنا رسول الله ﷺ فقرأ علينا: "أن لا يشركن بالله شيئاً" (الممتحنہ: ۱۲) (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۴۸۹۲، ۷۲۱۵) (ہم نے رسول کریم ﷺ سے بیعت کی، سو آپ نے ہمیں یہ آیت پڑھ کر سنائی، "کہ ہم خواتین اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں)۔

اور ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"وفي هذا الحديث أن كلام الأجنبية مباح سماعه، وأن صوتها ليس بعورة" (ابن حجر، فتح الباری ۱۳/ ۲۰۴، بیروت، دار المعرفۃ ۱۳۷۹ھ) (اس حدیث سے یہ فائدہ نکلتا ہے کہ اجنبی خاتون کی گفتگو کا سننا مباح ہے اور اس کی آواز ستر میں داخل نہیں ہے)۔

بین مذہبی مذاکرات — حدود وقیود، اصول وآداب

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ☆

آمد ورفت کی سہولیات، سائنسی ایجادات، ذرائع ابلاغ کی کثرت نے پوری دنیا کو ایک دسترخوان کے مانند کر دیا ہے، ایک ایسی دنیا جسے لوگ گلوبل ایج (Golobul Eage) سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی وجہ سے مختلف مذاہب واقوام سے اختلاط عام ہے اور مختلف تہذیب وثقافت کو تصادم کا سامنا ہے، اقوام عالم نے دنیا کے مختلف ملکوں کو اپنی آماجگاہ بنا لیا ہے، کہیں مسلمان اکثریت میں ہیں اور کہیں غیر مسلم، خود ہندوستان کا حال یہ ہے کہ انڈونیشیا کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد یہیں بود وباش کرتی ہے، سماجی اور ملکی تعلقات کی استواری اور ہم آہنگی پر ہی تجارتی، معاشی، سیاسی اور دفاعی تعلقات کا انحصار ہے، اس لیے سبھی مذہب اور فرقہ کے افراد بقاء باہم کے لیے مذاکرات کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں؛ کیونکہ یہ اپنی بات رکھنے، دوسروں کی غلط فہمیاں دور کرنے، آپسی اختلافات کو صلح کی میز پر طے کرنے اور دوسروں کے موقف کو سمجھنے کا عمدہ ذریعہ ہے، اس کی وجہ سے مختلف مذاہب کے لوگ سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں، اپنی سناتے، دوسروں کی سنتے ہیں، اس سے لوگوں کے درمیان صبر وتحمل اور قوت برداشت پیدا ہوتی ہے اور ہمدردی ورواداری کے ساتھ زندگی گزارنے کا مزاج بنتا ہے، یہ اس معاملہ کا ایک رخ ہے، اور حقیقت سے قریب تر ہے، لیکن اس معاملہ کا دوسرا رخ حقیقت سے بعید تر ہے اور وہ یہ کہ دنیا نے یہ مان لیا ہے کہ امن وسکون کی پامالی کا سبب مذہب ہے، اس لیے اس کی بحالی کے لیے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک میز پر جمع کر لیا جاتا ہے؛ لیکن یہ حقیقت اور واقعہ کے خلاف ہے، دنیا کی دو بڑی جنگیں، ہندوستان میں کورو پانڈو کی لڑائی، مغلیہ دور حکومت میں مسلم حکمرانوں اور نوابوں کے درمیان کی لڑائیاں، الگ الگ مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان نہیں تھیں؛ لیکن ہم مذہب ہونے کے باوجود ان لڑائیوں نے جو بربادی کی داستان رقم کی، وہ تاریخ کا المناک باب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تہذیبی اور مذہبی تصادم ہمیشہ حکمرانوں کے بنائے ہوئے اصول اور ان کی منشا سے پیدا ہوتے ہیں، ان کے اپنے تحفظات، اپنے حلقۂ اثر کو وسعت دینے کے منصوبے اور اپنے مفادات کے لئے کسی حد تک چلے جانے کے عزم نے ہی دنیا میں بدامنی پیدا کر رکھی ہے، ایک بار ان کو مکالمات ومذاکرات کی میز پر لا بیٹھائیے؛ پھر دیکھئے کس طرح امن کی فضا قائم ہوتی ہے۔

حکومت کی ان پالیسیوں کے طفیل ہی عوام میں جذباتیت، جوش اور جائز وناجائز کی تمیز کے بغیر قتل وغارت گری کا بازار گرم

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

ہوتا ہے، اور حکمراں طبقے کی شہہ پا کر ایسا بے قابو ہو جاتا ہے کہ مذہب کی ساری تعلیمات دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، مراقبہ، یوگ اور مختلف ذرائع سے جذبات پر قابو پانے کی جو مشق ہوتی ہے وہ ریت کے ٹیلوں کی طرح ڈھہہ جاتی ہے۔

اس لئے ان مکالمات کے ذریعہ ہمیں ایک ایسے سماج کی تشکیل کے لیے سوچنا چاہیے؛ جس میں حکمراں طبقوں کو بھی عدم تشدد اور رواداری کے اصولوں کا پابند بنایا جا سکتا ہو، جب تک طاقت ور ظلم کرتا رہے گا، عدل و انصاف کی دھجیاں اڑائی جاتی رہیں گی، ان مکالمات سے امن و آشتی کا قیام عمل میں نہیں آسکتا۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد عرض ہے کہ

۱۔ بین مذہبی مذاکرات کا مطلب مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مکالمہ ہے، اس لیے کہ مذاہب کی تکمیل تو اپنے اپنے عہد میں انبیاء و رسل نے کر دیا اور اس کا آخری ایڈیشن ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور اللہ رب العزت نے اعلان کر دیا کہ آج تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا گیا اور میری نعمت اتمام کو پہنچی اور تمہارے دین اسلام پر میں راضی ہوا۔

”اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً“ (المائدہ: ۳)۔

(آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے پورا کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر مکمل کر دیں اور تمہارے واسطے دین اسلام کو پسند کیا)۔

اب جب دین کی تکمیل ہوگئی تو ہم ان مذاکرات کے نتیجے میں اس میں کچھ داخل نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس میں کچھ کم کر سکتے ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ دین اسلام ہی ہے؛ جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک آتا رہا، زمانہ، علاقہ اور احوال کے اعتبار سے اس میں ترمیم و تنسیخ اور تبدیلیاں ہوتی رہیں اور آخری تبدیلی کے ساتھ آخری نبی تاجدار انبیاء محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل کر دیا گیا، اب قیامت تک نہ کوئی نبی، رسول آئیں گے اور نہ کوئی آسمانی کتاب نازل ہوگی۔

اس لیے بین مذہبی مذاکرات میں مذہبی معاملات پر گفتگو ہو تو سکتی ہے؛ لیکن اس مذاکرہ کے نتیجے میں نہ تو کسی مذہبی حکم سے دستبردار ہوا جا سکتا ہے اور نہ ہی مختلف مذاہب کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کو جوڑ کر اور دیگر معتقدات کو چھوڑ کر کوئی نیا دینی اور مذہبی اصول بنایا جا سکتا ہے، اس لیے مذہبی معاملات میں مذاکرہ کی بنیاد صرف اور صرف دعوتی نقطۂ نظر ہوگا، اور اس میں سمجھوتے کا کوئی معاملہ کسی بھی درجے میں نہیں کیا جا سکتا، البتہ سماجی اور سیاسی معاملات میں تھوڑی توسع ہے، جس کا پتہ میثاق مدینہ سے چلتا ہے، مدینہ میں یہود کے مختلف قبائل آباد تھے، آپ نے ان کے ساتھ مذاکرہ کیا اور اس کے نتیجے میں میثاق مدینہ وجود میں آیا۔

۲۔ البتہ مختلف مذاہب کے درمیان جو مشترکہ تعلیمات ہیں، اسے بین مذہبی مذاکرات میں پیش کیا جا سکتا ہے، قرآن کریم میں اللہ کے رسول ﷺ کو ہدایت دی گئی ہے کہ آپ کہہ دیجئے:

”قُلْ یٰاَهْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوا اِلیٰ کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئاً وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ“ (آل عمران: ۶۴)۔

(آپ کہہ دیجئے؛ اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کی بندگی

نہیں کریں، اس کا کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں اور کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بناوے)۔

ان مشترکہ امور اور تعلیمات کے اظہار کے لیے دیگر مذاہب کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے؛ لیکن یہ صرف مسلمات کو تاریخی تسلسل عطا کرنے اور سامنے والے کو سمجھانے کی غرض سے ہوگا اور مذاکرہ کرنے والے کو اس کا خیال رکھنا ہوگا؛ بلکہ واضح کر دینا ہوگا کہ کوئی بات اگر دوسرے مذہب میں تحریف وتبدیلی کی وجہ سے موجود نہیں ہے تو اس سے اسلام کی حقانیت وصداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور وہ اسی طرح قابل عمل ہیں؛ جیسے دوسرے احکام، سابقہ ادیان ومذاہب میں ان امور کے مذکور نہ ہونے سے اس کی حقانیت وصداقت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۳۔ باہمی مذاکرات اور خوش گوار تعلقات کے لئے بھی دیگر اہل مذاہب کے بعض مذہبی رسوم اور اعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، اس معاملہ میں فقہاء کے جو اقوال ہیں، ان کی روشنی میں زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتناب واحتراز کرنا چاہیے، ابن القاسم نے ان کشتیوں پر سوار ہونے کو بھی مکروہ کہا ہے؛ جو کشتیاں غیر مسلموں کے مذہبی میلے کی طرف رواں دواں ہوں؛ کیونکہ انکے ساتھ ہونے پر اللہ کے غضب کا اندیشہ ہے (الاقتضاء/۱۱۱)۔

حضرت عمرؓ مشرکین کے تہواروں کے موقع ان کے عبادت خانوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا کرتے تھے (اعلاء السنن ۱۲/ ۷۰۳)، حضرت عبداللہ بن عمرؓ غیر مسلموں کے علاقے میں گھر بنانے، ان کے تہواروں کی نقل اتارنے اور ان میں شریک ہونے کی صورت میں موت آجائے تو اس کا شمار قیامت کے دن مشرکین میں سے ہونے کی بات کہا کرتے تھے (الاقتضاء/۹۵)۔

البتہ امام احمد بن حنبلؒ نے غیر مسلموں کے مذہبی تہوار میں صرف خریداری کی غرض سے جانے کو ان کے عبادت خانوں میں داخل نہ ہونے کی شرط پر ''لاحرج'' کہا ہے (اقتضاء الصراط المستقیم/۱۳۰)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ عام مسلمانوں کے لیے غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں شرکت کو گناہ کہتے ہیں اور بلا ضرورت مذہبی تقریبات کے موقع سے لگنے والے بازار میں بھی جانا مکروہ قرار دیتے ہیں اور جو حضرات مقتدیٰ ہیں ان کے لیے احتراز واجب کہتے ہیں (امداد الفتاوی ۲/۱۴۱)۔

۴۔ ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے ان اعمال کو بھی ترک نہیں کیا جاسکتا جو شرعا واجب نہیں، محض مباح ہیں، دلیل کے طور ''یَا اَیُّھا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً'' کے شان نزول کو پیش کیا جاسکتا ہے، اونٹ کا گوشت کھانا مباح ہے، واجب نہیں؛ لیکن جب حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس کے نہ کھانے کا فیصلہ کیا تو اسے مکمل دخول اسلام کے منافی قرار دیا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی، اس کا سیدھا مطلب ہے کہ مباح چیزوں کے ترک کا عزم درست نہیں ہے۔

ایک دوسری مثال سیرت مبارکہ میں حضور ﷺ کے شہد نہ کھانے کی قسم سے متعلق ہے، شہد کھانا محض مباح ہے، واجب نہیں؛ لیکن آپ کے نہ کھانے کی قسم پر سورۃ تحریم کی ابتدائی آیتوں میں دیکھئے، اللہ رب العزت نے کس لب ولہجہ میں تنبیہ فرمائی ہے:

B10

”يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللهُ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ“(التحریم:۱)۔

(اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے، اسے آپ کیوں حرام کرتے ہیں؟ آپ اپنی بیویوں کی رضا مندی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے)۔

ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے آج کا دانشور طبقہ گائے کی قربانی کے ترک پر اصرار کرتا ہے اور دوسرے جانور کی قربانی پر زور دیتا ہے، ظاہر ہے گائے کی قربانی، فرض واجب نہیں ہے، دوسرے جانوروں کی طرح اس کی بھی قربانی کی جاسکتی ہے؛لیکن مباح کام کو ممنوع قرار دینے سے اس کا حکم بدل جاتا ہے اور شریعت اسے ناپسند کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ۱۳۳۶ھ میں بعض دیہاتوں میں غیر مسلموں کے ساتھ یہ مصالحت ہوئی کہ گائے کی قربانی ترک کردی جائے گی تو انجمن علماء بہار نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۵/۶/ شوال ۱۳۳۶ھ یعنی آج سے سوسال قبل یہ تجویز پاس کی تھی کہ:

”اضحیۂ بقر شعائر اسلام وسنت نبویہ ہے، یہ ہمیشہ حسب دستور برقرار اور جاری رہے گی اور مواضعات (دیہاتوں) میں مخالفین اسلام کے دباؤ سے ترکِ اضحیۂ بقر پر جو مصالحت کی گئی ہے وہ بالکل باطل اور ناجائز ہے اور ایسے عقد مصلاحت کا نقض واجب ہے“(امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب ۴۹، جدید ایڈیشن)۔

رہ گیا اس سوال کے دوسرے جزء کا کہ جن اعمال کا تعلق مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہو، اسے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور فتنہ فساد سے بچنے کے لیے ترک کر دینا، اس کا مفہوم میرے ذہن میں واضح نہ ہوسکا، اگر اس سے مراد رسم ورواج ہیں، جو مسلم معاشرہ میں جاری ہیں اور اسلامی تہذیب وثقافت سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں ہے، تو اسے ترک کرنا ہی چاہیے؛لیکن ہم جسے اسلامی تہذیب وثقافت کہتے ہیں، اس کی کہیں نہ کہیں اور کوئی نہ کوئی شرعی بنیاد ہے، اس لیے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے ہم ایسے کسی اعمال کو نہیں چھوڑ سکتے، اگر سوال میں دو ایک مثال دے دیا جاتا تو اس جملے کا مفہوم زیادہ واضح ہوجاتا اور جواب دینا دوٹوک لفظوں میں ممکن ہوتا۔

۵۔ ہم آہنگی اور فتنہ فساد اور دل آزاری کے خوف سے کفر وشرک اور معبودان باطل کے خلاف گفت وشنید کو بھی ترک نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ یہ ضروریات دین میں سے ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے؛البتہ مذاہب باطلہ پر تنقید کرتے وقت گفتگو ہو یا تحریر، درج ذیل چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

(الف) معبودان باطل کے باطل ہونے کو مدلل کیا جائے؛لیکن ان کو برا بھلا کہنے سے اجتناب کیا جائے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

”وَلَا تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوْا اللهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ“(الانعام:۱۰۸)۔

(اور گالی مت دو ان کو جن کی یہ لوگ اللہ تعالی کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیوں کہ وہ براہِ جہل حد سے گذر کر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے)۔

(ب) گفتگو میں نرمی اور قول حسن کا پہلو غالب رہے، اللہ رب العزت نے اپنے وقت کے سب سے اچھے انسان حضرت موسیٰ کو وقت کے سب سے بُرے انسان فرعون کے پاس بھیجا تو حکم دیا:

"فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلاً لَّيِّنا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى" (طٰہٰ:۴۴)۔

(پھر اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کرلے (یا عذاب الٰہی سے) ڈر جائے)۔

سامنے والا کفر وشرک پر جما ہوا ہے،لیکن وہ فرعون سے بُرا نہیں ہے، کیونکہ وہ خدائی دعویدار نہیں ہے، فرعون تو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا، اس لیے مقام ومنصب کی رعایت سے گفتگو نرم کرنی چاہیے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ ہی قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" (البقرۃ:۸۳) کا حکم دیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کی طرح ہی لوگوں سے اچھی گفتگو کرنا ضروری ہے، ہمارے پاس حکم میں تفریق کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(ج) محض مناظرے اور مجادلے کے لیے تنقید نہیں کی جائے، مقصد اللہ کے بندوں کو رب کی طرف بلانا ہو اور گفتگو اخلاص کے ساتھ ہی ہو؛ کیونکہ صرف بحث، اسلام کی نظر میں لایعنی چیز ہے، اعمال کا مدار نیت پر ہے؛ اس لیے نیت خالص دعوت دین کی ہونی چاہیے۔

(د) بحث میں معاملہ جنگ وجدال تک نہ پہنچے، اس لیے کہ ہمارا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے، اللہ رب العزت نے اپنے رسول ﷺ کے بارے میں صاف صاف فرمادیا کہ

"فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ" (الرعد:۴۰)۔

(پس آپ کے ذمہ صرف احکام کا پہونچا دینا ہے اور داروگیر کرنا ہمارا کام ہے)۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا کہ اعلان کردیجئے:

"قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ" (الانعام:٦٦)۔

(کہہ دیجئے کہ میں تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں)۔

(ہ) کفر وشرک اور معبودان باطل پر تنقید کرتے وقت مداہنت کو راہ نہ دی جائے اور حق وباطل کے اختلاط سے گریز کیا جائے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

"وَلَا تَلْبِسُوْا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (البقرۃ:۴۲)۔

(اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت رکھو حق کو، حالاں کہ تم جانتے ہو)۔

(و) کسی خاص شخص کو نشانہ نہ بنائے، بلکہ عمومی تنقید فکر پر کی جائے، شخص پر نہیں، بہت ضروری ہو تو ان صفات کا ذکر کر دیا جائے جس سے وہ شخص مشخص ہوجائے، البتہ نام لینے سے ممکنہ حد تک پرہیز کرے؛ کیونکہ مقصد فرد کی دل آزاری نہیں، پورے

نظام کی خرابی بیان کرنی ہے، جس کے لوگ معتقد ہیں۔ قرآن کریم کا لب ولہجہ بیش تر جگہوں پر تنقید کے سلسلے میں یہی ہے اور حضور اکرم ﷺ کا خطاب بھی "مابال أقوام" کے لفظ سے ہوا کرتا تھا، اللہ رب العزت کی تنقید کا یہ طریقہ دیکھئے:

"اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ یَّھْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ" (الجاثیہ: ۲۳)۔

(بھلا دیکھ تو جس نے اپنا حاکم اپنی خواہش کو ٹھہرالیا، اور اللہ نے اس کو راہ سے جانتے بوجھتے ہٹا دیا، اس کے دل اور کان پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر اندھیرا مسلط کر دیا، تو اللہ کے سوا ایسے کو کون راہ پر لا سکتا ہے، سو کیا تم غور نہیں کرتے)۔

(ز) تنقید کا مقصد اصلاح حال ہو، تنقیص اور تحقیر نہیں، روئے زمین کے سب سے بہتر انسان اور سب سے بڑے داعی کا معمول یہ تھا کہ اللہ کا پیغام جس تک پہنچاتے اسے حقیر نہیں سمجھتے تھے:

"وکان رسول اللہ ﷺ لا یحقر أحدا یبلغه رسالات اللہ تعالی" (ابونعیم فی دلائل النبوۃ)۔

(آپ جسے خدا کا پیغام پہنچاتے اسے کبھی حقیر نہیں سمجھتے تھے)۔

(ح) تنقید کرتے وقت بھی ترغیب کا پہلو غالب رہے؛ تاکہ لوگ نفرت کے بجائے مسرت اور تنگی کے بجائے فراخی محسوس کریں اور ان کے قلوب اللہ کی پیدا کردہ آسانی اور اس کی بے پایاں رحمتوں سے فیض یاب ہونے کے لیے پرامید ہوں، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"بشروا ولا تنفروا یسروا ولا تعسروا" (بخاری: بعث معاذ الی الیمن)۔

(خوش خبری سنائیو، متنفر نہ کیجیو، آسانی کریو، تنگی مت پیدا کیجیو)۔

(ط) مذاکرہ میں ساری توجہ بینہ، دلیل اور برہان پر مرکوز رکھی جائے اور بات وہ کی جائے جو حق اور درست ہو، اس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذاکرہ کو سامنے رکھنا چاہیے۔

(ی) گفتگو کا معیار وہ رکھا جائے، جو سامعین اور مخاطب کے لیے قابل فہم ہو، ژولیدگی اور چیستاں بنانے سے احتراز کیا جائے، جو کچھ کہا جائے دو اور دو چار کی طرح واضح ہو، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ جو سنتا، سمجھ لیتا۔

"کان کلام النبی ﷺ فصلا یفهمه کل من یسمعه" (ابوداؤد)۔

(نبی ﷺ کا کلام اتنا واضح ہوتا کہ ہر سننے والا اس کو سمجھ لیتا)۔

(ک) گفتگو کرتے وقت اسلامی اخلاق کے برتنے کا التزام کرے، جوش میں نہ آئے، غضبناک نہ ہو، بدگمانی میں نہ پڑے؛ بلکہ اپنی بات نرم روی کے ساتھ رکھے، کیونکہ اس طرح لوگوں کے قلوب قبول حق کے لیے تیار ہوتے ہیں اور لوگوں کے لیے رجوع کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۵۹)۔
(اور اگر آپ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے)۔
دوسری جگہ ارشاد ہے:
"وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" (النحل: ۲۵) (اوران سے بہتر طریقے سے گفتگو کیجئے)۔
مفسرین نے لکھا ہے کہ جدال بالاحسن کا مطلب درشتی وتلخی سے بچتے ہوئے نرم ومشفقانہ لب ولہجہ اختیار کرنا ہے۔
(ل) گفتگو امن وامان کی فضا میں کیا جائے، بدامنی کا ماحول نہ بنایا جائے، تہدید اور وعید کا ذکر نہ کرے۔
شیخ محمد حسن رقیط لکھتے ہیں:

"نیز ایسے تشدد سے بچنا جس سے کسی جھگڑے اور تنازعہ کا اندیشہ ہو، یہ مذکورہ باتیں باہمی گفتگو (مکالمہ) کے آداب میں سے ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ہدایت پا جانے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ جنگ وجدال میں پھنس گئی ہو، اسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا اور فرمایا یہ حدیث درجہ کے اعتبار سے حسن صحیح ہے" (قضایا معاصرۃ فی میزان الاسلام ۱۰۱)۔

(م) کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو ذمہ دارانہ اقدام کے منافی ہو اور جس سے بغض وعدوان مستفاد ہوتا ہو، اسی طرح مذاکرۃ کرنے والے کو ان تمام آراء سے پرہیز کرنا چاہیے؛ جو الٰہی طریقے سے میل نہ کھاتا ہو اور جو فسق وفجور اور فتنوں کی طرف لے جانے والا ہو، اسی طرح ان آرا سے بھی گریز کرنا چاہیے؛ جو گمراہی، بدعت اور خواہشات نفس کی تکمیل کی دعوت دینے والی ہو۔

"اور باہمی گفتگو (مکالمہ) کے آداب میں احساس ذمہ داری کے ساتھ کسی کا جارحانہ پہلو اختیار نہ کرنا بھی ہے؛ چنانچہ ایسی آزاد خیالی سے بچا جائے گا؛ جس سے طریقۂ خداوندی متصادم ہوتا ہو اور نہ کسی ایسی رائے میں آزادی دی جاسکتی ہے جس سے کوئی باطل رواج پائے، یا کسی فتنہ کا اندیشہ ہو، اسی طرح جس سے کوئی گمراہی، بدعت یا خواہش نفسانی کا پہلو سامنے آئے" (قضایا معاصرۃ فی میزان الاسلام)۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:
"من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه فهو رد" (رواہ البخاری)۔
(جس نے ہماری باتوں میں جسے میں نے نہیں کہی اضافہ کیا ہو تو وہ باتیں مقبول نہیں، امام بخاریؒ نے اسے روایت کیا)۔
دوسری جگہ ارشاد ہے:
"ولعن رسول اللہ ﷺ من یأوی محدثا أی مبتدعا فی الدین"
(اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے شخص پر لعنت بھیجی ہے، جس نے دین میں کسی نئی بات کا اضافہ کیا ہو)۔
۶۔ مشترکہ سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر

مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنا درست ہے؛ تاکہ مختلف مذاہب کے لوگ ایک ساتھ مل کر ان سماجی مسائل کے حل کے لیے جدوجہد کریں، یہ مذاکرہ انسانی احترام واکرام اور سماجی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مفید ہے اور اس سے دوریاں ختم ہونے کے امکانات بھی کثیر ہیں۔

اس کی دلیل حلف الفضول، میثاق مدینہ اور حلف خزاعہ کی تجدید ہے، حلف الفضول جنگ فجار کے چار ماہ بعد بعثت نبوی سے بیس سال قبل ہوا تھا، یہ مختلف قبیلوں کے درمیان ہوا تھا، یہ قبائل تھے بنو ہاشم، زہرہ، تمیم بن مرۃ وغیرہ، یہ متحدہ محاذ مظلوموں کی مدد اور ظالموں کے مقابلے کے لیے بنا تھا، اس محاذ کی تشکیل میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر حضور ﷺ بنفس نفیس شریک تھے، آپ ﷺ کا اس معاہدہ کے سلسلہ میں عہد اسلام میں یہ ارشاد بڑی اہمیت رکھتا ہے:

"قال :لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم ولو ادعى به في الإسلام لأجبت" (بیہقی :۳٦٧٦)۔

(فرمایا: عبداللہ بن جدعان کے مکان پر میں اس معاہدہ میں شریک تھا، یہ معاہدہ سرخ اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے؛ اگر عہد اسلامی میں بھی مجھے ایسے معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں اس کو قبول کروں گا)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مشترکہ انسانی اور سماجی مسائل کے لئے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مذاکرات کی گنجائش ہے اور مذاکرات کے نتیجے میں معاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے؛ لیکن یہ بات ملحوظ رکھنی ہوگی کہ معاہدہ میں کوئی چیز خلاف شرع نہ ہو اور مباح چیزوں کے ترک پر بھی کوئی دفعہ اس میں شامل نہ کیا گیا ہو۔

میثاق مدینہ بھی لمبے مذاکرہ کے بعد بقاء باہم کے اصول پر ایک معاہدہ ہے، گو اس مذاکرہ اور معاہدہ میں اسلام غالب قوت نظر آتا ہے اور فیصلے کا اختیار حضور ﷺ کو حاصل ہوتا ہے؛ لیکن اس سے غیر مسلموں کے ساتھ مشترکہ سماجی مسائل میں اتحاد اور مذاکرہ کے جواز کا پتہ چلتا ہے، صلح حدیبیہ کے موقع سے حلف خزاعہ کی تجدید اور توثیق سے بھی اس قسم کے مذاکرہ اور معاہدہ پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

(۷) درج بالا واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سیاست میں حصہ داری اور سماجی انصاف کے لیے دیگر مذاہب کی نمائندہ شخصیتوں یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت وشنید اور مذاکرہ کیا جاسکتا ہے؛ البتہ مذاکرہ کے نتیجے میں جو معاہدہ ہو، اس میں کوئی دفعہ اسلام مخالف نہ ہو، اس کا خیال رکھنا ہوگا، اس سلسلے میں ان دنوں کم سے کم مشترکہ لائحۂ عمل Comon Menimom Program پر سیاسی جماعتیں متحد ہوتی ہیں، اسی طرح کے مشترکہ نکات پر جو اسلام مخالف نہ ہو، گفت وشنید کی جاسکتی ہے۔

(۸) پردے کا جو تصور اسلام میں ہے، اس پر عمل کا تقاضہ صرف مسلمانوں سے ہے، دوسرے مذاہب کے مرد وعورت پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، موجودہ صورت حال میں ہم انہیں اس قسم کے پردہ پر مجبور بھی نہیں کر سکتے، اس لیے ان کا اسٹیج پر موجود رہنا بین

مذہبی مذاکرات میں شرکت سے مانع نہیں ہوگا،لیکن جو مسلمان اس مذاکرہ میں شریک ہے، اسے اسلامی حکم غض بصر اور اختلاط سے حتی الامکان احتراز کرنا ہوگا، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

"قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ" (النور) (ایمان والے مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں)۔

رہ گیا اختلاط؛ تو اس سے حقیقتاً بچنا تو ممکن نہیں، البتہ حکماً بچا جا سکتا ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہو کہ اپنی نشست خواتین مقرر کے پہلو کے بجائے مردوں کے ساتھ رکھے، بین مذہبی مذاکرات میں اس قدر احتیاط کے ساتھ شرکت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، شیخ محمد حسن رقیط لکھتے ہیں:

"البتہ ایسا اختلاط جس کی اجازت مذہب اسلام میں دی گئی ہے اور گذشتہ زمانے میں مسلم عورتوں کے بارے میں رائج رہا ہے، وہ ایسا اختلاط ہے جو شرعی مصلحت پر مبنی ہو اور جس سے کوئی جائز و درست نفع حاصل ہو، بایں طور کہ اس کے توسط سے معاشرہ کی ترقی اور تمدنی ارتقاء سامنے آئے" (قضایا معاصرہ فی میزان الاسلام ر ۱۱۴)۔

البتہ اگر مذاکرہ میں مسلم عورتیں نمائندگی کر رہی ہوں تو ان کے لیے لباس شرعی، غض بصر اور دوسرے اسلامی احکام کا التزام ضروری ہوگا، کیوں کہ سارے اسلامی احکام پر ان کے لیے عمل ضروری ہے؛ چنانچہ گفتگو میں لوچ اور بے محابا اختلاط سے گریز کرنا ہوگا؛ بلکہ درست یہ ہے کہ اس قسم کے مذاکرہ میں وہ شرکت سے گریز کریں اور یہ کام مردوں کو ہی کرنے دیں، بالفرض کوئی دوسری شکل نہ ہو تو پورے اسلامی احکام اور تہذیب و ثقافت کی پابندی کے ساتھ شریک ہوں۔

موجودہ حالت میں بین مذہبی مذاکرات —ضرورت واہمیت

مفتی انور علی اعظمی ☆

جواب(۱): مختلف مذاہب کے لوگوں سے مذہبی، سیاسی، سماجی ان تمام پہلوؤں پر مذاکرات ہو سکتے ہیں، کیونکہ اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے اللہ کا آخری پیغام ہے اس میں ان تمام پہلوؤں پر واضح ہدایات موجود ہیں، اس لئے اس دین کی نمائندگی کرنے والا اگر کتاب وسنت پر دسترس رکھتا ہے تو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں نہ مرعوب ہوگا اور نہ ان کا جواب دینے میں لاچار اور مجبور ہوگا، بلکہ اطمینان بخش گفتگو کرنے کی پوزیشن میں ہوگا۔

مذہبی، سیاسی، سماجی امور پر گفتگو کے نمونے کتاب وسنت میں موجود ہیں۔

مذہبی مذاکرے قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر مذکور ہیں، چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"قال له صاحبه وهو يحاوره أكفرت بالذى خلقک من تراب ثم من نطفة ثم سواک رجلا" (سورہ کہف:۳۷)۔

(ایک کافر سے اس کے مومن دوست نے کہا جب کہ وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا کیا تم نے اس ذات کا کفر کیا جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پیدا کیا پھر تمہیں ایک مکمل مرد بنا دیا)۔

"وقالوا أ إذا كنا عظاما ورفاتا أ إنا لمبعوثون خلقا جديدا قل كونوا حجارة أوحديداً أوخلقا مما يكبر فى صدوركم فسيقولون من يعيدنا قل الذى فطركم أول مرة فسينغضون إليک رؤوسهم ويقولون متى هو قل عسٰى أن يكون قريبا" (سورہ بنی اسرائیل:۵۱)۔

(اور کفار مکہ نے کہا: کیا جب ہم ہو جائیں گے ہڈی اور ریزہ ریزہ تو ہم اٹھائے جائیں گے نئی خلقت میں، آپ کہہ دیجئے تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا، یا کوئی اور مخلوق جو تمہارے دل میں بڑی معلوم ہو، پھر عنقریب وہ کہیں گے ہمیں کون لوٹائے گا تو آپ کہئے وہی ذات جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا پھر وہ اپنا سر ہلائیں گے اور کہیں گے ایسا کب ہوگا، آپ کہئے امید ہے کہ قریب ہی ہوگا)۔

مذہبی گفتگو کے اس جیسے بہت سے نمونے قرآن پاک میں موجود ہیں، سماجی پہلو پر اہل کتاب سے اللہ کے رسول ﷺ نے گفتگو فرمائی، بخاری شریف پر مذکور ہے:

☆ دار العلوم مئو، یوپی۔

''یہودی اپنے ایک مرد اور ایک عورت کو لے کر آپ ﷺ کے پاس آئے، ان دونوں نے زنا کیا تھا، آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم لوگ زانیوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہو؟ ان سبھوں نے کہا کہ ہم ان کے چہروں میں سیاہی پوتتے ہیں اور ان کو مارتے ہیں، تو آپ ﷺ نے کہا کہ کیا توراۃ میں رجم کا حکم نہیں ہے؟ تو ان لوگوں نے جواب دیا: ہم توراۃ میں اس طرح کی کوئی بات نہیں پاتے، عبداللہ بن سلام موجود تھے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، توراۃ لاؤ اور اس کو پڑھو اگر سچے ہو۔ توراۃ لائی گئی لیکن اس کے مدرس نے آیت رجم کو ہتھیلی سے چھپالیا، عبداللہ بن سلام نے اس کا ہاتھ وہاں سے ہٹایا اور کہا: یہ کیا ہے؟ پھر ان لوگوں نے دیکھا تو کہا: یہ آیت رجم ہے، پھر ان دونوں کو رجم کیا گیا'' (صحیح بخاری ۲/ ۶۵۴)۔

قرآن پاک نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے : ''**قل فأتوا بالتوراة فاتلوها إن كنتم صادقين**'' (آل عمران: ۹۳) (کہہ دو، لاؤ تورات اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو)۔

سیاسی پہلو پر اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی دوسرے مذاہب کے لوگوں سے بار بار گفتگو ہوئی۔

مدینہ جانے کے بعد یہودیوں سے معاہدہ، حدیبیہ میں قریش کے لوگوں سے معاہدہ، جسے صلح حدیبیہ کے نام سے ساری دنیا جانتی ہے، جس کو قرآن پاک نے فتح مبین قرار دیا، فتح مکہ سے قبل مختلف عربی قبائل جیسے بنوضمرہ، بنوخزیمہ وغیرہ سے معاہدہ، کتاب وسنت کے یہ دلائل اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ دیگر مذاہب کے لوگوں سے ان پہلوؤں پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔

بین مذاہب گفتگو کے اصول وآداب:

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے گفتگو کرنے والا دراصل اسلام کی نمائندگی کر رہا ہے اور اس کی حیثیت ایک داعی کی ہے، اس لئے اسے وہ تمام آداب ملحوظ رکھنا چاہئے جن کا دعوت تقاضا کر رہی ہے اور اس کو وہی انداز اپنانا چاہئے جو انبیائے کرام نے اختیار کیے، قرآن پاک میں اس کے آداب اس طرح مذکور ہیں:

''**وقل لعبادي يقول التي هي أحسن إن الشيطن ينزغ بينهم**'' (اسراء: ۵۳) (اور میرے بندوں سے کہئے وہ وہی بات کہیں جو انتہائی بہتر ہو، بے شک شیطان ان کے درمیان جھگڑا کرانا چاہتا ہے)۔

امام قرطبیؒ نے کہا کہ یہ آیت عمر بن الخطابؓ کے بارے میں نازل ہوئی، واقعہ یہ پیش آیا کہ کسی شخص نے ان کو گالی دی تھی اور برا بھلا کہا تھا اور حضرت عمرؓ نے اس کے قتل کا ارادہ کرلیا، پس ایک بڑا فتنہ بھڑکنے کے قریب تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری (الجامع لاحکام القرآن ۱۰/ ۲۷۶)۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا : ''**وجادلهم بالتي هي أحسن**'' (النحل: ۲۵) یعنی جو شخص بحث ومباحثہ کرنا چاہے تو چاہئے کہ جواب دینے والا مسلمان نرمی اور اخلاق کے ساتھ اس کو جواب دے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی کو یہی حکم دیا ہے کہ آپ ان سے بحث ومباحثہ کیجئے اسی طریقے پر جو انتہائی بہتر ہو۔

حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام جب فرعون کی جانب بھیجے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا: ''**فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشى**'' (طہ: ۴۴) (پس آپ دونوں اس سے نرم بات کیجئے تاکہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے)، حالانکہ

اللہ تعالیٰ اس کی شقاوت اور بدبختی کو جانتے تھے پھر بھی دونوں پیغمبروں کو نرم گفتگو کرنے کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے: ”وقولوا للناس حسنا“ (سورہ بقرہ: ۸۳) (اور لوگوں سے اچھی بات کہو)۔

علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ طلحہ ابن عمر نے عطاء ابن ابی رباحؒ سے کہا کہ آپ کے پاس مختلف قسم کے لوگ اکٹھا ہوتے ہیں اور میں مزاج میں تیزی رکھتا ہوں بعض لوگوں سے سخت بات کہہ دیتا ہوں تو حضرت عطاء نے ان سے کہا ایسا نہ کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے: ”وقولوا للناس حسنا“، اس آیت میں یہود ونصاریٰ بھی داخل ہیں ان کے ساتھ بھی ہم کو اچھی بات کرنے کا اور اچھے اخلاق سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔

غیر مسلمین سے گفتگو کرنے کی کچھ شرائط ہیں ان کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، تا کہ گفتگو نتیجہ خیز ہو اور اس سے دین کا نفع ہو، علماء کے نزدیک بین المذاہب مذاکرات کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔

(۱) علم (۲) استقامہ (۳) اخلاص (۴) الجہر بالحق (۵) گفتگو کے آداب کی پابندی

بین المذاہب گفتگو کی پہلی شرط علم ہے، جاہل شخص نفع سے زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے، اسی لئے اللہ رب العزت نے بغیر علم کے بحث کرنیوالے کی مذمت کی ہے: ”ومن الناس من يجادل في الله بغير علم ولا هدى ولا كتاب منير“ (سورہ حج: ۸)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بغیر علم بحث کرنے پر اہل کتاب کی مذمت کی ہے: ”يآاهل الكتاب لم تحاجون في إبراهيم وما أنزلت التوراة والإنجيل إلا من بعده أفلا تعقلون۔ هاأنتم هؤلاء حاججتم فيما لكم به علم فلم تحآجون فيما ليس لكم به علم والله يعلم وأنتم لا تعلمون“ (سورہ آل عمران: ۶۵-۶۶)۔

(اے اہل کتاب! کیوں تم لوگ ابراہیم کے بارے میں بحث ومباحثہ کرتے ہو، حالانکہ توراۃ وانجیل تو ابراہیم کے بعد اتاری گئی، کیا تم لوگ سمجھتے نہیں کہ جس چیز کے بارے میں تمہیں معلومات ہے اس میں تو بحث کرتے ہی ہو جس چیز کے بارے میں تمہیں معلومات نہیں اس میں کیوں بحث کرتے ہو، اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے)۔

قرطبی نے کہا: یہ آیت بغیر علم کے بحث ومباحثہ سے روکنے پر دلیل ہے۔

اسی طرح سے گفتگو کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صاحب بصیرت ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے کہا: ”قل هذه سبيلي أدعوا إلى الله على بصيرة أنا ومن اتبعني“ (سورہ یوسف: ۱۰۸) (اے نبی ﷺ! آپ کہیے: یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور میری اتباع کرنے والے بھی)۔

بین المذاہب گفتگو کرنے والے کے لئے دوسری شرط ہے ”استقامت على الحق“ حق پر جمے رہنا، اور جو حقیقت میں اللہ کی طرف دعوت دینے والا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ حق پر جما رہے اور حق کو مضبوطی سے پکڑے رہے، اس کے اندر کسی طرح کا فکری انحراف اور ذہنی کجی نہ ہو، کیونکہ صراط مستقیم سے انحراف کرنے والا نہ دین کی صحیح ترجمانی کرسکتا ہے اور نہ ہی دعوت کی ذمہ داریوں کو انجام تک پہنچا سکتا ہے۔

اگر داعی حق سے منحرف ہوگا تو اس کی باتیں لوگوں کو صحیح راستے سے بیزار کریں گی، کیونکہ لوگ دیکھیں گے کہ یہ جن چیزوں کی دعوت دیتا ہے خود ان پر عمل نہیں کرتا۔

تیسری چیز جو داعی کے لئے ضروری ہے وہ ''اخلاص'' ہے۔ کیونکہ اگر داعی اپنے ذاتی مقاصد اور دنیاوی نفع کے لئے یہ کام کرے گا تو پھر وہ بہت سی حقیقتوں کا کھل کر اظہار نہیں کرے گا، اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے تملک اور چاپلوسی کرے گا، اور حق کو بیان کرنے کے بجائے دین کے معاملے میں مداہنت کرے گا۔

''حق کا کھلم کھلا اظہار کرنا'' داعی کے لئے ضروری ہے۔ قرآن پاک میں پیغمبروں اور اللہ کے نیک بندوں کے جو واقعات مذکور ہیں اس سے یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔ اصحاب کہف کو بادشاہ نے اپنے دربار میں بلایا اور ان پر شاہانہ رعب ڈال کر پوچھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ ان لوگوں نے کہا: "**ربنا رب السموات و الأرض لن ندعوا من دونہٖ إلٰھا لقد قلنا إذا شططا**'' (سورہ کہف: ۱۴) (ہمارا پروردگار وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ہم اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں پکار سکتے اور اگر ہم نے ایسا کیا تو بہت غلط کیا۔

ایسے لوگ جو اللہ کا پیغام بغیر بزدلی اور بے خوفی سے پہنچاتے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی ہے: "**الذین یبلغون رسٰلت اللہ ویخشونہ ولا یخشون أحدا إلا اللہ و کفی باللہ حسیبا**'' (سورۃ الاحزاب: ۳۹) (وہ لوگ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے اور اللہ کافی ہے حساب لینے کے لئے)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے کہا: "**فاصدع بما تؤمر وأعرض عن المشرکین**'' (سورۃ الحجر: ۹۱) (جس چیز کا آپ کو حکم دیا جارہا ہے علی الاعلان کہتے رہیے اور مشرکوں سے اعراض کیجیے)۔

ایسے موقع پر جو لوگ حق کو چھپاتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے اللہ کے پیغام کو پہنچانے میں کوتاہی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی سخت مذمت کی ہے: "**إن الذین یکتمون ما أنزل اللہ من الکتاب ویشترون بہ ثمناً قلیلاً أولٰئک ما یأکلون فی بطونھم إلا النار**'' (سورہ بقرہ: ۱۷۴) (بیشک وہ لوگ جو اس کتاب کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کے بدلہ تھوڑا پیسہ حاصل کرتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے)۔

غیر مسلموں سے گفتگو کے وقت کھلم کھلا حق کا اظہار ہونا چاہئے، ورنہ بجائے نفع کے نقصان کا خطرہ ہے، گفتگو بین المذاہب کے لئے پانچویں چیز جو ضروری ہے وہ ہے ''گفتگو کے آداب کا لحاظ رکھنا'' **(ھذا ما عندی و اللہ اعلم بالصواب)**

دوسرے مذاہب کی کتابوں سے استفادہ:

جواب(۲): باہمی مذاکرات میں دوسری کتابوں کا حوالہ دینا اور ان سے استفادہ کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہ چیزیں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں موجود ہوں، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مختلف مواقع پر اہل کتاب کو اسی انداز سے مخاطب کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو محمد ﷺ پر ایمان لانے کی ترغیب دیتے ہوئے اسی بات کا ذکر کیا ہے کہ اس نبی امی ﷺ کا

ذکر ان کی کتابوں میں موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر ایمان لانے والے اہل کتاب کے افراد کی تعریف بھی کی ہے:

”ورحمتی وسعت کل شیء فسأ کتبها للذین یتقون ویؤتون الزکوة والذین هم بأ یتنا یؤمنون۔ الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والإنجیل، یأمرهم بالمعروف وینهون عن المنکر ویحل لهم الطیبات ویحرم علیم الخبئث ویضع عنهم إصرهم والأغلال التی کانت علیهم، فالذین أمنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذی أنزل معه أولٰئک هم المفلحون“ (سورہ الاعراف ۱۵۶:-۱۵۷)۔

(اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، پس عنقریب میں اس رحمت کو لکھ دوں گا ان لوگوں کے لئے جوڈرتے ہیں اورزکوۃ دیتے ہیں اور جولوگ ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے لوگ اس امی رسول اور نبی ﷺ کی پیروی کرتے ہیں، جس کو اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں جو ان کو حکم دیتا ہے بھلائی کا اور روکتا ہے برائی سے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان کے مردپر خبیث چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان سے اس بوجھ اور بیڑیوں کو اٹھاتا ہے جو ان پر تھیں، پس وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور ان کی تائید کیا اور ان کی مدد کیا اور اس نور کی اتباع کیا جو ان کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ کامیاب ہیں)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے توحید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے نبی ﷺ سے کہا کہ ان کو اسی متفق علیہ چیز کی دعوت دیجئے جو ان دونوں کے درمیان مشترک ہے: ”قل یا أهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا و بینکم أن لا نعبد إلا الله“ (اے نبیؐ! آپ کہیے کہ تم آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں)۔

توحید جو اہل کتاب اور مسلمانوں کے یہاں متفق علیہ عقیدہ ہے اور سارے انبیاء کی دعوت کا سب سے اہم حصہ ہے اہل کتاب نے اس بنیادی عقیدے کو بگاڑ ڈالا تھا، اللہ رب العزت نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے محمد ﷺ کی باتوں کو قبول کرنے کی ترغیب دی۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے بعض فروعی مسائل میں بھی ان کی کتابوں کا حوالہ دے کر اہل کتاب کو دین محمدی کی طرف لوٹنے کا حکم دیا ہے: ”کل الطعام کان حلا لبنی إسرائیل إلا ما حرم إسرائیل علی نفسه من قبل أن تنزل التوراة، قل فأتوا بالتوراة فاتلوها إن کنتم صادقین۔ فمن افتری علی الله الکذب من بعد ذلک فأولٰئک هم الظلمون“ (سورہ آل عمران: ۹۳-۹۴) (سارا کھانا بنو اسرائیل کے لئے حلال تھا سوائے اس کے جو حضرت یعقوبؑ نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا قبل اس کے کہ تورات اتاری جائے۔ اے نبی ﷺ! آپ کہیے کہ تورات لاؤ اور اس کی تلاوت کرو اگر تم سچے ہو، پس جو شخص اللہ پر جھوٹ گھڑے اس کے بعد وہی لوگ ظالم ہیں)۔

قرآن پاک میں اللہ رب العزت نے بیس سے زیادہ آیتوں میں اہل کتاب کو متوجہ کرنے کے لئے تورات و انجیل کا حوالہ دیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند آیتیں مزید ذکر کی جاتی ہیں:

”وکیف یحکمونک وعندهم التوراة فیها حکم الله“ (سورہ مائدہ: ۴۳) (اور کیسے وہ لوگ آپ سے فیصلہ کراتے

ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم ہے)۔

”وآتینا موسی الکتاب وجعلنه هدی لبنی اسرائیل أن لا تتخذوا من دونی وکیلا“ (سورہ بنی اسرائیل:۲) (اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دیا اور ہم نے اس کو بنایا بنی اسرائیل کے لئے ہدایت یہ کہ تم لوگ مجھے چھوڑ کر کسی اور کو کارساز نہ بناؤ)۔

”ولیحکم أهل الانجیل بما أنزل الله فیه ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الفسقون“ (سورہ مائدہ:۴۷) (اور تاکہ فیصلہ کریں انجیل والے اسی حکم کے ساتھ جو اللہ نے انجیل میں اتارا اور جو لوگ فیصلہ نہ کریں اس حکم کے ساتھ جو اللہ نے اتارا تو وہ فاسق ہیں)۔

قرآن پاک کی یہ صریح آیتیں مذاکرہ بین المذاہب کے درمیان ہماری مددگار ہوسکتی ہیں اور ہم ان کے سامنے ان مضامین اور مباحث کا حوالہ دے سکتے ہیں جو کتاب اللہ میں موجود ہیں۔

قرآن پاک نے ہمارے نبی ﷺ کا نام، ان کے اوصاف، ان کا مقام ہجرت واضح طور پر پچھلی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے: ”مبشرا برسول یأتی من بعدی اسمه أحمد“ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری سناتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا)۔ عیسائیوں نے انجیل سے اس حصہ کو غائب کر دیا تھا لیکن ابھی چند سال قبل ترکی میں انجیل کا ایک ایسا نسخہ ملا جس میں یہ بات موجود ہے اور روم کے پادریوں نے جانچ کے بعد اس کے صحیح ہونے کی تصدیق بھی کی ہے۔

اہل کتاب کے بارے میں ہے: ”یعرفونه کما یعرفون أبناءهم“ (یہ لوگ محمد ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) اور ظاہر ہے کہ یہ پہچان انھیں اپنی کتابوں سے حاصل ہوئی ہے۔

اسی لئے باہمی مذاکرات میں دوسرے مذاہب کی کتابوں سے استفادہ کرنے کی گنجائش ہے۔ ”وید“ جو ہندو دھرم کی مذہبی کتاب ہے اور جسے وہ لوگ سب سے مقدس مانتے ہیں اس پر متعدد مسلمان عالموں نے کام کیا ہے اور اس کے تراجم اور تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خالص توحید کا ذکر ہے۔ جنت اور جہنم کے بارے میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو قرآن وحدیث سے مطابقت رکھتی ہیں، اس کے متعدد اشلوک سورہ فاتحہ کی آیتوں سے ملتے ہیں جیسا کہ شمس نوید عثمانی نے اپنی کتاب ”اگر اب بھی نہ جاگے تو“ میں لکھا ہے (هذا ما عندی والله اعلم بالصواب)۔

اہل مذاہب کے مذہبی تقریبات میں شرکت:

جواب(۳): مذہبی رسوم واعمال میں ان کے تہوار بھی آتے ہیں، اسی طرح اس کی ارتھی کے ساتھ جانا اور چتا کو آگ لگانا، ان کے مرنے پر تیرہ دنوں کے بعد کھانے کی دعوت میں جانا مذہبی رسوم میں شامل ہے۔ جہاں تک تہواروں کی شرکت کا مسئلہ ہے اس کی بالکل گنجائش نہیں ہے، کیونکہ ان کے تہواروں میں شرک کا مظاہرہ ہوتا ہے، غیر اللہ کے نعرے لگائے جاتے ہیں، مورتیوں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، ان کی پوجا ہوتی ہے، یہ ساری باتیں توحید کے سراسر خلاف ہیں۔ اللہ رب العزت نے شرک کو سب سے بڑا اور ناقابل معافی گناہ قرار دیا ہے اور اس کی جانب معمولی میلان اور جھکاؤ کو بھی سخت جرم کہا ہے، اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے:"ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار ومالکم من دون اللہ من أولیاء ثم لاتنصرون"(سورہ ہود: ۱۱۳) (اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو لگے گی آگ اور کوئی نہیں ہوگا تمہارا اللہ کے سوا مددگار پھر کہیں تم مدد نہیں کیے جاؤ گے)۔

اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ اور تابعین سے چند اقوال منقول ہیں:

حضرت قتادہ نے کہا: ''ظالموں سے دوستی نہ کر''۔

ابن جریج نے کہا: ''ظالموں کی طرف کسی طرح کا میلان نہ رکھو''۔

ابوالعالیہ نے کہا: ''ان کے اعمال وافعال کو پسند نہ کرو''۔

عکرمہ نے کہا: ''ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو'' (معارف القرآن ۴/ ۶۷۳)۔

تفسیر ابن کثیر میں اس طرح مذکور ہے:

"قال علی بن طلحة عن ابن عباس لا تداھنوا۔ وقال العوفی عن ابن عباس ھو الرکون إلی الشرک۔ وقال أبو العالیة لا ترضوا بأعمالھم۔ وقال ابن جریر عن ابن عباس رضی اللہ عنہ لا تمیلوا إلی الذین ظلموا، وھذا القول حسن أی لا تستعینوا بالظلمة فتکونوا کأنکم رضیتم بأعمالھم" (تفسیر ابن کثیر ۲/ ۴۷۸)۔

مندرجہ بالا تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ظالموں کی طرف میلان ہرگز جائز نہیں، شرک سب سے بڑا ظلم ہے اور مشرکین سب سے بڑے ظالم ہیں، ان کے تہوار شرک کے پرچار اور اظہار ہی کے لئے منعقد کیے جاتے ہیں، لہٰذا ان میں جانا اس آیت کا اولین مصداق ہے۔

توحید خالص دین کی اصل ہے، اس میں کسی قسم کا نقصان بقاء دین کے لئے خطرہ کی گھنٹی ہے، ہمارے ملک کی بعض ریاستوں میں جہاں علماء کم ہیں اور جہالت عام ہے بہت سے مسلمان ان کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں۔

اس کے لئے ہمیں بے حد تیقظ اور بیدار مغزی کی ضرورت ہے تاکہ امت صراط مستقیم سے ہٹنے نہ پائے۔

کسی غیر مسلم کے مرنے کے موقع پر ان کے گھر پر جاسکتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرسکتے ہیں، ان کے بچے بیوی بے سہارا ہوں تو ان کی مالی مدد بھی کرنے میں کوئی حرج نہیں، ان کی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے ان سب کاموں کی گنجائش ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا إلیھم" (سورۂ ممتحنہ: ۸) (اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ تم ان سے کرو بھلائی اور انصاف کا سلوک)۔

ہندوستان جیسے ملک میں رہنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور موقع کے مناسب حکمت اپنانا ضروری

ہے، البتہ ارتھی کے ساتھ جانا، چتا کو آگ لگانے کے موقع پر وہاں رہنا، ان کی تیرہویں کے کھانے میں شامل ہونا ہمارے لئے درست نہیں، کیونکہ یہ سب ان کی مذہبی رسمیں ہیں، ہمارے مذہب کے خلاف ہیں، ہم کو ان سے دور رہنا چاہیے۔ پچھلے سمیناروں میں یہ مباحث طے ہو چکے ہیں (ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب)۔

مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے دستبرداری:

سوال نمبر (۴) میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے کس طرح کے اعمال کو ترک کرنے کے لئے پوچھا جارہا ہے، میں نے فقہ اکیڈمی کے آفس سے وضاحت چاہی تو وہاں سے تحریری طور پر کچھ باتیں بھیجی گئیں، مثلاً گائے کے ذبیحہ پر اصرار، ملی جلی آبادیوں میں مائک سے اذان دینا، رمضان میں جگانے کے لئے رات بھر اعلان کرنا، پندرہ شعبان کو نوجوانوں کے ذریعہ رات بھر ہنگامہ، غیر مسلم آبادیوں میں رات رات بھر کے مذہبی جلسے، میلاد النبی کا جلوس، محرم کا تعزیہ۔

جواب (۴): مذکورہ امور میں اکثر چیزیں ایسی ہیں جن کا کتاب وسنت سے تعلق نہیں ہے، جیسے میلاد النبیؐ کا جلوس، اور محرم کا تعزیہ یا پندرہویں شعبان کو نوجوانوں کے ذریعہ رات بھر کا ہنگامہ۔ صحیح العقیدہ مسلمان میلاد النبی ﷺ کے جلوس اور محرم کے تعزیہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، جو مسلمان ان پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں ان کو ایسے اعمال چھوڑنے پر آمادہ کرنا بہت بڑا نیکی کا کام ہے، امت مسلمہ ان کاموں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوجائے یہ سب کے لئے مفید ہے، اس کی ترغیب دینا ہماری ذمہ داری میں شامل ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے زمانے سے تعزیہ کے خلاف مہم جاری ہے اور بہت حد تک اس میں کامیابی بھی ملی ہے، لیکن اب بھی ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں یہ بدعت باقی ہے اور اس کو مکمل طور پر ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

عید میلاد النبیؐ کے موقعوں پر بھی ہندوستان کے مختلف شہروں میں اربوں روپئے غیر شرعی امور میں خرچ کیے جاتے ہیں، بمبئی، حیدرآباد، احمد آباد وغیرہ شہروں میں نبی ﷺ کی محبت کا حوالہ دے کر چندہ کرنے والے خوب پیسہ اکٹھا کرتے ہیں اور آرائش وزیبائش قمقمہ بجلی اور جلسہ جلوس کے نام پر دوسروں کی رقم کو پانی کی طرح بہاتے ہیں، ان امور پر کنٹرول کرنا اور سمجھا بجھا کر لوگوں کو صحیح دین کی طرف مائل کرنا نہ صرف ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ فساد سے بچنے کے لئے ضروری ہے بلکہ نبی ﷺ کے دین کا یہی تقاضا بھی ہے۔

ہندوستان کی جن ریاستوں میں گائے کے ذبیحے پر پابندی ہے اس کی قربانی پر اصرار کرنا ایک غیر ضروری کام ہے، مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ضرورت ہے، اسی طرح سے رمضان میں بعض جگہوں پر لاؤڈ اسپیکر کا غیر ضروری استعمال ہوتا ہے، دیر دیر تک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ نعت خوانی کی جاتی ہے، یہ بات بھی دوسرے مذہب والوں کے لئے پریشانی کا باعث ہے، بلا شبہ اس طرح کی چیزوں سے بھی احتیاط کرنا چاہئے، بعض جگہوں پر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سحری کے وقت میں جگانے کا کام لیا جاتا ہے، جہاں تک ہوسکے اس کام کے لئے بھی لاؤڈ اسپیکر کا محدود استعمال کرنا چاہئے۔

رات رات بھر کے جلسے بھی بعض علاقوں میں ہوتے ہیں، ایسے پروگراموں پر غیر مسلموں کو بھی اعتراض ہوسکتا ہے اور بہتیرے مسلمان بھی اس کو ناپسند کرتے ہیں، اس طرح کے امور میں ہمیں سنت نبوی سے سبق لینا چاہیے، صحیح حدیث میں وارد ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ عشاء کے پہلے سونا ناپسند کرتے تھے اور عشاء کے بعد بات کرنا ناپسند کرتے (ترمذی شریف)۔

مذہبی جلسوں کے لئے سب سے مناسب مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت ہے، عشاء کی نماز اپنے معمول سے آدھ گھنٹہ ایک گھنٹہ مؤخر کی جاسکتی ہے، ایسے پروگرام میں سب کو راحت ہوتی ہے، عشاء کے بعد جلسہ کرنا اصل مقصد کو فوت کردیتا ہے، شرکاء کے لئے دیر رات تک جگنے کی وجہ سے فجر کی نماز پڑھنا مشکل ہوتا ہے، اس لئے دینی جلسوں کے ذمہ داران کو دین کا مفاد مقدم رکھنا چاہئے، جلسہ کو رسم بنانا غلط ہے، اس کو دین کے صحیح طریقہ پر ہونا چاہئے۔

لاؤڈ اسپیکر سے اذان:

اذان ایک اعلان ہے، اذان میں تھوڑا سا وقت لگتا ہے، اذان سے ہندو مسلمان دونوں کوئی پریشانی نہیں محسوس کرتے، اذان دعوت عامہ اور دعوت تامہ ہے، اسلام کا سبق ہے، اس لئے ہمارا اپنی طرف سے اذان کے لئے مائک کے استعمال کی مخالفت کرنا درست نہیں ہے، اس وجہ سے مسلمانوں میں بھی ایک بڑا فتنہ پیدا ہوسکتا ہے اور فرقہ پرستوں کو ہمارے خلاف ایک بڑا ہتھیار مل سکتا ہے، اگر ان کی طرف سے کہیں مخالفت ہوتی ہے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کی مخالفت کی وجہ اسلام سے دشمنی تو نہیں ہے، وہ اپنے جلوس میں ڈی جے کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اور ایک ساتھ پچیس تیس اسپیکر لگا کر چلتے ہیں، سب کے کان پھٹنے لگتے ہیں، سرکار نے ڈی جے کے استعمال کو غیر قانونی قرار دیا ہے، لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے، اس ماحول میں اگر ہم مساجد سے مائک ہٹانے کی بات کریں گے تو عام مسلمانوں کے لئے اس کا قبول کرنا بہت مشکل ہوگا اور ہمارے لئے پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے، جب کہ اذان میں استعمال کیا جانے والا اسپیکر معتدل ہوتا ہے، اور اذان ایسے وقت نہیں ہوتی کہ لوگوں کی نیند میں عمومی خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہو (**ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب**)۔

مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کے کیا حدود و آداب ہیں؟

جواب (۵): اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں باطل پر تنقید کی ایسی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں جن میں باتیں بہت ٹھوس ہیں، لیکن دل آزاری کا انداز بالکل نہیں ہے: "**وقالوا أإذا كنا عظاماً ورفاتاً أإنا لمبعوثون خلقا جديدا۔ قل كونوا حجارةً أو حديدًا۔ أو خلقا مما يكبر فى صدوركم فسيقولون من يعيدنا قل الذى فطركم أول مرة، فسينغضون إليك رؤوسهم ويقولون متى هو قل عسى أن يكون قريباً۔ يوم يدعوكم فتستجيبون بحمده وتظنون إن لبثتم إلا قليلاً۔ وقل لعبادى يقولوا التى هى أحسن إن الشيطن ينزغ بينهم إن الشيطن كان للإنسان عدوًّا مبيناً**" (سورہ اسراء: ۴۹–۵۳)۔

(اور کہتے ہیں جب ہم (مرکر بوسیدہ) ہڈیاں اور چور چور ہوجائیں گے تو کیا ازسرنو پیدا ہو کر اٹھیں گے۔ کہہ دو کہ (خواہ تم) پتھر ہوجاؤ یا لوہا یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک بڑی سخت ہو، تو عنقریب وہ لوگ کہیں گے کہ کون ہے جو ہمیں جلائے گا؟ کہہ دو کہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا۔ تو تمہارے آگے اپنا سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ ایسا کب ہوگا؟ کہہ دو امید ہے کہ جلد ہی ہوگا، جس دن وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی تعریف کے ساتھ جواب دوگے اور تم گمان کروگے کہ (دنیا میں) بہت کم (مدت) رہے۔ اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ ایسی باتیں کہا کریں جو بہت پسندیدہ ہوں، کیونکہ شیطان ان میں فساد ڈلوا دیتا ہے، بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے)۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے سوالات کا انتہائی مکمل اور ٹھوس جواب دیا ہے اور ایک بنیادی عقیدہ بعث بعدالموت کو انتہائی مضبوطی کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن دل آزاری کا کوئی انداز نہیں ہے، اسی طرح سے توحید پر قرآن پاک میں بے شمار دلائل دیے گئے ہیں، پیغمبروں اور اللہ کے نیک بندوں کا مکالمہ اور آپسی گفتگو نقل کی گئی ہے لیکن ان میں دل آزاری کا کوئی شائبہ نہیں ہے، جیسے سورۂ اسراء کی یہ آیت ملاحظہ ہو: **"قل لو کان معه ألهة کما یقولون إذا لابتغوا إلی ذی العرش سبیلا"** (سورہ اسراء: ۴۲) (اے نبی ﷺ! آپ کہیے کہ اگر اللہ کے ساتھ دوسرے معبود ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تب وہ دوسرے خداعرش والے تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرتے، بڑی پاک ہے اللہ کی ذات اور خوب بلند و برتر ہے ان چیزوں سے جو وہ کہتے ہیں)۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے کہا ہے: **"تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم أن لا نعبد إلا الله"** (سورہ آل عمران: ۶۴) (آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں)، قرآن پاک میں بہت ساری جگہوں پر یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہہ کر مخاطب کیا گیا یہ خود ان کے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے، ایک آیت ملاحظہ ہو:

"یاأهل الکتاب قد جاء کم رسولنا یبین لکم علی فترة من الرسل أن تقولوا ما جاء نا من بشیر ولا نذیر، فقد جاء کم بشیر ونذیر والله علی کل شیء قدیر" (سورہ مائدہ: ۱۹) (اے اہل کتاب! تحقیق کہ تمہارے پاس ہمارا رسول رسولوں کی آمد کے ایک وقفے کے بعد آپہنچا جو تمہارے لیے صاف صاف بیان کررہا ہے تاکہ تمہاری یہ بات نہ رہ جائے کہ ہمارے پاس تو کوئی بھلائی برائی سنانے والا آیا ہی نہیں، پس اب تو یقینا خوشخبری سنانے والا اور ڈرانیوالا آپہنچا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

اہل کتاب کی گفتگو میں مندرجہ ذیل آداب کی رعایت ضروری ہے:

(۱) "نرم اور بھلی بات کہنا" اللہ رب العزت نے ہمیں اس کا حکم دیا، ایک جگہ ارشاد ہے: **"وقولوا للناس حسنا"** (سورہ بقرہ: ۸۳) (لوگوں سے بھلی بات کہو)۔

اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا اور کہا: **"فقولا له قولا لینا"** (سورۃ طہ: ۴۴) (تم دونوں اس سے نرم بات کہو)۔ آج کوئی کہنے والا موسیٰ و ہارون سے افضل نہیں ہوسکتا، کوئی مخاطب فرعون سے زیادہ B11

خبیث نہیں ہوسکتا۔

"قال الحسن: لین القول من الأدب الحسن الجمیل الخلق الکریم وھو مما ارتضاہ اللہ واحبہ۔ قال عطاء بن أبی رباح: من لقیب من الناس فقل لہ حسنا من القول" (جامع البیان ۱/ ۲۹۲)۔

قال ابن کثیر: "وجادلھم بالتی ھی أحسن" أی من احتاج منھم إلی مناظرۃ وجدال فلیکن بالوجہ الحسن برفق ولین وحسن خطاب" (ابن کثیر ۲/ ۵۹۲)۔

(ابن کثیر نے کہا کہ مذکورہ آیت میں ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص مناظرہ اور مباحثہ کرے تو اسے چاہیے کہ یہ کام خندہ پیشانی، نرمی اور اچھی گفتگو کے ساتھ انجام دے)۔

بین المذاہب گفتگو کے موقع پر یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی کافر کو کافر کہنے سے تکلیف ہوتی ہے تو ہم اس سے پرہیز کریں۔

فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے: "یقول نظام المفتی: لوقال لیھودی أو مجوسی یاکافر یأثم إن شق علیہ" (الفتاویٰ الہندیہ ۵/ ۳۴۸)۔

اس کو یہ گناہ اس بنا پر ہوگا کہ اس نے دعوت میں حکمت کا راستہ چھوڑ دیا، حالانکہ وہ اس کا مکلف ہے: "ادع إلی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" (سورۃ نحل: ۱۲۵) (اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ)۔

(۲) گفتگو کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ ہم ان کی برائی سے چشم پوشی کریں اور اس کے بجائے اچھی بات کہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولتسمعن من الذین أوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین أشرکوا أذی کثیرا، وإن تصبروا وتتقوا فإن ذلک من عزم الأمور" (آل عمران: ۱۸۶) (اور تم لوگ اہل کتاب اور مشرکین سے ضرور سنو گے تکلیف پہنچانے والی باتیں اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرو تو یہ یقیناً بہت بڑی ہمت کا کام ہے)۔

(۳) جس چیز کو اچھی طرح نہ جانتا ہو اس کے اندر مباحثہ کرنا منع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إن الذین یجادلون فی أیات اللہ بغیر سلطن أتاھم إن فی صدورھم إلا کبر ما ھم ببالغیہ فاستعذ باللہ إنہ ھوالسمیع البصیر" (سورۃ غافر: ۵۶) (بیشک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں میں بحث کرتے ہیں بغیر کسی ایسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ان کے دلوں میں تکبر کے سوا کچھ نہیں ہے اور وہ اپنے مقصد تک پہنچنے والے نہیں ہیں، آپ ایسے لوگوں سے اللہ کی پناہ مانگئے بیشک وہ بڑا سننے والا اور بڑا دیکھنے والا ہے)۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس نجران کے دو راہب آئے، آپ نے ان دونوں پر اسلام پیش کیا، ان میں سے ایک نے کہا: ہم آپ کے پہلے سے مسلمان ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم دونوں جھوٹے ہو تم کو اسلام سے تین چیزیں روکتی ہیں (۱) تمہارا صلیب کی عبادت کرنا (۲) خنزیر کھانا (۳) اللہ کے لئے بیٹا ماننا۔ آپ ﷺ کی بات پر عیسائی عالم نے کہا: من أبو عیسی؟ عیسی

کا باپ کون ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ کسی معاملے میں جلدی نہیں کرتے تھے جب تک اللہ کا حکم نہ آجائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ''إن مثل عیسی عند اللہ کمثل أدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون'' (آل عمران: ۵۹، رواہ الطبری فی تفسیرہ) (بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ کی طرح ہے، پیدا کیا ان کو مٹی سے پھر کہا اس سے ہوجا پس وہ ہوجاتا ہے)۔

(۴) گفتگو کرنے والے کے لئے اپنی گفتگو میں مخاطب کا اکرام کرنا اور اس کو اچھے القاب سے یاد کرنا یہ بھی ایک ادب ہے، جب عکرمہ بن ابی جہل اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے تو رسول ﷺ ان کے استقبال میں کھڑے ہوگئے، ان سے معانقہ کیا اور آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''مرحبا بالراکب المهاجر'' (ترمذی شریف: ۲۷۳۵)۔

اور عکرمہ کے باپ ابوجہل کو اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرح مخاطب کیا: ''یا أبا الحکم هلم إلی الله وإلی رسوله وإلی کتابه أدعوک إلی الله فناداه ﷺ بأحب الأسماء إلیه تألفا لقلبه'' (رواہ ابن ابی شیبہ فی المصنف: ۳۵۸۲۹)۔

(۵) اپنے مخالف کے ساتھ گفتگو میں نیچے اتر کر بات کرنا یہ بھی تنقید کے آداب میں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وإنا أو إیاکم لعلی هدی أو فی ضلل مبین'' (سورۃ سبا: ۲۴)۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ ایک شخص یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ میں سچا اور میرا مخاطب جھوٹا ہے لیکن مخاطب کو صراحتاً جھوٹا نہیں کہتا وہ کہتا ہے ''أحدنا کاذب'' رسول اللہ ﷺ یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ میں ہدایت پر ہوں اور میرے مخالفین گمراہی پر ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہی انداز سکھایا (قرطبی الجامع لاحکام القرآن ۱۴/۲۸۹)۔

مشترک سماجی مسائل پر مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات:

جواب (۶): مشترک سماجی مسائل جن سے نقصان کا تعلق کسی خاص مذہب کے ماننے والوں سے نہیں ہے بلکہ سب سے ہے، ان کے خلاف متحد ہوکر کام کرنا اور دیگر اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنا درست ہے، اس میں شرعاً کوئی رکاوٹ نہیں ہے، جیسے کرپشن اور بے حیائی عورتوں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی اہل اسلام کے نزدیک یہ امور منکرات کے قبیل سے ہیں، اور یہ منکر پر نکیر کرنا مسلمانوں کے فرائض میں شامل ہے، ہمارے ملک میں رشوت اور بے ایمانی کا دائرہ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ سرکاری دفاتر، سیاست داں، پولس محکمہ، عدالتیں کوئی ان سے پاک نہیں ہے، ہر جگہ یہ برائیاں موجود ہیں، ملک میں یہ برائیاں دن بدن بڑھ رہی ہیں، ان برائیوں پر آواز اٹھانا اسلامی مزاج کے عین مطابق ہے، اگر ہم ہندوستان جیسے ملک میں قائدانہ رول ادا نہیں کرسکتے ہیں تو دوسروں کے ساتھ مل کر یہ کام بخوبی کرسکتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے دین کی امتیازی خصوصیت ہے نیکیوں کا حکم کرنا اور برائیوں سے روکنا، سارے اچھے اخلاق کو فروغ دینا آپ کی سنت ہے اور سب تعاونوا علی البر والتقوی میں داخل ہے جس کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، بے حیائی اور عریانیت اس دور کی ایک عمومی بیماری ہے، جدید آلات جیسے ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ ان مقاصد کے لئے بھرپور استعمال کیا جارہا ہے، شیطان اور اس کے چیلے ان چیزوں کے فروغ دینے کے لئے باقاعدہ مشن

چلا رہے ہیں اور ٹھیک وہی صورت حال ہے جو قرآن نے بیان کی ہے: "**المنفقون والمنفقات بعضهم من بعض يأمرون بالمنكر وينهون عن المعروف**" (سورہ توبہ: ۶۷) (منافق مرد اور منافق عورتیں ان کا مشن اور مقصد ایک ہے، وہ برائیوں کا حکم دیتے ہیں اور نیکی کے کاموں سے روکتے ہیں)، اس کے برخلاف ایمان والوں کا مشن ہے اسے بھی قرآن پاک نے ذکر کیا ہے: {**والمومنون والمومنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر**" (سورہ توبہ: ۷۱) (مومن مرد اور مومن عورتیں سب ایک دوسرے کے مددگار ہیں بھلائی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں)۔ اللہ رب العزت نے ہر طرح کی بے حیائی سے منع کیا ہے، بلکہ اس کو حرام قرار دیا ہے: "**قل إنما حرم ربي الفواحش ما ظهر منها وما بطن**" (سورہ اعراف: ۳۳) (اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے ہر طرح کی بے حیائی کو حرام قرار دیا ہے چاہے وہ ظاہر ہو یا چھپی ہوئی)۔

لہٰذا بے حیائی اور عریانیت کے خلاف جدوجہد کرنا ہمارا بنیادی کام ہے اور ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کیا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کے ساتھ ظلم برداشت نہیں کیا ان کے حقوق کی رعایت کا حکم بھی دیا ہے، ابوداؤد شریف میں روایت ہے: "**عن سهل بن حنظلة قال مر رسول الله ﷺ ببعير قد لحق ظهره ببطنه قال اتقوا الله في هذه المعجمه فاركبوها صالحة وكلوها صالحة**" (ابوداؤد شریف: باب ما یؤمر بہ من القیام علی الدواب والبہائم) (سہل ابن حنظلہؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک اونٹ پر گذر ہوا جس کی پیٹھ پیٹ سے سٹ گئی تھی، آپ ﷺ نے کہا کہ ان بے زبان جانوروں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان پر اچھے حال میں سواری کرو اور ان کو اچھے حال میں کھاؤ)۔

جو مذہب جانوروں کے بارے میں اتنی رعایت کرتا ہو تو وہ انسانوں کے حقوق کی طرف سے کیسے غافل ہو سکتا ہے، اس لئے عورتوں مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ معاشرہ میں جو مظالم ہو رہے ہیں ان کے خلاف آواز اٹھانا اور ان میں قوت پیدا کرنے کے لئے دوسرے مذہب والوں کے ساتھ مذاکرہ کرنا بالکل درست ہے (**هذا ما عندي والله أعلم بالصواب**)۔

اسلام مخالف جماعتوں اور شخصیات سے مذاکرہ اور گفت وشنید:

جواب (۷): جمہوری ممالک مثلاً ہندوستان جیسے ملک میں مسلم قائدین کو دوسرے مذہب کی نمائندہ شخصیتوں یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت پیش آجائے تو ہمارے راہنماؤں کے لئے ان سے بات چیت کرنا بالکل جائز ہے، چاہے وہ سیاسی جماعت یا شخصیت اسلام مخالف ہی کیوں نہ ہو، سنت نبوی میں اس کی بھی مثالیں موجود ہیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے اسلام کے دشمنوں سے کئی مرتبہ بات کی تھی، متعدد مراحل کی گفتگو کے بعد صلح نامہ لکھا گیا، صلح نامہ میں حضرت علیؓ نے محمد رسول اللہ لکھ دیا، قریش کو لفظ رسول اللہ پر سخت اعتراض تھا، یہ کہا کہ اگر ہم ان کو اللہ کا رسول مانتے تو پھر ہمیں اختلاف ہی کیوں ہوتا، بالآخر اس کو کٹوا کر ہی دم لیا، اللہ کے رسول ﷺ نے اس موقع پر دب کر صلح کی،

حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کو نا گوار معلوم ہوا لیکن صلح اپنے انجام تک پہنچ گئی اور اللہ تعالی نے اس کو پسند کیا، واپسی میں راستہ میں ''إنا فتحنا لک فتحا مبینا'' اتار کر رسول اللہ ﷺ کو خوش کر دیا۔

صلح حدیبیہ ہمارے لئے بہت بڑی دلیل ہے اس بات پر کہ ہم مذہب اسلام کے مخالفین سے بوقت ضرورت گفتگو کر سکتے ہیں، ہمارے ملک میں بی۔ جے۔ پی۔ بھی اقتدار میں آسکتی ہے جیسے آج کل ہے، اس کی پشت پر آر۔ ایس۔ ایس۔ ہے، دونوں کی اسلام دشمنی عیاں ہے، جب سے یہ سرکار اقتدار میں آئی ہے فرقہ پرستوں کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک اسلامی مخالف ایجنڈا روز سامنے آتا ہے، کبھی گھر واپسی، کبھی لو جہاد، سوریہ نمسکار، گئو کشی یہ سارے ایجنڈے سامنے آچکے ہیں، ابھی معلوم نہیں پانچ سال میں اور کتنے مسائل سامنے آئیں گے۔ اس صورت حال میں ان کی اعلیٰ قیادت سے ملنے کی ضرورت یقینا پیش آسکتی ہے، وہ ملاقات مسلمانوں کے دفاع کے لیے ہوگی، اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں۔ ضرورت پیش آنے پر ہمارے قائدین کا ان سے ملنا بالکل جائز ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ جانے کے بعد یہودیوں سے بھی مل کر معاہدہ کیا تھا، عمرو ابن امیہ ضمری نے بیر معونہ کے واقعہ کے بعد جب مارنے والے قبیلہ کے دو آدمیوں کو انتقاماً قتل کر دیا تھا تو رسول اللہ ﷺ اسی معاہدہ کی بنیاد پر یہودیوں کے قبیلہ بنو قریظہ میں گئے تا کہ ان کے آدمیوں کی دیت میں ان سے مدد لیں۔

جس ملک میں ہم رہتے ہیں وہاں کی حکومت اور دیگر سیاسی جماعت سے ملنا کبھی کبھی شدید مجبوری بن جاتا ہے، ایسے مواقع پر نہ ملنا مضر ہوتا ہے، اس لئے اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ ملنے والے حضرات مذہب اور اہل مذہب کے حق میں مخلص ہوں اور اسلام کے بنیادی اصول میں متصلب اور مضبوط ہوں، آج کے دور میں قوم فروش اور ایمان فروش افراد کی کمی نہیں ہے، ایسے لوگوں کو ہماری قیادت کا حق نہیں ہے، مذہب اور قیادت کے اہل وہی لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں اور کتاب وسنت کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہوں۔

بین مذہبی مذاکرات کی مجلسوں میں خواتین مقرر سے پردہ:

جواب (۸): بین مذہبی مذاکرات کی مجلس یا پروگرام میں خواتین مقرر اگر اسٹیج پر موجود ہیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے غض بصر سے کام لیں، مصافحہ وغیرہ ہرگز نہ کریں، کیونکہ ہم ان کو روک نہیں سکتے یا ان کے آنے پر پابندی نہیں لگا سکتے، اپنی حد تک احتیاط کر سکتے ہیں، بہت سے ملکوں میں مختلف مقامات پر اس طرح کی مجبوریاں آتی ہیں، مجبوری اور ضرورت کی بنا پر اس کی گنجائش ہوگی، ہندوستان پاکستان میں اسمبلی اور پارلیامنٹ میں عورتیں الیکشن لڑتی ہیں، ہاؤس میں دونوں جمع ہوتے ہیں، غیر مسلم عورتیں تو شرعی احکام کی پابند نہیں ہیں، مسلمان عورتوں کا حال بھی پردہ کے معاملہ میں بہت اطمینان بخش نہیں ہے، تو کیا عورتوں کی بے پردگی کی وجہ سے مردوں کو ان کے عوامی اداروں میں جانے سے روک دیا جائے، یہی حال سرکاری آفسوں اور عصری تعلیم گاہوں

کا بھی ہے، ہمارے ملک میں ہر جگہ عورتیں پہنچ رہی ہیں، ان کے پردہ کا اہتمام نہ کرنے کی بنا پر مردوں کو روکا نہیں جاسکتا، مردوں کو احتیاط اور غض بصر کے ساتھ رہنے کی تلقین کی جائے گی۔

بس ٹرین کے اسفار میں بھی یہ مجبوریاں ہیں، عورتیں کہاں نہیں رہتیں اور سب کو شرعی پردہ کا مکلف بنانا ہمارے بس میں نہیں ہے، سفر کرنا ایک مجبوری ہے، فقہاء نے اسی طرح کی مجبوری کی بنا پر باندیوں کے پردہ کو ہلکا کردیا اور عام مردوں کے حق میں ان کا ستر وہی بتایا جو گھر کے اندر آزاد عورتوں کا ستر ان کے محارم کے حق میں ہے (ہدایہ ۴؍۴۶۴) پر مذکور ہے: "**وينظر الرجل من مملوكة غيره إلى ما يجوز أن ينظر إليه من دوات محارمه لأنها تخرج لحوائج مولاها وتخدم أضيافه وهي في ثياب مهنتها فصاحالها خارج البيت في حق الأجانب كحال المرأة داخله في حق محارم الأقرب**" (ہدایہ کتاب الکراہیہ ۴؍۴۶۲)۔

اور دوسری جگہ مذکور ہے:

"**لا بأس بأن تسافر الأمة وأم الولد بغير محرم لأن الأجانب في حق الإماء فيما يرجع إلى النظر والمس بمنزلة المحارم على ماذكرنا من قبل**" (کتاب الکراہیہ ۴؍۴۷۷)۔

ان تفاصیل کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ اسٹیج پر آنے والی عورتوں کو دیکھ کر اپنی پیاس بجھائی جائے اور لطف لیا جائے، بلکہ مسلمان مرد کے لئے غض بصر اور احتیاط بہرحال لازم ہے اور شہوت کے ساتھ دیکھنے کی اجازت ہرگز نہیں ہوگی، لیکن اگر وہ پروگرام میں آہی جاتی ہیں اور ہم نہ ان کو روکنے پر قادر ہیں نہ ہی شرعی پردہ کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور ہمارا اسٹیج چھوڑ کر جانا ہماری کمزوری پر محمول ہوسکتا ہے، تو بہرحال ہمیں اس صورت حال سے نمٹنے کا راستہ نکالنا ہوگا (**هذا ما عندي والله أعلم بالصواب**)۔

مذاکرہ بین المذاہب — محرکات، ضرورت واہمیت اور خدوخال

ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی ☆

تمہید:

اکیسویں صدی بہت سے اعتبارات سے گذشتہ صدیوں کی بہ نسبت زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنے تنوع، اثر پذیری، مابعد جدیدیت، وسائل کی فراوانی اور تکثیریت کی بنا پر ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے، دنیا کی طنابیں سمٹ چکی ہیں اور دنیا عالمی گاؤں (Global village) کی صورت اختیار کر چکی ہے، مختلف مذاہب، ثقافت اور تہذیبوں کی حامل قومیں اپنے اپنے دینی، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت میں سرگرم عمل ہیں، نسلی، تہذیبی اور نظریاتی اساس پر وجود میں آنے والی قومیں اپنی اپنی دلچسپیوں اور ترجیحات کے تناظر میں اپنا لائحہ عمل تیار کرتی ہیں اور ان کا دانشور طبقہ اس لائحہ عمل کی تنفیذ کی راہیں تلاش کرتا ہے اور حکمراں طبقہ ان کو نافذ کرتا ہے۔

بین المذاہب مذاکرہ ایک قدیم تاریخی روایت:

جن حضرات کی اقوام وملک کی تاریخ پر نظر ہے وہ اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہیں کہ بین المذاہب مذاکرہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی جڑیں قدیم تاریخی ادوار میں پیوست ہیں اور اس کی نظیریں ہمیں تاریخ کے صفحات میں ملتی ہیں، حضور اکرم ﷺ کی سیرت میں ایسے متعدد واقعات ہیں جن میں آپ کے اور مشرکین مکہ کے درمیان مذاکرہ کی تفصیلات موجود ہیں، جن میں ہمارے لیے اسوہ بھی ہے اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل کا درس بھی۔

بطور نمونہ چند واقعات یہاں پر نقل کیے جا رہے ہیں جن کا تعلق کفار مکہ اور بعض اہل کتاب اور حضور ﷺ کے درمیان مذاکرہ سے ہے۔

(الف) ایک بار عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابوسفیان، ولید بن مغیرہ، عاص بن ہشام، عاص بن وائل اور ابوجہل، ابوطالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ کا بھتیجہ ہمارے آباء واجداد کی توہین کرتا ہے، ہمارے بتوں کو برا کہتا ہے اور ہمیں احمق سمجھتا ہے، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان کی حمایت سے دست برداری اختیار کرلیں، ابوطالب نے سرداران مشرکین مکہ کے دباؤ میں آکر حضور اکرم ﷺ سے فرمایا کہ بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میں برداشت نہ کرسکوں، اس کے جواب میں حضور

☆ اورنگ آباد، مہاراشٹر۔

اکرم ﷺ نے فرمایا: ''خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھدیں تو میں اپنے اس عمل سے باز نہیں آسکتا، جب تک کہ یہ دین غالب نہ آجائے یا مجھے اس عمل کو انجام دیتے دیتے موت نہ آجائے'' (سیرت ابن ہشام)۔

سیرت نبوی کا یہ واقعہ مذاکرہ بین المذاہب کے سلسلہ میں اصولی حیثیت رکھتا ہے جس پر ہم آئندہ گفتگو کریں گے۔

(ب) ایک بار مکہ کا صاحب ثروت رئیس عتبہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو کا یوں آغاز کیا: ''میرے بھتیجے تم ہمارے درمیان جس حیثیت کے مالک ہو وہ تمہارے علم میں ہے، تم نے اپنی قوم کو ایک ایسے فتنے میں مبتلا کیا ہے جس نے ان کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے، تم نے ان کو، ان کے آباء واجداد کو بے وقوف واحمق ٹھہرایا، ان کے مذہب کی توہین کی، ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا، میں کچھ باتیں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں، شاید تمہیں کوئی بات قبول ہو، بھتیجے اگر تم اس کارروائی سے مال و دولت جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں اس قدر مال و دولت دیں گے کہ تو مکہ کا امیر ترین شخص بن جائے، اگر عزت و ناموری کی خواہش ہے تو ہم سب تمہیں اپنا رئیس ماننے کو تیار ہیں اور اگر تمہارا مقصود حصول حکومت ہے تو ہم تمہیں عرب کا بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہیں، غرض جو چاہو ہم کرنے کو تیار ہیں، مگر تم اپنے اس طریقے سے باز آجاؤ اور اگر تمہارے دماغ میں کوئی خلل واقع ہو گیا ہے یا آسیب یا جن وغیرہ کا اثر ہے جس کا علاج تمہارے بس میں نہیں ہے تو بتا دو ہم تمہارا علاج کرائیں گے اور اس کا سارا خرچ ہم برداشت کریں گے، اس کے بعد اللہ کے رسول نے فرمایا: ''آپ کو جو کہنا تھا کیا آپ کہہ چکے؟ عتبہ نے کہا: ہاں، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ آپ نے میرے سلسلے میں فرمایا ہے، اس میں ذرہ برابر صداقت نہیں ہے، نہ ہی میرا مقصود مال و دولت ہے، نہ جاہ وعزت اور نہ حکومت ہے اور نہ ہی میرے دماغ میں خلل ہے، پھر آپ نے سجدہ تک سورہ فصلت کی چند آیتیں تلاوت کیں'' (سیرت ابن ہشام جلد اول، تاریخ طبری جلد اول)۔

(ج) جناب ابوطالب سخت بیمار تھے، ابوجہل، ابوسفیان اور چند دیگر رؤسائے قریش عیادت کے لیے آئے اور کہا: ہم تو آپ کی عظمت کے قائل ہیں، آپ کے بھتیجے نے ہمیں سخت فتنے میں مبتلا کر رکھا ہے، اس نے اپنے اور قریش کے درمیان اختلاف کی ایک خلیج حائل کر رکھی ہے آپ بھی اچھی طرح اس سے واقف ہیں، بہتر ہے کہ آپ کے سامنے وہ اور ہم کوئی معاہدہ کرلیں، ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہے، ہمارے دین کی توہین نہ کرے، ہم ان کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالیں گے، ابوطالب نے حضور کو بلایا، آپ کے سامنے قریش کا موقف پیش کیا اور آپ کو اس کام سے باز رہنے کی تلقین کی، جب ابوطالب نے بات ختم کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: عم محترم! میری تو صرف ایک ہی بات ہے اگر قریش اسے مان لیں تو عرب و عجم دونوں ان کے زیر نگیں ہو جائیں، ابوجہل نے کہا: بتاؤ ہم ایک نہیں ایسی دس باتیں ماننے کے لیے تیار ہیں تا کہ اختلاف مٹ جائے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ یہ کہ تم لا إله إلا الله محمد رسول الله کو مان لو، جھوٹے خداؤں کا جوا گردن سے اتار دو، یہ سن کر ابوجہل نے کہا: اے محمد عجیب بات کہی تم نے، بھلا اتنے معبودوں کو چھوڑ کر ہم کیسے ایک خدا کی عبادت شروع کر دیں؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ (سیرت ابن ہشام جلد اول)۔

(د) صفوان بن عسال مرادی کہتے ہیں ایک یہودی نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ مجھے اس نبی کے پاس لے چلو ہم ان سے آیت : ”ولقد اٰتینا موسیٰ...“ کا مطلب دریافت کریں گے، وہ بولا! خدارا ایسا غضب نہ کرنا، انھیں نبی مت کہو، اگر کہیں انھوں نے تیری زبان سے نبی کا لفظ سن لیا تو وہ بہت مسرور ہوں گے، وہ دونوں حضور کے پاس آئے اور گفتگو کا آغاز کیا اور پوچھا کہ ان آیات ”ولقد اٰتینا موسیٰ...“ سے کیا مراد ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰؑ پر نازل کیے گئے ہیں، وہ احکام یہ ہیں: کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، کسی محترم جان کو ناحق قتل نہ کرو، سحر کا عمل نہ کرو، سود نہ کھاؤ، کسی بے گناہ کو پکڑ کر کسی حاکم کے پاس اس لیے نہ لے جاؤ کہ وہ اسے قتل کردے، کسی پاک باز عفیفہ عورت پر تہمت نہ لگاؤ، جہاد میں پشت نہ پھیرو اور ہاں تمہارے لیے ایک خصوصی حکم بھی ہے کہ شنبہ کے دن شکار کھیلنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے شریعت کے حدود مت توڑو۔ یہ سن کر یہودی نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک برحق نبی ہیں۔ یہ سن کر اللہ کے رسول نے فرمایا تو پھر میری اتباع میں تمھیں کون سی چیز مانع ہیں؟ یہودی نے کہا: حضرت داؤد کی یہ دعا کہ نبوت ہمیشہ انہی کی نسل میں رہے گی، ہمارے لیے مانع ہیں، اگر ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں تو ہمیں خوف یہ ہے کہ کہیں یہودی ہمیں مار نہ ڈالیں (مسند احمد، سنن ابوداؤد، ترجمان السنہ جلد دوم)۔

اسی طرح کتب سیرت میں کثرت سے وفود کا تذکرہ ملتا ہے جو حضور کی خدمت میں مختلف علاقوں سے حاضر ہوئے اور آپ سے متعدد امور پر گفتگو کی، ان وفود کے نام اس طرح ہیں:

(۱) وفد بنوتمیم (۲) وفد بنوعامر (۳) وفد سعد بن بکر (۴) وفد عبدالقیس (۵) وفد بنوحنیفہ (۶) وفد بنو طے (۷) وفد عدی بن حاتم (۸) وفد بنوزبید (۹) وفد کندہ (۱۰) وفد ازد (۱۱) بادشاہان حمیر کا قاصد (۱۲) وفد فروہ ابن عمر جذامی (۱۳) وفد بنو الحرس (۱۴) وفد ہمدان (۱۵) رفاعہ ابن زید جذامی (۱۶) وفد انصار اول (۱۷) وفد انصار ثانی (۱۸) وفد مزینہ (۱۹) وفد اسد (۲۰) وفد عبس (۲۱) وفد فزارہ (۲۲) وفد مرہ (۲۳) وفد ثعلبہ (۲۴) وفد محارب (۲۵) وفد کلاب (۲۶) وفد عقیل بن کعب (۲۷) وفد جعدہ (۲۸) وفد قشیر ابن کعب (۲۹) وفد بنو البکاء (۳۰) وفد کنانہ (۳۱) وفد بنو ابن عدی (۳۲) وفد اشجع (۳۳) وفد باہلہ (۳۴) وفد سُلیم (۳۵) وفد ہلال بن عامر (۳۶) وفد ثقیف (۳۷) وفد بکر ابن وائل (۳۸) وفد تغلب (۳۹) وفد شیبان (۴۰) وفد تُجیب (۴۱) وفد خولان (۴۲) وفد جُعفی (۴۳) وفد صداء (۴۴) وفد صدف (۴۵) وفد خُشین (۴۶) وفد سعد ہزیم (۴۷) وفد بلیّ (۴۸) وفد بہرا (۴۹) وفد عذرہ (۵۰) وفد سلاماں (۵۱) وفد جہینہ (۵۲) وفد کلب (۵۳) وفد جرم (۵۴) وفد غسان (۵۵) وفد سعد العشیرہ (۵۶) وفد عنس (۵۷) وفد الواربین (۵۸) وفد الرہاویین (۵۹) وفد غامد (۶۰) وفد نخع (۶۱) وفد بجیلہ (۶۲) وفد خثعم (۶۳) وفد اشعریین (۶۴) وفد حضرموت (۶۵) وفد ازدعان (۶۶) وفد غافق (۶۷) وفد بارق (۶۸) وفد دوس (۶۹) وفد ثمالہ وحداں (۷۰) وفد اسلم (۷۱) وفد مہرہ (۷۲) وفد نجران (۷۳) وفد جیشان۔

(ابن ہشام، طبقات ابن سعد)

اسی طرح آپ ﷺ نے مختلف افراد اور سربراہان مملکت کے نام خطوط بھی روانہ فرمائے، خطوط بھی مذاکرہ یا حوار کے ضمن میں آتے ہیں جن کی تفصیلات اس طرح ہیں:

(۱) النجاشی کے نام (۲) قیصر روم کے نام (۳) کسری بن ہرمز کے نام (۴) مقوقس کے نام (۵) الحارث بن ابی شمر الغسانی کے نام (۶) ہوذہ بن علی الحنفی کے نام (۷) جیفر وعبد نبی الجلندی کے نام (۸) المنذر بن ساوی العبدی کے نام (۹) اہل ہجر کے نام (۱۰) اہل یمن کے نام (۱۱) اہالیان یمن کے نام (۱۲) جبلہ بن الأیہم کے نام (۱۳) ذی الکلاع کے نام (۱۴) اہل نجران کے نام (۱۵) ربیعہ بن ذی مرحب کے نام (۱۶) بنو لخم کے نام (۱۷) خالد بن ضماد الازدی کے نام (۱۸) عمرو بن حزم کے نام (۱۹) حصین بن اوس الاسلمی کے نام (۲۰) یزید بن الطفیل کے نام (۲۱) بنی قنان بن ثعلبہ کے نام (۲۲) عبد یغوث بن وعلہ کے نام (۲۳) زیاد بن الحارث کے نام (۲۴) یزید بن المحجّل کے نام (۲۵) قیس بن الحصین کے نام (۲۶) بنی قنان ابن یزید کے نام (۲۷) عاصم بن الحارث کے نام (۲۸) بنو معلویہ بن جرول کے نام (۲۹) عامر بن الاسود ابن عامر بن جُوین الطائی کے نام (۳۰) بنی جوین طائی کے نام (۳۱) بنی معن طائی کے نام (۳۲) بنی اسد کے نام (۳۳) جنادہ الازدی کے نام (۳۴) سعد ہذیم کے نام (۳۵) بنی زرعہ اور جہینہ کے بنی الربعۃ کے نام (۳۶) بنی جعیل کے نام (۳۷) الاسلم الخزاعی کے نام (۳۸) عوسجہ بن حرملہ الجہنی کے نام (۳۹) بنی شیخ کے نام (۴۰) بنی الجرمز بن ربیعہ کے نام (۴۱) عمرو بن معبد الجہنی کے نام (۴۲) بلال بن الحارث المزنی کے نام (۴۳) بدیل وبسر وسروات بنی عمرو کے نام (۴۴) العداد بن خالد بن ہوذہ کے نام (۴۵) مسیلمہ کذاب کے نام (۴۶) سلمہ بن مالک کے نام (۴۷) العباس بن مرداس کے نام (۴۸) ہوذہ بن نُبیشہ کے نام (۴۹) الأجب کے نام (۵۰) راشد بن عبد السلمی کے نام (۵۱) حرام بن عبد عوف کے نام (۵۲) الزبیر بن العوام کے نام (۵۳) نعیم بن سعود کے نام (۵۴) جمل بن رزام العدوی کے نام (۵۵) حصین بن نضلہ الاسدی کے نام (۵۶) بنی غفار کے نام (۵۷) بنی ہمزہ بن بکر کے نام (۵۸) الہلال صاحب البحرین کے نام (۵۹) اسیبخت بن عبداللہ صاحب ہجر کے نام (۶۰) اہل ہجر کے نام (۶۱) المنذر بن ساوی کے نام دوسرا خط (۶۳) العلاء بن الحضرمی کے پاس (۶۴) ضغاطر الاسقف کے نام (۶۵) بنی جنبہ یہود مقنا کے نام (۶۶) یحنہ بن روبہ اوسروات اہل ایلہ کے نام (۶۷) جبل تہامہ کے گروہ بندوں کے نام (۶۸) بنی غادیا کے نام (۶۹) بنی عریض کے نام (۷۰) بنی زہیر بن اقیش کے نام (۷۱) ابوظبیان الازدی الغامدی کے نام (۷۲) حبیب بن عمرو کے نام (۷۳) الولید بن جابر کے نام (۷۴) سمعان بن عمرو بن قریط کے نام (۷۵) فروہ بن عمرو الجذامی کے نام (۷۶) بکر بن وائل کے نام (۷۷) السعیر بن عداء کے نام (۷۸) الحارث بن کلال کے نام (۷۹) عبد القیس کے نام (۸۰) اقیال حضرموت کے نام (۸۱) نغاثہ بن فروہ کے نام (۸۲) مطرف بن الکاہن الباہلی کے نام (۸۳) نہشل بن مالک الوائلی کے نام (۸۴) بنو ثقیف کے نام (۸۵) سعید بن سفیان الرّعلی کے نام (۸۶) عتبہ بن فرقد کے نام (۸۷) سلمہ بن مالک السلمی کے نام (۸۸) بنی جناب کلبی کے نام (۸۹) مہری بن الابیض کے نام (۹۰) خثعم کے نام (۹۱) ثمالہ والحدان

کے نام (۹۲) بارق الازدی کے نام (۹۳) وائل بن حجر کے نام (۹۴) اہل نجران کے نام (۹۵) اکیدر کے نام (۹۶) یحنہ بن روبہ کے نام (۹۷) اہل اذرح کے نام (۹۸) اہل جرباء واذرح کے نام (۹۹) اہل مقنا کے نام (طبقات ابن سعد، المواہب اللدنیہ، الوفاء باحوال المصطفیٰ)۔

مذاکرہ بین المذاہب کے اسباب ومحرکات:

مشہور برطانوی مورخ آرنلڈ ٹوئن بی (A.J.Toynbee) نے اپنی کتاب ''تاریخ کا مطالعہ'' میں پوری دانشورانہ قوت اور مورخانہ جلال کے ساتھ مغربی مسیحی تہذیب کے دو مظاہر کا ان الفاظ میں تجزیہ کیا ہے:

(الف) یہ تہذیب پوری دنیا میں پھیل جانے کا وصف رکھتی ہے جس کے باعث آج وہ تنہا ایسی تہذیب ہے جو حقیقی طور پر عالمگیر ہو گئی ہے۔

(ب) یہ تہذیب جدید ترین وسائل و ذرائع کے حامل ہونے کے سبب مادی طور پر پوری دنیا کو جوڑ چکی ہے اور اس نے زمان ومکان پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔

عالم کاری یا عالمگیریت (Globalization) نے دو تصورات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے:

(الف) معاشی نظام، جمہوریت، حقوق انسانی، ماحولیات، متبادل اعتماد، بین الاقوامی تجارت، عالمی گاؤں، امن عالم کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایٹمی پھیلاؤ کی روک تھام اور دہشت گردی، تشدد اور انتہا پسندی کی سرکوبی۔

(ب) اس کا دوسرا تصور سیاسی اور نظریاتی ہے جس کے اثرات اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

ان تصورات کا واضح مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کے حامل افراد اپنی شناخت سے دستبردار ہو جائیں اور مغربی مسیحی تہذیب کو اپنے درد کا درماں سمجھیں اور مسلمان بحیثیت امت مسلمہ اپنی شناخت اور تشخص سے دستبردار ہو جائیں اور اپنے آپ کو عالمی گاؤں کے عالمی انسان کے قالب میں ڈھال لیں، اس طرح مغربی تصور کے مطابق عالمی سطح پر دو چیزیں وجود میں آئیں گی:

(الف) جدید عالمی نظام (New World Order)

(ب) جدید عالمی تہذیب (New Global Civilization)

اس وقت امریکہ اور اس کے تصوراتی حلیف ممالک کی ساری تگ ودو کا ماحصل جدید عالمی نظام اور جدید عالمی تہذیب کا نفاذ ہے، اور صورتحال یہ ہے کہ مسلمان اس وقت اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس تہذیبی یلغار کا مقابلہ کر سکیں، کیونکہ مغرب کے پاس وسائل کی فراوانی ہے اور قوت وطاقت کے وسیع ترسرچشمے سے وہ بہرہ ور ہے، اس لیے مذاکرہ کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی متبادل ہے۔ اسی لیے آج قومی اور بین الاقوامی سطح پر مذاکرات کا سلسلہ جاری ہے، کیونکہ مذاکرات کے ذریعے ہی گلوبلائزیشن کے مادی اور تہذیبی نقصانات کو آہستہ آہستہ کم کیا جا سکتا ہے، دوسرا طریقہ کار یہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ہم مذاکرات کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیں، اس دلیل کی روشنی میں کہ اسلامی تہذیب ایک مکمل تہذیب ہے، اس تہذیب

کے علم برداروں کو کسی دوسری تہذیب کے علم برداروں کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ منفی سوچ ہے اور اس لیے بھی کہ اکیسویں صدی نے تہذیب کے دائرہ کو اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ تمام گوشہ ہائے حیات اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں اور نہ چاہنے کے باوجود اس کے زیر سایہ زندگی کے شب و روز گذارنے پر مجبور ہیں۔

مذاکرہ بین المذاہب کے فریق:

حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم مذاکرہ کی میز پر آئیں اور اپنے خول میں بند رہنے یا سمٹ جانے کے بجائے فریق ثانی کے ساتھ مذاکرہ کے عمل کا آغاز کریں، کیونکہ گلوبلائزیشن کے اس دور میں جو عالمی مسائل پیدا ہو گئے ہیں کوئی حکومت یا چند حکومتیں اپنے وسائل یا طاقت کی بنیاد پر حل نہیں کر سکتیں، کیونکہ جب مسائل عالمی ہیں تو ان کے حل کی تدبیریں بھی عالمی طور پر مذاکرات کے ذریعہ ہی اختیار کی جا سکتی ہیں، مثال کے طور پر عورتوں اور بچوں کے حقوق، منظم جرائم کی روک تھام، تشدد کی وارداتوں اور دہشت گردی پر قابو پانے کی حکمت عملی، غربت، صحت اور شفاف پانی کی فراہمی، بحری اور فضائی قزاقی کے بڑھتے ہوئے واقعات یہ وہ مسائل ہیں جو تنہا کوئی حکومت اپنے وسائل کی بنیاد پر حل نہیں کر سکتی، اس لیے مذاکرہ میں ایک فریق امت مسلمہ ہوگی اور دوسرا فریق کسی بھی مذہب سے وابستہ تنظیمیں، افراد اور حکومتیں ہو سکتی ہیں، اس وقت دنیا میں جو مشہور مذاہب موجود ہیں اور جو کبھی بھی اسلامی تہذیب کی بیخ کنی کے سلسلے میں اسلام دشمن طاقتوں سے معاہدہ یا مفاہمت کا طریقہ کار اپنا سکتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) عیسائی مذہب (۲) یہودی مذہب (۳) تاؤ مذہب (۴) کنفیوشس مذہب (۵) شنٹو مذہب (۶) سکھ مذہب (۷) بدھ مذہب (۸) جین مذہب (۹) ہندو مذہب (۱۰) زرتشتی مذہب (۱۱) اور صابی مذہب۔

ان مذکورہ مشہور مذاہب میں قرآن پاک نے دو کے لیے اہل کتاب کی اصطلاح استعمال کی ہے یعنی عیسائی مذہب اور یہودی مذہب کے لیے اور بقیہ مذاہب قرآنی اصطلاح کے لحاظ سے غیر اہل کتاب ہیں اور اسلام نے بعض احکام میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کے درمیان فرق کیا ہے جن کی تفصیلات کتب تفسیر اور فقہ میں موجود ہیں۔

مذاکرہ بین المذاہب کا موضوع:

مذاکرہ سے پہلے مذاکرہ بین المذاہب کا موضوع متعین ہونا چاہیے، عالمی سطح پر مذاکرہ کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو اپنے مذہب اور فکر کی دعوت دے اور فریق ثانی سے اسے قبول کرنے پر اصرار کرے یا وحدت ادیان کی دعوت دے یا تہذیب جدید کی تشکیل نو پر غور و فکر کرنے پر آمادہ کرے، بلکہ اس کا ایک متعین ہدف اور مقصد ہونا چاہیے جس کی وضاحت سطور ذیل میں کی جا رہی ہے:

مذاکرہ بین المذاہب کا مقصد مختلف مذاہب اور افکار کے حامل افراد کے درمیان انفرادی اور اجتماعی سطح پر مثبت اور

صحت مند طرز فکر کی آبیاری کرنا اور اس کے لیے مناسب اور قابل عمل اعتماد سازی کا ماحول اور فضا تیار کرنا ہے، خدانخواستہ مذاکرہ بین المذاہب کا مقصد وحدت ادیان کی دعوت ہو یا کسی نئے دین کی ایجاد ہو، بلکہ اس کا مقصد پرامن بقائے باہم کے آفاقی اور کائناتی تصور کو عام کرنا اور تقویت پہنچانا ہونا چاہیے، تاکہ باہمی مشورہ سے ایسے وسائل تک رسائی حاصل کرسکے جن کے توسط سے دنیا امن وسلامتی کا گہوارہ بن سکے، جنگ وجدال اور تشدد سے نجات حاصل ہو سکے، دنیا سے افلاس وغربت کا خاتمہ ہو سکے، ماحولیاتی آلودگی سے گلوخلاصی ہو سکے اور انسانیت کو عظمت وشرافت اور اس کا کھویا ہوا وقار نصیب ہو سکے۔

مذاکرہ بین المذاہب سے پہلے ہدف کا تعین اس لیے ضروری ہے کہ ایک مسلمان مذاکرہ کے وقت فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ وحدت ادیان کی دعوت یا دین جدید کی دعوت کے مذاکرہ میں نہ شامل ہوسکتا ہے اور نہ اسے کسی بھی صورت حال میں قبول کرسکتا ہے، کیونکہ ان کا تصور دیگر ادیان کے حامل افراد کے تصور سے میل نہیں کھاتا، اسلامی مفکر ڈاکٹر طہ جابر العلوانی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اسلامی تصور اپنے ابتدائی ایام ہی سے ایک عالم گیر تصور ہے، عالمگیریت کا تصور اس کے تمام پہلوؤں میں رچا بسا ہوا ہے خواہ وہ اعتقادی ہوں یا شرعی، اسی طرح کائنات، انسان اور زندگی کے متعلق اسلام کے کلی نظریہ میں اس کی روح کارفرما ہے، عربوں کی زبان میں خود ان ہی میں سے ایک رسول پر جو ان کے مقدس شہر ام القریٰ (مکہ مکرمہ) میں رہ رہا تھا، قرآن مجید کا نزول ایک عرب شخص کے لیے اس پیغام کی عالمگیریت، اس کے عموم اور اس کی ہمہ گیری کے سمجھنے میں رکاوٹ نہیں بنا، وہ اس مشن کے ادراک سے قاصر نہیں رہا کہ اسے اس پیغام کا حامل بن کر اس کو روئے زمین کے چپے چپے تک پہنچانا ہے، وہ اس حقیقت کے سمجھنے سے بھی غافل نہیں رہا کہ یہ ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کی امت کی طرف منتقل ہوجائے گی جسے لوگوں کی بھلائی کے لیے برپا کی گئی ایک محوری امت (امت قطب) ہونا چاہیے، کیونکہ یہی امت تمام لوگوں کو ہدایت، حق اور تمام اقدار کے گرد جمع کرے گی جو اس پیغام میں مضمر ہیں“ (اسلام اور دیگر تہذیبیں ۳۱،۳۰)۔

اسلام کے اس آفاقی اور عالمگیر تصور کی شہادت انصاف پسند غیر مسلم مورخین نے بھی دی ہے، ولفرڈ کانٹویل اسمتھ (Wilfred Cantwell Smith) اپنی معرکۃ الآراء کتاب (New York Islam in Modern History 1957 p36,37) میں لکھتا ہے: ”مسلمانوں کی کامیابی ان کے مذہب کی داخلی کامیابی ہے، وہ صرف میدان جنگ میں فاتح نہیں ہوئے اور انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں پر ہی اثر نہیں ڈالا، بلکہ مقابلۃً مختصر عرصہ میں انھوں نے زندگی کو ایک ایسی مجموعی شکل دینے میں کامیابی حاصل کی جسے تمدن کہتے ہیں، اسلامی تہذیب کی تشکیل میں مختلف عوامل جیسے عرب، یونان، مشرق اوسط کی سامی تہذیب، ساسان ایران اور ہندوستانی عناصر نے حصہ لیا، مسلمانوں کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ان سب عناصر کو ایک ہم جنس طریقہ زندگی میں متحد کردیا اور اسے مزید ترقی دی، یہ اسلام تھا جس نے اس کی تکمیل کی اور اسے باقی رکھنے کی قوت فراہم کی، زندگی کے ہر رخ کو اس نے اسلامی شکل دی خواہ اس کے ترکیبی عناصر کی ماہیت کچھ بھی رہی ہو۔

اسلامی طرز زندگی نے معاشرہ کو وحدت وقوت عطا کی، متحد رکھنے والی اس قوت میں مذہبی قانون کو مرکزی مقام حاصل تھا جس نے اپنے طاقت ور اور متعین دھارے کے ذریعہ رسوم وعبادات سے لے کر ملکیت تک ہر چیز کو منضبط کر دیا، شرعی قانون نے اسلامی معاشرہ کو قرطبہ سے ملتان تک وحدت عطا کی، اس نے مسلم افراد کو بھی وحدت عطا کی اور اس کی زندگی کے سبھی اعمال کو ملکوتی رنگ دے کر بامعنی بنا دیا، معاشرہ کو تسلسل دے کر اس نے زمانہ کو بھی وحدت بخشی، سلاطین کا سلسلہ آتا اور جاتا رہا لیکن ان کی حیثیت ربانی احکام کے مطابق کرہ ارضی پر عمرانی زندگی کی تشکیل کی مسلسل کوشش میں محض ضمنی رہی''۔

اس لیے اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان گفتگو کے آغاز سے پہلے اصول وضوابط کا تعین ضروری ہے، کیونکہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اسلام کے سلسلہ میں مغربی اذہان میں تحفظات موجود ہیں اور مغربی ذہن مذاکرہ کے اسلامی ایجنڈہ کو مغربی تہذیب، جدید عالمی نظام، عالمی گاؤں اور بین الاقوامی اعتماد سازی کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتا ہے اور اسلامی تہذیب کے ساتھ مغرب کے اس معاندانہ رویے کے پس پشت سیاسی، اقتصادی اور عالمگیریت کی مصلحتیں ہیں۔

مذاکرہ بین المذاہب کی ضرورت واہمیت دور حاضر میں:

قدیم اور معاصر تہذیبی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ قدیم یونانی، رومی اور ساسانی تہذیبیں روایتی جبر واستبداد کے فلسفیانہ فکر کے تناظر میں انسانوں پر مسلط کی گئیں تھیں اور ان کو اس بات پر مجبور کیا گیا تھا کہ وہ اس تہذیبی فکر کو اپنے ذہن ودماغ میں جگہ دیں چاہے ان کی فطرت اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو اور آج مغربی تہذیب کا استبدادی عمل بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔ اس میں زمان ومکان اور وسائل کا فرق تو ہوسکتا ہے لیکن دونوں کی روح میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تہذیب کی اساس انسانی مقاصد کی تکمیل کی دعوت ہے جو تمام انسانوں کے درمیان مشترک ہے۔ اسلام نے اپنی مفتوح غیر مسلم رعایا کے مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی روایتوں کا مکمل تحفظ کیا کیونکہ اسلامی تہذیب دیگر تہذیبوں کو اپنے اندر ضم کر کے ان کے تشخص کو ختم کرنے کے تصور کی مخالف رہی ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں مغربی تہذیب دوسری تہذیبوں کو تحفظ فراہم کرنے کے تصور سے عاری ہے۔ اسلامی تہذیب کا یہی طرہ امتیاز ہے جس کی وجہ سے وہ مختلف تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی اکائیوں کو اسلامی تہذیب کی عالمگیریت کے دائرہ میں سمو لینے پر قادر ہوگئی اور بقول مفکر اسلام ڈاکٹر طہ جابر علوانی کہ اگر معاصر تہذیب کا نقطۂ کمال تکثیریت (Pluralism) کو تسلیم کرتا ہے تو اسلامی پیغام کی تکثیریت کا کمال یہ ہے کہ اس نے ماضی وحال ہر زمانہ میں نہ صرف تکثیریت کو تسلیم کیا ہے بلکہ اسے اپنانے کے ساتھ ساتھ عالمگیریت کی سمت میں متحرک وفعال بھی بنا دیا ہے تاکہ وہ مثبت انسانی تنوع کے دائرہ میں ایک متحرک عنصر کی شکل اختیار کرے (اسلام اور دیگر تہذیبیں ص ۴۸)۔

اس کے مقابلہ میں مغربی گلوبلائزیشن کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ مغربی تہذیب کو اقوام عالم پر ان کی مرضی اور خواہش کے بغیر تھوپ دیا جائے اور حالات کی ستم ظریفی کہئے کہ اس تہذیبی استعماریت کے شکار سب سے زیادہ مسلمان ہیں، کیونکہ وہ

ایک مستقل تہذیب اور مکمل دین کے حامل ہیں، اس لیے دیگر اقوام کے مقابلہ میں مغربی تہذیب اسلامی تہذیب پر زیادہ شب خون مارتی دکھائی دیتی ہے اور اس کے لیے بنیاد پرستی (حقیقت پسندی) جیسے القاب وضع کرتی ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اپنی ہی تہذیب کو تہذیب سمجھتی ہے اور دنیا میں پائے جانے والے ثقافتی تنوع کی نفی کرتی ہے اور اپنے تجربہ کو کائناتی تجربہ قرار دیتی ہے جس کے پس پشت سیاسی اور اقتصادی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں، ان حالات میں جب فریق اول فریق ثانی کو مساوی سطح دینے پر راضی نہ ہو تو پھر مساویانہ سطح پر مذاکرات کی کوشش کس طرح بارآور ہوسکتی ہیں۔

اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب کی سخت جانی اور ہزار کمزوریوں کے باوجود عالم اسلام کا اپنے مذہب پر ایمان وایقان اور اس کے تحفظ اور بقا کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کا عزم اور اسلام کو دین حق سمجھنے اور اس کو تمام ادیان عالم پر غالب کرنے کا وعدۂ خداوندی اور خاکستر قلب مومن میں پنہاں شعلہ وشرر، مغربی تہذیب کے علم برداروں کو اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے مذاکرہ کی میز پر لایا جائے اور ان کو گلوبلائزیشن کے مصنوعی آلہ تنفس (وینٹی لیٹر) کے استعمال پر مجبور کیا جائے اور ان کو یہ باور کرایا جائے کہ اگر آپ نے اس آلہ کو استعمال نہیں کیا تو آپ جینے کے حق سے محروم ہوسکتے ہے یا کیے جاسکتے ہیں، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مذاکرہ مغرب کی مجبوری ہے اور کسی بھی صورت میں عالم اسلام کی مجبوری نہیں ہے، لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ ہم مذاکرہ سے پہلوتہی کے قائل ہیں، بلکہ مذاکرات جس سطح پر بھی ہوں ہم پوری قوت سے اپنا نقطۂ نظر قرآن اور اسوۂ رسول کی روشنی میں پیش کرنے کے موقف میں ہیں، اس لیے ہم اس حقیقت کے اظہار میں حق بہ جانب ہیں کہ مسلمانوں کے امت قطب (محوری امت) ہونے کی حیثیت مغرب کے لیے مذاکرات کی اصل محرک ہے ورنہ جفا جو اور تغافل خو مغرب کی نظر التفات عالم اسلام کی طرف ہو اور وہ اسے مذاکرہ کی دعوت دے ایک ناممکن اور ناقابل فہم سی بات ہے۔

بہر حال مذاکرات کو امت مسلمہ، عالمگیر اسلامی تہذیب کے خط وخال کو واضح طور پر پیش کرنے کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرسکتی ہے اور مغربی تہذیب کے علم برداروں کے سامنے مغربی تہذیب کی استعماری سیاسی اور اقتصادی ناہمواری کو وضاحت کے ساتھ پیش کرسکتی ہے، کیونکہ عالمگیر اسلامی تہذیب کی اساس انصاف، آزادی اور مساوات ہے، جبکہ مغربی تہذیب کی پوری سیاست خود غرضی پر مبنی ہے اور مقصد تک پہنچنے کے لیے صحیح اور غلط ذرائع کا بے محابا استعمال کرتی ہے، افغانستان، عراق، شام اور فلسطین میں رونما ہونے والے واقعات سے اس حقیقت پر بصیرت افروز روشنی پڑتی ہے، ان باتوں کے ساتھ ساتھ مسلمان اس وقت اپنی تہذیب اور دین کے حوالے سے متضاد قسم کی صورت حال سے بھی دوچار ہیں، ایک طرف وہ مسلح جارحیت کے شکار ہیں اور دوسری طرف ان کو مذاکرہ کی میز پر لانے کی کوشش بھی جاری ہے، شاید اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہو کہ مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتی ہے اور مذاکرہ کے ذریعہ وہ اس حریف کو زیر کرنا چاہتی ہے اور اس مذاکرہ کو اس وقت تک جاری رکھنا چاہتی ہے جب تک کہ اس کو یہ محسوس بلکہ یقین نہ ہوجائے کہ اب اس تہذیب سے مغرب کو کوئی خطرہ نہیں ہے، اس لیے کہ اب یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ مغربی تہذیب کا حقیقی تصادم اس کے علم برداروں کی نظر میں اسلامی تہذیب سے ہے اور

مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کو انفرادی، اجتماعی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی سطح پر ختم کرنے کی کوششوں میں دن رات مصروف ہے اور مذاکرہ کو صرف ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے، جس کی تصدیق امریکی وزیر خارجہ کے ۴/مئی ۱۹۹۴ء کے اس بیان سے ہوتی ہے جو تحریک آزادی فلسطین اور اسرائیل کے درمیان اوسلو معاہدہ کے اصولوں کے نفاذ کے سلسلہ میں منعقد کیے گئے ایک جشن میں دیا گیا تھا، انھوں نے کہا: ''ہم مشرق وسطیٰ کے تنازعہ کے خاتمہ تک نہیں پہنچے ہیں، لیکن اس کی شکل تبدیل کر رہے ہیں، اس علاقہ میں قوت کو اس وقت تک بنیادی محرک سمجھا جاتا رہے گا جب تک اس خطہ میں مذاکرات کو اصل حیثیت حاصل نہیں ہو جاتی، یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ گفتگو تہذیبوں کا ہتھیار اور اس کی ترجمان ہوتی ہے''۔

یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو مذاکرہ کی دعوت دی جارہی ہے اور دوسری طرف عالم اسلام کو سیاسی اور فوجی اعتبار سے کمزور کر کے ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کی سازشیں بھی رچی جارہی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کو اندرونی طور پر غیر مستحکم کرنے کی بھی کوششیں جاری ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب عالم اسلام میں موجود اسلامی روح کو مذاکرات کے ذریعہ کچلنا چاہتا ہے اور اسلام کی ایسی تشریح چاہتا ہے جو مغرب کے مزاج وفکر سے ہم آہنگ ہو، اس پس منظر میں مذاکرہ کی ضرورت و اہمیت پہلے کے مقابلہ میں دوچند ہوگئی ہے۔

مذاکرہ بین المذاہب کے بنیادی خدوخال:

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیب کا تاریخ کے ہر دور میں رزم آرائی، جہاں بانی اور جہاں گیری سے گہرا تعلق رہا ہے، اسی لیے برطانوی مورخ آرنلڈ بہ بانگ دہل اپنی کتاب ''تاریخ کا مطالعہ'' میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ جنگ تہذیب کی پیداوار ہے، چونکہ تہذیب بہ ذات خود جنگ نہیں کرتی، لیکن اپنے پیروؤں کی عملی زندگی پر زبردست اثر ڈالتی ہے، اس لیے تصادم کے تناظر میں مذاکرہ کے وقت فریقین کی تہذیب کے خارجی و داخلی پہلوؤں کا ژرف نگاہی اور گہرائی سے مطالعہ اور فہم ضروری ہے، تا کہ ان اسباب ومحرکات کی تمام صورتیں گفتگو کے وقت پیش نظر رہیں، جن کی وجہ سے مذاکرات کی ضرورت پیش آتی ہے۔

۲۔ کفار اور اہل کتاب کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے جس میں کسی بھی قسم کا کوئی ابہام اور ایہام نہیں ہے، سورۂ ممتحنہ کی آیت نمبر ایک میں اللہ کا ارشاد ہے: ''**يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا عدوی و عدوكم أولياء تلقون إليهم بالمؤدة و قد كفروا بما جآء كم من الحق**'' (اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو، حالانکہ تمہارے پاس جو دین حق آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفتی محمد شفیع صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ''اس آیت میں لفظ کفار کو چھوڑ کر عدوی اور عدوکم کا عنوان اختیار کرنے میں اول تو اس حکم کی علت اور دلیل کی طرف اشارہ ہو گیا کہ اپنے اور خدا کے دشمنوں سے دوستی کی توقع رکھنا سخت دھوکہ ہے، اس سے بچو، دوسرے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ کافر جب تک کافر ہے وہ کسی مسلمان کا جب تک کہ وہ مسلمان ہے دوست

نہیں ہوسکتا، وہ خدا کا دشمن ہے، تو مسلمان جو خدا کی محبت کا دعویدار ہے، اس سے اس کی دوستی کیسے ہوسکتی ہے'' (معارف القرآن ۸/۴۰۱)۔

اسی سورۃ ممتحنہ کی آیت نمبر ۲ کی تفسیر میں فرماتے ہیں : ''ان لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ موقع پانے کے باوجود تمہارے ساتھ کوئی رواداری برتیں گے اس کا کوئی امکان نہیں ہے، ان کو جب کبھی تم پر غلبہ حاصل ہوگا تو ان کے ہاتھ اور زبان تمہاری برائی اور خرابی کے سوا کسی چیز کی طرف نہ اٹھیں گے، ''ودوا لو تکفرون'' اس میں اشارہ ہے کہ جب تم ان سے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو ان کی دوستی صرف تمہارے ایمان کی قیمت پر ہوگی، جب تک تم کفر میں مبتلا نہ ہوجاؤ وہ کبھی تم سے راضی نہ ہوں گے'' (معارف القرآن ۸/۴۰۲)۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: ''**یا أیها الذین آمنوا لا تتخذوا الیهود والنصاری أولیاء بعضهم أولیاء بعض ومن یتولهم منکم فإنه منهم**'' (اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، کیونکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، تو جو ان سے دوستی کرے گا وہ ان ہی میں شمار ہوگا)۔

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸ کی تفسیر کرتے ہوئے مفتی شفیع صاحب تحریر کرتے ہیں: دو شخصوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں:

(الف) ایک درجہ قلبی موالات یا دلی مودت ومحبت ہے، یہ صرف مومنین کے ساتھ مخصوص ہے، غیر مومن کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

(ب) دوسرا درجہ مواسات کا ہے، جس کے معنی ہیں ہمدردی وخیر خواہی اور نفع رسانی کے، یہ بجز کفار اہل حرب کے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہیں باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔

(ج) تیسرا درجہ مدارات کا ہے، جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہنچانا ہو یا وہ اپنے مہمان ہوں یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸ میں ''**إلا أن تتقوا منهم تقاة**'' سے یہی درجہ مدارات کا مراد ہے یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں ہے مگر ایسی حالت میں جبکہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چونکہ مدارات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے، اس لیے اس کو موالات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

(د) چوتھا درجہ معاملات کا ہے کہ ان سے تجارت یا اجرت وملازمت اور صنعت وحرفت کے معاملات کیے جائیں، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو، رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کا تعامل اس پر شاہد ہے (معارف القرآن ۲/۵۰-۵۱)۔

۳۔ مذاکرہ کے وقت اسلام پر ایمان اور ایقان واذعان کے ساتھ اس امر کا استحضار بھی ضروری ہے کہ دین اسلام حقائق پر

B12

مبنی ہے، اس کے عقائد اور اس کی تعلیمات شک وشبہ سے بالاتر صداقتیں ہیں، اس لیے کسی بھی مرحلہ میں ہمارا لہجہ معذرت خواہانہ نا ہو اور بغیر کسی پس وپیش کے اس حقیقت کا اظہار کریں کہ اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے اور اسے تمام مذاہب پر برتری حاصل ہے اور اپنی دینی حمیت اور غیرت کو کبھی بھی پژمردگی اور دور از کار تاویلوں کی رزم گاہ نہ بننے دیں۔

۴۔ مذاکرہ بین المذاہب کے وقت تہذیبوں کی اقدار پر جب ہم محو گفتگو ہوں تو ہماری ترکیز اسلامی تہذیب کی خصوصیات اور اس کے مزاج پر ہو، کیونکہ ہماری تہذیب کا اصل سرچشمہ دین ہے اور مسلمان اور دین کے رابطے کی اساس پر اسلامی تہذیب کی عمارت استادہ ہے۔

۵۔ میثاق مدینہ اور حلف الفضول کے تناظر میں حضور اکرم ﷺ کے فرمان مبارک کی روشنی میں پر امن بقائے باہم کے سلسلے میں ہم معاندانہ اور مخاصمانہ رویہ اپنانے کے بجائے ایسا وطیرہ اختیار کریں جس سے انتشار وافتراق کے عناصر کی حوصلہ شکنی ہو، باہمی اعتماد کی حوصلہ افزائی ہو اور عام انسانیت کے لیے جو چیزیں سودمند ہیں ان میں ہم دیگر اقوام کی تائید کے ذریعہ انسانیت کو مطلوبہ خوشحالی، امن وسکون اور روشن مستقبل عطا کرسکیں۔

۶۔ مذاکرہ کے دوران یہ بات بھی ہمارے ذہن ودماغ میں اچھی طرح راسخ رہے کہ گفتگو کے کسی بھی مرحلے میں ہم مرعوبیت کے شکار ہو کر دین کے کسی بھی حصے سے دستبرداری پر آمدگی کا اظہار نہ کریں، جیسا کہ بعض ملکوں میں نصاب سے قرآن پاک کی ان آیتوں کے حذف کرنے کا سلسلہ جاری ہے جن میں یہود ونصاریٰ کا تذکرہ ہے یا ان آیتوں کو حذف کیا جارہا ہے جن میں جہاد وقتال کا تذکرہ ہے، یہ طرز عمل غیر دانشمندانہ ہے اور اسلام کی روح کے منافی اور اسوۂ رسول کے منافی ہے۔

۷۔ مذاکرہ کے دوران کسی ایک مکتب فکر (School of thought) یا مسالک فقہیہ کو اپنا شعار نہ بنایا جائے، بلکہ اسلام اور امت مسلمہ کے وسیع تر مفاد کی خاطر قرآن وسنت کی عالمگیر حقیقتوں کو گفتگو کا محور بنایا جائے، تاکہ گفتگو ثمر آور ہو اور قرآن وسنت کی ہمہ گیر رہنمائی میں ہم قافلہ سالار بن کر عالم کی رہبری کا فریضہ انجام دینے کی پوزیشن میں آسکیں، ورنہ کسی ایک مسلک یا مکتب فکر کی ترجمانی اور اس پر اصرار کے نتیجے میں بعض دفعہ کسی لائحہ عمل کی تعیین مشکل ہوجاتی ہے۔

۸۔ آسانی اور یسر کے پہلو کو ترجیح دیں اور عسر اور تنگی کی راہ پر چلنے سے گریز کریں، اللہ کے رسول کا اسوہ ہمیں بتاتا ہے کہ "ما خير بين أمرين إلا اختار أيسرهما" جب آپ کو دو چیزوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ آسان پہلو کو اختیار کرتے اور مشکل سے اجتناب کرتے۔

۹۔ مذاکرہ کا آغاز فریقین غیر جانبدارانہ کریں، ایسا نہ ہو کہ دونوں کے ذہنوں میں پہلے سے ایک لائحہ عمل اور نتیجہ موجود ہو اور گفتگو کو اسی رخ پر لے جانے کی کوشش کریں یا فریقین کے ذہن محبت یا نفرت کے جذبات سے لبریز ہوں اور گفتگو پر اس کے اثرات مرتب ہوں۔

۱۰۔ فریق ثانی تہذیب کے تصادم کا قائل ہو یا تاریخ کے خاتمہ کا ہم اس ماحول میں ایسا کردار ادا کریں کہ اس سے

زوال پذیر تہذیبیں اپنے اپنے دائرہ کار میں انسانیت کی فلاح کا کام انجام دینے کی پوزیشن میں آسکیں اور غور وفکر کے ذریعہ تہذیبوں کے بہترین ثمرات اور زندہ عناصر کا سراغ لگا سکیں اور کسی بھی تہذیبی فریق کے ذاتی امتیازات اور خصوصیات کی بیخ کنی یا اسے اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کے بجائے ہم تہذیبوں کے درمیان ایسا نقطۂ اشتراک تلاش کریں جس سے عام انسانی تہذیب کی تشکیل کی راہ ہموار ہو۔

۱۱۔ مذاکرہ کی میز پر آنے سے پہلے فریقین ثقافتی تنوع، مساوات اور تہذیبوں کے درمیان اختلاف کے مسلمہ اصول کو علمی اور فکری طور پر تسلیم کریں، کیونکہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مغرب ثقافتی تنوع کی یکسر نفی کرتا ہے اور اپنی ہی تہذیب کو تہذیب سمجھتا ہے۔

۱۲۔ گفتگو اور مذاکرہ کے لیے ایسے افراد کو نامزد کیا جائے جن کی نظر پورے اسلامی اثاثے پر ہو اور وہ دور حاضر کے تمام افکار وتصورات سے براہ راست واقف بھی ہوں، ان کی معلومات کے ذرائع ثانوی نہ ہوں اور وہ وضاحت کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔

۱۳۔ مذاکرہ کار اہل کتاب اور دنیا میں موجود دوسرے مشہور مذاہب کے اصول ومبادی سے اچھی طرح واقف ہوں، تاکہ ان کی کتابوں کے حوالے کے ذریعہ ان کو قائل کرسکیں۔

۱۴۔ عربی اور دیگر مقامی زبانوں سے واقفیت کے ساتھ بین الاقوامی ایک یا کئی زبانوں میں اہل زبان جیسی مہارت رکھتا ہو، خاص طور پر اس زمانے میں انگریزی جو بین الاقوامی زبان ہے اس میں اچھی مہارت رکھتا ہو، کیونکہ زبان بھی اپنی ایک تاثیر رکھتی ہے۔

۱۵۔ انبیاء کرام کی دعوت کے حکیمانہ اسلوب اور قوموں کے ساتھ ان کی گفتگو کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقف ہو۔

۱۶۔ مختلف ادوار میں علماء اہل سنت نے فریق ثانی کے شکوک وشبہات کے اعتراضات کے جواب کے سلسلے میں کیا طریقہ کار اختیار کیا (جو کتابوں میں منضبط اور مندرج ہیں) اس پر مذاکرہ کار کی گہری نگاہ ہو۔

۱۷۔ اہل کتاب سے مذاکرہ کی صورت میں ان کے یہاں معتبر کتابوں کی روشنی میں ان کی کتابوں کی باہمی تضادات کی نشاندہی کی جائے، جیسا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ نے اپنی مایہ ناز کتاب اظہار الحق میں کیا ہے اور جو کتاب متعدد بار سعودی عرب سے شائع بھی ہوچکی ہے، اور علامہ ابن تیمیہ کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح اور دیگر کتابوں سے بھی جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، مدد لی جاسکتی ہے۔

۱۸۔ مذاکرہ کے دوران ''وجادلهم بالتي هي أحسن'' کے اصول پر سختی سے عمل کیا جائے، چاہے فریق ثانی گفتگو کے دوران عمداً بعض تعبیرات کے ذریعہ مشتعل کرنے کی کوشش کرے۔

مذاکرہ بین المذاہب کے اصول وشرائط:

اس وقت متعدد مذاہب اوران کے پیرو دنیا کے مختلف خطوں میں آباد ہیں ان سے گفتگو کے وقت درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔قرآن پاک کے حکم پر عمل کرتے ہوئے حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ سبیل رب کی دعوت دی جائے۔
۲۔عصبیت، بغض وعناد، ظلم وزیادتی اور تشدد سے کلی طور پر بچنے کی کوشش کی جائے۔
۳۔دلائل وبراہین کے ذریعہ ان کو مطمئن کرنے کی حتی الامکان سعی کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔
۴۔ایسا نقطہ اجتماع تلاش کیا جائے جس پر فریقین متفق ہوسکیں۔
۵۔دین ودنیا کے مسائل سے مکمل آگہی ہو۔
۶۔فکر میں سلامتی اور راست روی ہو، اس میں کسی بھی قسم کی کجی یا مرعوبیت کا شائبہ نہ ہو۔
۷۔حق تک پہنچنے اور اس کو تسلیم کرنے کا جذبہ موجود ہو۔

مذاکرہ بین المذاہب کا طریقہ کار:

مذاکرہ بین المذاہب کے سلسلے میں تین طریقہ کار اختیار کیے جاسکتے ہیں:

(الف) انفرادی سطح پر مذاکرہ: اس سے مراد یہ ہے کہ گفتگو انفرادی سطح پر ہو اور گفتگو کے دوران فرد فرد سے مخاطب ہو، وہ گفتگو بالمشافہ بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ آجکل ٹی وی وغیرہ پر اس طرح کی مجالس کا انعقاد عمل میں آتا ہے اور یہ گفتگو موبائل، ٹیلی فون اور انٹرنیٹ وغیرہ سے بھی انجام دی جاسکتی ہے۔

(ب) اجتماعی مذاکرہ: مذاکرہ کے اس عمل کو انفرادی سطح پر انجام دینے کے بجائے سمینار، کانفرنس، کارنر میٹنگ اور دوسرے ذرائع کے توسط سے بھی انجام دیا جاسکتا ہے۔

(ج) تحریری مذاکرہ: اس طریقہ کار میں گفتگو کے بجائے تحریر کے استعمال کے ذریعہ اپنی بات اور اپنے خیالات فریق ثانی تک پہنچائے جاسکتے ہیں، اس کی متعدد صورتیں آج موجود ہیں: جیسے خطوط نویسی، ایس ایم ایس، انٹرنیٹ اور دوسرے تحریری ذرائع۔

مذاکرہ کے اسالیب:

قرآن کریم اور سنت نبوی سے مذاکرہ کے متعدد اسالیب پر روشنی پڑی ہے:

۱۔تذکیری اسلوب:

یعنی ایسا اسلوب جس میں مخاطب کو اللہ کی نعمتوں کی یاددہانی کرائی جائے اور ان پر اللہ کے جو احسانات ہیں ان پر غور

کرنے کی دعوت دی جائے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ”یا بنی إسرائیل اذکروا نعمتی التی أنعمت علیکم وأنی فضلتکم علی العالمین“ (البقرۃ ۴۷) (اے اولاد یعقوب! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضلیت دی)۔

۲۔ترغیبی اسلوب:

قرآن پاک نے متعدد آیتوں میں دعوت کا ترغیبی اسلوب اختیار کیا ہے آیت قرآنی ہے: ”ولو أن أهل الکتاب آمنوا واتقوا الکفرنا عنهم سیاتهم ولأدخلناهم جنات النعیم ولو أنهم أقاموا التوراۃ والإنجیل وما أنزل إلیهم من ربهم لأکلوا من فوقهم ومن تحت أرجلهم منهم أمة مقتصدة وکثیر منهم ساء مایعملون“ (سورۃ مائدۃ: ۶۵۔۶۶) (اور اگر یہ اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کی تمام برائیاں معاف کر دیتے اور ضرور انھیں راحت وآرام کی جنتوں میں لے جاتے اور اگر یہ لوگ تورات، انجیل اور ان کی جانب جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے روزیاں پاتے اور کھاتے۔ایک جماعت تو ان میں سے درمیانہ روش کی ہے، باقی ان میں سے بہت سے لوگوں کے برے اعمال ہیں)۔

۳۔ترہیبی اسلوب:

قرآن نے ترغیب (رغبت دلانا) کے ساتھ متعدد مقامات پر ترہیب (خوف دلانا) کا اسلوب بھی اختیار کیا ہے، کیونکہ بعض دفعہ فرد یا جماعت پر ترغیب کے مقابلہ میں ترہیب کا اسلوب زود اثر اور دیر پا ہوتا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

”لقد کفر الذین قالوا إن الله ثالث ثلاثة وما من إله إلا إله واحد وإن لم ینتهوا عما یقولون لیمسنّ الذین کفروا منهم عذاب ألیم“ (سورۃ مائدہ: ۷۳) (وہ لوگ بھی قطعاً کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے، دراصل سواء اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں، اگر یہ لوگ اپنے اس قول سے باز نہ رہے تو ان میں سے جو کفر پر رہیں گے انھیں المناک عذاب ضرور پہنچے گا)۔

۴۔اظہار ناراضگی وناپسندیدگی کا اسلوب:

قرآن نے قوموں کو اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کی غرض سے ناراضگی اور ناپسندیدگی کے اسلوب کو بھی اپنایا ہے، کیونکہ بعض طبیعتیں اس اسلوب کی متقاضی ہوتی ہیں۔

”یا أهل الکتاب لم تکفرون بآیات الله وأنتم تشهدون یا أهل الکتاب لم تلبسون الحق بالباطل وتکتمون الحق وأنتم تعلمون“ (آل عمران ۷۱–۷۰)۔

(اے اہل کتاب تم (باوجود قائل ہونے کے پھر بھی) دانستہ اللہ کی آیات کا کیوں کفر کر رہے ہو، اے اہل کتاب باوجود جاننے کے حق و باطل کو کیوں خلط ملط کر رہے ہو اور کیوں حق کو چھپا رہے ہو)۔

۵۔ باہم مسلمہ اصول کی دہائی کا دعوتی اسلوب:

قرآن نے اہل کتاب کو ان اصولوں کی روشنی میں جو ان کے یہاں مسلم ہیں ایک میز پر آنے کی دعوت دی ہے تا کہ ان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا جائے کہ جس امر کی دعوت دی جا رہی وہ تمہارے اصولوں سے متصادم نہیں ہے، بلکہ تمہارے عقیدہ اور اصول کے عین مطابق ہے، تو پھر اس کو تسلیم کر لینے کی راہ میں کون سی چیز مانع ہے۔

"قل یا أهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا و بینکم ألا نعبد إلا الله و لا نشرک به شیئًا و لا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون" (سورہ آل عمران: ۶۴)۔

(آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالی کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، نہ اللہ تعالی کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی رب بنائیں، پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں)۔

مذاکرہ کے ذرائع اور اسوۂ رسول:

موقع محل کے اعتبار سے مذاکرہ کے لیے متعدد ذرائع اختیار کیے جاسکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ وہ شریعت سے متصادم نہ ہوں اور جائز ذرائع کے دائرہ میں آتے ہوں، اس سلسلہ میں اسوۂ رسول کے غائرانہ مطالعہ سے مذاکرہ کے متعدد ذرائع ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱) فریق ثانی کے سامنے قرآن پاک کی تلاوت۔
۲) سربراہان مملکت اور قبائل کے سرداروں کے نام خطوط کی روانگی۔
۳) فریق ثانی سے ان کی مجلسوں، گھروں اور بازاروں میں ملاقاتیں۔
۴) مرکز اسلام میں فریق ثانی کو آنے کی دعوت۔
۵) مختلف علاقوں سے آنے والے وفود وقبائل کا استقبال۔
۶) غزوات کے مواقع پر فریق ثانی تک پیغام رسانی کا عمل۔
۷) فریق ثانی کے مذہبی رہنماؤں سے ان کی کتابوں کے حوالہ سے گفتگو۔

دنیا کو اسلام کے دس بنیادی عطیات:

مذاکرہ کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ مجموعی طور پر اسلامی تہذیب کے دس بنیادی عطیات (Gifts) کو ذہن میں رکھے،

تا کہ وہ مرعوبیت سے پرے ہوکر آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکے، وہ عطیات یہ ہیں:

۱۔صاف اور واضح عقیدہ توحید۔

۲۔انسانی وحدت ومساوات کا تصور۔

۳۔انسانیت کے شرف اور انسان کی عزت وبلندی کا اعلان۔

۴۔عورت کی حیثیت عرفی کی بحالی اور اس کے حقوق کی بازیابی۔

۵۔ناامیدی اور بدفالی کی تردید اور نفسیات انسانی میں حوصلہ مندی اور اعتماد وافتخار کی آفرینش۔

۶۔دین ودنیا کا اجتماع اور حریف اور برسر جنگ انسانی طبقات کی وحدت۔

۷۔دین وعلم کے درمیان مقدس دائمی رشتے کا قیام واستحکام اور ایک کی قسمت کو دوسرے کی قسمت سے وابستہ کر دینا، علم کی تکریم وتعظیم اور اسے بامقصد، مفید اور خداترسی کا ذریعہ بنانے کی سعی محمود۔

۸۔عقل سے دینی معاملات میں بھی کام لینے اور فائدہ اٹھانے اور انفس وآفاق میں غور وفکر کی ترغیب۔

۹۔امت اسلامیہ کو دنیا کی نگرانی ورہنمائی، انفرادی واجتماعی اخلاق ورجحانات کے احتساب، دنیا میں انصاف کے قیام اور شہادت حق کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کرنا۔

۱۰۔عالمگیر اعتقادی اور تہذیبی وحدت کا قیام (تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، از: حضرت علی میاں ندویؒ ر ۲۱۔۲۰)۔

ان احسانات وعطیات کا تذکرہ کرنے کے بعد مفکر اسلام نے اسلامی تہذیب وتمدن کے بارے میں جس حیات پرور اور فکر انگیز حقیقت کا اظہار کیا ہے وہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے، وہ فرماتے ہیں:

"اسلام کی تہذیبی عطا اور انسانی تہذیب پر اس کے احسانات کی شرح اور قافلہ انسانیت کو زوال اور خودکشی سے بچانے اور اسے فروغ وترقی عطا کرنے کے سلسلہ میں اسلام کی عظیم خدمات کے ذکر کے بعد ایک ابدی اور تاریخی حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ انسانی تہذیب میں تاثیری عمل اور اس کا وقتاً فوقتاً از سر نو جائزہ لیتے رہنے اور اسے "قدیم صالح وجدید نافع" کا امتزاج عطا کرنے اور اسے تخریبی ومہلک عناصر اور فاسد ومضر رجحانات سے بچانے کا عمل مستقل اور مسلسل طور پر انجام دیا جانا چاہیے۔

دوسری علمی وتاریخی حقیقت یہ ہے کہ امت اسلامیہ اسلامی تہذیب پر اس حالت میں اثر انداز نہیں ہوسکتی کہ وہ خود دوسری تہذیبوں کے دسترخوان کی ریزہ چیں ہو اور ان کے سرچشمہ سے سیراب ہو رہی ہو اور ان کے اثرات میں گلے گلے ڈوبی ہوئی ہو، وہ اس صورت حال میں تو اوروں کو متوجہ بھی نہیں کرسکتی چہ جائیکہ وہ دوسری قوموں کو بھی اپنی تقلید پر آمادہ کر سکے ایسا اس وقت ہوسکتا ہے جب وہ پوری طرح اس بات پر ایمان رکھتی ہو کہ اس کی تہذیب وثقافت مستقل بالذات ہے اور ربانی وآسمانی خصوصیات رکھتی ہے، ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے مناسب ومفید ہے، مضبوط بنیادوں پر قائم اور کتاب وسنت سے ماخوذ اور ربانی ہدایات اور نبوی تعلیمات پر مبنی ہے اور اس میں عفت وطہارت کا ایک خاص تصور ہے، کیونکہ اس کی طہارت صرف نظافت کے مرادف نہیں ہے اور نہ اس

کے یہاں عفت کا مفہوم اخلاقی غلطیوں سے اجتناب تک محدود ہے، بلکہ اس کے وسیع معانی اور دوررس اور ہمہ گیر مفاہیم ہیں، اسلامی زندگی مغربی تہذیب سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی جس کا نشوونما مخصوص تاریخی عوامل کے زیر اثر اور ایسے ماحول میں ہوا ہے جس پر مادیت کا غلبہ تھا اور ایک طویل عرصہ تک اس پر مذہب دشمنی اور اخلاق وصالح اقدار سے بغاوت کی حکمرانی تھی جیسا کہ اس تہذیب اور اس کی تاریخ کے ایک بڑے واقف کار ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے کہا ہے ع

روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

تمام تمدنی سہولتوں اور نئی مصنوعات کی ایجادات اور سائنس کی معلومات اور اسلامی تہذیب کے جلال وجمال، سادگی وحقیقت پسندی، طہارت ونظافت پر توجہ، اسراف وفضول خرچی اور خارجی مظاہر اور نمائش سے پرہیز کا باہمی اتفاق واجتماع اس وقت بہت آسان ہے جب اسلامی حکومتوں اور معاشروں کو مستقل غیر تقلیدی وغیر عاجلانہ اور احساس کمتری سے دور رہتے ہوئے تمدنی منصوبہ بندی کی توفیق ہو اور ان میں ذہانت کی چمک اور اسلامی صفات اور اسلامی تہذیب کے اثر سے ایمان وانفرادیت موجود ہو جس کی وہ مرہون منت ہیں اور اس کے ساتھ ان میں اپنے اسلامی تشخص وامتیاز پر فخر کا جذبہ بھی کارفرما ہو" (حوالہ سابقہ ۱۳۷/۱۳۶-۱۳۷)۔

مذاکرہ بین المذاہب کے نتائج اور اس کی افادیت:

مذاکرہ ایک طویل المیعاد مسلسل عمل ہے اور چند مذاکرات کو اس سلسلہ میں کسی مثبت نتیجہ تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھنا حالات وواقعات سے ناواقفیت کی دلیل ہے، لیکن گلوبلائزیشن کے اس نازک دور میں بھی عالمگیر پیغام کی حامل ہونے کی حیثیت سے اس امت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ تہذیب کی تعمیر وتشکیل میں اپنے وجود اور کردار کو تسلسل کے ساتھ باقی رکھے اور دوسری تہذیبوں کے مابین اپنی تہذیبی عالمگیریت کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرے اور خیر امت ہونے کی حیثیت سے جو فریضہ اس پر عائد ہوتا ہے اس سے بہ حسن وخوبی سبک دوش ہو، تاکہ دنیا اسلامی تہذیب کے احسانات واثرات کی گرانباری کے اظہار پر مجبور ہو اور آزادی، انصاف اور مساوات کی عام انسانی قدروں کو اس کا صحیح اور جائز مقام ملے، ان مقاصد کے حصول کے لیے یا مطلوبہ مثبت نتائج تک رسائی کے لیے مذاکرہ ایک اہم ذریعہ ہے اور اپنے آپ میں مطلوب بھی اور اس لیے بھی کہ اسلامی تہذیب مذاکرات کے اس مسلسل عمل کی ہمت افزائی کرتی ہے، کیونکہ دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے اور حقائق تک رسائی کا بہترین ذریعہ مذاکرہ ہی ہے، اس لیے شدید اختلافات اور نقطہ نظر میں تضادات کے باوجود مذاکرہ کے عمل کو جاری رہنا چاہیے کہ اسی سے بہترین نتائج ظاہر ہوں گے، مفاہمت کی راہیں ہموار ہوں گی اور عالمگیریت کے اس دور میں انسانوں کے عام بنیادی مسائل اسی کے ذریعہ حل ہوں گے۔ وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین۔

دیگر مذاہب کے ساتھ مذاکرات — اصول وآداب

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی ☆

اللہ تعالی نے اس کائنات میں انسانوں کومختلف گروہوں، طبقوں اور ملتوں میں تقسیم کررکھا ہے، جو اس کی حکمت ومشیت کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے:

"ولو شاء ربک لجعل الناس أمة واحدة ولا یزالون مختلفین إلا من رحم ربک ولذلک خلقهم وتمت کلمة ربک لأملئن جهنم من الجنة والناس أجمعین"(سورہ ہود:۱۱۸)۔

(اور بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا، اور وہ برابر اختلاف ہی کرتے رہیں گے، اور اس سے صرف وہی لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے، اور اسی (آزادی انتخاب واختیار اور آزمائش) کے لیے تو اس نے انہیں پیدا کیا ہے، اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا)۔

اس لئے اسلام کا یہ ماننا ہے کہ عقیدے کے اختلاف کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی تمام لوگوں کو کسی ایک دین پر جمع کیا جا سکتا ہے، اور جبر و دباؤ کے ذریعہ کسی مذہب کو ختم کرنا اور مٹانا صحیح نہیں ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولو شاء ربک لآمن من فی الأرض کلهم جمیعا أفأنت تکره الناس حتی یکونوا مؤمنین"(سورہ یونس:۹۹)۔

(اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین کے تمام لوگ ایمان لے آئے ہوتے، تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا، یہاں تک کہ وہ مومن ہو جائیں)۔

اور ایک دوسری آیت میں ہے:

"فذکر إنما أنت مذکر لست علیهم بمسیطر"(سورہ غاشیہ:۲۲)۔

(اے نبی! تم نصیحت کیا کرو تمہارا کام صرف نصیحت کرنا ہے، تم ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو)۔

علامہ طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"تمہیں ان پر مسلط نہیں کیا گیا ہے، اور نہ ہی تم انہیں مجبور کرنے والے ہو کہ اپنی مرضی چلانے کے لئے ان پر جبر کرو" (جامع البیان ۱۶۶/۳۰)۔

☆ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ۔

نیز کہا گیا ہے:

"لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي" (بقرہ:۲۵۶)۔

(دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے، کیونکہ ہدایت اور ضلالت دونوں واضح ہو چکے ہیں)۔

اس لیے نبیوں اور داعیوں کی یہ ذمہ داری بتلائی گئی ہے کہ ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش ضرور کریں، لیکن کسی کے اعراض اور سرکشی سے دل گرفتہ اور ناراض نہ ہوں۔

"فإن تولوا فإنما عليك البلاغ المبين" (سورہ نحل:۸۲)۔

نیز اعراض اور قبول حق سے انکار کے باوجود بحیثیت انسان ہر شخص لائق احترام ہے، کیونکہ سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں، چنانچہ قرآن میں ہے:

"يا أيها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيراً ونساء" (نساء:۱)۔

(لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے)۔

"يا أيها الناس إنا خلقناكم من ذكر و أنثى وجعلناكم شعوباو قبائل لتعارفوا" (حجرات:۱۳)۔

(لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو چونکہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے، اس لئے بحیثیت انسان ہر ایک لائق احترام ہے)۔

اس لئے تمام لوگ بشر ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں، اگر ان میں کوئی فرق اور امتیاز ہے تو وہ صرف دینداری ارتقوی کے اعتبار سے۔

"إن أكرمكم عند الله أتقاكم" (حجرات:۱۳)۔

(بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)۔

انسانوں کے درمیان باہمی تعارف اور خوشگوار تعلقات کے لئے باہمی مکالمہ اور گفتگو ضروری ہے، اور مختلف ملتوں کے درمیان آویزش اور کشمکش اس راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، اور اسلام کی روح کے خلاف ہے جو کہ صلح و آشتی اور امن وسلامتی سے عبارت ہے، اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جنگ سے ممکن حد تک بچا جائے، اور دل میں جنگ کی خواہش کو پنپنے نہ دیا جائے اور نہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو مذہبی آویزش کی طرف گامزن ہو، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

"لاتتمنوا إلقاء العدو وسلوا الله العافية فإذا لقيتم فاثبتوا" (صحیح بخاری:۲۹۶۶، صحیح مسلم:۱۷۴۱)۔

(دشمن سے مڈبھیڑ کی خواہش مت کرو، اور اللہ سے عافیت کی دعا مانگا کرو، لیکن اگر جنگ ناگزیر ہو جائے تو پھر ثابت

قدم رہو)۔

غرضیکہ اسلام کی نگاہ میں انفرادی، اجتماعی، ریاستی، ملکی، عالمی، مذہبی اور سیاسی ہر طرح کی کشمکش اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے مذاکرہ اور گفتگو ایک بہترین راستہ ہے، چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی حضرت محمد ﷺ تک کے تمام نبیوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کے لئے مذاکرہ کے طریقے کو اپنایا، اور اس راہ میں انہوں نے ہر طرح کی مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کیں، اور اگر چہ بعض نبیوں کے لئے اس کی خاطر جنگ لڑنے کی نوبت بھی پیش آئی، لیکن جنگ اصل مقصد نہیں تھا، بلکہ مقصود اصلی مذہبی جبر کا خاتمہ اور بات چیت کے لئے فضا کو سازگار بنانا تھا۔

بین مذہبی مذاکرہ کے پیچھے تین طرح کے مقاصد ہو سکتے ہیں:

ا۔ دعوتی مذاکرہ:

تمام انبیاء کرام نے ''دین'' کی دعوت کے لئے مذاکرہ کے طریقہ کو اپنایا، جن کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے، جن میں سے حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت موسی علیہم السلام کا مذاکرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اور اپنے آخری رسول ﷺ کو خطاب کر کے اللہ تعالی نے فرمایا:

''ادع إلى سبيل ربک بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن إن ربک هو أعلم بمن ضل عن سبيله وهو أعلم بالمتهدين'' (النحل:۱۲۵)۔

(اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور لوگوں سے ایسے طریقے سے گفتگو کرو جو سب سے بہتر ہو، تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے)۔

اور حدیث میں ہے:

''جاهدوا المشركين بأموالكم وأنفسكم وألسنتكم'' (ابوداؤد:۲۵۰۴، احمد:۱۱۸۳۷)۔

(مشرکوں سے اپنے مال، اپنی جان اور اپنی زبان کے ذریعہ جہاد کرو)۔

مذکورہ آیت وروایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی گفتگو ایک دینی فریضہ ہے جسے اللہ تعالی نے اہل علم اور اہل بصیرت پر فرض قرار دیا ہے، علامہ ابن حزم مذکورہ حدیث کے سلسلہ میں کہتے ہیں:

یہ اعلی درجہ کی صحیح روایت ہے جس میں مباحثہ اور مذاکرہ کا حکم دیا گیا ہے اور یہ اسی طرح سے فرض ہے جس طرح سے کہ جسمانی جہاد (الاحکام ۱/۲۷)۔

لہذا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ دعوتی مذاکرے کے لئے پہل کریں اور اس کے لئے فضا کو سازگار بنانے کی کوشش کریں اور اس سلسلہ میں غیر مسلموں کی طرف سے آنے والے حالات کا صبر اور اعراض کے ذریعہ مقابلہ کریں۔

اصول وآداب:

دعوتی مذاکرے میں درج ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

ا۔ دعوتی اسلوب، نہایت، سنجیدہ، پرکشش، حکمت آمیز اور محبت ریز ہو، لب ولہجہ ناصحانہ اور انداز، رحم وکرم اور شفقت سے لبریز ہو، چنانچہ قرآن کریم میں عام طور پر یہود ونصاری کو "یا اہل الکتاب" جیسے معزز اور شفقت آمیز لقب سے خطاب کیا گیا ہے۔اور حضرت موسی وہارون کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے حکم دیا گیا ہے:

"**وقولا له قولا لينا**"(سورہ طہ:۴۴)(اس سے نرمی سے بات کرنا)۔

اس لئے داعی کے ذہن میں یہ رہنا چاہیئے کہ وہ حضرت موسی وہارون علیہما السلام سے افضل نہیں ہے اور نہ ہی اس کا مخاطب فرعون سے زیادہ بدتر ہے، اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے دعوتی خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو انہوں نے متعدد بادشاہوں کے نام لکھے ہیں، اور جو دعوتی اسلوب کا بہترین نمونہ ہیں۔

۲۔ داعی اور مخاطب، دونوں کے سامنے مذاکرے کا مقصد واضح ہونا چاہیئے کہ اس مذاکرے کا حاصل اسلام کا تعارف، اس کی دعوت وتبلیغ، اور غلط فہمیوں کا ازالہ اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش ہے۔

۳۔ مخاطب کے احساسات وجذبات اور مذہبی نظریات کا پاس ولحاظ رکھا جائے، اور ایسا کوئی رویہ اختیار نہ کیا جائے جس سے باہمی کشمکش اور نفرت پیدا ہو، اللہ تبارک وتعالی کا حکم ہے کہ:

"**ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم، كذلك زينا لكل أمة عملهم، ثم إلى ربهم مرجعهم فينبئهم بما كانوا يعملون**"(سورہ انعام:۱۰۸)۔

(اور ان لوگوں کو گالی مت دو جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جہالت کی بنا پر دشمنی میں اللہ کی شان میں گستاخی کرنے لگیں، اور ہم نے اسی طرح سے ہر گروہ کے لئے اس کے عمل کو خوش نما بنا دیا ہے، پھر انہیں اپنے رب کی طرف پلٹ کر آنا ہے، اس وقت وہ انہیں بتادے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں)۔

علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں ان تمام چیزوں کو برا بھلا کہنے اور گالی دینے سے منع کیا گیا ہے، جسے دوسرے مذہب کے لوگ مقدس اور قابل احترام سمجھتے ہوں، اور امت مسلمہ کے لئے یہ حکم ہر حال میں باقی ہے، اور ایسا کرنا بطور تعظیم کے نہیں ہے بلکہ حکمت عملی اور دل جوئی اور غیر مسلموں کو قریب کرنے کا ایک ذریعہ ہے، لہذا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ عیسائیوں کے صلیب، ان کے مذہب اور ان کے عبادت خانوں کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کرے، بلکہ ان چیزوں تک پہنچانے والا بھی کوئی کام نہ کرے، اس لئے کہ ایسا کرنے میں دوسرے کو معصیت کے لئے اکسانا ہے، اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق پر قائم رہنے والے کے لئے بھی کبھی حق کہنے سے بچنا چاہیئے جبکہ اس کی وجہ سے کوئی دینی ضرر لاحق ہو (الجامع لاحکام القرآن ۶۱/۷)۔

اور اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسی اشعری کو دعوتی مقصد سے یمن روانہ کرتے ہوئے فرمایا:

"بشروا ولا تنفروا، یسروا ولا تعسروا" (صحیح بخاری: ۶۹، مسلم ۱۷۳۲)۔

(خوش کن بات کہو، نفرت انگیز لہجہ اور طریقہ اختیار مت کرو، آسانی پیدا کرو اور لوگوں کو دشواری میں مت ڈالو)۔

اور فتاوی ہندیہ میں ہے:

"اگر کسی یہودی اور نصرانی کو کافر کہہ کر مخاطب کرے تو اگر یہ جملہ اسے ناگوار گزرے تو کہنے والا گنہ گار ہوگا"۔

اس مسئلے میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کی دلجوئی اور ان کے خلاف نفرت انگیز اور ناگوار بات کہنے کے سلسلہ میں ہمارے فقہاء کس درجہ حساس ہیں، اگر مسلمانوں میں یہ حساسیت پیدا ہو جائے تو ہمارے بہت سارے مسائل خود بخود حل ہوسکتے ہیں۔

۴۔ مسلمانوں خصوصاً داعیوں اور مذہبی مذاکرہ کرنے والوں کو ردعمل کی نفسیات سے بچنا چاہئے، غیر مسلموں کی طرف سے کوئی دل آزار بات کہی جائے تو اس کا جواب صبر و اعراض اور حسن عمل کے ذریعہ دے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

"ادفع بالتی هی أحسن السیئة نحن أعلم بما یصفون" (المومنون: ۹۶) (برائی کو اس طریقے سے دور کریں جو سراسر بھلائی والا ہو، اور جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں ہم اس سے بخوبی واقف ہیں)۔

اور قرآنی آیت:

"ولا تجادلوا أهل الکتاب إلا بالتی هی أحسن" (عنکبوت: ۴۶) کی تفسیر میں امام طبری لکھتے ہیں کہ

"اگر وہ لوگ بری بات کہیں اور بدتمیزی کریں تو تم ان کے جواب میں اچھی بات کہو" (جامع البیان ۲۱/۱)۔

غرضیکہ دوسرے مذاہب پر تنقید یا جواب میں ایسا اسلوب اختیار نہیں کرنا چاہئے جو دل آزاری کا سبب بنے بلکہ مسلمانوں کو ہر حال میں صبر و اعراض، اور تقوی کی روش پر قائم رہنا چاہئے اور معروضی، سنجیدہ، حکمت آمیز اور محبت ریز اسلوب اختیار کرنا چاہئے، جیسا کہ قرآن میں ایک موقع پر کہا گیا ہے:

"إنا وإیاکم لعلی هدی أو فی ضلال مبین" (سورہ سبا: ۲۴)۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ آنحضور کو یقینی طور پر معلوم تھا کہ وہ راست پر اور مشرکین گمراہ ہیں لیکن خطاب میں نرمی پیدا کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا (الجامع لاحکام القرآن ۲/ ۱۴)۔

اپنے نظریات کو بہتر انداز میں پیش کرنے کے بعد دوسرے کو اپنی بات کے کہنے کا موقع دیا جائے، اور کہا جائے کہ میں توحق کا پیروکار ہوں اگر تمہارے پاس بھی مل جائے تو میں قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

"قل فأتوا بکتب من عند الله هو أهدی منهما اتبعه إن کنتم صادقین" (قصص: ۴۹)۔

"قل إن کان للرحمن ولد فأنا أول العابدین" (سورہ زخرف: ۸۱)۔

امام طبری کہتے ہیں کہ یہ جملہ شک کے طور پر نہیں ہے، بلکہ گفتگو میں نرمی اور حسن خطاب کے لئے یہ انداز اپنایا گیا ہے (جامع البیان ۲۵ / ۱۰۳)۔

اور اگر اس طرزِ عمل کے باوجود بھی دوسری طرف سے ہٹ دھرمی اور ضد کا مظاہرہ کیا جائے تو خوبصورت انداز میں گفتگو کو ختم کر دینا چاہئے۔

"وإن كذبوك فقل لی عملی ولكم عملكم أنتم بريئون مما أعمل وأنا بریئ مما تعملون" (سورہ یونس: ۴۱)۔

۲۔ مشترکہ اقدار یا اسلامی تعلیمات کے ثبوت کے لئے دوسرے مذاہب کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، خود قرآن میں جگہ جگہ بشارت نبویہ سے متعلق توریت اور انجیل کا حوالہ موجود ہے، اور حدیث میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتم سے گفتگو کرتے ہوئے آنحضور ﷺ نے فرمایا:

"يا عدی أسلم تسلم فقلت إنی علی دين، قال أنا أعلم بدينک منک ألم تكن ركوسيا قلب بلی، قال أو لم تسير فی قومک بالمرباع قلت بلی، قال فإن ذلک لم يكن يحل لک فی دينک، قلت أجل" (السیرۃ النبویہ لابن ہشام ۴/ ۵۸۰، الطبقات الکبری موسی سعد ۱/ ۳۲۲)۔

(عدی! اسلام قبول کرلو، محفوظ ہو جاؤ گے، انہوں نے کہا میں ایک دین کا پیروکار ہوں، آنحضور نے فرمایا کہ میں تمہارے دین کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ کیا تمہارا تعلق رکوسی فرقے سے نہیں ہے؟ (شامی عیسائیوں کا ایک گروہ جس کے عقائد فرقہ صابئہ سے ملتے جلتے ہیں) میں نے کہا کہ ہاں میرا تعلق اسی جماعت سے ہے، آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی قوم سے چوتھائی مال وصول نہیں کرتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ حالانکہ یہ تمہارے دین میں حلال نہیں ہے، انہوں نے کہا آپ نے سچ فرمایا)۔

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ نے رجم کے ثبوت کے لئے توریت کی طرف رجوع کیا، جو ایک مشہور و معروف واقعہ ہے، اور فتاوی ہندیہ میں ہے:

"ولا ينبغی للرجل أن يسأل اليهودی والنصرانی عن التوراة والإنجيل والزبور ولا يكتبه ولا يتعلمه ولا يستدل لإثبات المطالب بما ذكر فی تلک الكتب، وأما استدلال العلماء فی إثبات رسالة سيدنا محمد ﷺ بالمذكور فی أسفار التوراة وصحف الإنجيل فذلک للإلزام عليهم بما عندهم" (الہندیہ ۵/ ۳۴۸)۔

اور شیخ ابن السعدی لکھتے ہیں:

"اگر غیر مسلم اپنے کو حق پر سمجھتا ہے یا وہ باطل کی طرف دعوت دینے والا ہے تو اس سے گفتگو کے لئے بہتر سے بہتر طریقے کا انتخاب کرے، مثلاً اس کے سامنے ایسی دلیلیں پیش کرے جس کا کہ وہ قائل ہے، کیونکہ یہ مقصد کے حصول میں زیادہ معاون ہے" (تفسیر تیسیر الکریم ۳/ ۹۳)۔

ا۔سماجی اور سیاسی مذاکرہ:

مختلف مذاہب کے وجود کو ختم نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے اس اختلاف کے باوجود بقاء باہم کا کیا طریقہ ہوگا؟ کیسے ایک دوسرے کے ساتھ امن وسکون کی زندگی گزاری جاسکتی ہے؟ کیسے ایک دوسرے کے ساتھ انسانی تعلقات استوار کئے جائیں؟ اس پر بھی مذاکرہ مطلوب ہے، اور اس طرح کے مذاکرات کے لئے ”میثاق مدینہ“ ایک بہترین نمونہ ہے، جس میں نسل ومذہب کے اختلاف کے باوجود سب کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں آنحضور ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ یہود اور مسلمان، دونوں ایک امت اور جماعت ہوں گے، اور جو کوئی اس معاہدہ میں شامل لوگوں سے جنگ کرے تو سب لوگ مل کر اس سے مقابلہ کریں گے، اور یہ معاہدہ نیکی اور باہمی خیر خواہی کے کاموں میں ہوگا، نہ کہ کسی گناہ کے کام میں، اور مظلوم کی مدد کی جائے گی، اور اس معاہدہ میں شامل لوگوں کے لئے آپس میں جنگ وجدال کرنا حرام ہوگا (دیکھئے الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ ر ٦٤-٥٧)۔

اور اسی طرح سے بعثت سے پہلے آنحضور ﷺ نے حلف الفضول نامی معاہدے میں شرکت فرمائی جس میں اس پر اتفاق کیا گیا تھا کہ ظالم کے ظلم کو روکیں گے اور مظلوم کی مدد کریں گے، اور آپ ﷺ بعثت کے بعد اس معاہدہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ

”**لو دعيت اليوم فی الإسلام لأجبت**“ (مسند احمد: ۱٦۵۸، الادب المفرد ۵۷۰)۔

اسلام، پرامن بقاء باہم کا قائل ہے، وہ دوسرے مذاہب کو مٹانے کا نہیں بلکہ انہیں گوارا کرنے اور ان کے ساتھ عدل وانصاف کا رویہ اختیار کرنے بلکہ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مسلم وغیر مسلم کے فرق کے بغیر تمام پڑوسیوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے اور ان کے ساتھ داد ودہش کا معاملہ روا رکھنے کا حکم دیا ہے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص ہرگز مومن نہیں ہے جس کے پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ رہیں، غیر مسلم والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم خود قرآن میں موجود ہے، اور دوسرے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ رشتہ کا پاس ولحاظ رکھنے اور صلہ رحمی کی تاکید متعدد حدیثوں میں مذکور ہے، اور فقہ وفتاوی کی مشہور کتاب فتاوی الہندیہ میں ہے:

”**ولا بأس بمصافحة المسلم جاره النصرانی إذا رجع بعد الغيبة ويتأذى بترک المصافحة**“ (الہندیہ ۵/۳۴۸)۔

(اگر کسی مسلمان کا نصرانی پڑوسی سفر سے واپس آئے تو مسلمان اس سے مصافحہ کرسکتا ہے جبکہ وہ مصافحہ نہ کرنے کی وجہ سے اسے تکلیف اور رنج ہو)۔

اس طرح کے مذاکرات میں چند چیزوں کا لحاظ رکھنا ہوگا:

الف: دوسرے مذاہب کے وجود اور بقا کا اعتراف اور کسی کے لئے کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کا حق اور آزادی کا اقرار۔

ب: اعتقادی مسائل میں بحث ومباحثہ سے بچنا اور اس سے اعراض کرنا۔

ج: گفتگو کے ماحول کو پراگندہ کرنے والی چیزوں سے دور رہنا، مثلاً کسی کو کافر کہہ کر مخاطب کرنا یا ان کے مذہبی نظریات اور مقدسات پر حملہ کرنا۔

د: مشترکہ اتفاقی اور اخلاقی اقدار کو نمایاں کرنا۔

ہ: مذہبی اور سماجی مذاکرے کے لئے غیر مسلموں کو مسجدوں میں آنے یا ان کے عبادت خانوں میں جانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

سیرت کی کتابوں میں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور ان کے ساتھ پرامن بقاء باہم کا یہ غیر معمولی واقعہ مذکور ہے کہ آنحضور ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ کئی روز تک گفتگو فرمائی اور انہیں اپنے طریقے پر مسجد نبوی میں صلاۃ ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی (السیرۃ النبویہ ۱/۵۱۱)، اس واقعہ کے ذیل میں علامہ ابن القیم لکھتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب مسجدوں میں آسکتے ہیں، نیز مسلمانوں کی موجودگی میں وہ مسجد کے اندر اپنے طور پر صلاۃ ادا کرسکتے ہیں، لیکن ایسا کرنا عارضی اور وقتی طور کے لئے ہونا چاہئے، اس کی عادت بنا لینے کی اجازت نہیں ہوگی'' (زاد المعاد ۳/۶۳۸)۔

اسی طرح سے حدیثوں میں ہے کہ آنحضور ﷺ دعوت وتبلیغ کے لئے غیر مسلموں کے مذہبی مقامات پر جایا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عوف بن مالک کہتے ہیں:

''انطلق النبی ﷺ یوما وأنا معه حتی دخلنا کنیسة الیهود یوم عید لهم'' (مسند احمد: ۲۳۴۶۴)۔

(ایک دن نبی ﷺ روانہ ہوئے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا، یہاں تک کہ ہم یہودیوں کے عبادت خانے میں داخل ہو گئے، وہ ان کے تہوار کا دن تھا)۔

اسی موقع پر حضرت عبداللہ بن سلام مشرف بہ اسلام ہوئے۔

۳۔ اسی طرح سے باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے غیر مسلموں کے میلوں وغیرہ میں شرکت کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس عمل کی وجہ سے کسی بت وغیرہ کی تعظیم نہ ہوتی ہو، اور نہ ہی وہاں مشرکانہ کام انجام دیئے جارہے ہوں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ دعوت وتبلیغ کے لئے کفار مکہ کے میلوں میں تشریف لے جایا کرتے تھے، اور اگر یہ شرط نہ پائی جاتی تو شرکت درست نہیں ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

''وإذا رأیت الذین یخوضون فی آیاتنا فأعرض عنهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره وإما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین'' (الانعام: ۶۸)۔

(جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب جوئی کررہے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہوجاؤ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں، اگر شیطان تمہیں یہ بات بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو)۔

اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یجلس علی مائدة یدار علیها الخمر''۔

واضح رہے کہ غیر مسلموں کے مذہبی رسوم واعمال عام طور پر شرکیہ تصورات سے آلودہ ہوتے ہیں، اس لئے انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے بھی ان میں شرکت درست نہیں ہے، الا یہ کہ ان کی غلط باتوں پر تنقید اور کلمہ حق کو بلند کرنا مقصود ہو تو شرکت کی اجازت ہے، چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے کہ اگر مجوسی کھانے کے دوران کفریہ کمالات نہ گنگناتا ہو تو اس کے ساتھ کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر گنگناتا رہتا ہو تو درست نہیں ہے، کیونکہ وہ کفر وشرک کا اظہار کر رہا ہے اور اس حالت میں اس کے ساتھ کھانا درست نہیں ہے (الہندیہ ۵/۳۴۷)۔

۴۔ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے بعض ایسے اعمال بھی ترک کئے جاسکتے ہیں، جو شرعاً واجب نہیں، یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی متوارث، تہذیب وثقافت سے ہو، چنانچہ امام بخاری نے یہ عنوان قائم کیا ہے:

"باب من ترک بعض الاختيار مخافة أن يقصر فهم بعض الناس عنه فيقعوا فی أشد منه"۔

اور اس عنوان کے ذیل میں یہ حدیث نقل کی ہے:

"قال النبی ﷺ یا عائشة لو لا قومک حدیث عهدهم بکفرهم لنقضت الکعبة فجعلت لها بابين، بابا يدخل الناس، وبابا يخرجون" (بخاری حدیث ۱۲۶)۔

علامہ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مفسدہ اور برائی سے بچنے کے لئے کسی مصلحت اور اچھائی کو ترک کیا جاسکتا ہے، نیز کسی برائی پر نکیر نہ کرنا درست ہے جبکہ اس کی وجہ سے بڑی برائی میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو (فتح الباری ۱/۲۲۵)، اور علامہ عینی نے ابن بطال کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کبھی امر بالمعروف کو ترک کردیا جاتا ہے جبکہ اس کی وجہ سے کسی فتنہ کا اندیشہ ہو (عمدۃ القاری ۲/۲۰۴)۔

۵۔ بین مذہبی مذاکروں اور مکالموں کا ایک مقصد وحدت ادیان بھی ہے، جس میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ تمام مذاہب کے عقیدہ اور نظریہ کو صحیح سمجھا جائے، اور عبادات کی تمام شکلوں کو درست قرار دیا جائے، مختلف مذاہب کے مذہبی اعمال ورسوم کی ایک ہی عبادت خانے میں انجام دیئے جائیں، مختلف اور متضاد نظریات کو باہم جمع کیا جائے، رواداری اور اختلاف کو نزاع کو ختم کرنے کے لئے دوسرے مذاہب کے کچھ باتوں کو قبول کرلیا جائے، اس کے لئے کچھ اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا جائے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کی کسی چیز پر گفتگو دوسروں کے لئے تو ممکن ہے لیکن امت مسلمہ کے لئے محال ہے، اس لئے کہ دین اسلام کسی فرد کی خواہش اور کوشش کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی کو خوش کرنے اور راضی کرنے کے لئے کوئی تبدیلی کر سکے۔ بلکہ اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین قابل قبول نہیں ہے، بلکہ کسی دین کی طرف معمولی رجحان بھی لائق گرفت ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولا ترکنوا إلی الذين ظلموا فتمسکم النار ومالکم من دون الله من أولياء ثم لا تنصرون"۔

(اور ظالموں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا مددگار نہ ملے گا جو تمہیں اللہ سے بچا سکے، اور کہیں سے بھی تم کو کوئی مدد نہیں ملے گی)۔

B13

غرضیکہ کسی بھی طرح کی گفتگو میں رواداری اور دوسرے مذاہب کے پیروں کاروں کے ساتھ حسن سلوک، احترام انسانیت، مشترکہ اخلاقی اقدار، سماجی مسائل، پرامن اور بقاء باہم پر بات کی جاسکتی ہے، لیکن کسی دینی معاملہ پر سمجھوتا، کسی اصول کا سودا کرنے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی، اس سلسلہ میں ہمارے لئے حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام کا طرز عمل بہترین اسوہ ہے کہ جب وہ پوچھ گچھ کے لئے نجاشی کے دربار میں حاضر کئے گئے تو انہوں نے آپس میں یہ طے کرلیا تھا کہ ہم وہی بات کہیں گے جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتلائی ہے، خواہ ہمیں یہاں رہنے دیا جائے یا باہر کردیا جائے، چنانچہ انہوں نے کسی رورعایت کے بغیر اسلامی تعلیمات کو برملا بیان کیا، جس سے شاہ حبشہ مطمئن ہوگیا، اور انہیں کفار قریش کے قاصدوں کے حوالہ کرنے سے انکار کردیا، قاصدوں کے سربراہ حضرت عمرو بن عاص نے کہا کہ کل میں نجاشی کے پاس جاکر ایسی کہوں گا جس کی وجہ سے ان کی جڑ کٹ جائے گی، اور تمام بولتی بند ہوجائے گی، چنانچہ انہوں نے نجاشی سے کہا کہ یہ لوگ حضرت عیسی کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، اس لئے انہیں دوبارہ بلاکر باز پرس کیجئے، یہ بڑا نازک مرحلہ تھا، سچ بات کہیں تو نجاشی کی ناراضگی کا خطرتھا، لیکن انہوں نے طے کرلیا کہ جو ہوگا ہوگا ہم تو حق بات ہی کہیں گے، اور اس سلسلہ میں کوئی نرمی اور لچک گوارا نہیں کریں گے، غور کا مقام ہے کہ جلاوطنی کی حالت میں جہاں ان کا کوئی مددگار نہ تھا انہوں نے حق کے معاملے میں کسی مداہنت کو نہیں اپنایا اور صاف صاف بے کم وکاست اسلامی عقیدہ اور نظریہ کو بیان کردیا۔

خلاصہ جوابات:

۱۔ مذہبی، سماجی، سیاسی، تمام پہلوؤں پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔
۲۔ دوسرے مذاہب کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، (دلیل کے لئے دیکھیے: ٦)۔
۳۔ دوسرے مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں شرکت درست نہیں۔
۴۔ ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے کچھ ایسے اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے جو شرعاً واجب نہیں۔
۵۔ جواب کی تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان: اصول وآداب۔
٦۔ اس طرح کے مسائل پر مذاکرات ہونے چاہئیں، اس کے لئے حلف الفضول بہترین نظیر ہے۔
۷۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بھی گفتگو کی جاسکتی ہے بلکہ کی جانی چاہئے۔
۸۔ کفار فروعات کے مخاطب نہیں ہیں، اس لئے ایسی محفلوں میں غض بصر سے کام لینا چاہئے۔

بین مذاہب مذاکرات۔اصول وآداب

مولانامحبوب فروغ احمد قاسمی ☆

دنیا کی موجودہ صورت حال، گذشتہ ادوار سے بالکل مختلف ہے، آج بیشتر حصہ میں بھانت بھانت کی بولی بولنے والے، الگ الگ جادہ راہ رکھنے والے، مختلف طرز فکر وطرز زندگی کی پاسداری کرنے والے، اور جدا جدا راہ عمل اپنانے والے مل جل کر بستے ہیں، دنیا میں چین وسکون کے ساتھ جینے کے لئے ملی جلی آبادی میں آباد انسانوں سے راہ ورسم استوار رکھنا ازحد ضروری ہوتا ہے، کیونکہ بسااوقات نفرت کا ماحول، غلط فہمی اور اس سے پیدا ہونے والا تشدد بھرا ماحول صرف دنیوی شب وروز کو ہی مکدر نہیں کرتا، بلکہ دینی رجحانات وخیالات بھی بری طرح متاثر ہوتے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ امن وسکون کا باغ وبہار رسہ کشی وتناؤ کا شکار ہوکر ویران ہوجاتا ہے۔

اس صورت حال سے دوچار پہلے بھی انسان ہوتا تھا، مگر محدود پیمانہ پر، جب سے مشینی دور کا آغاز ہوا اور دنیا کی پھیلی ہوئی آبادی سمٹ کر آئینہ میں نظر آنے والی صورت کی طرح نظر آنے لگی تو خوشی وناخوشی بھی بین الاقوامی بن گئی، اب ایک جگہ کا دکھ ہر جگہ محسوس کیا جاسکتا ہے، اور ایک جگہ کی خوشی ہر حصہ میں ہلچل مچا سکتی ہے، گویا کہ پوری دنیا ایک ہی درد اور ایک ہی کرب کی شکار ہے، جس سے ناخوشگوار ماحول پوری دنیا پر چھا گیا، اس کی کرواہٹ کو کم کرنے یا مٹانے میں مذاکرات وباہمی تبادلہ خیال کو خاص طور پر کلیدی رول ادا کرنے والا اور اساسی میز سمجھا جانے لگا، اس میں بہت حد تک تیزی آئی ہے، کچھ اسلام دشمنوں خاص طور پر کیتھولک کلیسا کی سوچی سمجھی سازش کو بھی اس کے کردار میں دخل رہا، اس لئے کسی بھی قسم کا مذاکرہ منعقد کرتے وقت ایک مسلمان کو بہت ہی حساس رہنے کی ضرورت ہے، ایسا نہ ہو کہ دشمنان اسلام کی دسیسہ کاری کی نذر اسلام کا دعوتی نظام ہوجائے، اور اسی میں الجھ الجھ کر اصل مقصد سے دور ہوتے چلے جائیں، نیز کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنا تشخص اور اپنی شناخت سے ہی ہاتھ دھونا پڑ جائے، اور افہام وتفہیم کے بجائے خود مرعوبیت کا شکار ہو کر خرمن اسلام کو تاخت وتاراج کرنے کی جدوجہد شروع کردیں، اللہ ان سب سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے، پوری حساسیت، بے دار مغزی، شریعت اسلام سے بے پناہ محبت ولگاؤ کے جذبہ اور دین اسلام اور اس کی ہر ہدایت کو برحق ہونے کے عقیدے کے ساتھ اس میدان خاردار میں ایک مؤمن کو قدم رکھنا چاہئے، تب ہی نتیجہ خیز اور امید افزا فضا بن پائے گی۔

مذاکرہ سے مقصود دوسروں کو مطمئن کرنا اور ان کے ذہنی خلجان کو دور کرنا ہوتا ہے، اسی کو افہام وتفہیم بھی کہتے ہیں، اس

☆ استاذ حدیث مدرسہ حسنیہ کایم کلم، کیرالہ۔

کے قریب قریب مناظرہ ومجادلہ ہیں، جن میں مخاطب کو خاموش ولاجواب کرنا ہوتا ہے، کوئی ضروری نہیں کہ ذہنی طور پر وہ مطمئن ہوجائے، مناظرہ بھی بعض اوقات بہت مفید ثابت ہوتا ہے، احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے ایک ضروری ومضبوط حربہ ہے، لیکن کچھ مدت پیشتر سے دیکھا جارہا ہے کہ ''مناظرہ'' میدان مباحثہ کا ادبی وخطابی اکھاڑہ ہوکررہ گیا ہے، بلکہ باطل کے تئیں اور بھی تشدد کو بھڑکانے میں مددگار ثابت ہورہا ہے، اس لیے اس کے بجائے مذاکرہ وباہمی تبادلہ خیال کا طریقہ اختیار کیا جانے لگا، اس طریقہ میں بہت حدتک کامیابی ہورہی ہے، اتنا فائدہ تو سردست ہوہی جاتا ہے کہ بیمار سماج کی غلط فہمی سے بہت حدتک ذہن صاف ہوجاتا ہے اور دل حقیقت کو قبول کرلیتا ہے خواہ اس کا برملا اظہار نہ ہوپائے۔

اسلامی تاریخ سے واقف حضرات سے یہ مخفی نہیں ہے کہ اسلام کی نشر واشاعت میں افہام وتفہیم پر کافی زور دیا گیا ہے، نزول وحی کے بعد سے ہی یہ سلسلہ شروع کیا گیا، کفار مکہ بالخصوص خاندان نبوت کے مختلف طبقات سے رسول اللہ ﷺ کی گفت وشنید، پھر اسلام لانے والوں کے سامنے اسلام کی دعوت، نتیجۃً لوگوں کا پس وپیش کرنا سب مذاکرہ کے وسیع مفہوم کے تحت آتا ہے، ویسے اس کی مشروعیت کے سلسلہ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر قبائل عرب جن خدشات میں مبتلا تھے ان خدشات کو عروہ بن مسعود ثقفی اور دیگر حضرات نے باہمی مذاکرہ میں فصیح وبلیغ لب ولہجہ میں رکھا تھا، اس کی بہترین دلیل بن سکتا ہے، امام بخاری نے طویل حدیث نقل کی ہے، عروہ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

''أی محمد! أرأیت إن استأصلت أمر قومک هل سمعت بأحد من العرب اجتاح أصله قبلک، وإن تکن الأخری فإنی واللہ لأری وجوهاً أشواباً من الناس خلیقاً أن یفروا ویدعوک'' الخ (بخاری شریف ۱/۳۷۸، کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد)۔

(اے محمد! ذرا بتایئے اگر آپ نے اپنی قوم کو نیست ونابود کرہی دیا تو آپ نے کسی عربی کے بارے میں سنا ہے؟ کہ اس نے آپ سے پہلے اپنی اصل کو ہی کرید دیا ہو، اور اگر صورت حال دیگر ہو تو بخدا میں آپ کے پاس مختلف قبائل کے افراد دیکھ رہا ہوں، یہ لوگ فرار اور آپ کو چھوڑ دینے کی ذہنیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں)۔

عام الوفود میں یمن کے نصاری کی ایک جماعت دربار رسالت میں حاضر ہوئی جو ''وفد نجران'' سے حدیث وسیرت کی کتابوں میں معروف ومشہور ہے، یہ وفد اہل علموں کا تھا، اس نے رسول اللہ ﷺ سے بہت طویل مذاکرہ ومکالمہ کیا ہے، انہوں نے مسجد نبوی میں کعبہ کی طرف رخ کرنے کے بجائے بیت اللحم کا استقبال کرکے اپنی عبادت بھی ادا کی، اللہ کے رسول نے منع کرنے سے صحابہ کو روک دیا، کیوں کہ ان کی شریعت میں ایسا ہی تھا (فقہ السیر ہللغزالی ۴۵۹-۴۶۳)۔

بعد کے ادوار میں بھی مذاکرات ہوتے رہے اور ہنوز جاری ہیں:

(۱) مذاکرت کے موضوعات:

چوں کہ مذاکرات کا مقصد دعوت وتبلیغ کی فضا ہموار کرنا، اسلام اور اسلامی احکام کے تئیں پائے جانے والے خدشات کا

ازالہ، غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات کو سازگار وموافق بنانا اورحق کی صحیح تفہیم وتشریح ہے، اس لیے اس کے موضوع سماجی وسیاسی کے علاوہ مذہبی بھی ہوسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے کفار سے جو مکالمات ہوئے ہیں ان میں کفار کی نیت کچھ بھی ہو مگر رسول اللہ ﷺ کی شرکت بہرحال افہام وتفہیم کے لئے تھی، ایک موقع پر تو رسول اللہ ﷺ بہت ہی عجلت کے ساتھ ایسی مجلس میں پہنچے جس میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن الحارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن مطلب بن اسد، زمعہ بن اسود، ابوجہل، امیہ بن خلف اور بھی سرداران قریش وشرفاء مکہ جمع تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مذاکرہ کی دعوت دی، آپ ﷺ کو جیسے ہی معلوم ہوا فوراً ہی مجلس میں رونق افروز ہوئے، ان حضرات نے اپنی بات رکھی:

''آپ نے اپنی اس دعوت سے جماعتوں میں تفرقہ ڈال دیا ہے، سب کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا، باپ دادا والا موروثی دین کا کچھ چٹھہ نکال دیا ہے، آخر کیا مقصد ہے؟ اگر مال کا حصول مقصد ہے تو ہم اتنا مال جمع کیے دیتے ہیں کہ آپ سب سے زیادہ مالدار تصور کیے جائیں، اگر سیادت وقیادت کی خواہش ہے تو ہم سب آپ کو قائد وحاکم ماننے کے لئے تیار ہیں، اگر کسی حسین وجمیل خاتون سے شادی چاہتے تو ہم اس کے لئے کوشش کرتے ہیں، یا اگر کسی قسم کی بیماری کا یہ اثر ہے تو ہم لوگ مل کر علاج کرادیتے ہیں''۔

گویا کہ ان سرداران کو دعوت اسلام کی بابت کچھ غلط فہمی واقعتاً تھی، یا انہوں نے بناوٹی انداز میں بظاہر کیا تھا، اللہ کے رسول نے ان کی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''مالي ما تقومون، ما جئت بما جئتكم به، أطلب أموالكم ولا الشرف فيكم ولا الملك عليكم ولكن الله بعثني إليكم رسولا وأنزل عليّ كتابا وأمرني أن أكون لكم بشيرا ونذيرا'' الخ (سیرت ابن ہشام ۱/۲۳۶ ط: دارالخیر)۔

(جو کچھ آپ حضرات نے فرمایا ان میں سے کوئی بات نہیں ہے، میں آپ حضرات سے نہ تو مال کا مطالبہ کرنے کے لئے حاضر ہوا اور نہ ہی شرافت وسیادت مطلوب ہے، لیکن میں تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، مجھ پر کتاب نازل ہوئی اور اللہ نے مجھے حکم دیا کہ میں تمہیں اچھائیوں کی خوشخبری دیتا رہوں اور برائیوں سے ڈراتا رہوں)۔

اس طرح کے اور بھی مکالمات ہیں جو مذہبی مذاکرہ کے جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

لیکن مذہبی مذاکرہ ایک خاردار وادی ہے، اور پرخطر پگڈنڈی ہے، اس پر سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے، نہ تو ہر کس وناکس کو اس میں گھسنے کی اجازت ہوسکتی ہے اور نہ ہی ہر وقت صرف مذاکرہ مذاکرہ کر کے اصل دعوتی مشن سے صرف نظر اور کنارہ کشی اختیار کی جاسکتی ہے، اس لئے:

(الف) ضروری ہے کہ مذاکرہ کرنے والے افراد پہلے تو دین اسلام کے ہر گوشہ وپہلو سے پورے طور پر بصیرت کے ساتھ مطمئن ہوں ورنہ جس کو خود اطمینان وشرح صدر نہ ہو وہ دوسروں کو کیا اطمینان دلا سکتا ہے، بلکہ خدانخواستہ دوسروں کا پلہ بھاری پڑ گیا اور کچھ شکوک وشبہات سے اس کے ذہن کو الجھا دیا گیا تو مذاکرہ کا فائدہ تو کجا اس کے مضر اثرات سماج میں پھیل جائیں گے۔

(ب) نیز یہ بھی ضروری ہے کہ جن حضرات سے مذاکرہ ہو رہا ہے ان کے یہاں جن کتابوں کو مقدس سمجھا جاتا ہے ان کے اس حصہ پر قابو یافتہ ہو جو ہمارے دین اور ہماری شریعت کے مزاج و مذاق سے ہم آہنگ ہو، بلکہ دین و ایمان کی تائید ہو رہی ہو، تا کہ وقت پڑنے پر ان کو پیش کیا جا سکے، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ ہر طرح کی تحریف کے باوجود ابھی بھی ان کتابوں میں ایک معتد بہ حصہ ایسا ضرور پایا جاتا ہے جو اسلام کی تائید کے لئے کافی ہو، حتی کہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب گیتا، رامائن، وید وغیرہ میں بہت سے اشلوک و دفعات اس بابت موجود ہیں۔

(ج) یہ بھی لازم ہے کہ مذاکرہ صرف رسمی و رواجی نوعیت کا نہ ہو اور نہ ہی خود غرضی و خود نمائی کے داعیہ سے ہو، ورنہ دین کے بجائے دنیا بن کر رہ جائے گا، آخر اسی ہندوستان میں کچھ صدی پہلے علماء کے بحث و مباحثہ اور اظہار برتری و ریاو نمو نے اسلام کے خرمن کو خاکستر کر کے ''دین الٰہی'' کے نام سے ناپاک نظام کو جنم دیا تھا، جس کی اصلاح و تجدید کے لئے حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے رفقاء کو کتنی جانفشانی برداشت کرنی پڑی اور ایک طویل عرصے کے بعد ''عالمگیر اورنگ زیب'' کے زمانہ میں صحیح اسلام کی ضیا پاشی ہو سکی۔

اس لیے نیک جذبات، مکمل وثوق و اعتماد، یقین کامل و مضبوط اعتقاد اور عمل و کردار سے مسلح ہو کر اس میں داخل ہونے سے بامقصد اور موثر مذاکرہ وجود پذیر ہو سکے گا۔

سیاسی و سماجی مذاکرے مذہبی مذاکرہ کے مقابلہ میں زیادہ سہل ہیں، ہر دور میں جنگ و جدال کے موقع پر سیاسی مذاکرہ کا انعقاد ہوا ہے، اور امن و امان کی بحالی نیز سماج کی بھلائی کے لیے سماجی مذاکرہ کا انعقاد بھی ہر زمانے کے حکام و علماء کرتے آئے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے جو معاہدے کیے وہ سماجی و سیاسی ہی تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر جنگ بندی کے لیے جو کفار کے قد آور شخصیات سے گفت و شنید ہوتی رہی بالآخر سہیل کی بات پر معاہدہ نامہ لکھا گیا یہ سیاسی مذاکرہ ہی تھا۔

لہٰذا مذاکرہ کے موضوعات وقت کی ضرورت کے لحاظ سے مذہبی و سیاسی اور سماجی ہو سکتے ہیں۔

(۲) دوسرے مذاہب کی کتابوں سے حوالہ کے لیے استفادہ:

دنیا میں جتنے بھی لوگ بستے ہیں ان کی مذہبی کتابوں میں ایسے نکات موجود ہیں جن کو الزامی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، مذاکرہ میں یہ موثر صورت ہوگی، اس لیے کہ خواہ ہم ان کتابوں کو محرف اور ناقابل اعتماد مانتے ہوں مگر ہمارا مخاطب ان کتابوں کے تقدس پر سر دھنتا ہے، اگر ان کو یاد دلایا جائے کہ تمہاری کتابوں میں بھی ایسی باتیں لکھی ہیں تو بہت ممکن ہے وہ حق کے قریب آجائیں، نیز ان کی مقدس ہستیوں کے وہ حالات جو امن و امان کی فضا برپا کرنے میں معاون ہوں، وجود صانع اور توحید باری کی حقانیت پر دلالت کرنے والے ہوں، عقیدۂ آخرت اور عقیدہ حشر و نشر کو مضبوط بنانے والے ہوں ان کو بیان کرنے سے ان کے قلب و دماغ کو اطمینان ہو سکتا ہے۔

یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ تورات وانجیل پر ہم کو یقین کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ ہمارے عقیدے کے لحاظ سے یہ ساری کتابیں تحریف کی شکار ہو چکی ہیں، بعض اوقات تو رسول اللہ ﷺ نے بہت ہی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ”أمتهكون أنتم كما تهوكت اليهود والنصارى“ (کیا تم لوگ بھی اپنے دین کے سلسلہ میں سرگرداں و پریشان ہو جیسا کہ یہود ونصاری تھے)۔

مگر اس سلسلہ میں ملا علی قاری نے شرح کرتے ہوئے صحیح مصداق کی نشاندہی کی ہے:

”حضور نے فرمایا: ان کی تصدیق مت کرو، ان امور میں جن کا صادق آنا واضح نہ ہو، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ کذب ہو، اور نہ ان کی تکذیب کرو، ان امور میں جن کو وہ تورات وانجیل سے بیان کرتے ہیں اور وہ امور وعلوم مشتبہ ہیں، پس جواز اور بطلان کا فیصلہ نہیں ہوگا، یہی سلف کی رائے ہے“ (مرقاۃ ۱/۱۹۱، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، الفصل الاول)۔

جن امور کو مذاکرات میں پیش کیا جارہا ہے یہ وہ امور نہیں ہیں جن کا صادق وکاذب ہونا مشکوک ہوں، بلکہ شریعت کے مزاج ومذاق سے جو ہم آہنگ ہیں انہیں کو پیش کرنا مطلوب ہے، لہذا اس میں حرج نہیں ہے، اس کے لیے ان کی کتابوں سے استفادہ میں مضائقہ نہیں ہے۔

دوسروں پر الزام قائم کرنے کے لئے فقہاء کے یہاں صراحتاً اجازت بھی موجود ہے:

”یہودی، نصرانی سے تورات، انجیل اور زبور سے متعلق نہ سوال کرے، نہ اس کو لکھے، نہ اس کو سیکھے اور نہ مقصود کو ثابت کرنے کے لئے ان کتابوں سے استدلال کرے، ہاں علماء کا جناب رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں تورات وانجیل سے استدلال کرنا تو ان پر ایسی چیزوں کے ذریعہ الزام کے لئے جو ان کے نزدیک مسلم ہیں“ (فتاوی ہندیہ ۵/۳۴۸ کتاب الکراہیۃ الباب الرابع فی أہل الذمۃ الخ، ط: احیاء التراث العربی)۔

(۳) مذہبی رسوم میں شرکت:

مذاکرہ کا مقصود دین وشریعت سے بھٹکے انسان کو راہ راست سے قریب کرنا اور اسلام جس صالح معاشرہ اور مثالی سوسائٹی کو برپا کرنا چاہتا ہے اس کی تشکیل میں مدد کرنا ہے، اگر مسلمان بھی خواہ رواداری میں ہی کیوں نہ ہو ایسے امور میں شرکت کرتا ہے جو اسلامی نظریہ وفکر کے لحاظ سے شرک وکفر پر مبنی ہیں تو خواہ تشبہ نہ سہی کم از کم مشابہت ضرور حاصل ہوگی، اسلام میں غیر قوم کی مشابہت سے بھی منع کیا گیا ہے، حدیث میں واضح ارشاد موجود ہے:

”ليس منا من تشبه بغيرنا، لا تشبهوا اليهود ولا النصارى“ (ترمذی ۹۹/۲ کتاب الاستیذان، باب کراہیۃ اشارۃ الید) (جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو)۔

یہ مماثلت ایسی چیز میں ہو جو ان کا مذہبی شعار بن چکا ہے، جیسے زنار پہننا، ہاتھ میں کڑا ڈالنا، خاص قسم کی ٹوپی اوڑھنا، فقہاء

نے ایسی مشابہت کو کفر کے ضمن میں رکھا ہے۔

مذہبی رسوم میں شرکت بھی اس زمرے میں آتا ہے، لہذا اگر بخوشی اور استحسان کے نظریہ سے شرکت ہورہی ہو۔ العیاذ باللہ تب تو بہت ہی سنگین جرم ہوگا کیوں کہ :

”إنما الرضا بالكفر مستحسنا كفر“(الملتقط: ۲۴۵) (کفر پر رضا استحسان کے ساتھ کفر ہے)۔

لیکن محض رواداری میں یہ شرکت ہورہی ہے تب بھی اس میں اس ”باطل امر“ کی حوصلہ افزائی اور تکثیر سواد کے ارتکاب کا جرم سرزد ہورہا ہے جو کم از کم حرام ضرور ہوگا۔

(۴) فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے بعض مباح امور کو چھوڑنے کی گنجائش:

فتنہ وفساد سے ضرر عام ہے، اگر اس کے مقابلہ میں اسلام کا کوئی ایسا حکم ہے جو شعار کے مرتبہ میں نہیں ہے، بلکہ از قبیل مباح یا مندوب ومستحب ہے، یا پھر مسلمانوں کی تہذیب وثقافت سے متعلق ہے تو ایک بڑے ضرر سے بچنے کے لئے ایسی چیزوں کو ترک کرے تو گنجائش ہے، قاضی محمد ثناء اللہ صاحب عثمانی مظہری نے ”لا تسبوا الذين يدعون الخ“ کی تفسیر کرتے ہوئے بطور ضابطہ تحریر کیا ہے:

”وفيه دليل على أن الطاعة إذا أدت إلى معصية راجحة وجب تركها لأن ما يؤدى إلى الشر شر“ (تفسیر مظہری ۳/۱۰۳، سورہ انعام: ۱۰۸، ط: زکریا دیوبند)۔

(اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جب طاعت کسی بڑی معصیت کا سبب ہو تو اس طاعت کو چھوڑنا واجب ہے، اس لئے کہ جو شر کا سبب ہو وہ بھی شر ہے)۔

فقہ کا ایک اہم باب ”سد ذرائع“ ہے، علامہ قرافی نے اس پر تفصیلی کلام کیا ہے، کوئی بھی جائز فعل اگر ردعمل کے طور پر کسی محظور ومفسدہ کا ذریعہ ہو اس کو روک دینے کا نام سد ذرائع ہے۔

(۱) اگر مفسدہ کا لزوم اور فتنہ کا ظہور یقینی ہو تو اس کے ممنوع ہونے پر اتفاق ہے۔

(۲) اسی طرح لزوم مفسدہ کا ظن غالب ہو تب بھی جمہور علماء ممنوع قرار دیتے ہیں۔

(۳) اگر اتفاقی طور پر مفسدہ کا لزوم ہورہا ہو تو یہ صورت ممانعت کے دائرے میں نہیں آتی ہے۔

(۴) اگر بسا اوقات فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہے نہ تو اکثر ہوتا ہے اور نہ ہی صورت نادر کی ہے، یہ صورت حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک ممنوع نہیں ہے، جبکہ مالکیہ اس کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔

مثلاً اجنبی عورت سے خلوت میں فتنہ کا اندیشہ اکثر وغالب نہیں ہے، مگر بسا اوقات ہوتا ہے، اس لیے یہ صورت بھی ممنوع ہے۔

بہر حال ''سد ذرائع'' کا اسلام میں اعتبار ہے، اسی بنیاد پر فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ خانہ کعبہ کو بناء ابراہیم کے مطابق بنا دیں، مگر اس سے اندیشہ تھا کہ نئے مسلمانوں کے قلوب میں آباء واجداد کی موروثی تعمیر کو منہدم کرنے کے نتیجہ میں شکوک وشبہات پیدا ہوں گے، اللہ کے رسول ﷺ کعبہ کو بنائے ابراہیم کے مطابق کرنے سے باز رہے، حدیث کی اکثر کتب معتبرہ میں اس کی تخریج کی گئی ہے۔

یہ سد ذریعہ کی بہترین مثال ہے، علماء امت نے جا بجا اس کو بروئے کار لا کر مسائل کو حل کیا ہے، لہذا فتنہ وفساد کا خوف اگر ابھی بھی ہے تو ایسے امور سے دست کش ہونا چاہئے، بلکہ اجتناب کرنے میں امت کا بڑا فائدہ مضمر ہے۔

مگر اس سے وہ تہذیبی وثقافتی شعار مستثنیٰ ہوگا جو قوم مسلم کے تشخص وشناخت کی علامت ہے، اگر تشخص وشعار باقی نہیں رہے گا تو کوئی قوم بحیثیت قوم نہیں جانی جا سکتی، بلکہ دوسری قوموں کا حصہ ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے، اقوام وملل کی تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔

نیز وہ مباح امر جو مقاصد اسلامیہ میں سے نہ ہو، وہیں پر سد ذریعہ کو کام میں لایا جا سکتا ہے، اس لیے کہ مقاصد شریعت میں سے ہونے کے وقت اس کو ترک کرنا جائز نہیں ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''جو کام مقاصد شریعت میں داخل ہیں خواہ فرائض وواجبات ہوں یا سنن مؤکدہ، یا دوسری قسم کے شعائر اسلامی، اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی وغلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی'' (معارف القرآن ۳/ ۴۲۳ ط: ربانی بکڈپو)۔

(۵) مذاہب باطلہ پر تنقید کے حدود:

مشرکانہ عمل اور معصیت کے کام سے سمجھوتہ تو ممکن نہیں، بلکہ مذاکرہ کا مقصد ہی ان کو ایسے اعمال سے باز رکھنا اور مثالی ماحول سازی کرنا ہے، البتہ دعوتی اصول وضوابط کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

(الف) دعوت کا کام احکام سنانا نہیں، بلکہ ان پر عمل کرنے کی طرف بلانا ہے، لہذا بلانے کے تمام اصول وضوابط کو اپنایا جائے گا، بلانا اسی وقت مؤثر ہوتا ہے جبکہ مخاطب کو بلانے کے انداز سے وحشت ونفرت نہ ہو، اور اس میں استہزا وتمسخر کا پہلو نہ ہو، ورنہ اول وہلہ میں مخاطب بدک جائے گا۔

اس لئے مذاکرہ میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ انداز نفرت آمیز اور استہزا والا نہ ہو، پیغمبرانہ دعوت کی یہی شان تھی، لوگوں کی طرف سے خواہ کتنا بھی مذاق اڑایا گیا، دین ومذہب پر فقرے کسے گئے، ذاتیات تک پر حملہ کیا گیا، قوم نوح اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ رہی ہے: ''إنا لنراک فی ضلال مبین'' (ہم آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں پاتے ہیں)، مگر پیغمبر کا جواب بس یوں ہوتا ہے: ''یا قوم لیس بی ضلالة ولکنی رسول من رب العالمین'' (میرے بھائیو! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں، میں

تو رب العالمین کا رسول وقاصد ہوں)۔

حضرت ہود علیہ السلام کا انداز کتنا دل آزار ہے :"إنا لنراک فی سفاهة وإنا لنظنک من الکاذبین" (ہم تو آپ کو بیوقوف سمجھتے ہیں اور ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں)۔

لیکن پیغمبر خدا کہہ رہے ہیں :"یا قوم لیس بی سفاهة ولکنی رسول من رب العالمین" (اے بھائیو! مجھ میں بے وقوفی وکم عقلی نہیں، میں تو رب العالمین کا رسول ہوں)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تو فرعون اور اس کی قوم نے حد ہی کردی، کلیم اللہ اس کو رب العالمین کی طرف بلا رہے ہیں، لیکن فرعون کہتا ہے : کون رب العالمین؟ اللہ کے پیغمبر نے جب "رب السموات والأرض " کہہ کر اپنے موقف کا اظہار کیا تو فرعون نے استہزا کرتے ہوئے کہا :"ألا تسمعون"، لوگو! سن رہے ہو، کیسی بے عقلی کی بات کر رہے ہیں، جب حضرت موسیٰ نے اس کا کوئی ری ایکشن نہیں لیا اور اتنا کہا:"ربکم ورب آبائکم الأولین" (تمہارے اور تمہارے باپ داداؤں کا بھی وہی رب ہے) تو فرعون نے جھنجھلا کر کہا:"إن رسولکم الذی أرسل إلیکم لمجنون" (تمہارا رسول تو مجنون ودیوانہ معلوم ہوتا ہے)، لیکن پیغمبر ان سب سے بے پرواہ ہو کر کہہ رہے ہیں:"رب المشرق والمغرب وما بینهما إن کنتم تعقلون" (وہ رب مشرق ومغرب کا، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو)۔

خاتم الانبیاء کو دعوت کی راہ میں کتنا کچھ نہیں کیا گیا، ساحر ودیوانہ کے لقب سے کافروں نے یاد کیا مگر آپ نے کبھی استہزاء کا جواب استہزاء سے نہیں بلکہ پیار ومحبت سے دیا، استہزاء وتمسخر کا ردعمل بعض اوقات بہت مضر ثابت ہوتا اور فتنہ کا باب کھول دیتا ہے، قرآن کریم نے ایسے دل آزار انداز اختیار کرنے سے سختی سے منع کیا ہے۔

"لا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوا بغیر علم" (انعام:۱۰۸) (آپ ان بتوں کو برا نہیں کہیں جن کو ان لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے جس کے نتیجے میں وہ اللہ کو برا کہنے لگیں اپنی بے سمجھی کی وجہ سے)

اس آیت کے تحت جصاص لکھتے ہیں:

"وفی ذلک دلیل علی أن المحق علیه أن یکف عن سب السفهاء الذین یتسرعون إلی سبه علی وجه المقابلة له لأنه بمنزلة البعث علی المعصیة" (احکام القرآن للجصاص ۳/۹ دار الفکر)۔

(اس میں اس پر دلیل ہے کہ اہل حق پر واجب ہے، ان بیوقوفوں کو برا بھلا کہنے سے باز رہیں جو ردعمل کے طور پر اللہ کو برا بھلا کہنے پر بہت جلد اتر آتے ہیں، کیونکہ یہ معصیت پر برانگیختہ کرنے کے درجے میں ہے)۔

قرطبی مالکی نے لکھا ہے:

"علماء نے فرمایا: اس کا حکم اس امت میں ہر حال میں باقی ہے، بس جب کافر قوت میں ہو اور خوف ہو کہ وہ اسلام یا نبی علیہ السلام یا اللہ عزوجل کو برا بھلا کہے گا تو مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ان کے صلیبوں، دین اور عبادت گاہوں کو برا بھلا کہیں اور

نہ ان چیزوں سے تعرض کرے جو مذکورہ برائی تک پہنچائے، اس لیے کہ یہ معصیت پر برانگیختہ کرنے کے مرادف ہے'' (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۴/ ۲۸، سورہ انعام)۔

(ب) قرآن کریم نے دعوت کے اصول میں ''حکمت'' پر خاص طور پر توجہ دیا ہے، ''حکمت'' کی تفسیر وتشریح کا حاصل یہ ہے کہ جو بات کہی جارہی ہے وہ مبنی برحقیقت ہو اور انداز ایسا اختیار کیا جائے جو دل میں اتر کر قبول کی اپیل کرے، دل میں اترنے کے لیے حالات کے تقاضوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے، ہر ایک سے گفتگو کا انداز یکساں نہیں ہوگا، مذاکرہ میں شریک افراد بعض تو آخرت کے قائل اور وجود صانع کے معترف ہوں گے، تو بعض خالص مادہ پرست، آخرت کے تصور سے بے گانہ صانع وخالق کے وجود و وجوب کے منکر ہوں گے، مزاج ومذاق کے اعتبار سے بھی مختلف ہوں گے، بعض بے جا تشدد وتعصب کے گھناؤنے مرض میں مبتلا تو بعض سادگی ونرمی کے لبادہ پوش۔

بہر حال پہلے تقاضائے وقت اور اشخاص وافراد کے احوال سے آشنا ہونا ضروری ہے، پھر جہاں سختی کی ضرورت ہو تو اس کو بروئے کار لایا جائے، لیکن جہاں نرمی سے کام چل رہا ہو تو نرمی برتی جائے، بلکہ جہاں تک ہوسکے اشتعال کے بجائے سنجیدہ وشائستہ لب ولہجہ، محبت سے بھرا انداز اختیار کیا جائے، قرآن کریم نے مکالمہ ومجادلہ کے موقع پر خاص طور پر ''احسن طریق'' اختیار کرنے کی تلقین کی ہے: ''ولا تجادلوا أهل الكتاب إلى بالتى هى أحسن'' (اہل کتاب سے مجادلہ احسن انداز میں کرو)، حضرت موسی وہارون کو جب فرعون کے پاس بھیجا گیا تو خاص طور پر حکم دیا گیا: ''قولا له قولا لينا'' (ان سے بات کرنے میں نرم گفتاری اختیار کیجئے)۔

اسی شیریں انداز سے اسلام کا دائرہ وسیع ہوا ہے، حلقہ بگوش اسلام کے حالات کا اگر سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہوگی کہ ان کو متاثر کرنے میں سختی سے زیادہ شائستگی وحرف شیریں نے کردار ادا کیا ہے، قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی اسی صفت کو موقع استحسان میں بیان کررہا ہے:

''فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك'' (آل عمران: ۱۵۹) (اللہ کی رحمت کی وجہ سے آپ ان پر نرم ہوگئے، اگر آپ سخت مزاج وسخت رو ہوتے تو آپ کے پاس سے یہ حضرات بھاگ جاتے)۔

لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یک گونہ سختی کو بھی اختیار نہ کیا جائے، بلکہ بوقت ضرورت کچھ سخت کلام بھی اپنا کام کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے عروہ بن مسعود ثقفی ودیگر سرداران حجاز سے صلح حدیبیہ کے موقع پر جو تبادلہ خیال کیا ان میں اللہ کے رسول ﷺ نے آخر میں یہ بھی فرمایا:

''وإن هم أبوا فوالذى نفسى بيده لأقاتلنهم على أمرى هذا حتى تنفرد سالفتى أو لينفذن الله أمره''

(بخاری شریف ۱/ ۳۷۸ کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد)۔

(اگر وہ حضرات انکار کرتے ہیں تو خدا کی قسم میں ان سے اس امر پر قتال کروں گا، تا آں کہ میری گردن الگ ہوجائے، یا

اللہ تعالی اپنے امر کو نافذ و غالب کر دے)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تیکھا انداز غیر مناسب ہے تو دبا دبا لب ولہجہ اور مرعوبانہ گفتار بھی بعض اوقات مخالفین کو جری بنا دیتا ہے، پھر وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس شاید ٹھوس اقدام کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔

(ج) تیسری اہم پیش رفت "موعظہ حسنہ" کے ساتھ ہونی چاہئے، اس کا سادا سا مفہوم ہے کہ مخاطبین کو باور کروانے کی حتی الامکان کوشش کی جائے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ خیر خواہی کے جذبہ سے کہا جا رہا ہے، خود غرضی و خود نمائی مطلوب نہیں ہے۔

اس لیے ان کے سامنے حق کے فضائل اور اس کے خلاف کرنے کی صورت میں جو وہاں آسکتا ہے عقلی و نقلی ہر طرح سے رکھ دیا جائے۔

انبیاء کرام کی دعوت میں جا بجا قوم کو "یا قومی" (اے میری قوم، اے میرے بھائی) سے خطاب کیا گیا ہے، اس میں یہی راز پنہاں ہے کہ مخاطب کو وہ اپنا بھائی اور قوم کا فرد سمجھ کر بات کر رہا ہے، اپنے بھائی کے ساتھ معاملہ خیر خواہی کا ہونا چاہئے، اس سلسلہ میں اگر مخاطب قوم کے بزرگوں اور رشی منیوں کی مقدس کتابوں سے ان امور کو ان کے سامنے رکھا جائے جو اسلام کے موافق ہیں تو خیر خواہ ہونے کا تصور پختہ ہو جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے شاہ روم کو جب دعوتی خط روانہ کیا ہے، اس میں جہاں ان کے منصب وجاہ کا لحاظ رکھا گیا ہے، ایک متفق علیہ امر کا ذکر کر کے ان کو قریب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم" (ہمارے اور تمہارے مابین متفق کلمہ کی طرف آئیں)۔

(د) اعتراف حق: اگر شرکاء کی طرف سے کوئی حق بات آتی ہے تو اس کا بھرپور استقبال کیا جائے اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا اعتراف کیا جائے، اس سے قبول حق کے لئے سازگار ماحول تیار ہوگا۔

(ہ) اختتام مذاکرہ میں سنجیدگی و متانت کا مظاہرہ: مذاکرہ کسی وجہ سے ناکام ہو جائے تو ایسے موقع پر سنجیدگی و متانت کا مظاہرہ کیا جائے، بے جا الزام تراشی سے احتراز کیا جائے، اور "لكم دينكم ولي دين" کا سہارا لے کر ساری باتوں کو انگیز کیا جائے، نیز آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

(۶) سماجی مسائل میں مذاکرہ :

مومن داعی قوم کا نام ہے، دعوت اپنے اندر بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے، ہر کار خیر اور خیر خواہی کے امر کی طرف بلانا دعوت میں شامل ہے، مذاکرہ کا اصل منشا دعوت ہی ہے، اس لیے سماجی مسائل، غربت میں تناسب، بے حیائی و کرپشن کا خاتمہ، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے منعقد مذاکرہ میں شرکت، اس کے لیے کوشش خیر کی جدوجہد ہے، جس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے اور حتی المقدور اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے سعی کرنی چاہئے۔

(۷) سیاسی لوگوں کے ساتھ مذاکرات :

سیاسی جماعت کا نصب العین بعض اوقات اسلام مخالف ہوتے ہیں، یہ ایسے ہی ہیں جیسے یہود ونصاری کے نظریات اسلام سے متصادم ہیں، مگر دعوتی نقطہ نظر سے ان دشمنان اسلام سے مذاکرات کی بھی گنجائش ہے، اسی طرح بعض مسلم مسائل ایسے ہیں کہ بدون ان سے گفت وشنید اور ہم خیال بنائے بغیر حل ہونا ممکن نظر نہیں آتا، بالخصوص ہندوستان جیسے غیر مسلم اقتدار والے ملکوں میں اس کی ضرورت زیادہ محسوس کی جاتی ہے، آئے دن دشمنان وقت کی طرف سے اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں کو متہم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اسلامی شعائر پر روز بروز حملہ تیز ہورہا ہے، ان سب کاروائی میں کسی نہ کسی طرح سیاسی حلقوں کی سرپرستی بھی ہوتی ہے، ان کی حفاظت اور حقوق کی بازیابی کی کوشش ان جماعتوں سے بات چیت کرکے کامیاب کی جاسکتی ہے۔

(۸) خواتین مقررین کی موجودگی میں مسلمانوں کا طرز عمل :

خواتین خواہ مسلمان ہوں یا کافر پردے کے احکام میں برابر ہیں، اتنی بات اپنی جگہ برحق ہے کہ مردوں کی مجلسوں میں عورت کی شرکت سے ''خلوۃ'' کی حرمت مرتفع ہوجاتی ہے۔

"والظاهر أن علة الكراهة الخلوة، ومفاده أنها تنتفي بوجود رجل آخر" (ردالمحتار ۵/۳۶۰ کتاب الحظر والاباحۃ فصل فی النظر واللمس، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(ظاہر ہے کہ کراہت کی علت خلوت ہے، اس کا مفاد یہ ہے کہ کسی دوسرے مرد کی موجودگی میں یہ کراہت ختم ہوجائے گی)۔

لیکن پردہ وغیرہ کے احکام اپنی جگہ باقی رہیں گے، ہاں ضرورت کے مواقع پر اس کی بھی گنجائش ہوجاتی ہے، مذاکرہ میں خواتین کی شرکت ضرورت ہے یا نہیں یہ محل نظر ہے، لیکن ان کی شرکت سے مفر بھی نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات تو ان خواتین کی قیادت وسیادت ہی میں مذاکرہ ہوتا ہے، اس میں مسلمانوں کی شرکت نہ ہونے سے اکثر واقعی مسائل حل نہ ہوتے ہوں تو شرکت ضروری ہوگی، لیکن حتی الامکان شریعت کے حدود وقیود کی پابندی کی جائے، کم از کم غض بصر اور نگاہ کو نیچی رکھ کر اپنے آپ کو بچایا جاسکتا ہے، اس لیے مسلم شرکاء کے لیے ضروری ہے کہ بلاضرورت ان غیر محرمات پر نگاہ نہ ڈالیں۔

بین مذہبی مذاکرات — احکام وآداب

مفتی محمد جمال الدین قاسمی ☆

اسلام ایک عالمگیر اور آفاقی مذہب ہے، امن وسلامتی کا پیامبر ہے، الفت ومحبت اور اخوت وبھائی چارگی کا علمبردار ہے، وہ اپنے پیروکاروں کو روئے زمین پر عدل وانصاف قائم کرنے کی تاکید کرتا ہے، ظلم وستم اور فتنہ وفساد کی سرکوبی کرنے کا حکم دیتا ہے، مذہبی رواداری، فراخدلی، سیرچشمی اور تحمل مزاجی کی تلقین کرتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ مسلم فرمانرواؤں نے دنیا کے جن خطوں پر حکومت کی ہے وہاں کے عوام مجموعی طور پر خوشحال اور امن وچین سے زندگی بسر کرتے تھے، مسلم ہو یا کافر، امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، آقا ہو یا غلام ہر ایک کو یکساں طور پر مراعات اور شہری حقوق حاصل تھے، مسلمان تو مسلمان غیر مسلم کو بھی ظلم وزیادتی اور حق تلفی کا اندیشہ نہیں تھا، موجودہ زمانے میں حضرت انسان نے اگرچہ تہذیب وتمدن اور سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز طور پر پیش رفت کی ہے؛ تاہم اخلاق وکردار اور عادات واطوار کے لحاظ سے وہ مسلسل پستی کی طرف گامزن ہے، تعصب وتخرب، نفرت وعداوت، نسل پرستی وگروہ بندی اس کی خمیر میں داخل ہوچکی ہے، مذہب اور جنس کی بنیاد پر امتیازانہ سلوک اور دوہرا رویہ اس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے، سیم وزر اور مالی مفاد کی خاطر قتل وغارت گری اور فتنہ وفساد معاشرہ کا حصہ بن چکا ہے، جس کی وجہ سے انسان کا خون پانی سے زیادہ ارزاں ہوگیا ہے، انسانی قدروں کی شناخت ختم ہوگئی ہے، اور پوری دنیا ظلم وزیادتی اور فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن گئی ہے، ایسے سخت اور ناگفتہ بہ حالات میں مصالح عامہ اور مشترکہ مفادات کے حصول کے لئے اتحاد ویکجہتی اور ثقافتی ہم آہنگی کا ہونا ناگزیر ہے، ظاہر ہے کہ اس کے لئے بین مذہبی مذاکرات کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے؛ تاکہ مختلف مذاہب کے سربرآوردہ لوگ آپسی بات چیت کے ذریعہ عالمی سطح پر امن وامان کی خوشگوار فضا کو یقینی بنائیں، باہمی بغض وعناد اور نفرت وانتقام کی آگ کو فرو کریں، رواداری، فراخدلی اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کریں، اس سے پوری نوع انسانیت کو فائدہ پہنچے گا، اور ظلم وستم اور فتنہ وفساد کا خاتمہ بھی ہوگا؛ لیکن بین مذہبی مذاکرات جہاں نفع بخش اور کافی اہمیت کا حامل ہے وہیں یہ بڑا نازک اور مشکل کام بھی ہے؛ کیوں کہ ایک مسلمان دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام تو کرسکتا ہے؛ لیکن اپنے مذہب کے کسی حکم شرعی سے دست بردار نہیں ہوسکتا، ذیل میں بین المذاہب مذاکرات کی اقسام اور اس کے احکام کو قدرے تفصیل سے بیان کرنے کا ارادہ ہے، اللہ تبارک وتعالی سے دعاء ہے کہ حق بات لکھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب فرمائے، آمین

☆ صدر مفتی دار العلوم حیدرآباد، تلنگانہ۔

مذہبی امور کے متعلق مذاکرات:

مذہبی اور دینی امور کے متعلق مذاکرات اور آپسی بات چیت کی مختلف صورتیں ہیں، اور ہر صورت کا حکم مستقل اور جداگانہ ہے، ذیل میں اس کی تفصیل ذکر کی جارہی ہے:

دعوتی موضوع پر مذاکرات:

مذہبی اور دینی امور کے متعلق مذاکرات کی ایک صورت دعوت الی اللہ ہے، دعوت وتبلیغ ایک اہم اور عظیم الشان فریضہ ہے، غیر مسلموں کو اللہ کی طرف دعوت دینا، ان کے سامنے مذہب اسلام کی حقانیت واضح کرنا اور دینی تعلیمات کے محاسن اور خوبیاں بیان کرنا ایک مستحسن اور قابل تقلید عمل ہے، جب تک امت محمدیہ نے اس عظیم الشان فریضہ کو انجام دیا، اور دعوت واشاعت دین کا مشن سنبھالا ان کا آفتاب اقبال عالم افق پر چمکتا رہا، اور سرفرازی وکامرانی ان کے پابہ رکاب رہی، اور جب بھی انہوں نے اس عظیم الشان فریضہ سے غفلت برتا، اور دعوت دین جیسے اہم کام میں سستی وسہل انگاری سے کام لیا تو ادبار وپستی کی عمیق کھائیوں میں جا گری، اور شکستہ پائی وزبوں طالعی اس کا مقدر ٹھہری۔

دعوتی مذاکرات کا موضوع:

قرآن کریم کے اندر مختلف آیتوں میں یہود ونصاری کی تبلیغ اور ان کے درمیان اشاعت دین کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان آیات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی واصلاحی گفتگو مندرجہ ذیل نقاط پر ہونی چاہیے:

☆عقیدۂ توحید: یعنی اللہ تبارک وتعالی ایک ہے، اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات میں کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے، عبادت وبندگی کے لائق صرف وہی ذات خداوند ہے۔

☆عقیدۂ رسالت: یعنی آپ ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں، آپ کی آمد کے بعد قیامت تک کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا، آپ ﷺ نے امت کے سامنے جو دین اسلام پیش کیا ہے وہ حق ہے اور واجب الاتباع ہے۔

☆عقیدۂ آخرت: یعنی ایک دن یہ ساری کائنات فنا ہوجائے گی، اور تمام انس وجن کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا، اور ان سے حساب وکتاب لیا جائے گا، نیک اور صالح لوگوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا، اور بدکار اور کفار کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

دعوتی مذاکرات کے اصول وآداب قرآن کی روشنی میں:

دعوت دین کا عمل جہاں اہمیت اور عظمت کا حامل ہے وہیں یہ ایک نازک اور جوکھم بھرا عمل بھی ہے؛ کیوں کہ دعوت دین اور اشاعت اسلام کا منہج صحیح اور درست ہوتو اس کے فوائد جیسے وسیع، ہمہ گیر اور ہمہ جہتی ہوتے ہیں، اسی طرح اگر دعوت اسلام کا

منہج غلط اور نادرست ہوتو اس کے نقصانات بھی دوررس اور غیر محدود ہوتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ دعوت دین جیسے عظیم الشان فریضہ کے لئے اللہ تبارک وتعالی نے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ جاری فرمایا، اور خلق اللہ کی اخلاقی وروحانی اصلاح کے لئے ایسے انسانوں کا انتخاب فرمایا جن کے نفوس مزکی اور قلوب مصفی تھے، اور ساتھ ہی یہ قدرتی انتظام فرمایا کہ وحی کا سلسلہ بھی جاری فرمایا؛ تا کہ دعوتی میدان میں وقتاً فوقتاً مفید ہدایات دی جاتی رہیں، اللہ تبارک وتعالی نے دعوتی طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"أدع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن" (النحل: ۱۲۵)۔

(آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلائیے، اور ان سے (ضرورت پڑنے پر) اچھے طریقہ سے بحث کیجئے)۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالی نے دعوتی واصلاحی موضوع پر گفتگو کرتے وقت تین آداب کی رعایت کرنے کا حکم دیا ہے: حکمت، موعظت حسنہ اور مجادلہ احسن؛ لیکن قرآن کے انداز بیان سے ایسا لگتا ہے کہ دعوت کے بنیادی اصول دو ہی ہیں: حکمت اور موعظت حسنہ؛ لیکن بسا اوقات مباحثہ کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے، اس کی تائید مفسر قرآن علامہ آلوسیؒ کے بیان سے بھی ہوتی ہے:

"اصول دعوت تو دو ہی چیزیں ہیں: حکمت اور موعظت، تیسری چیز مجادلہ اصول دعوت میں داخل نہیں ہے، ہاں دعوتی موضوع پر گفتگو کرتے وقت کہیں اس کی بھی ضرورت پیش آتی ہے" (روح المعانی ۷/۴۸۹ دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

دعوتی اسلوب میں حکمت ودانشمندی:

حکمت بہت بڑی دولت ہے، یہ لفظ اپنے جلوے میں بے پناہ وسعت رکھتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جہاں اور مقاصد ذکر کیے گئے ہیں ان ہی میں سے ایک تعلیم حکمت بھی ہے (آل عمران: ۱۶۴)، احادیث شریفہ میں جن چیزوں کو قابل رشک قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک حکمت بھی ہے (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۰۹)، مشہور مفسر قرآن علامہ آلوسیؒ حکمت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"الكلام الصواب القريب الواقع من النفس أجمل موقع" (تفسیر البحر المحیط ۶/۶۱۲ دار الفکر بیروت)۔

(یعنی حکمت سے مراد وہ بصیرت وشعور ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضائے حال کے مناسب کلام کرے، اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب کی طبع نازک پر اس کی کوئی بات گراں نہ گزرے، (یعنی نرمی کی جگہ نرمی، سختی کی جگہ سختی، اختصار کی جگہ اختصار اور طوالت کی جگہ طوالت اختیار کرے، اور جہاں صراحت کے ساتھ کوئی بات کہنے میں مخاطب کو ناگوار گزرتا ہو تو وہاں اشارے اور کنایات سے گفتگو کرے))۔

دعوتی واصلاحی مذاکرات میں حکمت ودانشمندی اختیار کرنے کے ضمن میں بہت سی باتیں آتی ہیں، بطور نمونہ چند باتوں کی

نشاندہی کی جاتی ہے :

☆ دعوتی موضوع پر مذاکرات کے وقت مخاطب کی ذہنی سطح اور اس کے علم وفہم کی رعایت کی جائے، خود آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

"حدثوا الناس بما یعرفون" (بخاری، حدیث نمبر: ۱۲۷)۔

(لوگوں سے ان کے فہم کے مطابق گفتگو کرو)۔

یعنی ہر شخص کے ساتھ یکساں گفتگو نہ کرو؛ بلکہ ہر ایک کی ذہنی سطح اور علمی لیاقت کے مطابق گفتگو کرو، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کعبۃ اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی بنیادوں پر تعمیر کروں؛ لیکن چوں کہ قریش نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اور کعبۃ اللہ کو منہدم کرکے دوبارہ تعمیر کرنے میں لوگوں کے فتنے میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا؛ اس لئے آپ ﷺ اس ارادے سے باز آ گئے (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، حدیث نمبر: ۵۷۳۲)۔

اسی لئے آپ ﷺ کے دعوتی اسلوب کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ ہمیشہ مخاطب کی ذہنی سطح کی رعایت فرماتے تھے، اس کا اندازہ ابوداؤد شریف کی ایک حدیث سے بھی ہوتا ہے :

"حضرت جابر بن سلیمؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس خدا کا رسول ہوں کہ جب تمہیں کوئی نقصان پہنچے پھر اس سے دعاء کرو تو وہ غلہ اور سبزہ اگائے اور جب تم کسی بے آب وگیاہ سرزمین میں ہو پھر تمہاری اونٹنی گم ہوجائے اور تم اس سے دعاء کرو تو وہ تمہاری اونٹنی واپس لائے، حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: کسی کو گالی مت دینا، حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے اس کے بعد کسی کو گالی نہیں دی" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۰۸۴)۔

مذکورہ بالا حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت جابرؓ کو بہت سی ایسی باتوں کی طرف توجہ دلائی جو ان کے روزمرہ کے مشاہدے اور تجربے میں تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس خدا کا رسول ہوں جس سے مصیبت میں دعائیں مانگی جاتی ہیں، اور جو بندے کی ہر چھوٹی بڑی پریشانیوں کو دور کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر دعوتی وتذکیری موضوع پر گفتگو کرتے وقت مخاطب کی علمی وذہنی سطح کی رعایت نہ کی جائے تو مدعو کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، اور قبول حق کا امکان بھی کم ہوجاتا ہے؛ اس لئے مخاطب کے فہم اور اس کی صلاحیت کے مطابق بات کرنا ہی حکمت ہے۔

☆ دعوتی واصلاحی موضوع پر گفتگو کرتے وقت تدریج کا خیال رکھا جائے، تدریج کا مطلب یہ ہے کہ مرحلہ وار اسلام کی تعلیمات وہدایات مخاطب کے سامنے بیان کی جائیں، یکبارگی اسلام کے تمام احکام مخاطب کو سنائے جائیں گے تو وہ پریشان ہوجائے گا، کتاب وسنت میں قدم قدم پر مصلحت اور تدریج کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور قانون سازی کے لئے پہلے ماحول کو سازگار بنانے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور طبیعت انسانی میں قبول وطاعت کے شمع کو فروزاں کیا گیا ہے۔

B14

☆انسانی نفسیات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں نفسیات ایک فن کی حیثیت اختیار کر گیا ہے؛اس لئے دعوتی مذاکرات کے وقت مخاطب کی نفسیات کا خیال رکھا جائے ،آپ ﷺ ہمیشہ دعوت دیتے وقت مخاطب کی نفسیات کا خیال رکھا کرتے تھے۔

☆جن غیر مسلموں کے ساتھ دعوتی واصلاحی موضوع پر مذاکرات اور آپسی بات چیت ہو ان کے ساتھ غم خواری اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے ،اچھے اور شریفانہ اخلاق کا ان کے سامنے مظاہرہ کیا جائے؛ کیوں کہ اخلاق حسنہ وہ اثر انگیز طلسم ہے جو انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے، دلوں سے حسد ونفرت اور بغض وعداوت کو ختم کر دیتی ہے، اور طاعت وقبول کا صالح جذبہ پیدا کرتی ہے، چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک یہودی لڑکا آپ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، لیکن جب وہ بیمار پڑا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور اس کے سرہانے بیٹھنے کے بعد فرمایا: اے بیٹے! اسلام قبول کر لے، اس لڑکے نے مستفسرانہ نگاہوں سے اپنے والد کو دیکھا، والد نے کہا: بیٹا ابوالقاسم کی بات مان لے، چنانچہ وہ کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا، جب آپ ﷺ واپس ہونے کے لئے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا : ’’تعریف ہے اس خدا کی جس نے اس کو دوزخ کی آگ سے بچالیا‘‘(بخاری، حدیث نمبر:۱۳۵۶)۔

موعظت حسنہ:

موعظت حسنہ سے مراد یہ ہے کہ دعوتی واصلاحی عنوان پر مذاکرات کرتے وقت داعی میں ہمدردی اور خیر کا عنصر غالب ہو، حق بات کو اچھے اور موثر انداز میں مخاطب کے سامنے پیش کیا جائے ،حضرت موسی وحضرت ہارون علیہما الصلاۃ والسلام کو جب فرعون کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو انہیں یہ ہدایت دی گئی کہ اس سے نرم بات کرو :

”إذهبا إلى فرعون إنه طغى فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشى“(طہ:۴۴،۴۳)۔

(تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ حد سے بڑھ گیا ہے، اور اس سے نرم بات کرو، شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے)۔

آج جن لوگوں کے ساتھ دعوتی واصلاحی پہلو پر مذاکرات کرتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں، اور ہم میں سے کوئی موسی وہارون علیہما السلام کے برابر مکرم اور قابل احترام نہیں، تو ہمیں یہ کیسے حق حاصل ہوگا کہ دعوتی مذاکرات کے وقت سخت اور درشت لہجہ اختیار کریں، یا کوئی ایسا عنوان اختیار کریں جس سے مخاطب کی دل آزاری ہو یا اس کی حیثیت عرفی مجروح ہو۔

سیرت طیبہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ دعوت واصلاح میں لطف اور نرمی کو اختیار کیا ہے، حتی کہ ان حالات اور مواقع میں بھی جہاں ایک انسان غصہ اور اشتعال میں آجاتا ہے، اور درشت لہجہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ایک جگہ خود آپ ﷺ نے دعوت واصلاح میں نرمی اور آسانی اختیار کرنے کا حکم دیا :

”يسروا ولا تعسروا، بشروا ولا تنفروا“(بخاری، حدیث نمبر:۶۹)۔

(آسانی پیدا کرو دشواری میں مت ڈالو، خوش خبری سناؤ اور نفرت مت پیدا کرو)۔

مباحثہ:

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا کہ اصول دعوت تو دو ہی چیزیں ہیں: حکمت اور موعظت حسنہ، تاہم کبھی کبھی دعوتی و اصلاحی پہلو پر مذاکرات میں ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے جو شکوک و اوہام میں مبتلا ہوتے ہیں، ہٹ دھرمی، ضد اور عناد ان کی طبیعت ثانیہ ہوتی ہے، ایسے لوگوں سے بحث و مباحثہ ناگزیر ہو جاتا ہے، ان لوگوں سے بحث و مباحثہ کرتے وقت اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ گفتگو میں لطف اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کیے جائیں جو مخاطب کو بآسانی سمجھ میں آ سکیں، دلیل میں وہ مقدمات پیش کیے جائیں جو مشہور و معروف ہوں جس سے مخاطب کے شکوک و شبہات رفع ہوں، اور قبول و طاعت کا صالح جذبہ ان میں بیدار ہو۔

انبیاء کرام کا اسلوب دعوت:

انبیائے کرام نے اپنی قوم سے جو دعوتی و اصلاحی گفتگو کی ہے اس کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے ذکر کیا ہے، پچھلی قوموں نے انبیائے کرام سے گفتگو کرتے وقت نہایت درشت اور غیر مہذب لہجہ اختیار کیا، اور گفتار میں زہر افشانی کی؛ لیکن انبیائے کرام نے سنجیدہ اور شائستہ جواب دیا، اور ذرا بھی اشتعال میں نہیں آئے، اولوالعزم پیغمبر حضرت نوح علیہ الصلاۃ والسلام نے مسلسل ساڑھے نو سو سال تک دعوتی مشن کو انجام دیا، اور اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا؛ لیکن معدودے چند لوگوں کے علاوہ اکثریت آپ پر ایمان نہیں لائی؛ بلکہ بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یوں کہا:

"إنا لنراک فی ضلال مبین" (الاعراف:۶۰)۔

(ہم آپ کو کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں)۔

اس پر حضرت نوح علیہ الصلاۃ والسلام نے گفتار میں نرمی اور لہجہ میں سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا:

"لیس بی ضلالۃ ولکنی رسول من رب العلمین" (الاعراف:۶۱)۔

(میں گمراہی میں مبتلا نہیں ہوں؛ لیکن میں رب العلمین کا فرستادہ ہوں)۔

اسی طرح حضرت شعیب علیہ الصلاۃ والسلام نے جب اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلایا، اور ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا تو انہوں نے تمسخر اور مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

"یاشعیب أصلاتک تأمرک أن نترک مایعبد آباؤنا أو أن نفعل فی أموالنا مانشاء إنک لأنت الحلیم الرشید" (ہود:۸۷)۔

(اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباء واجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا ہم اپنے مالوں میں جو چاہیں تصرف نہ کریں، بے شک تو ہی بردبار اور سمجھدار بنتا ہے)۔

ظاہر ہے کہ حضرت شعیب علیہ الصلاۃ والسلام کی قوم نے نہایت چبھتا ہوا اور اشتعال انگیز جملہ استعمال کیا؛ لیکن اس پر حضرت شعیب علیہ الصلاۃ والسلام نے اصلاح آمیز لہجہ میں کہا :

"یاقوم أرأیتم إن کنت علی بینة من ربی ورزقنی منه رزقاحسنا وماأرید أن أخالفکم إلی ماأنهاکم عنه إن أرید إلاالإصلاح مااستطعت وماتوفیقی إلابالله علیه توکلت وإلیه أنیب" (ہود:۸۸)۔

(اے میری قوم! کیاتم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل رکھتا ہوں، اور (اس کاحال یہ ہو کہ) اس نے اپنی طرف سے مجھے اچھارزق عطا کیا (اس کے باوجود میں چپ رہوں، اور تمہیں راہ حق کی طرف نہ بلاؤں) اور میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے میں تمہاری اصلاح حال کی کوشش کروں، اور مجھے اللہ ہی کی طرف سے توفیق ملتی ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا، اور میں اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں)۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے پچھلی قوموں اور ان کے انبیاء کے بہت سے مکالمے متعدد مقامات پر ذکر کیے ہیں، ان تمام مکالموں میں انبیائے کرام کے طرز گفتگو میں شفقت وہمدردی نمایاں طور پر نظر آتی ہے، زہر افشانی کا جواب گل افشانی سے اور غیر مہذب گفتگو کا جواب مہذب انداز میں دیا گیا ہے، یقینا دعوتی اسلوب میں یہی وہ شاہ کلید ہے جو پتھر دل انسان کو بھی موم کر دیتا ہے، اور بڑے سے بڑے مجرم اور بغاوت پسند انسان کے اندر قبول وطاعت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

تقریب بین الادیان:

مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے مابین مذہبی امور پر مذاکرات اور آپسی بات چیت کی دوسری صورت یہ ہے کہ تمام مذاہب کو من وعن اس کے تمام اجزاء وعناصر کے ساتھ حق تسلیم کرلیا جائے، اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ بظاہر تمام مذاہب الگ الگ ہیں؛ لیکن سب کا منزل مقصود ایک ہے، چنانچہ ہر مذہب کے لوگ دوسرے مذاہب کے شعائر اور اس کے عقائد کا احترام کریں، اور ان کے تہوار اور مذہبی عبادات میں شریک ہوں، یا باہمی مذاکرات کے ذریعہ ہر مذہب کے کچھ عناصر لے کر ایک نیا دین تشکیل دیا جائے، اور پوری نوع انسانیت کے لئے وہ دین قابل عمل ہو؛ تاکہ کسی قسم کا مذہبی نزاع باقی نہ رہے، اور پوری نوع انسانیت امن وسکون کی سانس لے سکے، اور باہمی اتحاد واتفاق اور اخوت وبھائی چارگی کی فضا عام ہو، اور پوری دنیا امن وآشتی کا گہوارہ ہو۔

تقریب بین الادیان شریعت کی نظر میں:

ظاہر ہے کہ تقریب بین الادیان شریعت سے متصادم نظریہ ہے، اس سے کفر وشرک پر مبنی مذاہب کی توثیق وتصویب ہوتی ہے، اسلام کسی بھی قیمت پر اس نوع کی گفت وشنید کی اجازت نہیں دے سکتا؛ اور اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں :

الف: ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ دین اسلام ہی برحق مذہب ہے، یہ زندہ جاوید اور قیامت تک باقی رہنے والا

دستور العمل ہے، وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ آفتاب اسلام طلوع ہونے کے بعد سارے مذاہب کی روشنیاں ماند پڑ گئیں، اور مذاہب کی دنیا میں سیادت وقیادت کا خلعت صرف اور صرف مذہب اسلام کو ہی زیب دیتا ہے، اور دنیا وآخرت میں فلاح وکامیابی کا راز مذہب اسلام میں ہی پوشیدہ ہے، قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالی کی بارگاہ میں صرف مذہب اسلام ہی مقبول ہوگا، اسلام کے علاوہ کوئی بھی مذہب قیامت کے دن قابل قبول نہیں ہوگا، فرمان باری تعالی ہے :

"إن الدين عند الله الإسلام" (آل عمران:۱۹)۔

(بے شک اللہ کے دربار میں مذہب اسلام ہی مقبول ہے)۔

دوسری جگہ اللہ تبارک وتعالی نے دوٹوک لفظوں میں یہ حقیقت بیان فرمائی ہے :

"ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه وهو فى الآخرة من الخاسرين" (آل عمران:۸۵)۔

(اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین طلب کرے گا تو ہرگز اس کو قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا)۔

ب: اللہ تبارک وتعالی نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مسلمانوں کو کفار کے ساتھ موالات اور قلبی تعلق رکھنے سے صاف الفاظ میں منع کیا ہے، ارشاد باری ہے :

"لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين ومن يفعل ذلك فليس من الله فى شئ" (آل عمران:۲۸)

(اور جو لوگ ایمان والے ہیں انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ مومنوں کو چھوڑ کر منکرین حق کو اپنا رفیق ومددگار بنالیں، اور جس نے ایسا کیا تو وہ یاد رکھے کہ اس کا اللہ سے کوئی سروکار نہیں رہا)۔

"يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض ومن يتولهم منكم فإنه منهم" (المائدة:۵۱) (یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق ومددگار نہ بناؤ، وہ (تمہاری مخالفت میں) ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور (دیکھو اب) تم میں سے کوئی انہیں رفیق ومددگار بنائے گا تو وہ انہی میں سے سمجھا جائے گا)۔

ظاہر ہے کہ جب تمام مذاہب کو حق مان لیا جائے یا تمام مذاہب کے کچھ عناصر کو لے کر ایک نیا دین تشکیل دیا جائے تو موالات کفار سے ممانعت کا حکم منجمد ہو جائے گا۔

ج: تقریب بین الادیان سے ان بہت سے نصوص قطعیہ ظاہرہ کی تکذیب اور انکار لازم آتا ہے جن میں یہود ونصاری اور کفار کے مذاہب کو باطل قرار دیا گیا ہے، اور ان کی کتابوں کو تحریف شدہ بتایا گیا ہے :

"فويل للذين يكتبون الكتاب بأيديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا فويل لهم مما كتبت أيديهم وويل لهم مما يكسبون" (البقرة:۷۹)۔

(ان لوگوں کے لئے ہلاکت وبربادی ہے جو خود اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف

سے ہے، تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑا سا معاوضہ حاصل کرلیں، جوان کے ہاتھوں نے لکھا ہے وہ بھی باعث تباہی ہے، اور جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں وہ بھی ان کے لئے سامان خرابی ہے)۔

اسی طرح وہ نصوص بھی بے معنی ہوجائیں گے جس میں اہل کتاب اور کفار کے عقائد باطلہ پر تنقید کی گئی ہے، اور انہیں راہ راست پر آنے کی تاکید کی گئی ہے، وہ نصوص یہ ہیں :

"یا أیها الناس ضرب مثل فاستمعوا له إن الذین تدعون من دون الله لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له وإن یسلبهم الذباب شیئا لا یستنقذوه منه ضعف الطالب والمطلوب" (الحج: ۷۳)۔

(اے لوگو ایک مثال سنائی جاتی ہے غور سے سنو اللہ کے سوا جن (خودساختہ) معبودوں کو تم پکارتے ہو انہوں نے ایک مکھی تک پیدا نہیں کی، اور اگر تمہارے یہ سارے معبود اکھٹے ہوکر زور لگائیں جب بھی پیدا نہ کرسکیں، اور (پھر اتنا ہی نہیں بلکہ) اگر ایک مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو ان میں قدرت نہیں کہ اس سے چھڑا لیں، تو دیکھو طلب گار بھی درماندہ ہوا اور مطلوب بھی)۔

قرآن مجید میں مذہبی لحاظ سے نوع انسانیت کی دو قسمیں کی گئی ہیں: مسلم اور کافر، چنانچہ حق تعالی شانہ کا ارشاد ہے:

"هو الذی خلقکم فمنکم کافر ومنکم مؤمن" (التغابن: ۲)۔

(وہی ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کوئی منکر ہے تو کوئی ماننے والا)۔

"إنا هدیناه السبیل إما شاکرا وإما کفورا" (الدہر: ۳)۔

(ہم نے اس پر راہ عمل کھول دی اب یہ اس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا)۔

مذہبی وحدت کو تسلیم کر لینے سے اس خدائی تقسیم کا انکار لازم آتا ہے۔

قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر ایمان والوں سے آخرت میں بہترین صلہ اور پر کیف نعمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے، اور کافروں کو دردناک سزا اور جہنم کی وعید سنائی گئی ہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے :

"إن المتقین فی ظلال وعیون وفواکه مما یشتهون کلوا واشربوا هنیئا بما کنتم تعملون إنا کذلک نجزی المحسنین" (المرسلات: ۴۱)۔

(بے شک پرہیزگار لوگ سایوں اور چشموں اور دل پسند میووں میں رہیں گے، تم جو کچھ عمل کرتے تھے اس کے بدلے مزے سے کھاؤ پیو، ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں)۔

"إن الذین کفروا من أهل الکتاب والمشرکین فی نار جهنم خالدین فیها أولئک هم شر البریة" (البینۃ: ۶)

(یقیناً وہ اہل کتاب جنہوں نے کفر کیا اور مشرک لوگ جہنم میں جائیں گے، اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ لوگ سب سے بدتر مخلوق ہیں)۔

ظاہر ہے کہ جب مذہبی اکائی کا جاذب نظر نظریہ قبول کرلیا جائے گا تو یہ آیتیں بھی اپنی معنویت کھو دیں گی۔

د: احادیث مبارکہ کے ذخیرہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں مشرکین مکہ کی طرف سے بھی تقریب بین الادیان کے لئے پیش رفت کی گئی، انہوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ ہم آپ کے معبود کو برحق تسلیم کرتے ہیں، آپ بھی ہمارے معبودوں کو برحق تسلیم کیجئے، چنانچہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے، ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کیجئے، اس پر سورۂ کافرون کی آیات نازل ہوئیں، اور مسلمانوں کو مشرکین مکہ سے ایسی مصالحت ومفاہمت کرنے سے روک دیا گیا (تفسیر ابن کثیر ۸/۵۰۷ دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

ہ: قرآن مجید میں مشرک مرد اور مشرک عورتوں سے مناکحت کا رشتہ قائم کرنے سے روکا گیا ہے (البقرۃ: ۲۲۱)، نیز آپ ﷺ نے یہ حقیقت بھی بیان فرمادی کہ کافر اور مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے (بخاری، حدیث نمبر: ۶۷۶۴)، جب تقریب بین الادیان کے ذریعہ مسلم وکافر کی تقسیم کالعدم کردی جائے گی تو یہ دونوں حکم شرعی کیوں کر قابل عمل رہیں گے۔

و: احادیث شریفہ میں ذمیوں کے احکام ذکر کیے گئے ہیں، اور امام المسلمین کو ذمیوں کے ساتھ عدل وانصاف کرنے اوران کو مذہبی آزادی دینے کا حکم دیا گیا ہے (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۲)، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے ذمیوں کے متعلق احکام ومسائل بیان کرنے کے لئے مستقل باب قائم کیا ہے، اگر تقریب بین الادیان کے لئے اہل مذاہب سے مذاکرات کیے جائیں تو ان احکام سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا۔

ز: کفار اور اہل کتاب کے ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟ اوران کے برتن کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ ان کے مذہبی میلوں میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں؟ اوران کے جنازہ اوراس میں ہونے والے مذہبی رسوم میں شریک ہونا شرعی نقطۂ نظر سے کیا حکم رکھتا ہے؟ یہ اوراس طرح کے بہت سے مسائل ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مفصل طور پر ذکر کیے گئے ہیں، اگر مذہبی وحدت کے لئے مذاکرات کئے جائیں گے تو ظاہر ہے کہ یہ سارے احکام بھی فرسودہ اور ناقابل عمل ٹھہریں گے۔

یہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند مسائل ذکر کیے گئے ہیں جن پر تقریب بین الادیان کے نظریہ کو حق بجانب تسلیم کر لینے سے ضرب پڑتا ہے، ورنہ فقہ کا ادنی طالب علم بھی ادنی غور وفکر سے اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ تقریب بین الادیان کی وجہ سے ہزاروں مسائل واحکام لغو ہو جائیں گے، اور محض فقہی کتابوں کی زینت بن کر رہ جائیں گے۔

ح: یورپ اور کلیسا کی طرف سے تقریب بین الادیان کے لئے باہمی مذاکرات کی جو پیش رفت ہوئی ہے اس کا محرک یہ ہے کہ مذاہب امن عالم کے لئے خطرہ ہیں، مذہب اور دین کے نام پر ہی ایک گروہ دوسرے گروہ سے دست بگریباں ہے، مذہبی تصلب کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ مرض کی صحیح تشخیص نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو عیسائی آپس میں نہیں لڑتے، اور آتش پرست اور بتوں کے سامنے اپنی جبین نیاز خم کرنے والے باہم برسر پیکار نہیں ہوتے۔

واقعہ یہ ہے کہ مغربی ممالک کی طرف سے بین مذہبی مذاکرات کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں اس کا مقصد صرف تقریب بین الادیان ہے؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ مغرب کے مفکرین ودانشور مغربی تہذیب وثقافت کے انتشار اوراس کی ترویج میں

مذاہب کوخطرہ سمجھتے ہیں؛ کیوں کہ مذاہب ہی خالق ومخلوق کے مابین تعلق وارتباط اوردائمی وابستگی پرزوردیتے ہیں، انسانیت کواعلی اخلاق وکردار کی تعلیم دیتے ہیں، عریانیت وفحاشی سے نفرت بڑھاتے ہیں، صحیح اورغلط باتوں میں امتیاز کا سلیقہ سکھاتے ہیں، چنانچہ مغرب اوراس کے ہم نواؤں نے سوچا کہ اگرمذاہب سے ہی لوگوں کے تعلق ووابستگی کوکمزورکردیا جائے تو آسانی مغربی تہذیب وافکار کو پوری نوع انسانیت پرمسلط کیا جاسکتا ہے، اور پورے عالم کومغرب کے رنگ میں ڈھالا جاسکتا ہے، چنانچہ انہوں نے بین مذہبی مذاکرات کا خوشنما اورجاذب نظرعنوان دے کرمختلف مذاہب کے پیروکاروں کوجمع کیا، اورتقریب بین الادیان کا نظریہ پیش کیا؛ تا کہ دلوں سے مذاہب کی وقعت اوراس کی اہمیت ختم ہوجائے، اور پوری نوع انسانیت مغربی تہذیب وثقافت میں ڈھل جائے۔

سماجی مسائل پرمذاکرات:

البتہ مشترکہ سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، مذہبی امورمیں مداخلت، مزدور، عورتوں اورعمر درازلوگوں کے ساتھ زیادتی کے خلاف اجتماعی جدوجہد کرنے اوراقلیتوں کے ساتھ عدل وانصاف کویقینی بنانے اوران کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے مختلف اہل مذاہب کے ساتھ باہمی مذاکرات کیا جاسکتا ہے۔

سماجی مسائل پرمذاکرات شرعی نقطۂ نظر سے:

اسلام ایک انسانیت نواز، انسانیت دوست اورامن پرست مذہب ہے، ہرطبقہ کے ساتھ عدل وانصاف کرنا اوران کے حقوق کا تحفظ کرنا اسلام کا نشان امتیاز ہے، غیرمسلموں کے ساتھ فراخدلی اوروسعت ظرفی کا مظاہرہ کرنا اورجذبہ انسانیت کی بنیاد پران کے جان ومال اوران کی عزت وآبرو کی حفاظت کرنا مسلمانوں کا فریضہ ہے، قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالی نے ان کفار کے ساتھ جومسلمانوں کے خلاف برسرپیکارنہیں ہیں حسن سلوک کرنے کا اوران کے ساتھ خیرخواہی سے پیش آنے کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

"لاینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروهم وتقسطوا إلیهم إن الله یحب المقسطین" (الممتحنہ: ۸)۔

(جن لوگوں نے تم سے دین کے لئے جنگ نہیں کی اورنہ تم کوگھروں سے بے گھر کیا اللہ تعالی اس سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ احسان اوربھلائی کرو، اورانصاف کے ساتھ پیش آؤ؛ کیوں کہ اللہ تعالی عدل کرنے والوں کومحبوب رکھتا ہے)۔

مشہورمفسرقرآن امام طبری رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سب سے صحیح رائے وہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عدل ونیکی کے برتاؤ کے حکم میں تمام مذاہب اورادیان کے ماننے والے شامل ہیں، بشرطیکہ انہوں نے مسلمانوں سے قتال نہ کیا ہواوران کوگھر بارچھوڑنے پرمجبور نہ کیا ہو؛ کیوں کہ اللہ تبارک وتعالی نے اپنے اس قول "**الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم**" میں عمومیت کے ساتھ سبھوں کوشامل رکھا ہے

اور کسی کی تخصیص نہیں کی ہے، اور جن لوگوں نے اس کے نسخ کا دعوی کیا ہے ان کی بات بے معنی ہے" (تفسیر طبری ۲۳/۲۳ ۳ مطبع موسسۃ الرسالہ)۔

تفسیر قرطبی میں ہے :

"**هذه الآية رخصة من الله تعالى في صلة الذين لم يعادو المسلمين و لم يقاتلوهم**" (تفسیر قرطبی: ۵۹/۱۸ مطبع دار الکتب المصریۃ قاہرہ) (اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے رخصت واجازت دی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا معاملہ کریں جو مسلمانوں سے عداوت ودشمنی نہیں رکھتے اور نہ ان سے جنگ کرتے ہیں)۔

یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت میں کچھ صحابہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر ہم غیر مسلموں پر صدقہ خیرات نہ کریں، ان کی مالی امداد نہ کریں تو ممکن ہے کہ وہ اپنی غربت وتنگدستی سے مجبور ہو کر حلقہ اسلام میں شامل ہوجائیں، تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی :

"**ليس عليك هداهم و لكن الله يهدى من يشاء و ما تنفقوا من خير فلأنفسكم و ما تنفقون إلا ابتغاء وجه الله و ما تنفقوا من خير يوف إليكم و أنتم لا تظلمون**" (البقرہ: ۲۷۲)۔

(آپ پر کچھ اس بات کی ذمہ داری نہیں کہ لوگ ہدایت قبول ہی کرلیں، یہ اللہ کا کام ہے جسے چاہے ہدایت دے، جو کچھ بھی تم خیرات کروگے تمہیں اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور اس میں ذرا برابر کمی نہیں ہوگی)۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالی نے مسلمانوں کو اس عمل سے منع فرمایا، اور حکم دیا کہ سابق میں جس طرح غیر مسلموں پر صدقہ خیرات کرتے تھے، اسی طرح اب بھی اس عمل کو جاری رکھیں، اس عمل پر اللہ کی طرف سے انہیں پورا پورا بدلہ اور اجر ملے گا (السنن الکبری للنسائی، حدیث نمبر: ۱۰۹۸۶)۔

احادیث شریفہ میں متعدد مقامات پر ذمیوں اور معاہدوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ان کے لئے عدل وانصاف کو یقینی بنانے کی تاکید کی گئی ہے، اور ان پر ظلم وزیادتی کرنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

"**من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وإن ريحها توجد من مسيرة أربعين عاما**" (بخاری، حدیث نمبر: ۳۱۶۶) (جو شخص کسی معاہد کو قتل کرے تو وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا جب کہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس ہوگی)۔

ایک موقع سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"**من ظلم معاهدا أو انتقصه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئا بغير طيب نفس فأنا حجيبه يوم القيامة**" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۲)۔

(جو شخص کسی معاہد پر دست درازی کرے یا اس کی حق تلفی کرے یا اس کو ایسے کام کا مکلف کرے جو اس کے بس میں نہیں ہے، یا اس کی خوش دلی کے بغیر اس کی کوئی چیز لے لئے تو قیامت کے دن میں اس کا ذمہ دار ہوں)۔

بخاری شریف کی روایت ہے :

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے ساتھ صلح کے زمانے میں میری والدہ جو کہ ابھی اسلام کی دولت سے محروم تھیں مجھ سے ملاقات کے لئے آئیں، میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! میری والدہ بڑی امیدوں سے میرے پاس آئی ہیں تو کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا : ’’ہاں ان کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرو‘‘ (بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۲۰)۔

مسلمانوں کا سیاست میں حصہ لینا:

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب سے مسلمانوں نے عملی میدان میں اپنی گرفت کھودی، علم وفن اور صنعت وحرفت کے میدان میں وہ مفلوج اور ناکارہ ہوگئے، اقتصاد ومعیشت اور سائنس وٹکنالوجی کے شعبے میں دوسری قوموں سے پچھڑ گئے تو زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گیا جن کی خمیر میں اسلام دشمنی داخل ہے، مسلمانوں سے بغض وعداوت اور نفرت وغصہ ان کے رگ وریشہ میں پیوست ہے، اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانا ان کے ایجنڈے میں شامل ہے، تاہم یہ بات کسی حد تک خوش آئند اور امید افزا ہے کہ غیر اسلامی ممالک میں ڈیموکریسی اور جمہوری نظام نافذ ہے، جس میں سیاسی ادوار بدلتے رہتے ہیں، صحافت واظہار رائے کی آزادی ہوتی ہے، نظام قضا خود مختار ہوتا ہے، اقلیت اور پسماندہ لوگوں کے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے، ایسے میں جمہوری ممالک کے اندر مسلمانوں کا سیاست میں حصہ لینا غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ پارلیمانی عمل میں عدم شرکت اور سیاست میں مسلمانوں کی عدم نمائندگی اس بات کا زیادہ موقع فراہم کرے گا کہ ایسے اصول وقوانین وضع ہوجائیں جس کے نتیجہ میں خطرہ بڑھ جائے، اور مسلمانوں کا زیادہ نقصان ہو۔

سیاسی نمائندگی شرعی نقطۂ نظر سے:

غیر اسلامی حکومت میں حصہ لینا اور سیاسی نمائندگی کرنا؛ تاکہ مسلمانوں کو شہری حقوق ومراعات حاصل ہوں، باعزت طور پر وہ زندگی بسر کرسکیں، اور مکمل آزادی کے ساتھ دین پر عمل کرسکیں، شرعی نقطۂ نظر سے جائز اور درست ہے، اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں :

حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام نے عزیز مصر سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اسے وزیر خزانہ بنائے :

’’إجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم‘‘ (یوسف:۵۵)۔

(آپ مجھ کو زمین کے خزانوں کا نگران مقرر کیجئے، بے شک میں حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں)۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مشہور مفسر قرآن علامہ شہاب الدین آلوسیؒ فرماتے ہیں :

’’اس میں منصب یا ذمہ داری کے مطالبہ کے جواز کی دلیل ہے، اگر طالب منصب اقامت عدل پر قدرت رکھتا ہو، خواہ کسی ظالم یا کافر سے ہی کیوں نہ مطالبہ کرنا پڑے‘‘ (روح المعانی ۷/۷ دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

اس کی تائید علامہ عزبن عبدالسلام کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جوانہوں نے اپنے قواعد میں بہت ہی سنجیدہ اور فقہی اسلوب میں کہا ہے :

''اگر مسلمانوں کے رسوخ کو پختہ کرنے اوران کے وجود کی حفاظت کے لئے غیر اسلامی حکومت میں مشارکت ہی واحد وسیلہ ہوتو اس کے جائز ہونے ؛ بلکہ بعض حالات میں واجب ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے'' (قواعدالاحکام فی مصالح الانام: ۹۶، مکتبۃ الکلیات الازہریۃ قاہرۃ)۔

سیاسی مسائل پر مذاکرات:

ظاہر ہے کہ جب جمہوری ممالک کے اندر مسلمان سیاست میں حصہ لیں گے تومختلف مذاہب کےلوگوں کے ساتھ سیاسی امور پر مذاکرات اور گفت وشنید کی ضرورت پیش آئے گی، ان لوگوں کے ساتھ سیاسی امور مثلا ملک میں امن وامان کا قیام، مہنگائی وافراط زر پر کنٹرول اور دہشت گردی اور شدت پسند عناصر کی بیخ کنی جیسے مسائل پر مذاکرات کیے جاسکتے ہیں۔

دیگر مذاہب کی کتابوں کا حوالہ:

مختلف مذاہب کے درمیان چوں کہ بہت سی تعلیمات میں اشتراک پایا جاتا ہے؛ اس لئے باہمی مذاکرات کے وقت ان کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، خود قرآن کریم نے یہودیوں کی آسمانی کتاب توریت کا متعدد مقامات پر حوالہ دیا ہے، چنانچہ ایک جگہ اللہ تبارک وتعالی نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ ہم نے یہودیوں کو خدائے وحدہ لاشریک لہ کی عبادت وبندگی، والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ خیر وبھلائی اور لوگوں سے اچھی بات کہنے کا حکم دیا؛ لیکن ان میں سے اکثر لوگ احکام خداوندی سے منھ موڑتے ہیں:

''وإذ أخذنا ميثاق بني اسرائيل لا تعبدون إلا الله وبالوالدين إحسانا وذى القربى واليتامى والمساكين وقولوا للناس حسنا وأقيموا الصلاة وآتوا الزكاة ثم توليتم إلا قليلا منكم وأنتم معرضون'' (البقرۃ: ۸۳)۔

علامہ ابوالطیب محمد صدیق خان متوفی ۱۳۰۷ھ میثاق کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''اوراس وقت کو یاد کرو جب کہ اے یہودیو! ہم نے تم سے عہدو پیمان لیا اور مراد یہ ہے کہ اللہ نے ان سے اس بات کا عہدو پیمان لیا کہ توریت میں جو احکام ان کے لئے مشروع کیے گئے ہیں اس پر عمل کریں'' (فتح البیان فی مقاصد القرآن ۱/ ۱۸۸، المکتبۃ العصریۃ للطباعۃ والنشر بیروت)۔

اسی طرح ایک مقام پر یہودیوں کا مزاج اوران کی فطرت کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے :

''وإذ أخذنا ميثاقكم لا تسفكون دماءكم ولاتخرجون أنفسكم من دياركم ثم أقررتم وأنتم تشهدون ثم أنتم هؤلاء تقتلون أنفسكم وتخرجون فريقا منكم من ديارهم تظاهرون عليهم بالإثم والعدوان وإن يأتوكم

أساری تفادوهم وهو محرم علیکم إخراجهم أفتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذلک منکم إلاخزی فی الحیاة الدنیا ویوم القیامة یردون إلی أشد العذاب وما الله بغافل عما تعملون“(البقرۃ: ۸۴،۸۵)۔

(اور وہ زمانہ بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے یہ عہد وقرار بھی لیا کہ باہمی خون ریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترک وطن مت کرانا، پھر تم نے اقرار بھی کرلیا اور (اقرار بھی ضمناً نہیں بلکہ ایسا صریح جیسے) تم شہادت دیتے ہو، پھر تم یہ (آنکھوں کے سامنے موجود ہی) ہو کہ قتل وقتال بھی کرتے ہو اور ایک دوسرے کو ترک وطن بھی کراتے ہو، (اس طور پر کہ) ان کو اپنوں کے مقابلہ میں (ان کی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ، اور اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرکرا کر رہا کرا دیتے ہو، حالاں کہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ تم کو ان کا ترک وطن کرا دینا بھی ممنوع ہے، (پس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض احکام پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے ہو، کیا سزا ہے ایسے شخص کی جو تم میں سے یہ حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیاوی زندگی میں اور روز قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں، اور اللہ تعالی بے خبر نہیں ہیں تمہارے اعمال سے)۔

ان آیات کریمہ میں جو مضمون ذکر کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر تھے، مشرکین کا بھی دو خاندان: اوس وخزرج آباد تھا، ان دونوں قبیلوں میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی، اور بسا اوقات نوبت جنگ تک آجاتی تھی، بنو قریظہ اوس کے اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے، جب جنگ ہوتی تو یہ دونوں یہودی قبائل بھی اپنے حلیفوں کے ساتھ برسر پیکار ہوتے، اور اپنے ہم مذہب دوسرے قبیلہ کو قتل بھی کرتے، اور شہر سے باہر بھی نکال دیتے؛ لیکن جب ان میں سے کوئی قید ہو کر آتا تو اپنے حلیف کو فدیہ ادا کرکے رہا کرا لیتے، اور کہتے کہ مذہب کی رو سے یہودی بھائیوں کو رہا کرانا ہماری ذمہ داری ہے، قرآن مجید نے اس رویہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہودیوں کو توریت میں تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا: آپس میں خون ریزی نہ کرنے کا، اپنے بھائیوں کو گھر سے نہ نکالنے کا اور کوئی قید ہو جائے تو اس کا فدیہ ادا کرنے کا، تو دو احکام کو ان لوگوں نے نظر انداز کردیا، اور پس پشت ڈال دیا، صرف ایک حکم کو یاد رکھا، گویا اللہ کے جس حکم پر جی چاہا عمل کرلیا اور جس کو چاہا چھوڑ دیا، اس آیت کریمہ میں بھی اللہ تبارک وتعالی نے یہودیوں کی آسمانی کتاب توریت کا حوالہ دیا ہے۔

اسی طرح ایک مقام پر اللہ تبارک وتعالی نے یہودیوں کی مذہبی کتاب توریت کے حوالہ سے قصاص کے متعلق دو بنیادی احکام کا تذکرہ فرمایا: اول یہ کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو ناحق جان بوجھ کر قتل کردے یا آنکھ پھوڑ دے یا ناک یا کان کاٹ لے یا دانت توڑ دے تو مجرم کو اسی کے مطابق سزا دی جائے گی، دوسرا حکم یہ ہے کہ جس شخص پر زیادتی کی گئی تو اس کو معاف کرنے کا حق حاصل ہوگا، چنانچہ اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے :

”وکتبنا علیهم فیها أن النفس بالنفس والعین بالعین والأنف بالأنف والأذن بالأذن والسن بالسن والجروح قصاص فمن تصدق به فهو کفارة له ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الظالمون“(المائدۃ: ۴۵)۔

اسی طرح روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ایک معزز شخص نے بدکاری کی، جس کی سزا توریت میں رجم ہے، یہود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور مقصد یہ تھا کہ اسلام میں کوئی ہلکی سزا ہو تو اس کا فیصلہ ہو جائے، آپ ﷺ نے پوچھا کہ توریت میں بدکاری کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا کہ بدکاری کی سزا کوڑے مارنا ہے، اور توریت کی اس آیت کو چھپا کر پیش کرنے لگے، عبداللہ بن سلامؓ نے انگلی اٹھوائی تو ان کی خیانت ظاہر ہوئی (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۴۴۶)۔

اسی واقعہ کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے:

"وکیف یحکمونک وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ ثم یتولون من بعدذلک وماأولئک بالمومنین" (المائدہ: ۴۳)۔

(اور یہودی لوگ آپ ﷺ کو کیسے حکم بناتے ہیں، جب کہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے، پھر بھی وہ لوگ اس کے بعد منھ موڑتے ہیں، اور وہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں)۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ضرورت پڑنے پر غیر قوموں کی مذہبی کتابوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، اور ان کتابوں کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔

غیر مسلموں کے مذہبی رسوم میں شرکت:

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات وروابط کو استوار رکھنے اور امن ویکجہتی کو فروغ دینے کے لئے ان کے مذہبی رسوم اور ان کے تہواروں میں شرکت کرنا ناجائز ہے، مسلمانوں کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ وہ اللہ تعالی کی عبادت بجالائیں؛ بلکہ ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شرک سے بیزاری کا اظہار کریں، اور مشرکانہ رسوم ورواج سے گریز کریں، سیدنا ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

"إنی بریء مما تشرکون إنی وجھت وجھی للذی فطر السماوات والأرض حنیفا وما أنا من المشرکین" (الانعام: ۷۸-۷۹) (میں مشرکانہ عمل سے بیزار ہوں، میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)۔

اللہ تبارک وتعالی نے قرآن کریم میں عباد الرحمن کی اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی ذکر کیا کہ وہ لوگ غیر مسلموں کے تہواروں میں شریک نہیں ہوتے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:

"والذین لایشھدون الزور وإذا مروا باللغو مروا کراما" (الفرقان: ۷۲)۔

اس آیت کریمہ میں بعض مفسرین کرام لفظ زور کا مصداق مشرکین کے مذہبی تہوار اور ان کے اعیاد قرار دیتے ہیں، چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

”وقال أبو العالية وطاوس ومحمد بن سيرين والضحاک والربيع بن أنس وغيرهم هی أعياد المشركين“ (تفسیر ابن کثیر ۶/ ۱۳۰)۔

نیز جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو وہاں سال میں دو مرتبہ جاہلی عید کا رواج دیکھا، تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اس عید میں شرکت کرنے سے منع فرمایا، چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت ہے :

”قدم رسول الله ﷺ المدينة ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال: ماهذان اليومان؟ قالوا كنا نلعب فيهما بالجاهلية، فقال رسول الله ﷺ: إن الله قد أبدلكم بهما خيرا منهما: يوم الأضحى ويوم الفطر“۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ اصحاب الجحیم کے اندر اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں :

”اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جاہلی عیدوں کو برقرار نہیں رکھا، اور نہ ہی صحابہ کرام کو حسب سابق جاہلی عید منانے کی اجازت دی ؛ بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے تمہارے لئے اس کے بدلہ میں دو عیدیں مقرر کی ہیں، تبدیلی کا لفظ بتلاتا ہے کہ جاہلی عید منسوخ ہوگئی ؛ کیوں کہ بدل اور مبدل منہ ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے“ (۱/ ۴۸۶، دار عالم الکتب بیروت)۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے عجمیوں کی زبان بولنے اور ان کے مذہبی تہواروں میں شریک ہونے سے منع کرتے ہوئے فرمایا :

”لا تعلموا رطانة الأعاجم، ولا تدخلوا على المشركين في كنائسهم يوم عيدهم؛ فإن السخطة تنزل عليهم“ (السنن الکبریٰ للبیہقی: حدیث نمبر: ۱۸۸۶۱)۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں :

”کفار کے میلوں میں ہرگز جانا درست نہیں، گناہ کبیرہ ہے، اگرچہ قرض دار ہو، اور امید فروخت مال اور نفع کثیر کی ہو، مطلقاً شرکت ایسے مواقع کی گناہ اور حرام ہے“ (فتاویٰ رشیدیہ کامل: ۴۶۶)۔

حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں :

”جیسے ان کے میلوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہے ایسے ہی غیر مسلم بھائیوں کو ان کے تیوہاروں کی مبارکباد پیش کرنا بھی درست نہیں ہے“ (فتاویٰ عبدالحئی: ۵۳۳)۔

امن و یکجہتی کے لئے اسلامی تہذیب وثقافت سے دست بردار ہونا:

وہ اعمال جو شرعاً واجب نہیں ہیں ؛ بلکہ ان کا تعلق مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے، امن و یکجہتی اور خیرسگالی کو فروغ دینے کے لئے مسلمانوں کا اجتماعی طور پر ایسے اعمال کا چھوڑ دینا اور اپنی متوارث تہذیب وثقافت سے دست بردار ہو جانا

درست نہیں ہے۔

یہ بات ضرور ہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے کچھ امور میں یہودیوں کی مشابہت اختیار کی تھی، اوراس کے پیچھے غالباً یہ فکر کارفرماتھی کہ یہود دین موسوی اور دین عیسوی میں مشابہت کو دیکھ کر متاثر ہوں، اور حلقہ اسلام میں داخل ہوجائیں، یا اس کی وجہ یہ تھی کہ صدر اسلام میں چوں کہ یہودیوں اور مسلمانوں میں کوئی تہذیبی فرق نہیں تھا؛ اس لئے بعض چیزوں میں مسامحت کی گئی لیکن جب دین کامل ہوگیا، اور تکمیل دین کے بعد اسلامی تہذیب کے حدود متعین ہوگئے، اور اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب نے ایک محاذ کی شکل اختیار کرلی، تو مسلمانوں کے لئے اپنی تہذیب وثقافت کو چھوڑ کر دوسری قوموں کی تہذیب کو اختیار کرنا ممنوع قرار پایا۔

واقعہ یہ ہے کہ شریعت کے عمومی مزاج اور اس کے احکام وعلل کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے قدم قدم پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس میں اجنبی اثرات درنہ آئیں، اور غیر اسلامی رسوم ورواج سے شریعت اسلامیہ کا صاف وشفاف سرچشمہ گدلانہ ہو، بلکہ نصوص شریعت کا گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غیر قوموں کی تہذیب وثقافت اور ان کے رسوم ورواج کی مخالفت اسلام کا مقصود اور مطمح نظر ہے، عبادت ہو یا معاشرت، اخلاقیات ہو یا سماجیات ہر ایک کی بابت اسلام نے رہنمایانہ خطوط وضع کیے ہیں، اور اپنے پیروکاروں کے لئے دین کا ایسا روح پرور مرقع پیش کیا ہے جس کے نقش ونگار اور بیل بوٹوں میں غیر قوموں کی تہذیب وثقافت سے مدد نہیں لی گئی ہے؛ بلکہ اسلام نے امت مسلمہ کو ایک جامع ہدایت دی کہ غیر منصوص مسائل میں جب اجتہاد اور استنباط کی ضرورت پیش آئے تو اس میں اصولی طور پر یہ خیال رکھا جائے کہ غیر قوموں کی تہذیب وثقافت کا رنگ اسلام پر نہ چڑھنے پائے، اور ان کے عادات واطوار کی چھاپ مذہب اسلام پر نہ پڑے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

"من تشبہ بقوم فھو منھم" (مشکاۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۴۳۴۷)۔

(جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے تو وہ انہی میں سے ہوگا)۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے شارح مشکاۃ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں :

"ھذا عام فی الخلق والشعار" (۲۷۸۲/۷)۔

اس وعید کے تحت تہذیبی واخلاقی دونوں قسم کی مشابہت داخل ہے۔

خود شریعت مطہرہ نے عملی طور پر اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ مسلمانوں کی عبادت وبندگی اور ان کی معاشرت کا طرز غیر قوموں سے الگ اور جدا ہو، اس کی شریعت اسلامیہ میں بہت سی نظیریں ہیں۔

نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ امن ویکجہتی اور باہمی رواداری کو یقینی بنانے کے لئے اجتماعی طور پر مسلمانوں کا اپنی متوارث تہذیب وثقافت کو چھوڑ دینا درست نہیں ہے، ہاں انفرادی طور پر اگر کوئی شخص کسی صالح مقصد مثلاً دعوت دین یا دفع مضرت کے لئے کبھی کبھار کسی اسلامی تہذیب کو چھوڑ دے، اور اس خاص موقع سے غیر قوموں کی موافقت کرلے تو اس کی گنجائش ہے، چنانچہ

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

''مثلاً کوئی مسلمان اگر دارالحرب یا دارالکفر میں ہے، تو وہ ظاہری مخالفت کا مامور نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہے، بلکہ کبھی مستحب اور کبھی واجب ہوجاتا ہے کہ کبھی کبھار ظاہراً ان کے ساتھ ہوجائے، مگر یہ اسی صورت میں ہے کہ اس میں کوئی دینی مصلحت ہو، جیسے دین کی دعوت، یا ان کا اور ان کی تہذیب وتمدن کا جائزہ لینا جس سے دفاعی کاموں میں مدد ملنے کی امید ہو یا مسلمانوں کی کسی افتاد سے حفاظت کی توقع ہو تو ایسی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں، اور دیگر صالح مقاصد کے لئے بھی یہ طریقہ کار اپنایا جاسکتا ہے'' (اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ أصحاب الجحیم)۔

معبودان باطلہ اور شرکیہ اعمال پر تنقید:

اسلام ایک زندہ جاوید اور برحق مذہب ہے، قیامت تک باقی رہنے والا ایک جامع ومکمل دستور العمل ہے، مسلمانوں کو اس دین مبین کی دعوت وتبلیغ اور اس کی نشر واشاعت کا حکم دیا گیا ہے، اسلام کے محاسن اور اس کی خصوصیات وامتیازات کو اجاگر کرنے اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی صحیح اور حقیقی تصویر پیش کرنے کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ احقاق حق اور اسلام کا صحیح تعارف ہر مسلمان کا مذہبی ودینی فریضہ ہے، خواہ اس سے بتان آزری کے کسی نقیب کی پیشانی پر شکن کے آثار ظاہر ہوتے ہوں، یا آتش کدۂ مجوسیت میں کھلبلی مچتی ہو، تاہم یہ ضروری ہے کہ داعی کے پیش نظر احقاق حق اور اسلام کی حقانیت کو اجاگر کرنا ہو، بے جا کسی مذہب پر تنقید اور ان کے پیروکاروں کی دل آزاری نہ ہو، خود قرآن کریم نے مکی دور میں جو مسلمانوں کے لئے جاں گسل اور مہیب دور تھا، جہاں حق کی آواز بلند کرنا اور صنم کدۂ مکہ میں اسلام کا اظہار کرنا پیغام موت ثابت ہوتا تھا، ایسے شکیب ربا اور زہرہ گداز حالات میں حق کا اعلان کیا، کفر واسلام کے مابین امتیازی خط قائم فرمایا، معبود برحق خدائے عزوجل کی قدرت اور اس کے کرشموں اور اس کے بالمقابل معبودان باطلہ کی لاچاری وبے بسی کو صاف اور دلنشیں اسلوب میں اجاگر کیا، چنانچہ ایک جگہ اللہ تبارک وتعالی نے اپنی قدرت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا :

''إن الله يمسک السماوات والأرض أن تزولا ولئن زالتا إن أمسکهما من أحد من بعده إنه کان حليما غفورا'' (الفاطر:۴۱)۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالی اپنی قدرت کاملہ کے بعض نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

''والله أخرجکم من بطون أمهاتکم لاتعلمون شيئا وجعل لکم السمع والأبصار والأفئدة لعلکم تشکرون ألم يروا إلی الطير مسخرات فی جو السماء مايمسکهن إلا الله إن فی ذلک لآيات لقوم يومنون'' (النحل:۷۹،۷۸)۔

اس کے بالمقابل قرآن کریم معبودان باطلہ کی کمزوری اور ان کی بے بسی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتا ہے :

”يا أيها الناس ضرب مثل فاستمعوا له إن الذين تدعون من دون الله لن يخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له وإن يسلبهم الذباب شيئا لايستنقذوه منه ضعف الطالب والمطلوب“(الحج:۷۳)۔

(اے لوگوایک مثال سنائی جاتی ہے غور سے سنواللہ کے سوا جن (خودساختہ) معبودوں کوتم پکارتے ہوانہوں نے ایک مکھی تک پیدانہیں کی، اوراگرتمہارے یہ سارے معبودا کھٹے ہوکرزورلگائیں جب بھی پیدانہ کرسکیں، اور(پھراتنا ہی نہیں بلکہ) اگرایک مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے توان میں قدرت نہیں کہ اس سے چھڑالیں،تو دیکھوطلب گاربھی درماندہ ہوااور مطلوب بھی)۔

مذکورہ نصوص سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اصل اسلام کی حقانیت اوراس کے عقائد کی بے غبار تشریح مقصود ہے،خواہ اس سے ضمنی طور پرکسی کی دل آزاری ہوتی ہویاکسی کے جذبات کوٹھیس پہنچتی ہو،تاہم اگر دیگر مذاہب کےلوگ اسلامی تعلیمات پربے جااعتراضات کریں،اوراسلامی احکام میں تشکیک پیدا کریں توان کے حملوں کا جواب جارحانہ انداز میں دیا جاسکتا ہے،اوران کے عقائد باطلہ پرتنقید کی جاسکتی ہے۔

مشترک سماجی مسائل پرگفتگو:

سماجی مسائل یعنی دنیامیں امن وامان کی خوشگوارفضا قائم کرنے،غربت وتنگدستی سے پریشان حال لوگوں کا تعاون کرنے اورپسماندہ طبقات کے ساتھ عدل وانصاف یقینی بنانے کے لئے دیگراہل مذاہب کے ساتھ باہمی مذاکرات کرنانہ صرف جائز؛ بلکہ مستحسن اورقابل تقلید عمل ہے،خودآپ ﷺ نے حلف الفضول میں شرکت فرمائی ہے....،آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ اس معاہدے کے مقابلہ میں اگرمجھ کوسرخ اونٹ بھی دیئے جائیں توہرگز پسند نہ کروں گا،اوراگرزمانہ اسلام میں بھی اس قسم کے معاہدے کی طرف بلایاجائے تومیں اس میں ضرورشرکت کروں گا(سیرت ابن ہشام ۱/۱۳۳مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی مصر)۔

ظاہرہے کہ یہ معاہدہ جس کی بنیادمظلوم کی دادرسی،ستائے ہوئے لوگوں کی نصرت واعانت اورہرطبقہ کے ساتھ عدل وانصاف کرنے پررکھی گئی تھی،اس معاہدے میں بلاتفریق مذہب وملت سب لوگ داخل تھے۔

جمہوری ممالک کے اندرسیاست میں حصہ داری:

جمہوری ممالک کے اندرسیاست میں حصہ لینا مسلمانوں کے لئے ناگزیرہے،ایسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کوبسااوقات ایسی جماعت کے ساتھ مذاکرات وآپسی بات چیت کی نوبت آجائے جواسلام اورمسلمانوں کے خلاف سخت گیر اورمتعصب نظریات کی حامل ہو،اسلام اورمسلمانوں کوزک پہنچاناان کے ایجنڈے میں شامل ہو،شرعی نقطۂ نظر سے ایسی جماعت کے ساتھ مذاکرات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ ایسی جماعت کے ساتھ مذاکرات نہ کرنے کی صورت میں اس بات کا خطرہ بڑھ جاتا ہے کہ سخت گیرجماعت کی طرف سے ایسے اقدامات کیے جائیں جس سے اسلام اورمسلمانوں کونقصان پہنچتا ہو،اورایسے B15

لائحہ عمل تیار کیے جائیں جس سے مسلمانوں کا باعزت طور پر ملک میں زندگی بسر کرنا مشکل ہوجائے؛لیکن اگران جماعتوں کے ساتھ مسلمان مذاکرات کریں گے تو بڑی حد تک یہ خطرہ ٹل سکتا ہے،اور مسلم سیاستداں اپنے اثرورسوخ سے اسلام مخالف ایجنڈوں کو نافذ ہونے سے روک سکتے ہیں،خود آپ ﷺ نے جب مدینہ منورہ ہجرت فرمایا تو مدینہ میں یہود کے چند قبائل آباد تھے،اور یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے لئے مارآستین تھے،اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشیں کرنا اور ان کو زک پہنچانے کے درپہ رہنا ان کی عادت تھی؛لیکن آپ ﷺ نے ان کے فتنہ وفساد کے سدباب کے لئے ان قبائل یہود کے ساتھ چند امور پر معاہدہ کیا تھا۔

اسی طرح کفارمکہ جن کے ظلم وستم کا بادل مسلمانوں پر پیہم برستا تھا،ان کے مصائب وشدائد کا طوفان بلاخیز مدینہ کی دیواروں سے آکر ٹکراتا تھا،ان کی تشنہ لبی مسلمانوں کے خون کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں بجھتی تھی،ان کی زبانیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتی تھیں،ایسے لوگوں کے ساتھ بھی آپ ﷺ نے سیاسی امور پر باہمی مذاکرات اور آپسی بات چیت کی ہے،جو سیرت کی کتابوں میں صلح حدیبیہ کے نام سے جانی جاتی ہے،مسلمان اور کفارمکہ کے درمیان مندرجہ ذیل امور پر مصالحت ہوئی تھی :

☆دس سال تک لڑائی موقوف رہے گی۔

☆قریش میں کا جو شخص بغیر اپنے ولی اورآقا کی اجازت کے مدینہ جائے گا وہ واپس کیا جائے گا،اگرچہ وہ مسلمان ہوکر جائے۔

☆اور جو شخص مسلمانوں میں سے مدینہ سے مکہ آجائے تو اس کو واپس نہ دیا جائے گا۔

☆اس درمیان کوئی ایک دوسرے پر تلوار نہ اٹھائے گا،اور نہ کوئی کسی سے خیانت کرے گا۔

☆محمدامسال بغیر عمرہ کے مدینہ واپس ہوجائیں،مکہ میں داخل نہ ہوں،سال آئندہ صرف تین دن مکہ میں رہ کر عمرہ کر کے واپس ہوجائیں،سوائے تلوار کے اور کوئی ہتھیار ساتھ نہ ہوں،اور تلواریں بھی نیام یا غلاف میں ہوں۔

☆قبائل متحدہ کو اختیار رہے کہ جس کے معاہدہ اور صلح میں شریک ہونا چاہیں شریک ہوجائیں (الروض الانف ۶ / ۴۶۲ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

مذہبی مذاکرات میں خواتین سے گفتگو:

عورت جس کو اسلام نے عفت وعصمت کی چادر عطا کی تھی،گھر کی چہار دیواری کو اس کے لئے محفوظ پناہ گاہ قرار دیا تھا آج مغربی تہذیب کے زیر اثر عورتیں اسٹیج کی زینت بن گئی ہیں،محافل ومجالس کی تفریح کا سامان بن گئی ہیں،چنانچہ ہر میدان میں وہ مردوں کے شانہ بشانہ پھرتی ہوئی نظر آتی ہیں،چنانچہ سیاسی مذاکرات کی میز پر جہاں مرد نظر آتے ہیں وہیں عورتیں بھی موجود ہوتی ہیں،ایسی صورت میں مذاکرات کے وقت غض بصر کے حکم پر عمل کرنا چاہیے،اور حتی المقدور ان سے نظریں بچا کر گفتگو کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے،رہا ان

سے مصافحہ یامعانقہ تو یہ قطعاحرام ہے،مسلمانوں کواس سے مجتنب رہنا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالی کاارشاد ہے :

''قل للمومنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلک أزكى لهم إن الله خبير بما يصنعون'' (النور:۳۰)۔

(آپ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں،اوراپنے شرمگاہوں کی حفاظت کریں،یہ ان کے دلوں کی پاکیزگی کاذریعہ ہے،یقیناًاللہ تعالی باخبر ہےان اعمال سے جووہ کررہے ہیں)۔

آپ ﷺ نے بدنگاہی کوابلیس کازہرآلود تیرقراردیا،جس سے ابلیس انسان کے قلب پرحملہ آورہوتا ہے،اوراس کواخلاقی بیماریوں میں مبتلا کردیتا ہے،چنانچہ حدیث میں آتا ہے :

''النظرة سهم من سهام إبليس مسموم ،من تركها مخافتي أبدلته ايمانا يجد حلاوته في قلبه'' (المعجم الکبیر للطبرانی،حدیث نمبر:۱۰۳۶۲)۔

(بدنگاہی ابلیس کاایک زہرآلود تیر ہے،جوشخص میرے خوف سے اپنی نگاہ نیچی رکھے گامیں اس کوایمان ویقین کی ایسی دولت عطاکروں گاجس کی حلاوت وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا)۔

احناف ،مالکیہ ،شوافع اورحنابلہ کا مختار اور پسندیدہ قول یہ ہے کہ آدمی کا اجنبی جوان عورت سے مصافحہ کرناحرام ہے،علامہ ابن تیمیہؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیہ میں ہے :

''وأما مصافحة الرجل للمرأة الأجنبية الشابة فقدذهب الحنفية والمالكية والشافعية والحنابلة في الرواية المختارة وابن تيمية إلى تحريمها'' (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ۳۵۹/۳۷دارالسلاسل الکویت)۔

موجودہ حالات میں بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

مفتی سید عبدالرحیم الحسنی ☆

جواب نمبرا:

تنظیم اسلامی کانفرنس کے زیر نگرانی کام کرنے والی مجمع الفقہ الاسلامی الدولی کے اٹھارھویں فقہی سمینار منعقدہ جولائی ۲۰۰۷ء بمقام پوتراجایا ملیشیا میں پیش کردہ سفارشات بسلسلہ ''اسلاموفوبیا۔چلینجز اور تیاریاں'' کے عنوان سے ایک اہم تجویز اس طرح پیش کی گئی ہے : ''مسلم علماء ومفکرین اور غیر مسلم قائدین اور دانشوروں کے درمیان علمی وفکری سمینار منعقد کیے جائیں، تاکہ مختلف مذہبی موضوعات پر کھل کر بات ہوسکے اور باہمی ربط وتعاون اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد مل سکے'' (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے صفحہ ۵۴۰)۔

لیکن یہاں یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آخر مفاہمت کس چیز پر ہونی چاہیے، اگر مفاہمت اس بات پر ہو کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے معبودوں کو، یا انکی کتابوں کو یا ان کی عظیم شخصیتوں کو برا نہیں کہیں گے تو مسلمان پہلے ہی سے اس پر کاربند ہیں، نہ انہوں پہلے برا کہا ہے اور نہ آئندہ کہیں گے، کیونکہ مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے ہیں، ان پر نازل شدہ کتابوں کو آسمانی کتابیں تسلیم کرتے ہیں، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کا احترام نہ کریں، ہاں وہ قرآنی تعلیم کے مطابق یہ ضرور کہتے ہیں کہ اب یہ دونوں شریعتیں ختم ہو چکی ہیں اور ان دونوں پیغمبروں کا دور نبوت گذر چکا ہے، اب آخری شریعت اسلام ہے، اور آخری نبی پیغمبر اسلام ﷺ ہیں، جن کی نبوت قیامت تک باقی رہنے والی ہے، لیکن اگر مفاہمت کی بنیاد یہ ہے کہ مسلمان اسلام کی طرح یہودیت اور عیسائیت کو بھی بہ حیثیت دین تسلیم کریں گے اور ان دونوں مذاہب کی تعلیمات کو بھی حق سمجھیں گے تو یہ مفاہمت ممکن ہی نہیں ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ اسلام اللہ کا آخری دین ہے اور وہی حق ہے، اس کے علاوہ تمام ادیان باطل ہیں، چاہے وہ سماوی ہوں یا غیر سماوی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ'' (سورہ آل عمران:۱۹)۔

☆ مہتمم دارالعلوم المصطفوی توحید گنج بارہ مولہ کشمیر۔

(بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے)۔

"وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ" (سورہ آل عمران: ۸۵)۔

(اور جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا طالب ہوگا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا)۔

اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے متعلق ارشاد فرمایا:

"فَإِنْ حَآجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ، وَقُلْ لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيِّينَ أَ أَسْلَمْتُمْ، فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا، وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ، وَاللّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ" (سورہ آل عمران: ۲۰)۔

(اور اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ میں نے اور میرے متبعین نے تو خود کو اللہ کے حوالے کر دیا اور اہل کتاب اور امیوں سے پوچھئے کہ کیا تم بھی اسلام لائے ہو؟ اگر وہ بھی اسی طرح اسلام لے آئے تو انہوں نے ہدایت پالی اور اگر انہوں نے اعراض کیا تو آپ پر صرف پہنچانے کی ذمہ داری تھی، اللہ اپنے بندوں کا حال خوب جاننے والا ہے)۔

کوئی مسلمان ان آیات پر ایمان رکھنے کے بعد مختلف ادیان کے درمیان تقارب کا تصور قبول نہیں کرسکتا، اور نہ ان ادیان کو برابری کے درجے میں رکھ کر گفتگو کرنے پر راضی ہوسکتا ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے، دو متضاد فکر کیسے مجتمع ہوسکتے ہیں، جس عقیدۂ توحید کی بنیاد اللہ وحدہ لاشریک کی وحدت پر قائم ہو وہ غیر اللہ کی عبادت پر کیسے متفق ہوسکتا ہے، جو شخص "إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العلمين" (میری نماز، میری عبادتیں میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے) کا اعلان کرتا ہے وہ اس شخص سے کیسے اتفاق کرسکتا ہے جو "إن الله ثالث ثلثة"، "عزير ن بن الله اور المسيح ابن الله" کا مدعی ہو۔

اسلام اور غیر اسلام کے درمیان وحدت اور تقارب کا تصور عقلاً بھی درست نہیں ہے اور شرعاً بھی غلط ہے، اگر کوئی شخص اسے قبول کرتا ہے یا اس کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ توحید کی حقیقت سے واقف نہیں ہے یا واقف تو ہے لیکن جان بوجھ کر اسلام کے عقیدۂ توحید کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے، اب رہا یہ سوال کہ غیر مسلمین کے ساتھ مذاکرات یا مکالمات کی بنیاد کیا ہوگی؟ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں اس کا جواب قرآن کریم میں تلاش کرنا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور کفار کے ساتھ بات چیت کی صرف ایک بنیاد ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہے:

(۱) انہیں توحید کی طرف بلایا جائے، اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے، اور اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی اتباع پر آمادہ کیا جائے:

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ" (سورہ آل عمران: ۶۴)۔

(آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں گے اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب ٹھہرائے گا، اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دیجئے کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں)۔

جولوگ بین المذاہب محاضرات کو تحریک کی شکل دینا چاہتے ہیں وہ خود فریبی میں مبتلا ہیں، آپ کتنی بھی کوشش کرلیں اور کوئی بھی طریقہ اپنالیں وہ اسلام دشمنی سے ہرگز باز نہیں آئیں گے، ان کے خود ساختہ مذاہب کی بنیاد ہی اسلام دشمنی پر ہے، جس دن یہ دشمنی ختم ہوجائے گی یہ مذہب خود بخود ختم ہوجائیں گے۔

قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے ہی یہ کہہ کر ان محاضرات کا دروازہ بند کردیا تھا:

"وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ" (سورہ بقرہ: ۱۲۰)۔

(نہ آپ سے یہود راضی ہونے والے ہیں اور نہ نصاریٰ تاوقتیکہ آپ ان کی ملت کے تابع نہ بن جائیں) (اسلام — حقائق اور غلط فہمیاں ر ۹۰، ۹۲)۔

بہر حال! دعوت توحید کے علاوہ جن اہم امور پر غیر مسلموں سے مکالمہ اور مذاکرات کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۲) مسلمان قرآن کے اس بنیادی اصول "لا إکراہ فی الدین" (دین کے سلسلہ میں کوئی زور وزبردستی نہیں ہے) کے پابند ہیں، انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ رواداری اور اپنائیت کا ثبوت دیا ہے، اسی لئے غیر مسلموں کو بھی اسلامی خصائص کا احترام کرنا اور پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گستاخانہ رویہ اور اسلامی تقدس سے کھلواڑ بند کرنا ہوگا (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے ر ۵۶۴)۔

(۳) اظہار خیال کی آزادی کی آڑ میں مسلمانوں کے درمیان پھیلائے جانے والے فتنہ وفساد اور اسلامی تقدس اور جذبات کو ٹھیس پہنچانے والے تمام ذرائع کا حتی الامکان سد باب ہو۔

(۴) بین الاقوامی معاہدوں کے بموجب مذاہب اور ان کے شعائر کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی پابندیوں کی تنفیذ کی جائے، نیز عالمی برادری میں اسلامی وغیر اسلامی مسائل کے درمیان تفریق وامتیاز یا دوہری پالیسی سے اجتناب کیا جائے (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے ص ۵۶۸)۔

جواب نمبر ۲:

اسرائیلی روایات:

الف: ۔صحابہؓ اہل کتاب کی ہر بات بلا چون وچرا تسلیم نہیں کرلیا کرتے تھے، بخلاف ازیں وہ حق وصواب کے طلبگار تھے

اور اہل کتاب کے غلط اقوال کو رد کر دیا کرتے تھے۔

بہر کیف اس میں شبہ نہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اہل کتاب سے استفادہ کرنے کا جو دائرہ متعین کیا تھا اس سے تجاوز نہیں کیا، آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا : ’’ایک آیت بھی ہو تو مجھ سے سن کر آگے پہنچا دو۔ بنی اسرائیل کی روایات بیان کیجئے اس میں کچھ مضائقہ نہیں، اور جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا اس نے اپنا گھر دوزخ میں بنایا‘‘ (فتح الباری ۳۲۹/۶)۔

حضور ﷺ کا دوسرا ارشاد یہ ہے : ’’اہل کتاب کی نہ ہی تصدیق کیجئے اور نہ تکذیب، یوں کہیئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو کچھ ہماری طرف اتارا‘‘ (فتح الباری ۱۲۰/۸)۔

مذکور الصدر دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں، پہلی حدیث میں بنی اسرائیل کے عجیب وغریب واقعات بیان کرنے کی اجازت دی گئی ہے جن سے وہ دوچار ہوئے، اس لئے کہ ان واقعات میں عبرت پذیری ونصیحت آموزی کا پہلو پایا جاتا ہے، مگر نقل وروایت کی یہ اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان واقعات کا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ ایک جھوٹی بات کے روایت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

’’امام شافعیؒ فرماتے ہیں یہ امر محتاج بیان نہیں کہ نبی کریم ﷺ جھوٹی روایت بیان کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس بات کے جھوٹے ہونے کا تمہیں علم نہ ہو بنی اسرائیل کے بارے میں، وہ بیان کیجئے، کیونکہ سچی بات کی نقل وروایت میں کچھ مضائقہ نہیں، دوسری حدیث بھی اس کی مانند ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اہل کتاب کی نہ تصدیق کیجئے اور نہ تکذیب‘‘ جو بات سچی اور قطعی ہو اس کی روایت کرنے سے آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا‘‘ (فتح الباری ۳۲۰/۶)۔

دوسری حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب کی بیان کردہ بات میں جب صدق وکذب دونوں کا احتمال ہو تو اس میں توقف سے کام لیا جائے، اس لئے کہ بعض اوقات سچی بات کو جھٹلا دیا جاتا ہے اور جھوٹی بات کی تصدیق کی جاتی ہے جس سے نقصان ہوتا ہے، البتہ اہل کتاب کی جو بات ہماری شریعت کے خلاف ہو ہم اس کی تکذیب کر سکتے ہیں اور جو بات ہمارے دین سے لگاؤ کھاتی ہو اس کی تصدیق کی ہمیں کھلی اجازت ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ عسقلانی نے اس حدیث کی شرح میں یہی بات تحریر کی اور امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس ضمن میں وارد شدہ سلف کے اقوال کو ہم اسی بات پر محمول کرتے ہیں (فتح الباری ۱۲۰/۸)۔

باقی رہی وہ حدیث جو امام احمد بن حنبلؒ وابن ابی شیبہ ومحدث بزارؒ نے بروایت جابر بن عبداللہؓ از عمر فاروقؓ نقل کی ہے کہ جناب فاروقؓ کو اہل کتاب سے ایک رسالہ ملا جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کو پڑھ کر سنایا تو آپ ﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا ابن الخطاب! تم اس رسالہ کی وجہ سے پریشان ہو، مجھے اس ذات کی قسم جس کے زیر تصرف میری جان ہے میں تمہارے پاس ایک صاف ستھری شریعت لایا ہوں، تم اہل کتاب سے جو بات بھی دریافت کرو گے اور وہ اس کے جواب میں حق بات کہیں تو تم اس کو

جھٹلاؤ گے یا جھوٹی بات کہیں گے اور تم اس کی تصدیق کروگے، بخدا اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے تو میری پیروی کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا (مسند احمد ۳/ ۳۸۷)۔

یہ حدیث اہل کتاب سے روایت کرنے کے خلاف نہیں، اس لئے کہ اس حدیث میں جو نہی وارد ہوئی ہے وہ آغاز اسلام اور استقرار احکام سے قبل ہوئی تھی، جب دینی احکام اچھی طرح جانے پہچانے گئے اور آمیزش کا خوف باقی نہ رہا تو اہل کتاب سے روایت کی اجازت دیدی گئی، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: ''یہ نہی دینی قواعد واحکام میں پختگی آنے سے قبل وارد ہوئی تھی، اس لئے کہ اس وقت فتنہ کا ڈر تھا جب یہ اندیشہ باقی نہ رہا تو اجازت دیدی گئی، اس لئے کہ اہل کتاب کے اخبار وواقعات سننے سے عبرت حاصل ہوتی ہے'' (فتح الباری ۶/ ۳۲۰)۔

مذکور الصدر بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ ہر سہ احادیث میں کسی قسم کا تعارض نہیں پایا جاتا، نیز یہ کہ اہل کتاب سے نقل واخذ کی جو اجازت دی گئی ہے اس کے حدود وقیود کیا ہیں (تاریخ تفسیر ومفسرین/ ۱۶۳، ۱۶۵)۔

ب:۔ ''اسرائیلیات'' یا ''اسرائیلی روایات'' ان روایات کو کہتے ہیں جو یہودیوں، یا عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے بعض براہ راست بائبل یا تلمود سے لی گئیں ہیں، بعض مشنا اور ان کی شروح سے، اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہل کتاب میں سینہ بسینہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں، اور عرب کے یہود ونصاریٰ میں معروف ومشہور تھیں، تفسیر کی مروجہ کتابوں میں ایسی روایات کی ایک بھاری تعداد موجود ہے، ان روایات کا حکم بیان کرتے ہوئے مشہور محقق صاحب تفسیر حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایسی روایات کی تین قسمیں ہیں، اور ہر قسم کا حکم علحدہ ہے (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر مقدمہ ۱/ ۴، اصول التفسیر لابن تیمیہ/ ۳۳)۔

جواب نمبر ۳:

الف: ''**قل یا أیها الکافرون، لا أعبد ما تعبدون، ولا أنتم عابدون ما أعبد، ولا أنا عابد ما عبدتم، ولا أنتم عابدون ما أعبد، لکم دینکم ولی دین**'' (سورہ کافرون)۔

(تو کہہ اے منکرو میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجو جس کو میں پوجوں اور نہ مجھ کو پوجنا ہے اس کا جس کو تم نے پوجا، اور نہ تم کو پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں تم کو تمہاری راہ اور مجھ کو میری راہ)۔

سورۂ کافرون میں کفار کی طرف سے پیش کی ہوئی مصالحت کی چند صورتوں کو بالکلیہ رد کر کے اعلان برأت کیا گیا، مگر خود قرآن کریم میں یہ ارشاد بھی موجود ہے ''**فإن جنحوا للسلم فاجنح لها**'' یعنی کفار اگر صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی جھک جائیے (یعنی معاہدہ صلح کر لیجئے) اور مدینہ طیبہ جب آپ ﷺ ہجرت کر کے تشریف لئے گئے تو یہود مدینہ سے آپکا معاہدہ صلح مشہور ومعروف ہے، اس لئے بعض مفسرین نے سورہ کافرون کو منسوخ کہہ دیا اور منسوخ کہنے کی بڑی وجہ آیت ''**لکم دینکم ولی دین**'' کو قرار دیا ہے، کیونکہ بظاہر یہ احکام جہاد کے منافی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہاں ''**لکم دینکم**'' کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو کفر کی اجازت یا کفر پر

برقرار رکھنے کی ضمانت دیدی گئی، بلکہ اس کا حاصل وہی ہے جو "**لنا أعمالنا و لكم أعمالكم**" کا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھگتوگے، اس لئے راجح اور صحیح جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورت منسوخ نہیں، جس قسم کی مصالحت سورہ کافرون کے نزول کا سبب بنی وہ جیسے اس وقت حرام تھی آج بھی حرام ہے اور جس صورت کی اجازت آیت مذکورہ میں آئی اور رسول اللہ ﷺ کے معاہدۂ یہود سے عملاً ظاہر ہوئی، وہ جیسے اس وقت جائز تھی آج بھی جائز ہے، بات صرف موقع ومحل کو سمجھنے اور شرائط صلح کو دیکھنے کی ہے، جس کا فیصلہ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمادیا ہے، جس میں کفار سے معاہدہ کو جائز قرار دینے کے ساتھ ایک استثناء کا ارشاد ہے، وہ یہ ہے: "**إلا صلحا أحل حراما أو حرم حلالا**" یعنی ہر صلح جائز ہے بجز اس صلح کے جس کی رو سے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال یا حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیا گیا ہو، اب غور کیجئے کہ کفار مکہ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں، ان سب میں کم از کم کفر واسلام کی حدود میں التباس یقینی ہے اور بعض صورتوں میں تو اصول اسلام کے خلاف شرک کا ارتکاب لازم آتا ہے، ایسی صلح سے سورہ کافرون نے اعلان برأت کردیا، اور دوسری جگہ جس صلح کو جائز قرار دیا اور معاہدۂ یہود سے اس کی عملی صورت معلوم ہوئی، اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں اصول اسلام کے خلاف کیا گیا ہو یا کفر واسلام کی حدود آپس میں ملتبس ہوئی ہوں، اسلام سے زیادہ کوئی مذہب رواداری، حسن سلوک، صلح وسالمیت کا داعی نہیں مگر صلح اپنے انسانی حقوق میں ہوتی ہے، خدا کے قانون اور اصول دین میں کسی صلح مصالحت کی گنجائش نہیں، واللہ اعلم (معارف القرآن ۸؍۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴)۔

ب: رسول اکرم ﷺ نے ابوطالب کی تدفین کے متعلق حضرت علیؓ سے فرمایا: جاؤ اپنے باپ کو دفن کرو، حضرت علیؓ نے عرض کیا: وہ مشرک اور ہدایت سے محروم تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ اور اپنے باپ کو دفن کرو (نصب الرایہ ۲؍۲۸۱)۔

چونکہ ابوطالب نے آپ ﷺ کی پرورش کی تھی، آپ ﷺ کے لئے ساری مصیبتوں کو برداشت کیا تھا، خاندان اور پھر لامتناہی احسان کی وجہ سے آپ ﷺ کا اخلاقی فریضہ تھا کہ کفن دفن کا انتظام کریں، اس لئے حضرت علیؓ کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی، محل غور بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خود شرکت نہیں کی، بلکہ اس فریضہ کو نبھانے کے لئے دوسرے کے حوالہ کردیا، گویا آپ ﷺ نے عدم شرکت کے ذریعہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور حضرت علیؓ کے حوالہ کرکے اپنے اخلاقی فریضہ کی تکمیل کی۔

ج: "**لا يتبع جنازته، أما عيادته فلا بأس بها فإنه قد يكون في ذلك مصلحة لتأليفه على الإسلام، وإذا مات كافرا فقد وجبت له النار و لهذا لا يصلى عليه**" (فتاویٰ ابن تیمیہ)۔

(کافر کے جنازہ میں شرکت نہیں کی جائیگی، رہی بات عیادت کی تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ کبھی اس میں اسلام پر مائل کرنے کے لئے کافر کی خاطرداری کی مصلحت ہوتی ہے اور جب وہ بحالت کفر مرگیا تو اس پر نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ اس پر جہنم واجب ہوچکی ہے۔

د: کسی مصلحت یا ضرورت سے غیر مسلموں سے ملنا جلنا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور انسانیت کے ناطے ان کا تعاون کرنا خاص کر جبکہ پڑوسی ہوں شرعاً جائز ہے، نیت اچھی اور اصلاح کی ہونی چاہیے، مداہنت کی صورت نہ ہو، البتہ ان کے

مذہبی معاملات اور مذہبی رسومات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، لہذا کوئی کافر بیمار ہوگیا یا اس کے یہاں کسی کا انتقال ہوگیا تو اس کی عیادت اور تعزیت کرنا تو جائز ہے مگر میت اور جنازہ لیکر چلنا اور انکے دیگر مذہبی رسومات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۸/۱۸۰، احسن الفتاویٰ ۴/۲۳۳، منتخبات نظام الفتاویٰ ۲/۳۷۵، فتاویٰ محمودیہ ۱۵/۳۴۵، جامع الفتاویٰ ۱/۵۰۴، امداد المفتین، کفایت المفتی ۴/۱۹۱، نصاب الاحتساب/۱۱۰)۔

ھ: اسلام میں غیر مسلم پڑوسیوں اور اہل تعلق کے بھی حقوق ہیں، اس لئے ان کی بیماری وغم کے موقعوں پر ان کی عیادت وتعزیت کی جائیگی۔

و: وندے ماترم جیسے گیت میں شرکیہ الفاظ ہیں اور ہندوستان کی سرزمین کو معبود کا درجہ دیے جانے کا تصور پایا جاتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے اس جیسے گیت کا پڑھنا شرعاً حرام ہے اور ان پر اس سے احتراز کرنا لازم ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے بھی اس سلسلہ میں اپنے چودھویں فقہی سمینار منعقدہ حیدرآباد میں یہ فیصلہ فرمایا ہے (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل/۵۰)۔

جواب نمبر ۴:

الف: ''یا أیها الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن إنه لکم عدو مبین'' (البقرۃ: ۲۰۸) (اے ایمان والو! داخل ہوجاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے)۔

ربط آیت:

اوپر مخلص کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہوجاتا ہے، یعنی قصد تو ہوتا ہے زیادہ اطاعت کا مگر وہ اطاعت بنظرِ غائر حد شریعت وسنت سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ جو پہلے علمائے یہود سے تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا، اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعت محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کردیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہوجائے اور شریعت محمدیہ کے خلاف بھی نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت مذکورہ میں کس قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے اور بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

(لہٰذا آجکل ہندوستان میں ذبیحہ گاؤ اور اس قسم کے معاملات درج بالا اہم ترین ہدایت کی روشنی میں داخل ہیں جس کا مطلب یہی ہے کہ جہاں مسلمانوں کا بس چلے اور اضطرار وشدید مفاسد کا خطرہ نہ ہو تو اجتماعی طور پر گائے کے ذبیحہ کو ترجیح دینا چاہیے)۔

خلاصہ تفسیر:

اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو (یہ نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف) پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں (احکام وشرائع کی) پہنچ چکی ہیں (پھر بھی صراط مستقیم) سے لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دینگے اور کچھ دنوں تک سزا نہ دیں تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت ومصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے) یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزا وسزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحبِ اختیار نہ ہوگا، سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے) (معارف القرآن ۱/ ۴۹۷، ۴۹۸)۔

ب: جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت وثواب بھی ہو مگر مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو اگر اسکے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کر دینا واجب ہو جاتا ہے، بخلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لزوم مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کیے جاسکتے۔

مگر جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں خواہ فرائض وواجبات ہوں یا سنن مؤکدہ یا دوسری قسم کے شعائر اسلامی اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں، تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائیگی،۔

(نوٹ) جواب ھذا کی مزید تفصیل آگے جواب نمبر ۵ میں بھی ملاحظہ فرمائیں!

جواب نمبر ۵:

الف: "وإذ قال إبرٰهيم لأبيه آزر أتتخذ أصناما ألهة إني أراك وقومك في ضلال مبين" (الانعام: ۷۴) (اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر کو، کیا تو مانتا ہے بتوں کو خدا، میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری قوم صریح گمراہ ہے)۔

مبلغین اسلام کے لئے چند ہدایات:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرز مناظرہ سے علماء ومبلغین کے لئے چند اہم ہدایات حاصل ہوئیں: اول یہ کہ قوموں

کی تبلیغ واصلاح میں نہ ہر جگہ سختی مناسب ہے، نہ ہر جگہ نرمی، بلکہ ہر ایک کا ایک موقع اور ایک حد ہے، چنانچہ بت پرستی کے معاملہ میں حضرت خلیل اللہ نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ اس کی گمراہی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے اور نجوم پرستی کے معاملہ میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے، بلکہ ایک خاص تدبیر سے معاملہ کی حقیقت کو قوم کے ذہن نشین فرمایا، کیونکہ سیاروں اور ستاروں کا بے بس اور بے اختیار ہونا اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود تراشیدہ بتوں کا، اس سے معلوم ہوا کہ عوام اگر کسی غلطی میں مبتلا ہوں جس کا غلطی اور گمراہی ہونا عام نظروں میں واضح نہ ہو تو عالم و مبلغ کو چاہیے کہ تشدد کے بجائے ان کے شبہات کو دور کرنیکی تدبیر کرے۔

دوسری ہدایت اس میں یہ ہے کہ اظہار حق وحقیقت کے لئے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو یوں خطاب نہیں کیا کہ تم ایسا کرو، بلکہ اپنا حال بتلادیا کہ میں تو ان طلوع وغروب کے چکر میں رہنے والی چیزوں کو معبود قرار نہیں دے سکتا، اس لئے میں نے اپنا رخ ایک ایسی ہستی کی طرف کرلیا ہے جو ان سب چیزوں کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے، مقصد تو یہی تھا کہ تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے، مگر حکیمانہ انداز میں صریح خطاب سے پرہیز فرمایا، تاکہ وہ ضد پر نہ آجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح اور مبلغ کا صرف یہ کام نہیں کہ حق بات کو جس طرح چاہے کہہ ڈالے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ ایسے انداز سے کہے جو لوگوں کے لئے مؤثر ہو (معارف القرآن ۳/ ۳۷۵، ۳۸۲، سورہ انعام)۔

ب : "ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم" (الانعام: ۱۰۸)۔

(اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بدون سمجھے)۔

آیت کا شان نزول:

ابن جریرؒ کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب رسول کریم ﷺ کے عم محترم ابوطالب مرض الموت میں تھے تو قریش کے مشرک سردار جو رسول اللہ ﷺ کی عداوت اور ایذارسانی میں لگے ہوئے تھے، اور قتل کی سازشیں کرتے رہتے تھے، ان کو یہ فکر ہوئی کہ ابوطالب کی وفات ہمارے لئے ایک مشکل مسئلہ بن جائے گی، کیونکہ ان کے بعد اگر ہم محمد (ﷺ) کو قتل کریں تو یہ ہماری عزت وشرافت کے خلاف ہوگا کہ لوگ کہیں گے کہ ابوطالب کے سامنے تو ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے، ان کی موت کے بعد اکیلا پا کر قتل کردیا، اس لئے اب وقت ہے کہ ہم مل کر خود ابوطالب ہی سے کوئی فیصلہ کن بات کرلیں۔

چند قریشی سرداروں نے یہ مشورہ کرکے ابوطالب کے پاس جانے کے لئے ایک وفد مرتب کیا، جس میں ابوسفیان، ابوجہل، عمرو بن عاص، وغیرہ قریشی سردار شامل تھے، ابوطالب سے اس وفد کی ملاقات کے لئے وقت لینے کا کام ایک شخص مطلب نامی کے سپرد ہوا، اس نے ابوطالب سے اجازت لے کر اس وفد کو وہاں پہنچایا۔

وفد نے ابوطالب سے کہا کہ آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں، اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بھتیجے محمد ﷺ نے ہمیں

اور ہمارے معبودوں کو سخت تکلیف اور ایذا پہنچا رکھی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں تو ہم اس پر صلح کرلیں گے کہ وہ اپنے دین پر جس طرح چاہیں عمل کریں، جس کو چاہیں معبود بنائیں ہم ان کو کچھ نہ کہیں گے۔

ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ یہ آپ کی برادری کے سردار آئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے اس وفد سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ ہمیں اور ہمارے معبودوں کو چھوڑ دیں، برا بھلا نہ کہیں اور ہم آپ کو اور آپ کے معبود کو چھوڑ دیں گے، اس طرح باہمی مخالفت ختم ہو جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا بتلاؤ کہ اگر تمہاری یہ بات مان لوں تو کیا تم ایک ایسا کلمہ کہنے کے لئے تیار ہو جاؤ گے جس کے کہنے سے تم سارے عرب کے مالک ہو جاؤ گے، اور عجم کے لوگ بھی تمہارے تابع اور باج گذار بن جائیں گے۔

ابو جہل بولا کہ ایسا کلمہ ایک نہیں ہم دس کہنے کو تیار ہیں، بتلایئے وہ کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: **لا إله إلا الله**، یہ سنتے ہی سب برہم ہو گئے، ابو طالب نے بھی حضور ﷺ سے کہا میرے بھتیجے: اس کلمہ کے سوا کوئی اور بات کہو، کیونکہ آپ کی قوم اس کلمہ سے گھبرا گئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: چچا جان! میں تو اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا کلمہ نہیں کہہ سکتا ہوں، اگر وہ آسمان سے آفتاب کو اتار لائیں اور میرے ہاتھ میں رکھ دیں جب بھی میں اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا ہرگز نہ کہوں گا، مقصود یہ تھا کہ ان کو مایوس کر دیں۔

اس پر یہ لوگ ناراض ہو کر کہنے لگے یا تو آپ ﷺ ہمارے معبودوں (بتوں) کو برا کہنے سے باز آجایئے، ورنہ ہم آپ کو بھی گالیاں دیں گے اور اس ذات کو بھی جس کا رسول آپ اپنے کو بتلاتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: "**ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم**"۔

رہا یہ معاملہ کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں بتوں کا تذکرہ سخت الفاظ میں آیا ہے، اور وہ آیات منسوخ بھی نہیں، ان کی تلاوت اب بھی ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیات قرانی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارد ہوئے ہیں، وہاں کسی کی دل آزاری نہ پیش نظر ہے اور نہ کوئی سمجھدار انسان ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس میں بتوں کو برا کہنا یا مشرکین کو چڑانا منظور ہے، اور یہ ایک ایسا کھلا ہوا فرق ہے جس کو ہر زبان کے اہل محاورہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم نے جابجا بتوں کے بے حس و بے شعور اور بے علم وقدرت اور بے بس ہونے کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ سمجھنے والے حقیقت کو سمجھ لیں، اور نہ سمجھنے والوں کی غلطی یا کوتاہ نظری واضح ہو جائے، جس کے نتیجہ میں یہ ارشاد ہوا ہے: "**ضعف الطالب والمطلوب**" (یہ بت بھی کمزور ہیں اور ان کے چاہنے والے بھی کمزور)، یا یہ ارشاد ہوا ہے: "**إنكم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم**" (تم اور جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں)، یہاں بھی کسی کو برا کہنا مقصود نہیں، گمراہی اور غلطی کے انجام بد کو بیان کرنا مقصود ہے، فقہائے کرام رحمھم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص اس آیت کو بھی مشرکین کو چڑانے کے سبب سے پڑھے تو اس کے لئے اس وقت یہ تلاوت کرنا بھی سبِ ممنوع میں داخل اور ناجائز ہے، جیسے

مواضعِ مکروہہ میں تلاوت قرآن کا ناجائز ہونا سب کو معلوم ہے (روح المعانی)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک اور قرآن کریم میں تو نہ پہلے کبھی ایسا کلام آیا تھا جس کو لوگ گالی سمجھیں، اور نہ آئندہ آنے کا کوئی خطرہ تھا، ہاں مسلمانوں سے اس کا امکان تھا ان کو اس آیت نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

ج: امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اس موضوع پر ایک مستقل باب رکھا ہے: "**باب من ترک بعض الاختیار مخافة أن یقصر فهم بعض الناس فیقعوا فی أشد منه**" یعنی بعض اوقات جائز بلکہ مستحسن چیزوں کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس سے کم فہم عوام کو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے بشرطیکہ یہ کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہ ہو۔

مگر جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں خواہ فرائض وواجبات ہوں یا سنن مؤکدہ یا دوسری قسم کے شعائر اسلامی اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں، تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی، ابتدائے اسلام کے واقعات شاہد ہیں کہ نماز وتلاوت اور تبلیغ اسلام کی وجہ سے مشرکین مکہ کو اشتعال ہوتا تھا، مگر اس کی وجہ سے ان شعائر اسلام کو کبھی ترک نہیں کیا گیا، بلکہ خود آیت مذکورہ کے شان نزول میں جو واقعہ ابوجہل وغیرہ رؤساء قریش کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہی تھا کہ قریشی سردار اس پر صلح کرنا چاہتے تھے کہ آپ ﷺ توحید کی تبلیغ کرنا چھوڑ دیں، جس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: میں یہ کام کسی حال میں نہیں کرسکتا اگرچہ وہ آفتاب وماہتاب لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

اس لئے اس مسئلہ کی تنقیح اس طرح ہوگئی کہ جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں اگر ان کے کرنے سے کچھ لوگ غلط فہمی یا غلط کاری کا شکار ہوتے ہوں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑ جائیگا، ہاں جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہیں اور ان کے ترک کردینے سے کوئی دینی مقصد فوت نہیں ہوتا ہو تو ایسے کاموں کو دوسروں کی غلط فہمی یا غلط کاری کے اندیشہ کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے گا (از معارف القرآن ۳/ ۴۱۸ تا ۴۲۴)۔

جواب نمبر ۶:

الف: "**لا یتخذ المومنون الکافرین أولیاء من دون المومنین، ومن یفعل ذلک فلیس من الله فی شئی إلا أن تتقوا منهم تقٰة، ویحذرکم الله نفسه وإلی الله المصیر**" (آل عمران :۲۸)۔

(نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر اور جو کوئی یہ کام کرے تو نہیں اس کو اللہ سے کوئی تعلق، مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو تم ان سے بچاؤ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے)۔

خلاصۂ تفسیر:

مذکور الصدر آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ کافروں کو دوست نہ بنائیں اور اس ہدایت کی مخالفت کرنے

والوں کے لئے سخت وعید ہے کہ جو ان کو دوست بنائے گا، اس کا اللہ تعالیٰ سے دوستی ومحبت کا علاقہ قطع ہو جائے گا، کافروں سے باطنی اور دلی دوستی تو مطلقاً حرام ہے، اور ظاہری دوستی معاملات کے درجہ میں اگرچہ جائز ہے، مگر بلا ضرورت وہ بھی پسند نہیں۔

یہ مضمون بہت سی آیاتِ قرآنیہ میں مجمل اور مفصل مذکور ہے، جس میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ موالات اور دوستی اور محبت سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے، ان تصریحات کو دیکھ کر حقیقت حال سے ناواقف غیر مسلموں کو تو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں غیر مسلموں سے کسی قسم کی رواداری اور تعلق کی بلکہ حسنِ اخلاق کی بھی کوئی گنجائش نہیں، اور دوسری طرف اس کے بالمقابل جب قرآن کی بہت سی آیات سے اور رسول کریم ﷺ کے ارشادات اور عمل سے، خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے تعامل سے غیر مسلموں کے ساتھ احسان وسلوک اور ہمدردی وغم خواری کے احکام اور ایسے ایسے واقعات ثابت ہوتے ہیں، جن کی مثالیں دنیا کی اقوام میں ملنا مشکل ہے، تو ایک سطحی نظر رکھنے والے مسلمان کو بھی اس جگہ قرآن وسنت کے احکام وارشادات میں باہم تعارض اور تصادم محسوس ہونے لگتا ہے، مگر یہ دونوں خیال قرآن کی حقیقی تعلیمات پر طائرانہ نظر اور ناقص تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں، اگر مختلف مقامات سے قرآن کی آیات کو جو اس معاملہ سے متعلق ہیں، جمع کر کے غور کیا جائے، تو نہ غیر مسلموں کے لئے وجہ شکایت باقی رہتی ہے، نہ آیات وروایات میں کسی قسم کا تعارض باقی رہتا ہے، اس لئے اس مقام کی پوری تشریح کر دی جاتی ہے، جس سے موالات اور احسان وسلوک، یا ہمدردی وغمخواری میں باہمی فرق اور ہر ایک کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی، اور یہ بھی کہ ان میں کون سا درجہ جائز ہے اور کون سا ناجائز، اور جو ناجائز ہے اس کی وجوہ کیا ہیں۔

بات یہ ہے کہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔

پہلا درجہ قلبی موالات یا دلی مودّت ومحبت ہے:

یہ صرف مومنین کے ساتھ مخصوص ہے، غیر مومن کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

دوسرا درجہ مواسات کا ہے:

جس کے معنیٰ ہیں، ہمدردی وخیر خواہی اور نفع رسانی کے، یہ بجز کفارِ اہل حرب کے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہیں، باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، سورہ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جس میں ارشاد ہے:

”لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا إلیھم“ (۶۰:۸) (اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا، ان سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا سلوک کرو)۔

تیسرا درجہ مدارات کا ہے:

جس کے معنیٰ ہیں ظاہری خوش خلقی، اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس سے مقصود ان

کو دینی نفع پہنچانا ہو، یا وہ اپنے مہمان ہوں، یا انکے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، سورہ آل عمران کی آیت مذکورہ میں "إلا أن تتقوا منهم تقٰة" سے یہی درجہ مدارات کا مراد ہے، یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں، مگر ایسی حالت میں جبکہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چونکہ مدارات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے، اس لئے اس کو موالات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا (بیان القرآن)۔

چوتھا درجہ معاملات کا ہے:

ان سے تجارت یا اجرت وملازمت وصنعت وحرفت کے معاملات کیئے جائیں، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہیں، بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو، رسول کریم ﷺ اور خلفاء راشدینؓ اور دوسرے صحابہؓ کا تعامل اس پر شاہد ہے، فقہاء نے اسی بنا پر کفارِ اہل حرب کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی ہے، اور ان کو اپنا ملازم رکھنا یا خود ان کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا یہ سب جائز ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ قلبی اور دلی دوستی ومحبت تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں جائز نہیں، اور احسان وہمدردی ونفع رسانی بجز اہل حرب کے اور سب کے ساتھ جائز ہے، اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس کا مقصد مہمان کی خاطرداری یا غیر مسلموں کو اسلامی معلومات اور دینی نفع پہنچانا یا اپنے آپ کو ان کے کسی نقصان وضرر سے بچانا ہو۔

رسول کریم ﷺ جو رحمۃ للعلمین ہو کر اس دنیا میں تشریف لائے، آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو احسان وہمدردی اور خوش خلقی کے معاملات کئے، اس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے، مکہ میں قحط پڑا تو جن دشمنوں نے آپ ﷺ کو اپنے وطن سے نکالا تھا، ان کی خود امداد فرمائی، پھر مکہ مکرمہ فتح ہو کر یہ سب دشمن آپ ﷺ کے قابو میں آگئے، تو سب کو یہ فرما کر آزاد کر دیا: "لا تثریب علیکم الیوم" یعنی آج تمہیں صرف معافی نہیں دی جاتی، بلکہ تمہارے پچھلے مظالم اور تکالیف پر ہم کوئی ملامت بھی نہیں کرتے، غیر مسلم جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہر شخص نہیں کرتا، کفار نے آپ ﷺ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں، کبھی آپ ﷺ کا ہاتھ انتقام کے لئے نہیں اٹھا، زبان مبارک سے بددعا بھی نہیں فرمائی، بنو ثقیف جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کا ایک وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ان کو مسجد نبوی ﷺ میں ٹھہرایا گیا، جو مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ عزت کا مقام تھا۔

فاروق اعظمؓ نے غیر مسلم محتاج ذمیوں کو مسلمانوں کی طرح بیت المال سے وظیفے دئے، خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے معاملات اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں، یہ سب مواسات یا مدارات یا معاملات کی صورتیں ہیں، جس موالات سے منع کیا گیا وہ نہ تھی۔

اس تفصیل اور تشریح سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوگیا کہ غیر مسلموں کے لئے اسلام میں کتنی رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم ہے، دوسری طرف جو ظاہری تعارض ترک موالات کی آیات سے محسوس ہوتا تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔

اب ایک بات یہ باقی رہ گئی کہ قرآن نے کفار کی موالات اور قلبی دوستی ومحبت کو اتنی شدت کے ساتھ کیوں روکا کہ وہ کسی حال میں کسی کافر کے ساتھ جائز نہیں رکھی، اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں اس دنیا کے اندر انسان کا وجود عام جانوروں یا جنگل کے درختوں اور گھاس پھوس کی طرح نہیں کہ پیدا ہوئے، پھولے پھلے، پھر مر کر ختم ہو گئے، بلکہ انسان کی زندگی اس جہاں میں ایک مقصدی زندگی ہے، اس کی زندگی کے تمام ادوار، اس کا کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، یہاں تک کہ جینا اور مرنا سب ایک مقصد کے گرد گھومتے ہیں، جب تک وہ اس مقصد کے مطابق ہیں تو یہ سارے کام صحیح و درست ہیں، اگر اس کے مخالف ہیں تو یہ سب غلط ہیں۔

ب: غیر مسلموں کے ساتھ انسانی بنیادوں پر ہمدردی اور غمخواری اور حسن سلوک بھی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، انفرادی طور پر حسن سلوک کی تاکید تو قرآن کریم نے اس طرح فرمائی کہ اگر کسی شخص کے والدین مشرک ہوں تو شرک میں تو انکی اطاعت جائز نہیں، لیکن انکے ساتھ دنیا میں حسن سلوک ضروری ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وإن جاهداک علی أن تشرک بی مالیس لک به علم فلا تطعهما وصاحبهما فی الدنیا معروفا" (سورۃ لقمان: ۱۸) (اگر والدین تم پر یہ زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی کو (خدائی میں) شریک قرار دو جسکی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں، تو انکی بات مت مانو اور دنیا میں انکے ساتھ بھلائی سے رہو)۔

پھر ایک اہم حکم سورہ ممتحنہ میں اس آیت نمبر ۸ کے حوالے سے پیچھے گذر چکا ہے:

"**لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروهم وتقسطوا إلیهم**" (سورہ ممتحنہ: ۸)۔

اس میں انفرادی طور پر کسی غیر مسلم کے ساتھ حسن سلوک بھی داخل ہے، اور اجتماعی ہمدردی بھی داخل ہے، حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ میں اسکے بھی بہت سے واقعات موجود ہیں، بخاری میں کئی مقامات پر یہ واقعہ آیا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی والدہ مشرک تھیں، مدینہ منورہ آئیں اور اپنی بیٹی سے کچھ مالی مدد کی توقع ظاہر کی، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: "صلی أمک" (اپنی والدہ کے ساتھ نیک سلوک کرو)۔

نیز یہ بات بالکل واضح ہے کہ مشرکین مکہ نبی کریم ﷺ کی دشمنی پر کمر باندھے ہوئے تھے، مکی زندگی میں انہوں نے آپ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ پر ظلم وستم توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی یہاں تک کہ شعب ابی طالب میں آپ ﷺ کے اہل خاندان کو محصور کر کے ان کا کھانا بند کر دیا، اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو درختوں کے پتوں اور چمڑوں پر بھی گزارا کرنا پڑا، لیکن جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو اس وقت ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں سخت قحط پڑا جس کے نتیجہ میں وہاں کے لوگ چمڑا تک B16

چوسنے پر مجبور ہو گئے، سورہ دخان کے آغاز میں ایک تفسیر کے مطابق قرآن کریم میں اسی قحط کا ذکر فرمایا ہے، اس موقع پر آپ ﷺ نے نہ صرف اس قحط کے دور کرنے کی دعاء فرمائی، بلکہ علامہ سرخسیؒ کے بیان کے مطابق ابوسفیان کے پاس پانچ سو اشرفیوں کی خطیر رقم بھیجی، تا کہ اسے مکہ مکرمہ کے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کیا جائے (مبسوط سرخسی باب صلح الملوک ۱۰/۹۲)۔

اس کے علاوہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ سے عجوہ کھجوروں کی ایک مقدار ابوسفیان کے پاس ہدیہ کے طور پر بھیجی، اور ان سے کچھ چمڑا بھیجنے کی فرمائش کی (کتاب الاموال لابی عبید باب فصل مابین الغنیمۃ والفئی حدیث نمبر: ۶۴۴)۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ اس چمڑے کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا خیال ہوگا کہ شامی راستے کی بندش کی وجہ سے اس کا خریدار کوئی نہیں ہوگا، اور وہ ابوسفیان کے پاس پڑا پڑا خراب ہو رہا ہوگا، اس لئے آپ ﷺ نے اس کے بدلہ میں کھجوریں بھیجیں، تا کہ قحط کے زمانہ میں انکی غذائی ضرورت پوری ہو سکے (عہد نبوی میں نظام حکمرانی: ۲۵۸)۔

ان واقعات سے آپ ﷺ نے ثابت فرمایا کہ دشمنی اور نفرت غیر مسلموں کی ذات سے نہیں ہے بلکہ ان کے باطل عقائد اور انکے فتنہ وفساد سے ہے، جہاں تک انکی انسانی حیثیت کا تعلق ہے، اس کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی مطلوب ہے، انہیں تبلیغ بھی خیر خواہی کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور جہاد کا آخری مقصد بھی انسانیت کی خیر خواہی کے سوا کچھ نہیں، تا کہ انسانیت فتنہ وفساد سے محفوظ ہو جائے۔

بھلائی کے کاموں میں تعاون:

ج: قرآن وسنت میں بھلائی کے کاموں میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل اور تعاون کی نہ صرف اجازت، بلکہ اسکی ترغیب دی ہے، قرآن کریم نے اس سلسلے میں دوٹوک اصول یہ بیان فرمایا ہے:

"وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورۃ المائدہ: ۲)۔

(اور نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی میں تعاون مت کرو)۔

یہ اصول قرآن کریم میں جس سیاق میں بیان فرمایا ہے، وہاں غیر مسلموں ہی کے خلاف زیادتی کا ذکر ہے، پوری آیت اس طرح ہے:

"ولا یجرمنکم شنآن قوم أن صدوکم عن المسجد الحرام أن تعتدوا وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب" (سورۃ المائدہ: ۲)۔

(اور کسی قوم کے ساتھ تمہاری یہ دشمنی کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو، اور نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی میں تعاون مت کرو)۔

لہذا اس میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی نیکی میں تعاون کا حکم شامل ہے، اور اگر غیر مسلم کوئی ایسا منصوبہ پیش کرے جو عام

انسانی فائدے کا ہو اور اس میں کوئی بات اسلامی شریعت اور مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف نہ ہو تو مسلمانوں کے لئے ایسے منصوبے میں شرکت بھی جائز بلکہ مستحسن ہے، حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ میں اس قسم کے تعاون اور اشتراک عمل کی بھی نظیریں موجود ہیں جن میں سب سے نمایاں وہ معاہدہ ہے جو "حلف الفضول" کہلاتا ہے، جس میں حضور نبی کریم ﷺ بنفس نفیس شریک تو اس وقت ہوئے تھے جب آپ بحیثیت نبی مبعوث نہیں ہوئے تھے، لیکن نبوت کے بعد خود آپ ﷺ نے اس معاہدے کا ذکر فرما کر اسکی تعریف کی اور ارشاد فرمایا:

"میں جس حلف میں ابن جدعان کے گھر میں شریک ہوا تھا، مجھے اسکی مخالفت کے بدلے میں سرخ اونٹ بھی پسند نہیں ہیں، بنو ہاشم، بنو زھرہ اور بنو تیم نے اس وقت اس بات کا حلفیہ معاہدہ کیا تھا کہ جب تک سمندر میں کسی اون کے ٹکڑے کو تر کرنے کی صلاحیت ہے، وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اگر (اب بھی) مجھے اس قسم کے معاہدے کی دعوت دی جائے گی تو میں اسے ضرور قبول کرونگا" (طبقات ابن سعد ۱/۱۰۷ و عیون الاثر لابن سید الناس ۱/۵۹)۔

بہر حال! اس معاہدے کی بنیاد پر علامہ سہیلیؒ اور دوسرے علماء نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون اور اشتراک عمل نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر آج بھی مجھے اس قسم کے کسی معاہدے کی طرف بلایا جائیگا تو میں اسے قبول کرلونگا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ ایک اسلامی ریاست یا مسلمانوں کی اجتماعی تنظیموں کے تعلقات کی نوعیت خود انکے اپنے طرز عمل پر موقوف ہے جسکے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے :

"فما استقاموا لكم فاستقيموا لهم" (سورہ توبہ: ۷)۔

(جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں، تم بھی انکے ساتھ سیدھے رہو) (اسلام اور سیاسی نظریات ر ۳۴۴ تا ۳۵۲)۔

د: ملک اور انسانیت کے نفع اور معاشرے میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے اور ان کے اشتراک سے تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔

ھ: اسلام انسانیت کا احترام کرتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے حتی المقدور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مظلوم غیر مسلم بھائیوں کی مدد کرنا انکا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل رص ۵۰)۔

و: اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ قدرتی آفات کے موقع پر مسلم تنظیموں کی جانب سے برادران وطن کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا جائے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جائے (غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل ر ۵۱)۔

جواب نمبر ۷:

الف: غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی تعلق کی تین صورتیں ہیں:

گفتگو اور سوال اس وقت ہے کہ مسلم وغیر مسلم کسی سیاسی وانتظامی معاملہ میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہو کر کام کریں، حالات موجودہ میں اس کی تین صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار کی دو جماعتوں میں محض صلح یا تجارتی معاملات وغیرہ کے متعلق کوئی معاہدہ ہو، استعانت واستمداد یا شرکت عمل کچھ نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ مسلم جماعت اپنے جماعتی نظام واستقلال کو باقی رکھتے ہوئے کسی تیسری قوم کا مقابلہ کرنے کے لئے یا نظام حکومت وغیرہ بنانے کے لئے باہم معاہدہ کے ساتھ اشتراک عمل کرے۔

تیسرے یہ کہ مسلمان انفرادی طور سے بلا کسی شرط ومعاہدہ کے کسی کافر قوم کے ساتھ شریک عمل ہو جائیں۔

پہلی صورت مصالحت بلا استعانت:

اس کی شرعی حدود وشرائط:

محض مصالحت بلا استعانت جس کو فقہی اصطلاح میں موادعت بھی کہا جاتا ہے، یہ اس وقت جائز ہے کہ صلح میں مسلمانوں کی مصلحت ہو اور مفاد اسلامی پیش نظر ہو، اور شرائط صلح خلاف شرع نہ ہوں (شرح سیر ۶۶/۴)، آیت کریمہ: **"وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله"**، اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے، اور آیت: **"فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم"** سے ظاہری تعارض کا شبہ ہو سکتا تھا، اس کو جمہور مفسرین وفقہاء نے رفع فرمادیا ہے (دیکھئے: احکام القرآن ۸۶/۳)۔

اور یہ جو ذکر کیا گیا کہ جب مشرکین مائل بصلح ہوں تو صلح کر لی جائے، یہ بھی ایک ثابت شدہ حکم ہے اور دونوں آیتوں یعنی آیت: **"وإن جنحوا"** اور آیت: **"فاقتلوا المشركين"** میں حکم کا اختلاف بوجہ اختلاف حالات کے ہے، تو جس حالت میں صلح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ حالت مسلمانوں کے ضعف وقلت کی اور کفار کی قوت اور کثرت کی ہے، اور جس حال میں قتل مشرکین واھل کتاب کا حکم دیا گیا ہے، وہ حالت مسلمانوں کی کثرت (غلبہ) وقوت کی ہے بمقابلہ کفار کے، اور آیت کریمہ: **"فلا تهنوا وتدعوا إلى السلم وأنتم الأعلون والله معكم"** میں صلح کرنے سے منع فرمایا گیا، یہ اسی وقت ہے، جب مسلمانوں کو کفار پر غلبہ پانے کی قدرت حاصل ہو (احکام القرآن)۔

اور اسی مضمون کی تائید میں اس سے پہلے ارشاد فرمایا ہے۔

علی الاطلاق صلح سے ممانعت نہیں، ورنہ اہل نجران سے حضور ﷺ کیوں صلح فرماتے، بلکہ قوّت وغلبۂ اسلام کے وقت اس آیت مبارکہ میں اُس صلح سے ممانعت ہے، جو سستی اور تکاسل سے ناشی ہو۔

اور نبی کریم ﷺ جب مدینہ تشریف فرما ہوئے تو بہت سے مشرکین بنونضیر، بنوقینقاع وبنو قریظہ سے معاہدات فرمائے، پھر آپ کے اور قریش مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا، اس میں مغازی اور سیر کے روایت کرنے والوں میں کوئی

اختلاف نہیں، اور یہ اسی وقت کے واقعات ہیں، جب کہ اہل اسلام کو قوت حاصل نہ تھی (احکام ۸۶/۳)۔

نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کی مصلحت وضرورت صلح میں ہو تو صلح کر لینا جائز ہے، نیز معلوم ہو گیا کہ صلح کے جواز میں یہ بھی شرط نہیں کہ مسلمان غالب ہی ہوں، بلکہ بعض فقہاء ومفسرین نے یہ شرط لگائی ہے کہ صلح جب جائز ہے کہ اہل اسلام کمزور ہوں۔

لیکن یہ حکم صرف مصالحت وموادعت کا ہے، جس میں کافر قوم سے استمداد اور استعانت اور اشتراک عمل کی صورت نہ ہو، اور جہاں اشتراک عمل اور استعانت ہو، اس کا حکم دوسری صورت کے تحت میں آتا ہے۔

دوسری صورت مصالحت مع استعانت واشتراک عمل:

اس کی شرعی حدود وشرائط:

جس میں کسی کافر قوم سے مصالحت ومعاہدہ کے ساتھ استعانت واستمداد اور اشتراک عمل بھی ہو، اس کے جواز کے لئے یہ شرط ہے کہ اگر مسلمان غالب اور کفار مغلوب ہوں، اور کفار مسلمانوں کے زیر علم قتال وغیرہ میں شریک ہوں تو جائز ہے، اور کفار کے غالب یا برابر ہونے کی صورت میں جائز نہیں۔

آیات قرآنیہ:

۱: ”یآیھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یألونکم خبالاً“

۲: ”یآیھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ أولیاء بعضھم أولیاء بعض ومن یتولھم منکم فإنہ منھم“

۳: ”یآیھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزواً ولعباً“

۴: ”بشر المنافقین بأن لھم عذاباً الیماً الذین یتخذون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین“۔

اور اسی مضمون کی دوسری آیات کثیرہ حسب تصریح ائمہ مفسرین (جو آئندہ عبارات میں آتی ہیں) اس پر شاہد ہیں کہ کفار سے استعانت جائز نہیں، البتہ نبی کریم ﷺ کے عمل وارشاد سے اتنی گنجائش ثابت ہوتی ہے کہ اگر کفار مغلوب وتابع اور مسلمانوں کے زیر علم ہوں، تو اشتراک عمل واستعانت جائز ہے۔

عہد رسالت میں بنی قینقاع اور ابن ابی کے ساتھ مختلف معاملہ:

نبی کریم ﷺ کے ارشاد وعمل میں مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کی تصریح بوضاحت موجود ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے بعض قبائل کفار بنی قینقاع وغیرہ کو جہاد میں ساتھ ہونے کی اجازت دے دی، اور غزوۂ احد میں ابن ابی کے حلفاء کو شریک جہاد ہونے سے ان الفاظ سے منع کر دیا: ”إنا لا نستعین بمن لیس علی دیننا“ (یعنی ہم ایسے لوگوں کی امداد نہیں لیا کرتے جو

ہمارے دین پر نہ ہوں)۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ بنوقینقاع وغیرہ اسلام کے زیر علم اور تابع تھے، اور حلفاء ابن ابی مسلمانوں کے تابع ہو کر ان کے زیر علم جہاد کرنے پر آمادہ نہیں تھے، جیسا کہ آئندہ شرح سیر کی عبارات میں اس کی تصریح آتی ہے۔

مفسرین اور فقہاء کی تصریحات:

امام ابوبکر جصاصؒ کی تصریحات احکام القرآن میں آیات مذکورۃ الصدر کے ماتحت حسب ذیل ہیں:

''حق تعالیٰ نے فرمایا: اے ایمان والو! تم غیروں کو اپنا بھیدی نہ بناؤ اور فرمایا کہ یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے، وہ بھی انہیں میں شمار ہے، ان آیات میں حق تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا ہے، اور ان کی اہانت واذلال کا حکم دیا ہے، اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس میں ان کی عزت اور برتری ہے، اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو ایک خط لکھا، جس میں ان کو اس سے منع فرمایا کہ وہ کتابت (پیشی) میں کسی مشرک سے امداد لیں، اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ''لاتتخذوا بطانة من دونكم لا يألونكم خبالا'' (۳/۱۲۳)۔

نیز احکام القرآن میں آیت مذکورہ کے ماتحت ارشاد فرمایا:

''اس آیت (لاتتخذوا بطانة) میں اس کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں اور ملازمتوں میں کفار اہل ذمہ سے امداد لینا جائز نہیں''۔

''آیت (يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا الذين اتخذوا دينكم هزواً ولعباً) میں ممانعت ہے مشرکین سے مدد حاصل کرنے کی، کیونکہ اولیاء (دوست) ہی انصار (مددگار) ہوتے ہیں، (اور دوست بنانا کفار کا حرام ہے) اور ہمارے ائمہ حنفیہ نے فرمایا ہے کہ مشرکین کی ایک جماعت سے بمقابلہ دوسرے مشرکین کے امداد لینا اس شرط سے جائز ہے کہ بوقت فتح غلبہ حکم اسلام کا ہو، اور اگر ایسی حالت ہو کہ بوقت فتح غلبہ اہل اسلام کا نہ ہو، بلکہ حکم شرک غالب ہو، تو مسلمانوں کو ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنا جائز نہیں'' (احکام القرآن للجصاص ۲/۵۴۴)۔

امام ابوبکر جصاص کی پہلی اور دوسری عبارت میں اس کی بھی تصریح ہوگئی کہ یہ مسئلہ صرف جہاد وقتال کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے جماعتی کام اور امور دینیہ سب اس میں داخل ہیں کہ ان میں مشرکین وکفار سے استعانت واستمداد جائز نہیں۔

اس سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ اس وقت کانگریس کی شرکت حقیقی معنی میں جہاد یا قتال نہیں، تو اس میں مشرکین سے استمداد واستعانت کو جہاد کی استعانت قرار دیکر ناجائز کیسے قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ امام جصاص کی تصریحات کے موافق یہ حکم جہاد اور جملہ امور مسلمین اور امور دینیہ پر حاوی ہے۔

اور حضرت امام محمد بن حسنؒ کی کتاب سیر کبیر اور اس کی شرح میں اس مسئلہ پر دو مستقل باب رکھے ہیں، پہلے باب کا عنوان الاستعانۃ باہل الشرک واستعانۃ المشرکین بالمسلمین ہے، یعنی مسلمانوں کا مشرکین سے یا مشرکین کا مسلمانوں سے امداد لینا، اس باب کے تحت میں فرماتے ہیں:

''اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مسلمان بمقابلہ مشرکین کے کسی دوسرے فرقہ مشرکین سے امداد لیں، بشرطیکہ امداد دینے والے مشرکین پر حکم اسلام کا غالب ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہود بنی قینقاع سے بمقابلہ بنی قریظہ امداد لی، نیز مکہ کے بعض غیر مسلم غزوۂ خیبر میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ پیادہ وسوار نکلے تھے، اس سے ہم سمجھے کہ کفار سے امداد لینا جائز ہے، اور یہ بعینہ ایسا ہے جیسے کفار کے مقابلہ میں کتوں سے امداد لے لی جاوے، اور رسول اللہ ﷺ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے اس حدیث میں کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید کبھی ایسی اقوام سے بھی فرمائیں گے، جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور یہ جو روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احد میں ایک پر شوکت لشکر دیکھ کر فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ عرض کیا گیا کہ یہود بنی قینقاع ہیں جو ابن ابیؓ منافق کے ساتھی ہیں، (آپ کی امداد کے لئے آرہے ہیں) آپ نے فرمایا کہ ہم ایسے لوگوں سے امداد نہیں لیا کرتے جو ہمارے ہم مذہب نہ ہوں، اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ یہ لشکر صاحب شوکت وقوت تھی، اور آنحضرت ﷺ کے زیر علم قتال کرنے کے لئے تیار نہ تھی، اور ہمارے نزدیک جب جماعت کفار ایسی حالت میں ہو تو ان سے امداد لینا جائز نہیں'' (شرح سیر ۱۸۶/۳)۔

فائدہ:... شرح سیر کی عبارت مذکورہ سے واضح ہو گیا کہ کسی کافر قوم سے جہاد وغیرہ میں امداد لینا اس وقت جائز ہے، جب کہ یہ قوم خود ایسی صاحب شوکت نہ ہو، جس سے مسلمانوں کو اندیشہ ہو، نیز یہ بھی شرط ہے، کہ وہ ہمارے زیر علم شریکِ جہاد ہو، اس کا کوئی مستقل جھنڈا نہ ہو۔

محقق ابن ہمام نے فتح القدیر میں بھی اس کی تصریح بالفاظِ ذیل فرمائی ہے:

''اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مشرکین کی ایک جماعت سے بمقابلہ دوسری جماعت مشرکین کے امداد لی جاوے، جب کہ وہ اپنی خوشی سے ہمارے ساتھ نکلیں، اور مال غنیمت سے ان کو کچھ حصہ دیا جاوے، پورا حصہ مسلمانوں کے برابر نہ دیا جاوے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا اپنا کوئی جھنڈا نہ ہو، بلکہ وہ مسلمانوں کے جھنڈے کے نیچے شریک قتال ہوں'' (فتح القدیر، قسمۃ الغنیمۃ ۳۲۸/۴)۔

شرح سیر میں دوسرا باب اسی مسئلہ سے متعلق اس عنوان سے رکھا ہے: ''**قتال أهل الإسلام أهل الشرک مع أهل الشرک**''یعنی مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ ہو کر دوسرے مشرکین سے لڑنا، اس باب کے تحت میں ارشاد ہے:

''مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ مشرکین کی ایک جماعت سے قتال کریں کسی دوسری جماعت مشرکین کے ساتھ ہو کر، کیونکہ مشرکین کی دونوں جماعتیں شیطان کی پارٹیاں ہیں اور شیطان کی پارٹی ناکام ونامراد ہے، اس لئے مسلمان کے لئے درست نہیں کہ وہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت کے ساتھ ضم ہو جاوے، جس سے اس کی تعداد بڑھے، اور یہ کہ وہ ان کی

طرف سے مدافعت کے لئے قتال کرے، اور یہ اس لئے کہ اس صورت میں حکم شرک غالب ہے، اور مسلمان جو جہاد کرتا ہے، تو اہل حق کی نصرت کے لئے کرتا ہے نہ کہ حکم شرک کو غالب کرنے کے لئے اور درست نہیں کہ کوئی اہل سنت مسلمان کسی فرقۂ خوارج کے ساتھ بمقابلہ دوسرے فرقۂ خوارج کے قتال میں شریک ہو، جب کہ فتح کے وقت غلبہ خوارج کا ہوتا ہو، کیونکہ اس فرقہ باغیہ کے ساتھ قتال کی اجازت صرف اس صورت میں ہے، جب کہ قتال کا انجام رجوع الی الحق ہو، اور جب کہ قتال کے بعد بھی حکم خوارج ہی کا غالب رہے تو یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا'' (شرح سیر ۳؍۲۴۱)۔

(۱) (عبارت مذکورہ میں لفظ لا ینبغی سے کسی اہل علم کو اس معاملہ میں تسہیل کا شبہ نہ ہونا چاہئے، کیونکہ اس کے مقابلہ میں لفظ اباحۃ لا کر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ لفظ لا ینبغی اس جگہ لا یجوز کے معنی میں ہے۔ ۱۲ منہ)

اور حدیث وفقہ کے مشہور امام طحاویؒ کی کتاب مشکل الآثار میں ہے:

''کفار اہل کتاب کا یہی حکم اب بھی بہت سے اہل علم کے نزدیک ہے، جن میں سے ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد وغیرہ ہیں، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ کفار اہل کتاب سے امداد لینا بمقابلہ دوسرے کفار کے جائز ہے، بشرطیکہ ان پر حکم ہمارا (اسلام کا) غالب ہو، اور اگر معاذ اللہ صورت اس کے خلاف ہو، (یعنی غلبہ کفار کا ہوتا ہو) تو استمداد کو منع فرماتے ہیں۔

مسئلہ زیر بحث پر آیاتِ قرآنیہ اور روایات حدیث کی نصوص صریحہ بقدر کفایت ذکر کر دی گئی، اور ان کے ضمن میں ائمہ مجتہدین اور علماء امت کی کچھ تصریحات بھی آچکی ہیں۔

اس مسئلہ میں خود امام اعظمؒ کا ایک فتوی ہے جو آپ نے امام محمد بن حسن کے سوال کے جواب میں دیا تھا۔

''کیا مسلمان اہل حرب کے مقابلہ میں مشرکین سے امداد لے سکتے ہیں؟''

آپ نے جواب میں فرمایا: ''اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ حکم اسلام کا ظاہر وغالب ہو، کیونکہ اس طرح اہل حرب سے قتال کرنا تو اعزاز دین کے لئے ہے، اور ان کے مقابلہ میں مشرکین سے استعانت ایسی ہے جیسے لڑائی میں کتوں سے کام لیا جاوے'' (بحوالہ مبسوط ۱۰؍۱۳۸)۔

اور امام دار الہجرۃ حضرت امام مالکؒ کے تلمیذ خاص جو مذہب مالکیہ کے مدونِ اول ہیں اپنی مشہور کتاب مدونہ کبریٰ میں فرماتے ہیں:

''میں نے دریافت کیا کہ کیا امام مالکؒ مسلمانوں کے لئے جہاد میں مشرکین سے امداد لینے کو منع فرماتے تھے، (ابن قاسم نے) کہا کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے آنحضرت ﷺ سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ ہم مشرک سے امداد نہیں لیتے، بس یہ حدیث روایت فرمائی اس کے سوا کچھ اس بارے میں نہیں فرمایا، ابن قاسم کہتے ہیں، کہ میں اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ مسلمان کفار سے امداد لے کر دوسرے کفار سے قتال کریں، مگر اس صورت میں کہ کفار خدمت گاروں اور ملازموں کی طرح ہمارے ساتھ لگ جاویں، تو پھر کوئی مضائقہ نہیں'' (مدونہ ۱؍۴۰)۔

عبارت مرقومہ سے ظاہر یہ ہے کہ امام ابن القاسمؒ نے استعانت بالمشرکین کی اُسی شرط کے ساتھ اجازت دی ہے جو امام اعظمؒ کے کلام میں گزر چکی ہے، یعنی یہ کہ کفار مغلوب ومقہور خدام کی طرح ساتھ لگ جاویں، تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔

تیسری صورت: اشتراک عمل بلا شرط ومعاہدہ:

یہ صورت بالاجماع ممنوع ہے۔

مندرجہ بالا دو صورتوں یعنی مصالحت اور استعانت بشرطیکہ غلبۂ حکم اسلام ہو کے سوا جتنی صورتیں کسی کافر قوم کے ساتھ اشتراک عمل کی ہیں وہ سب اس تیسری صورت میں داخل اور بتصریحاتِ قرآن وحدیث واجماعِ سلف وخلف ممنوع ہیں، گو درجات ممانعت حرمت وکراہت کے اعتبار سے مختلف ہوں۔

کفار کی متابعت وموالات حرام ہے۔

اور اصل یہ ہے کہ کفار اور کفر سے بغض وعداوت اور اظہار مخالفت اہم مقاصد اسلام سے ہے، اور اس کے مقابلہ میں کفار کی متابعت وموالات اور دوستانہ تعلقات حرام صریح اور مخالفت ومشابہت وغیرہ ممنوع وناجائز ہیں، صرف مصالحت اور اشتراک عمل کی وہ صورت جس میں غلبہ حکم اسلام کا ہو، یا معاملاتِ اجارہ وتجارت کی اجازت دی گئی ہے باقی ہر قسم کا اختلاط واشتراک کفار کے ساتھ حرام وناجائز ہے۔

قرآن وحدیث کی نصوص صریحہ اس بارے میں اس قدر ہیں کہ اگر جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہوجائے جس کا یہاں موقع نہیں۔

جواب نمبر ۸:

بین مذہبی مذاکرات کی مجلسوں اور پروگراموں میں بہر صورت پردۂ شرعی کا اہتمام کرایا جائے، بصورت دیگر شرکت سے معذرت کردی جائے، تاکہ غیر مسلم بھی پردۂ شرعی کی رعایت پر مجبور ہوجائیں، ورنہ تو مسلمان ہی داعی بننے کے بجائے خود غیر اسلامی تہذیب کے مدعو اور اس سے مرعوب وشکست خوردہ قرار پائیں گے، جبکہ "الإسلام يعلو ولا يعلى" مسلمہ قاعدہ ہے (مستفاد از جواہر الفقہ، فقہی مقالات)، هذا ما تيسر لي بعون الملك الوهاب، والله أعلم بالصواب۔

بین مذہبی مذاکرات۔اصول وآداب

مولانا محمد عثمان بستوی ☆

الحمدللہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی سید المرسلین و من تبعھم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد!

بین مذہبی مذاکرات سے متعلق سوالات کے جوابات اختصار کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں، بالترتیب جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔بین مذہبی مذاکرات شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہیں، مذاکرات خواہ دینی امور سے متعلق ہوں یا سیاسی وسماجی امور سے متعلق، کیونکہ بین مذہبی مذاکرات کے کل تین مقاصد ہوسکتے ہیں: (۱) آپسی رواداری کا فروغ، (۲) دعوت وتبلیغ، (۳) افہام وتفہیم، اور یہ تینوں مقاصد شرعاً مطلوب ومقصود ومحمود ہیں، لہذا بین مذہبی مذاکرات، "**الأمور بمقاصدھا**" کے ضابطہ سے شرعاً محمود ہوں گے، جیسا کہ آپسی رواداری کے فروغ کے لئے آپ ﷺ نے یہود مدینہ سے معاہدہ کیا (سیرت مصطفی)۔

☆ غزوہ احزاب کے موقع پر عیینہ ابن حصن فزاری سے مدینہ کے ایک تہائی کھجور کی پیداوار دے کر صلح کا ارادہ فرمایا (سیرت مصطفی)۔

☆ ہمیشہ آپ نے معاہدے کی پابندی فرمائی بدعہدی کو سنگین جرم قرار دیا (مشکوۃ)۔

☆ رواداری کے فروغ کے لئے انسانی بنیادوں پر غم خواری، حسن سلوک، انسانیت کے لئے مفید کاموں میں باہمی تعاون کی آپ نے قولی وعملی تعلیم فرمائی، چنانچہ قحط کے موقع پر اہل مکہ کے لئے پانچ سو اشرفیاں بطور تعاون ارسال فرمائی (المبسوط)۔

☆ اسی طرح مکہ کے خراب ہوتے ہوئے چمڑے کو اپنے پاس منگوایا اور بطور ہدیہ اہل مکہ کے لئے عجوہ کھجوریں بھیجیں (عہد نبوی میں نظام حکمرانی/۲۵۸)۔

☆ حضرت ثمامہ کو اہل مکہ کا غلہ بند کرنے سے منع فرمایا (فتح الباری ۸/۸۷)۔

☆ فتح مکہ کے موقع پر خون کے پیاسے دشمنوں کو معاف فرما کر رہتی دنیا تک کے لئے عفو ودرگذر کا درس دیا (سیرت مصطفی)۔

☆ نیز انسانیت کے لئے مفید کاموں میں آپ نے ہمیشہ تعاون فرمایا، چنانچہ حلف الفضول جو آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کا واقعۂ معاہدہ تھا، بعثت کے بعد آپ نے اس کے بارے میں یہ فرمایا: "**ما أحب أن لی بحلف حضرته بدار ابن جدعان حمر النعم و أنی أغدر به ھاشم وزھرۃ وتمیم تحالفوا أن یکونوا مع المظلوم مابل بحر صوفة ولو دعیت**

☆ استاذ مدرسہ ریاض العلوم گورینی، جونپور۔

به لأجبت"(طبقات ابن سعد ۱/ ۱۰۷) (یعنی میں جس حلف میں ابن جدعان کے گھر شریک ہوا تھا مجھے اس کی مخالفت کے بدلے میں سرخ اونٹ بھی پسند نہیں ہے بنو ہاشم، بنو زہرہ اور بنو تمیم نے اس بات کا حلفیہ معاہدہ کیا تھا کہ سمندر میں کسی اون کو تر کرنے کی صلاحیت تک وہ مظلوم کے ساتھ دیں گے، مجھے اس قسم کے معاہدے کی دعوت دی جائے گی تو میں اس کو ضرور قبول کروں گا)۔

مذکورہ بالا واقعات وروایات سے باہمی رواداری کے لئے بین مذہبی مذاکرات کا مستحسن ہونا معلوم ہوا اور دعوت وتبلیغ کے لئے بین مذہبی مذاکرات کا مستحسن ہونا "**ادع إلى سبيك ربك بالحكمة**" جیسی آیات وروایات سے ثابت ہوتا ہے اور افہام وتفہیم وازالۂ شکوک وشبہات کے لئے مذاکرات کا ثبوت "**وجادلهم بالتى هى أحسن**" اور "**ولا تجادلوا أهل الكتاب إلا بالتى هى أحسن**" جیسی آیات وروایات سے نیز نصارائے نجران کے وفد سے آپ ﷺ کا حضرت عیسی کی الوہیت کے سلسلہ میں تشفی بخش مذاکرہ وگفتگو کرنا (سیرت المصطفی ۳/ ۱۲۰۔۱۲۴) اور حضرت عبد اللہ بن عباس کا خوارج سے مذاکرہ وگفتگو کرنا (نسائی، باب خصائص علی)، اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیز کا خوارج کے وفد سے مذاکرہ کرنا، یہ سب افہام وتفہیم اور ازالۂ شکوک وشبہات کے لئے بین مذہبی مذاکرات کے مستحسن ہونے کی دلیل ہیں (نفحۃ العرب/ ۱۶۲)۔

حاصل یہ ہے کہ بین مذہبی مذاکرات شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ ہیں، خواہ دینی امور کسی افہام وتفہیم کے لئے یا دعوت وتبلیغ کے لئے کئے جائیں یا بھائی چارگی وآپسی اتحاد کو قائم کرنے کے لئے کئے جائیں، اختصار کے ساتھ ان کے دلائل کی جانب اشارہ کر دیا گیا ہے اور طوالت کے خوف سے روایات کے ذکر اور واقعات کی تفصیل کو ترک کر دیا گیا ہے۔

۲۔ بین مذہبی مذاکرات میں فریق مخالف کی تفہیم کے لئے ان کی کتب مذہبیہ سے استدلال واستفادہ فن مذاکرہ ومجادلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اصطلاح میں اس طرز استدلال کا نام مقاطع رکھا گیا ہے "**المقاطع هى المقدمات التى ينتهى إليها البحث من الضروريات والمقدمات المسلمات عند الخصم**" (تلخیصات عشر للتھانوی/ ۱۶)۔

اور کتاب وسنت میں بھی اس طریقہ استدلال سے مخاطب کی تفہیم کے لئے کام لیا گیا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت نے سورہ آل عمران آیت ۶۴ میں دعوت وتبلیغ کے اسی اسلوب کو اختیار کیا ہے۔

(۱) "**قل ياأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله**" (آل عمران: ۶۴)، اس آیت کی توضیح میں آسان تفسیر کے مصنف تحریر فرماتے ہیں: "اس سے دعوت حق کا اسلوب اور طریقہ معلوم ہوا کہ جب کسی قوم کو اسلام کی طرف بلایا جائے تو پہلے ان باتوں کی طرف بلایا جائے جو دونوں میں مشترک ہوں، تا کہ مفاہمت کی فضا میں دعوت کا آغاز ہو، یہاں یہود ونصاری کو قرآن نے پہلے توحید کی طرف بلایا ہے جو ان تینوں کتابوں کی مشترک تعلیم ہے" (آسان تفسیر ۱/ ۲۴۶)۔

(۲) "**وإذ قال عيسى بن مريم يابنى إسرائيل إنى رسول الله إليكم مصدقا لما بين يدى من التوراة ومبشرا برسول يأتى من بعدى اسمه أحمد**" (سورہ صف: ۶)۔

اس آیت میں بھی اسی اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے کہ جب تک کتب سابقہ سماویہ میں آپ کی بشارت نام کی صراحت کے ساتھ موجود ہے تو پھر اس کتب کے متبعین کے لئے آپ سے اعراض کی کوئی صورت اور وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔

(۳)"**ذرية من حملنا مع نوح إنه كان عبداً شكوراً**" (سورہ بنی اسرائیل: ۳)، اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے: "اس میں داعیانہ حکمت عملی کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جس کو دعوت دی جارہی ہے، اگر اس کے خاندان میں ایسے بزرگ گزرے ہوں جو دینی اعتبار سے ممتاز رہے ہوں تو ان کا بھی حوالہ دینا چاہئے، کیونکہ انسان کے سامنے جب اس کے گذشتہ بزرگوں کے حوالہ سے کوئی بات آتی ہے تو وہ اس کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے (آسان تفسیر ۱/۸۱۱)۔

(۴)"**ما أنزل الله على بشر من شئى**" کے جواب "**قل من أنزل الكتاب الذى جاء به موسى**" میں بھی اسی اسلوب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۵) یہود کو قرآن کریم کے حکم رجم کے قائل کرنے کے لئے ان سے تورات منگوا کر پڑھوانے والا واقعہ اور یہود کے آیت رجم کو چھپانے اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے اسکو ظاہر کر دینے والے قصہ میں بھی دعوت کے اسی اسلوب کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ فریق مخالف کو اسی کی مسلمہ کتاب سے ماننے پر مجبور کیا جائے (مشکوۃ/۳۰۹، حدیث:۳۵۵۹)۔

مذکورہ بالا آیات وروایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذاکرہ کے درمیان دوسرے مذاہب کی کتب کا حوالہ دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، بلکہ اسرع إلی القبول ہونے کی وجہ سے پسندیدہ طریقہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذاکرہ کرنے والے حضرات اگر اپنے مذہب کی پوری معلومات اور متاثر نہ ہونے کا پورا اطمینان رکھتے ہوں تو ان کے لئے دوسرے مذاہب کی کتب سے استفادہ کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے، اور جن حضرات کو اپنے مذہب کی پوری معلومات نہ ہوں یا متاثر ہونے کا احتمال ہو تو ان کے لئے دیگر مذہب کی کتب سے احتراز لازم ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

۳۔ اسلام دیگر مذاہب سے امتیاز کو چاہتا ہے، اسی لئے اسلام نے اذان، نماز، روزہ جیسی عبادات میں بھی دیگر مذاہب سے امتیاز کا خاص اہتمام رکھا، دیگر مذاہب سے ادنی مشابہت کو گوارہ نہیں کیا اور دیگر مذاہب سے تشبہ کو انتہائی مبغوض قرار دیا اور مشابہت اختیار کرنے والے کو اسی کا فرد قرار دیا گیا، اور "**من كثر سواد قوم فهو منهم**" سے ظاہری مشابہت پر بھی سخت نکیر کی گئی ہے، لہذا دیگر مذاہب کی کسی بھی مذہبی رسوم واعمال میں شرکت ناجائز وحرام ہے، لقولہ تعالی: "**تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**"، حضرت اقدس تھانویؒ اپنے ایک فتوی میں فرماتے ہیں: "چونکہ مبنیٰ اس درخواست کا ہنود کے مذہب کا احترام اور رعایت ہے، اور مسلمانوں کا اس کو قبول کرنا یا اعانت وتائید کرنا حرام قریب بکفر ہے اور جو شخص اس کے خلاف پر قادر ہو اس کو ایسے امر میں اتباع کرنا حرام اور قریب بکفر ہے" (امداد الفتاوی ۴/۲۶۸)۔

مذہبی رسوم میں شرکت اور اس کی تائید کے سلسلہ میں علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

"**والإعطاء باسم النيروز والمهرجان لايجوز الهدايا وإن قصد تعظيمه كما يعظمه المشركون يكفر،**

قال أبوحفص الکبیر :لو أن رجلاً عبد اللہ خمسین سنة ثم أھدی المشرک یوم النیروز بیضة یرید تعظیم الیوم فقد کفر وحبط عملہ ولو شری فیہ ما لم یشترہ قبل إن أراد تعظیمہ کفر, وإن أراد الأکل کالشرب والنعم لا یکفر ''(الدرالمختار ۱۰/۴۸۵-۴۸۶)۔

(غیر مسلمین کے تیوہار وغیرہ کی تعظیم کی وجہ سے ہدیہ وغیرہ دینا موجب کفر ہے، اگر کوئی پچاس سال تک عبادت کرے اور ایک غیر مسلم کی مذہبی رسوم کی تعظیم میں انڈا جیسی معمولی چیز دے کر شریک ہو تو اس کے تمام اعمال اور عبادات اکارت ہوگئیں الخ)۔ اور علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ غیر مسلمین کی مذہبی رسوم اور ان کے شعائر کے علاوہ دیگر رسومات میں بھی شرکت سے احتراز کرنا چاہئے (شامی ۱۰/۴۸۶ زکریا)۔

۴۔ دنیوی مصلحت ونفع کے لئے گناہ کرنا یا کسی فرض وواجب کو ترک کردینا جائز نہیں ہے، البتہ اگر کوئی کام شرعاً فرض اور واجب نہ ہو بلکہ صرف مباح یا مستحب ہے تو اس کو کسی دینی مصلحت مثلاً عوام کو فتنہ، یا معصیت، یا تکلیف سے بچانے کے لئے چھوڑ دینا جائز ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فتنہ کے اندیشہ کی بنا پر حطیم کو بیت المقدس میں داخل نہیں فرمایا، اور دروازہ کو نیچے نہیں لائے، اور نماز تراویح میں لوگوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے درود شریف کو مختصر کرنے اور دعا کو چھوڑ دینے کی اجازت حضرات فقہاء نے دی ہے (شامی ۳/۴۹۹ زکریا)۔

''**قال النبی ﷺ یا عائشة لو لا قومک حدیث عھدھم لنقضت الکعبة فجعلت لھا بابین باباً یدخل الناس وباباً یخرجون**'' (بخاری شریف حدیث:۱۲۶) (آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! اگر تیری قوم کے اسلام لانے کا زمانہ کفر کے قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ شریف کی عمارت کو توڑ کر اس کے دو دروازے بنا دیتا، ایک جس سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے جس سے لوگ باہر نکلتے)۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام کو عامۃ الناس کی بھلائی کا خیال رکھنا چاہئے، اگرچہ وہ غیر اولی ہو، لیکن حرام نہ ہو (فتح الباری ۱/۱۹۹)۔

ترک مباح کی شرط:

کسی مستحب، یا مباح کو مصلحۃً اسی وقت ترک کرنا جائز ہے، جبکہ اس مباح اور مستحب کے ساتھ اعتقاداً عملاً اور قانوناً حرام جیسا معاملہ نہ کیا جائے، لہٰذا اگر کسی مباح شرعی کو اعتقاداً حرام خیال کیا جائے، یا قانونی ممانعت کے ذریعہ بالکلیہ اس کو ترک کیا جائے، تو کسی مسلمان کے لئے اپنی رضا وخوشی سے ایسے قانون کی قولی یا عملی تائید کرنا حرام وناجائز ہے، کیونکہ حلت وحرمت ایک دینی معاملہ ہے، جس میں کسی انسان کی مداخلت جائز نہیں، یہاں تک کہ نبی پاک ﷺ کو بھی حلت وحرمت میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہے:

"یاأیھا النبی لم تحرم ما أحل اللہ لک" (سورہ تحریم: ۲)، "یا أیھا الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ما أحل اللہ لکم" (سورہ مائدہ: ۸۷)، "یاأیھاالناس کلوامما فی الأرض حلالا طیبا ولاتتبعوا خطوات الشیطان" (سورہ بقرہ: ۱۶۸)۔

شعائر اسلام و مسلمین کا حکم:

جو چیزیں شرعاً اسلام میں شمار ہوتی ہیں مثلاً اذان، نماز، ختنہ، داڑھی، ذبیحہ، ذبح بقر، وغیرہ اور جو امور عادیہ قومی علامت سمجھے جاتے ہوں، جن کے ترک سے قومی امتیاز ختم ہوجاتا ہو اور انسان دوسری قوم کا فرد معلوم ہونے لگے، قشقہ، زنار وغیرہ کو اختیار کرنے سے قومی امتیاز ختم ہوجاتا ہے، اسی طرح اہل اسلام کی لازمی بود وباش اور پوشاک جس کے چھوڑنے سے قومی امتیاز ختم ہوجائے، تو اس کا بھی حکم شعار کا ہوگا، کیونکہ شعار کے معنی علامت کے ہیں، لہذا جو چیزیں کسی قوم کی علامت بن جائیں وہ اس قوم کا شعار بن جائیں گی اور کسی بھی دینی وقومی شعار کا کسی بھی مصلحت سے ترک کرنا جائز نہیں، شعائر خواہ ثقافتی ہوں خواہ مذہبی ہوں یا عادی ان کی حفاظت بہرحال واجب ہے، جس کے دلائل ذیل میں ملاحظہ ہوں:

"یاأیھاالذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولاتتبعوا خطوات الشیطان إنہ لکم عدو مبین" (سورہ بقرہ: ۲۰۸)۔

تفسیر کبیر میں ہے:

"وکانوا یقولون ترک ھذہ الأشیاء (أی لحم الإبل) مباح فی الإسلام وواجب فی التوراۃ فنحن نترکھا احتیاطاً فکرہ اللہ تعالی، وذلک منھم وأمرھم أن یدخلوا فی السلم کافۃ أی فی شرائع الإسلام کافۃ ولایتمسکون بشیء من أحکام التوراۃ اعتقاداً لہ وعملاً بہ لأنھا صارت منسوخۃ" (تفسیر کبیر ۵/۲۰۷)۔

یعنی عبداللہ بن سلامؓ جب یہودیت سے تائب ہوکر اسلام میں داخل ہوئے تو وہ اونٹ کا گوشت اس وجہ سے تناول نہیں فرماتے تھے کہ تورات میں اس کی ممانعت آئی ہے اور اسلام میں صرف اس کی اباحت ہے، کھانا واجب ولازم نہیں ہے، اس لئے احتیاطاً اس کو ترک کردیا تھا تو آیت سابقہ نازل ہوئی، اور عبداللہ بن سلامؓ کو اونٹ کا گوشت ترک کرنے پر نکیر سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام اسلام کی حفاظت گرچہ وہ مباح ہو لازم ہے، کسی دوسرے کی رعایت میں ترک کرنا جائز نہیں، خصوصاً جب اس مباح فل سے قومی امتیاز پیدا ہوتا ہو، اور قومی امتیاز محفوظ رکھنے سے متعلق درج ذیل روایات بھی ملحوظ ہیں:

(۱) "عن عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ قال رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی ثوبین معصفرین فقال إن ھذا ثیاب الکفار فلا تلبسھا" (مسلم) (آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن عمرو کے بدن پر دو زعفرانی کپڑے دیکھے، تو آپ نے فرمایا کہ یہ کفار کے لباس ہیں لہذا ان کو مت پہنو)۔

(۲) "روی عن الحجاج ابن حسان قال دخلنا علی أنس بن مالک فحدثتنی أختی (المغیرۃ) قالت: وأنت یومئذ غلام ولک قرنان أو قصتان فمسح رأسک وبرک علیک وقال: احلقوا ھذین أو قصوھما فإن

هذا زی الیھود"(سنن ابی داؤد، کتاب الترجل ۴/ ۴۱۲)۔

(۳) **"عن علی رضی اللہ عنہ قال کانت بید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوس عربیة فرأی رجلاً بیده قوس فارسیة قال ماھذه؟ القھا وعلیکم بھذه وأشباھھا**"(رواہ ابن ماجہ)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ کے سر پر چوٹی دیکھی تو فرمایا کہ اس کو منڈا کردو، کیونکہ یہ یہودیوں کا طرز وطریقہ ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو پھینک دو، اس طرح کی چیزوں سے بچنا ضروری ہے۔

مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوا کہ قومی تشخصات وامتیازات کی حفاظت لازم وضروری ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اپنے تشخصات وامتیازات پر پابندی کی جائے اور غیروں کے تشخصات سے احتراز کیا جائے، قومی امتیازات کی حفاظت سے متعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایک تحریر سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے، جس سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ قومی امتیازات کی حفاظت کی بنا پر ہی قوم کا وجود باقی رہے گا، ورنہ زبان، رنگ، اعتقاد مذہب وغیرہ سب کے اختلاف کے باوجود دوسری قوم میں داخل ہوکر اپنی قومیت ختم کردے گا۔

ترک شعار کے نتائج:

حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں :

"جو قوم اور ملک اپنے یونیفارم کی محافظ نہیں رہی، وہ بہت جلد دوسری قوموں میں منجذب ہوگئی، حتی کہ اس کا نام ونشان تک بھی باقی نہ رہا، اسی ہندوستان میں یونانی آئے، سنتھین آئے، افغان آئے، آریہ آئے، تاتاری آئے، ترک آئے، مصری اور سوڈانی آئے، مگر مسلمانوں سے پہلے جو قومیں بھی آئیں آج ان میں سے کیا کوئی ملت یا قوم باقی ہے، کیا کسی کی بھی ہستی علاحدہ بتلائی جاسکتی ہے، سب کے سب ہندو قوم میں جذب ہوگئے، وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے اکثریت کے یونیفارم کو اختیار کرلیا، دھوتی، چوٹی، ساڑی، رسم ورواج وغیرہ میں انہی کے تابع ہوگئے، اس لئے انکی ہستی مٹ گئی باوجود اختلاف وعقائد کے سب کو ہندو قوم کہا جاتا ہے اور کسی کی قومی ہستی جس سے اس کی امتیازی شان ہو باقی نہیں، البتہ جن قوموں نے امتیازی یونیفارم کو قائم رکھا وہ آج اپنی قومیت اور ملیت کا تحفظ اور امتیاز رکھتے ہیں، فارسی قوم ہندوستان میں آئی، ہندو قوم اور راجاؤں نے ان کو ہضم کرنا چاہا، عورتوں کا یونیفارم بدلوادیا، معیشت اور زبان بدلوادی مگر مردوں کی ٹوپی نہ بدلی گئی، بالآخر آج وہ زندہ قوم اور موجود وممتاز ملت ہیں، سکھوں نے اپنی امتیازی وردی قائم کی، سر اور داڑھی کے بالوں کو محفوظ رکھا، آج ان کی قوم امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور زندہ قوم شمار کی جاتی ہے، مسلمان اس ملک میں آئے اور تقریباً ایک ہزار برس سے زائد ہوتا ہے کہ جب سے وہ آئے ہیں اگر وہ اپنے خصوصی یونیفارم کو محفوظ نہ رکھتے تو آج اسی طرح ہندو قوم میں نظر آتے جیسے کہ مسلمانوں سے پہلے آنے والی قومیں ہضم ہوکر اپنا نام ونشان مٹا گئیں، آج

بجز تاریخی صفحات کے ان کا نشان کرہ زمین پر نظر نہیں آتا، مسلمانوں نے نہ صرف یہی کیا کہ اپنا یونیفارم محفوظ رکھا بلکہ یہ بھی کیا کہ اکثریت کے یونیفارم کو مٹا کر اپنا یونیفارم پہنانا چاہا، چند ہزار تھے اور چند کروڑ بن گئے، صرف یہی نہیں کہ پاجامہ کرتا، عبا وقبا، عمامہ وستار محفوظ رکھا بلکہ اسماء رجال ونساء، تہذیب وکلچر، رسم ورواج، زبان وعمارت وغیرہ جملہ اشیاء کو محفوظ رکھا، اس لئے ان کی ہستی ایک مستقل ہستی ہندوستان میں قائم رہی اور جب تک اس کی مراعات رہیں گی رہیں گے، اور جب چھوڑیں گے مٹ جائیں گے'' (امدادالفتاوی ۴/ ۲۳۳)۔

حضرت اقدس مدنی کی چشم کشا تحریر اور تفصیل سابقہ سے یہ معلوم ہوگیا کہ اہل اسلام کے لئے اپنے مذہبی وقومی امتیازات کو باقی رکھنا واجب ہے، خواہ وہ زبان کی قبیل سے ہوں یا لباس وتعمیرات کی قبیل سے، کیونکہ یہ امتیازات ہی قومی اور مذہبی وجود کے بقا کا سبب ہوتے ہیں، اگر خدانخواستہ یہ امتیازات ختم ہوگئے تو تمہاری داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں، غیر قوموں سے قومی اور مذہبی امتیازات کے سلسلہ میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا ہے، البتہ مجبوری کے احکام الگ ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو چیزیں انسانی حقوق سے متعلق ہوتی ہیں، مثلاً مال، آبرو، جان، وغیرہ تو خوف اور فتنہ سے بچنے کے لئے ان کو ترک کی اجازت ہوتی ہے، لیکن جو چیزیں حقوق اللہ کی قبیل سے ہیں ان میں مصلحت کی بنا پر چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے، لہذا ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے اپنے حقوق مالی وعرضی کو چھوڑ دینا جائز ہے، لیکن قومی ومذہبی علامات وتشخصات وشعائر کا ان مصالح کی بنا پر چھوڑ دینا جائز نہیں ہے، اپنے مذہبی شعائر اور قومی امتیازات کی بقا کے لئے پوری کوشش کرنا زبانی اور عملی طور پر اس کی حفاظت کرنا اور اپنی رضا وخوشی سے اس سلسلہ میں کوئی مفاہمت نہ کرنا دینی اسلامی فریضہ اور قومی حمیت ودینی غیرت کا بھی تقاضا ہے اور اس میں کوتاہی لمحوں نے خطا کی صدیوں نے سزا پائی کا مصداق ہوگی۔

مذاہب باطلہ پر تنقید کے آداب:

۵۔(الف) مذاہب باطلہ پر تنقید، حسن نیت اور مخاطب کی خیر خواہی کے قصد وارادہ سے ہو، ریا ونمود، شہرت جیسی فاسد نیت سے تنقید جائز نہیں، **إنما الأعمال بالنیات**، ''**قال رسول اللہ ﷺ: من طلب العلم لیجاری به العلماء أو لیماری به السفهاء أو لیصرف به وجوه الناس إلیه أدخله الله النار**'' (ترمذی، ابن ماجہ) (جس نے علم دین اس لئے حاصل کیا تاکہ علماء سے مباحثہ کرے یا جاہلوں سے یا لوگوں کو اپنی طرف مائل کرے تو اللہ تعالی ایسے شخص کو جہنم میں داخل کرے گا)۔

(ب) اہانت آمیز ودل آزار قول وعمل سے احتراز لازم ہے، تنقید برائے توہین وتذلیل شرعاً جائز نہیں، کتاب وسنت میں اس کی ممانعت موجود ہے، ''**لا یسخر قوم من قوم**'' (حجرات)، ''**وجادلهم بالتي هي أحسن، هي أحسن طرق المجادلة من الرفق من غیر فظاظة ولا تعنیف**'' (البحر المحیط ۶/ ۶۱۳)۔

(علامہ ابوحیان نے بحر محیط میں فرمایا کہ عمدہ طریقہ یعنی سختی اور درشتی کے بجائے نرمی اور ملاطفت سے گفتگو کی جائے)۔

ہندیہ میں لکھا ہے:

"لو قال ليهودي أو مجوسي يا كافر يأثم إن شق عليه" (ہندیہ ۵/۳۴۸، الحظر والاباحہ) (اگر کسی نے مجوسی یا ہودی کو کافر کہہ کر مخاطب کیا اور اس کو اس سے تکلیف پہنچے تو خطاب کرنے والا گنہگار ہوگا)۔

(ج) مذاہب باطلہ کے حاملین کی تنقید و تذلیل پر صبر کرنا اور ان کی تنقید کا جواب بطریق احسن دینا بھی آداب مذاکرہ میں سے ہے، "وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاماً" (سورہ فرقان)۔

(د) ناگزیر حالت ہی میں تنقید کا پہلو اختیار کیا جائے، ورنہ عام حالات میں منفی پہلو کو ترک کر کے ایجابی پہلو اختیار کیا جائے، غیروں سے اسلام کے محاسن اور اس کی خوبیوں کو بیان کر کے متاثر کیا جائے، یہاں تک کہ کتاب وسنت میں موجود دعوت کے اسلوب کو اختیار کیا جائے۔

حاصل یہ کہ تنقید میں بھی اولاً نیت خیر خواہی کی ہو، تذلیل وتوہین مقصود نہ ہو، دوسرے یہ کہ گالی گلوج، طعن وتشنیع، اور دل آزار قول وعمل سے مکمل احتراز کرتے ہوئے، نرمی، سنجیدگی، عملی دلائل اور مسلم مقدمات کے ذریعہ گفتگو کی جائے، تیسرے اگر مخاطب سنجیدہ گفتگو سے بھی برہم ہو کر غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرے تو اس پر صبر کیا جائے اور فتنہ وفساد سے دوری اختیار کی جائے، چوتھے مثبت پہلو اختیار کیا جائے، حتی الامکان منفی پہلو سے احتراز کیا جائے، پانچویں ناگزیر حالت ہی میں تنقیدی پہلو اختیار کیا جائے، ورنہ عام حالات میں محاسن اسلام بیان کر کے متاثر کرنے کی کوشش کی جائے، اور کتاب وسنت میں موجود دعوت کے اسلوب کو اختیار کیا جائے، حضرت اقدس تھانوی فرماتے ہیں: "لأن الغرض إما أن يكون إظهاراً للصواب وإن لم يسكت الخصم فلا يتصدى لإسكاته، بل إذا رأى العناد فيه يقول لنا أعمالنا ولكم أعمالكم لاحجة بيننا وبينكم والله يجمع بيننا ... كما قال الله تعالى وإن جادلوك فقل الله أعلم بما تعملون" (بوادر النوادر ۴۶۸)۔

حاصل یہ کہ اگر مخاطب ہٹ دھرمی پر آجائے اور معقول بات بھی غیر معقول نظر آئے تو ایسے شخص سے مذاکرہ کا کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوتا ہے، اس لئے اس سے مذاکرہ گفتگو میں بے سود اور وقت کا ضیاع ہے۔

۶۔ نیکی اور بھلائی کاموں میں غیر مسلمین کے ساتھ تعاون اور اشتراک کا عمل نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، لہذا دیگر مذاہب والوں کے ساتھ سماجی برائیوں کے خاتمہ کے لئے مذاکرات اور معاہدات کرنا بھی افضل وبہتر ہوگا، کتاب وسنت سے ایسے معاہدات کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے، چنانچہ سورہ مائدہ کی آیت ۲ میں ہے:

(ا) "ولا يجرمنكم شنآن قوم أن صدوكم عن المسجد الحرام أن تعتدوا وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (مائدہ: ۲) (کسی قوم کے ساتھ تمہاری دشمنی کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو، نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی میں تعاون مت کرو)۔

B17

اس آیت میں غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کا حکم شامل ہے، اگر غیر مسلم کوئی ایسا منصوبہ پیش کریں جو عام انسانی فائدے کا ہو اور اس میں کوئی بات اسلامی شریعت اور مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف نہ ہو تو مسلمانوں کے لئے ایسے منصوبے میں شرکت بھی جائز بلکہ مستحسن ہے۔

(۲) اور خود حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ میں اس قسم کے تعاون اور اشتراک عمل کی نظریں موجود ہیں، جس میں سب سے نمایاں وہ معاہدہ ہے جو حلف الفضول کہلاتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حرب فجار کے بعد بعض طبیعتوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح زمانہ سابق میں قتل وغارت گری کے انسداد کے لئے فضل بن فضالہ، اور فضل بن وداعہ اور فضل بن حارث نے ایک معاہدہ مرتب کیا تھا جو انہیں کے نام پر حلف الفضول کے نام سے مشہوا ہوا، اسی طرح اب دوبارہ اس کی تجدید کی جائے، چنانچہ جب شوال میں حرب فجار کا سلسلہ ختم ہوا تو ذی قعدۃ اور الحرام میں حلف الفضول کا سلسلہ شروع ہوا، اور سب سے پہلے زبیر بن عبد المطلب اس معاہدہ اور حلف کے محرک ہوئے، اور بنو ہاشم اور بنو تمیم عبد اللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور عبد اللہ بن جدعان نے سب کے لئے کھانا تیار کروایا، اس وقت سب نے مظلوم کی حمایت ونصرت کا عہد کیا کہ مظلوم اپنا ہو یا پرایا، دیسی ہو یا پردیسی، حتی الوسع اس کی اعانت اور امداد کے لئے اس وقت سب نے اللہ تعالی کو گواہ بنا کر یہ عہد کیا:

”ليكونن يد ا واحدة مع المظلوم على الظالم حتى يؤدى إليه حقه ما بل بحر صوفة ومارسا حراء وتبير مكانهما وعلى التآسي في المعاش“ (جب تک سمندر میں اون کو تر کرنے کی صلاحیت ہے اور جب تک حراء اور ثبیر کے پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہیں یہ سب لوگ ظلم کے خلاف مظلوم کی مدد کے لئے اور معاش میں ایک دوسرے کی غمخواری کے لئے ایک ہاتھ کی طرح متحد رہیں گے)۔

اس کے بعد انہوں عاص بن وائل سے زبیدی شخص کا حق زبردستی دلوایا، حضور اکرم ﷺ اس معاہدہ کے وقت عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں حاضر تھے، اور آپ ﷺ نے اس معاہدہ کی تعریف کی اور ارشاد فرمایا:

”ما أحب أن لى بحلف حضرته بدار بن جدعان حمر النعم وإني أغدر به، هاشم وزهرة وتميم تحالفوا أن يكونوا مع المظلوم ما بل بحر صوفة ولو دعيت به لأجبت“ (طبقات ابن سعد ۱/۱۰۷)۔

(میں جس حلف میں بن جدعان کے گھر میں شریک ہوا تھا مجھے اس کی مخالفت کے بدلے میں سرخ اونٹ بھی پسند نہیں، بنو ہاشم اور بنو زہرہ بنو تمیم نے اس وقت اس بات کا حلفیہ معاہدہ کیا تھا کہ جب تک سمندر میں اون کے ٹکڑے کو تر کرنے کی صلاحیت ہے وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے، اگر اب بھی مجھے اس قسم کے معاہدہ کی دعوت دی جائے گی تو میں اسے ضرور قبول کروں گا)۔

علماء کرام نے اس معاہدہ کی بنیاد پر یہ اصول اخذ کیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون اور اشتراک عمل نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر آج بھی مجھے اس قسم کے کسی معاہدہ کے لئے بلایا جائے گا تو میں ضرور اس کو قبول کرلوں گا (اسلام اور سیاسی نظریات ۳۵۲)۔

خلاصہ: مشترک سماجی مسائل مثلاً غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں وغیرہ کی حق تلفی کے خلاف اتحاد کے لئے مذاکرہ کرنا، شرعاً افضل وبہتر ہے، "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان"۔

۷۔ اسلام مخالف جماعت سے مذاکرات کے جواز وعدم جواز کا مدار مصالح مسلمین پر ہے، اگر مذاکرات میں اہل اسلام کی مصلحت مضمر ہو تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ بہتر ہی ہے، جیسا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود مدینہ سے مذاکرات کے بعد ۴۷ دفعات پر مشتمل ایک معاہدہ فرمایا تھا اور حدیبیہ میں کفار مکہ سے مذاکرات کے ذریعہ ایک معاہدہ کیا گیا تھا، لیکن اگر اسلام مخالف جماعت سے مذاکرات میں اہل اسلام کا نقصان ہو اور مذاکرات میں مصالح مسلمین فوت ہوتے ہوں تو ان سے مذاکرات کی اجازت نہیں۔

"عن عائشة رضی اللہ عنہا أن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خرج إلى بدر حتى إذا كان بحرة الوبر لحقه رجل من المشركين يذكر منه جراة ونجدة فقال له النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تؤمن بالله ورسوله قال لا، قال: ارجع فلن أستعين بمشرك" (ترمذی ۲۲۶/۵)۔

(غزوہ بدر کے موقع پر حرۃ الوبر میں ایک مشرک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا جس کی جرأت وشجاعت مشہور تھی، اس نے آپ کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہو، اس نے کہا نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوٹ جاؤ، میں کسی مشرک سے مدد نہیں لوں گا)۔

حضرت اقدس تھانوی فرماتے ہیں کہ غیر مسلم سے مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی (جو مذاکرات کے لئے لازمی شرط ہوتی ہے) تین حالتوں میں درست ہے، (۱) دفع ضرر کے واسطے، (۲) غیر مسلم کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے، (۳) اکرام ضیف کے لئے، "إلا أن تتقوا منهم تقاة" میں دفع ضرر کا استثناء ہے، اور توقع ہدایت کے لئے مدارات کا بیان اس حدیث میں ہے جس میں بنو ثقیف کو مسجد میں ٹھہرانے کا ذکر ہے، لیکن کسی ذاتی نفع ومصلحت کے لئے غیر مسلم سے مدارات درست نہیں، خصوصاً جبکہ دینی ضرر کا خوف ہو تو بدرجہ اولی یہ اختلاط حرام ہوگا (بیان القرآن ۱۰۸/۱ آل عمران)۔

حاصل: مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ غیر مسلمین سے (خصوصاً جبکہ ایذاء مسلم ان کا شیوہ ہو) مذاکرات کرنا قومی دینی مصالح کی بنا پر جائز ہیں، لیکن ذاتی اغراض ومقاصد کے لئے ان سے راہ ورسم انتہائی بے غیرتی وبے حسی کی دلیل ہے۔

بے پردہ خواتین والی مجلس میں شرکت:

۸۔ بین مذہبی مذاکرات کے موقع پر مجلس مذاکرہ میں بے پردہ خواتین کے ہونے کی صورت میں حکم شریعت یہ ہے کہ اگر واقعتاً بین مذہبی مذاکرات کی ضرورت وحاجت ہو تو علماء، صلحاء اور مقتداء حضرات ایسی مجلس مذاکرہ سے کنارہ کش رہیں، اس فن کے دیگر ماہر مسلمان شریک ہوں اور بقدر ممکن غض بصر وحفاظت نظر سے کام لیں، لیکن اگر کسی خاص حالت میں اہل علم مقتدا حضرات کی شرکت ناگزیر ہو جائے تو ان کے لئے بھی حفاظت نظر وغض بصر کے ساتھ شریک ہونا جائز ہے، لیکن میڈیا کی زینت بننے سے بچنا

بہر حال واجب ہے۔

حضرات فقہاء کی تصریحات کا حاصل یہ ہے کہ طاعت وعبادت کی ایسی مجالس جس میں معصیت بھی ہو، اگر معصیت کو ختم کرنے کی قدرت ہو تو اس کو ختم کردینا لازم ہے، اور اگر اس کی قدرت نہ ہو تو اگر وہ عبادت دوسرے لوگوں کے ذریعہ انجام پذیر ہو جائے تو مقتدا کی شرکت منع ہے، لیکن اگر وہ عبادت اپنی انجام دہی میں علماء ومقتدا کی محتاج ہو تو معصیت سے علاحدہ ہو کر اس میں شریک ہونا جائز ہے اور معصیت سے اختلاط بہر حال جائز نہیں ہے (روح المعانی ۷/ ۲۵۲، بدائع ۲/ ۴۶)۔

حضرات فقہاء کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ بین مذہبی مذاکرہ جو دعوت تبلیغ، افہام وتفہیم کے لئے منعقد کیا جائے اور نظام مذاکرہ کے مفید ہونے کے بھی آثار ہوں تو چونکہ یہ مجلس عبادت کی مجلس ہوگی، اور اس میں بے پردہ خواتین کی شرکت کو روکنے کی جب قدرت نہ ہو تو صلحاء ومقتداء کی شرکت منع ہوگی، اور دیگر اہل اسلام کی شرکت غض بصر کے ساتھ جائز ہوگی، اور مجبوری کی صورت میں صلحاء ومقتداء کی شرکت بھی جائز ہوگی، اور کھیل وتفریح کے لئے منعقد کئے جانے والی مجالس مذاکرہ میں شرکت جائز نہ ہوگی۔

مختلف ثقافتوں کے مابین مذاکرات — اصول وآداب

مولانا محمد قمر الزماں ندوی ☆

تمہید:

یہ حقیقت ہے کہ آج پوری دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں سمٹ گئی ہے، دنیا کی مسافت اور فاصلہ کم ہو گیا ہے، اور دوری نزدیکی میں بدل گئی ہے، جدید سائنسی ترقیات نے پوری دنیا کی خبروں کو منٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچانے کی سہولت پیدا کردی ہے ان سب کے پیچھے اس ذات باری تعالیٰ کا ہاتھ اور فضل خداوندی ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ ذات بدیع السماوات والأرض ہے، فعال لما یرید ہے، اس نے انسان کو زمانے کے تقاضے اور حالات کے مطابق عقل وحکمت اور شعور ووجدان کی دولت سے نوازا ہے، اور "وعلم آدم الأسماء کلها" کہہ کر سائنس وٹکنالوجی کے دروازے کو انسانوں کے لئے وا کر دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا لوگوں کی واقفیت دنیا اور اس کی آبادی کے بارے میں محدود تھی، زیادہ سے زیادہ انسان اپنے اطراف واکناف، ملک اور پڑوسی ملک کے بارے میں واقفیت رکھتا تھا، مشترکہ آبادی کا تصور بہت کم تھا، لیکن موجودہ دور میں مختلف سماجی اور سیاسی عوامل کے نتیجے میں مشترک سماج اور معاشرہ وجود میں آرہے ہیں، دنیا کے اکثر ملکوں میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی ملی جلی آبادیاں پائی جاتی ہیں، بلکہ ایک سروے کے مطابق دنیا کی نصف آبادی مسلم غیر مسلم اکثریت ممالک میں آباد اور رہائش پذیر ہیں، اور خود ملک ہندوستان میں انڈونیشیا کو چھوڑ کر مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد آباد ہے۔

امت محمدیہ کی دعوت عالمی دعوت ہے:

چونکہ مذہب اسلام نے مسلمانوں کو اس کا مکلف بنایا ہے کہ وہ دعوت توحید کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچائیں اور رسالت اور ختم رسالت کے مقام اور اس کے مفہوم سے سارے انسانوں کو روشناس کرائیں، کیونکہ سارے انسان ایک ہی مرد (آدمؑ) اور عورت (حوّاؑ) سے اس دنیائے آب وگل میں وجود پذیر ہوئے ہیں، اور آخری نبی ﷺ عالمی نبی اور رسول ہیں اور ان کی دعوت عالمی اور انٹرنیشنل ہے اس لئے دنیا کے بسنے والے تمام لوگوں تک یہ صدائے حق پہنچے اور اس سلسلہ میں مذہبی مذاکرات کی ضرورت پڑے تو اس میں بھی ایمان والوں کو پیش پیش رہنا چاہئے، "یا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا

☆ مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپ گڑھ یوپی، جنرل سکریٹری مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی جھارکھنڈ۔

نشرک بہ شیئاً‘‘اس کا صرف جواز ہی نہیں فراہم کرتا؛ بلکہ اس کا حکم دیتا ہے؛ تا کہ اللہ تعالی کی وحدانیت پوری دنیا میں عام ہو اور جام توحید سے تمام نوع بشری سرشار ہو۔

عصر حاضر میں مذہبی مذاکرات کی ضرورت:

عصر حاضر میں آبادیوں کے اختلاط اور تعلقات کی وسعت اور ہمہ گیری کی وجہ سے بین الاقوامی مذہبی مذاکرات کی ضررت بڑھ گئی ہے، ان مذاکرات کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس طرح دوسروں کو سمجھنے اور خود اپنے آپ کو سمجھانے، غلط فہمیوں کو دور کرنے امن وامان کو قائم رکھنے، باہمی اختلافات کو دور کرنے، شدت پسندی کو روکنے اور بقائے باہم کے اصول پر رواداری اور ایک دوسرے کے ساتھ احترام کے ساتھ رہنے میں مدد ملتی ہے، دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانے کے نبی اور رسول نے اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ حوار یعنی مذہبی مذاکرات کیا اور حکمت ودانائی کے ساتھ اپنی دعوت کو ان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جس کی مختصر تفصیلات آگے پیش کی جارہی ہے:

بین مذہبی مذاکرات کتاب وسنت کی روشنی میں:

قرآن مجید اور دیگر الہامی کتابوں میں انبیاء کے واقعات اور ان نبیوں اور رسولوں کا اپنی اپنی قوموں سے تخاطب وخطاب اور تبادلہ خیال پر اگر غور کیا جائے تو وہ مذہبی مذاکرات کے بہترین نمونے ہیں، مذہبی مذاکرات کو مذہبی مناظرہ کا نام بھی دیا جاسکتا ہے، قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وقت کے بادشاہ نمرود (جو اپنے کو خدا سمجھتا تھا) سے زبردست مناظرہ کیا (البقرہ:۲۵۸)۔

اسی حضرت موسیٰ اور فرعون کے مذاکرے اور مناظرے (الشعراء: ۲۳۔۳۳)۔

جہاں تک مذہبی مذاکراہ کا ثبوت احادیث سے ہے تو اس سلسلہ میں متعدد احادیث ہیں جن سے مذہبی مذاکرہ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے اس سلسلہ میں صرف ایک حدیث پیش کی جارہی ہے جس کے راوی محمد بن اسحاق ہیں۔

قریش کے سرداروں میں سے ایک عتبہ بن ربیعہ ایک روز قریش کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، اور آنحضرت ﷺ بھی تنے تنہا حرم میں تشریف فرما تھے، عتبہ نے کہا کہ اے گروہ قریش! میں اٹھ کر محمد ﷺ سے گفتگو کیوں نہ کروں، اور ان کے سامنے بعض ایسی باتیں کیوں نہ پیش کروں جن میں سے کچھ نہ کچھ وہ قبول کرلے اور وہ ان میں سے جو رعایتیں چاہے ہم اسے دے دیں اور وہ ہم سے باز رہے تو قریش کے لوگوں نے کہا کیوں نہیں! اے ابولید اٹھ اور رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کر، عتبہ اٹھا اور آپ ﷺ کی طرف چلا اور آپ کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور کہا:

بھتیجے! تمہیں معلوم ہے کہ تم ہماری نظروں میں باعتبار خاندان بڑے رتبے والے ہو اور نسب کے لحاظ سے بھی اعلی ہو، تم اپنی قوم کے پاس بڑی اہمیت رکھنے والا مسئلہ لائے ہو، جس کے ذریعہ سے تم نے اس کی جماعت کو تتر بتر کردیا ہے، ان کے

عقلمندوں کو بیوقوف بنا دیا ہے، ان کے معبودوں اور دین کو عیب دار بنا دیا اور کردیا ہے اور ان کے اگلے بزرگوں کو کافر قرار دیا ہے، میری گفتگو سنو! میں چند باتیں تمہارے غور کے لئے پیش کرتا، شاید تم ان میں سے کچھ قبول کرلو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **قل یا أبا الولید أسمع** (اے ابوالولید کہو میں سنتا ہوں) اس نے کہا اگر تم اس مسئلہ کے ذریعہ سے جسے تم لائے ہو، صرف مال چاہتے ہو تو ہم تمہارے لئے اس قدر مال جمع کردیں گے کہ تم ہم سب میں سب سے زیادہ مالدار ہوجاؤ، اگر تم اس کے ذریعہ اعلی مرتبہ چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنالیں گے کہ کوئی بات تمہارے بغیر قطعی نہ ہو، اگر تم اس کے ذریعہ حکومت چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنالیتے ہیں، یہ جو تمہارے پاس آتا ہے اگر کوئی جن اور موکل جسے تم دیکھتے ہو اور اپنے پاس سے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تو ہم تمہارے لئے جھاڑ پھونک کا انتظام کریں گے، اور ہم مال خرچ کرکے اس سے تمہیں نجات دلائیں گے، کیونکہ بعض اوقات تابع (موکل اور جن) آدمی پر غلبہ حاصل کرلیتا ہے تو اس کا علاج معالجہ کے بغیر نہیں جاتا، یہی الفاظ یا اس قسم کے الفاظ اس نے آپ ﷺ سے کہے۔

آپ ﷺ اس کی گفتگو سنتے رہے اور جب عتبہ اپنی گفتگو ختم کرچکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوالولید! تجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا؟ کہا ہاں، فرمایا: اب مجھ سے سن، بولا سنائیے، رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کا یہ ٹکڑا پڑھا: "**بسم الله الرحمن الرحیم: حم تنزیل من الرحمن الرحیم کتاب فصلت آیاته قرآنا عربیا لقوم یعقلون بشیراً ونذیرا فأعرض أکثرهم فهم لا یسمعون وقالوا قلوبنا في أکنة مما تدعونا إلیه**" (سورہ فصلت: ۱-۵)۔

پھر رسول اللہ ﷺ اسی سورت کو اس سے آگے پڑھتے چلے گئے، عتبہ خاموش سنتا رہا، ہاتھ پیچھے رکھ لیے اور ان سے سہارا لیے ہوئے تھا، اس کے بعد رسول سجدہ تک پہنچے تو سجدہ کیا پھر فرمایا: "**قد سمعت یا أبا الولید ما سمعت فأنت وذاک**"۔

پھر جب عتبہ واپس قریش کے پاس لوٹا تو قریش نے خیریت پوچھی تو عتبہ نے جواب دیا: خدا کی قسم! جانے کی کیفیت کچھ تھی اور آنے کی کیفیت اس کے برعکس ہے، ایسی گفتگو میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنی، وہ نہ شعر ہے، نہ جادو اور نہ کہانت، قریش نے جب یہ سنا تو ان پر سناٹا طاری ہوگیا اور کہا واللہ اس نے تم پر اپنی زبان کا جادو کردیا (ملخص سیرت ابن ہشام ۱۶/۱، ۳۱۴)۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے وفود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مذاکرہ کیا اور پھر حلقہ بگوش اسلام ہوئے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

مذہبی مذاکرہ کا مقصد:

(۱) مذہبی مذاکرہ کا مقصد اور اولین مقصد غیر مسلموں پر دعوت ایمان پیش کرنا۔

(۲) مذہبی مذاکرات کا دوسرا اہم مقصد مشرکین کفار اور اہل کتاب کی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔

(۳) مذہبی مذاکرہ کا تیسرا مقصد باہمی دشمنی، نفرت اور عداوت کے جذبات کو ختم کرنا اور کرانا۔

مذہبی مذاکرات کرنے والے کے لئے مطلوبہ اوصاف:

یہ حقیقت ہے کہ مذہبی مذاکرات کا فائدہ اسی وقت ظاہر ہوگا اور یہ مذاکرات اسی وقت نفع بخش ہوسکتے ہیں، جب مذاکرہ کرنے والے ان مطلوبہ اوصاف کے حاصل ہوں گے۔

(۱) مذہبی مذاکرہ کرنے والے کے لئے سب پہلی اور ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اخلاق وکردار اعلی صفات کے حامل ہوں، اور ان کا طرز گفتگو بہتر اور دلکش ہو، مشہور محاورہ ہے: ''زبان شیریں ملک گیری''، ''**قولوا للناس حسنا**'' (البقرہ: ۸۳)، ''**وجادلهم بالتی هی أحسن**'' (النحل: ۱۲۵)۔

(۲) مذہبی مذاکرہ کرنے والے کی دوسری خوبی اور وصف یہ ہونا چاہئے کہ ان کو فریق مخالف کے ساتھ عام زندگی اور عام سلوک کے اعتبار سے بھی خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہئے، اس سلسلہ میں انبیاء کرام اور خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہم سب کے لئے بہترین نمونہ موجود ہے۔

(۳) مذہبی مذاکرہ کی کامیابی کے لئے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ فریق مخالف کے ساتھ عدل وانصاف کا رویہ اختیار کیا جائے اور اس میں جوخوبیاں اور اچھائیاں ہوں ان کا کھل کر اعتراف کیا جائے اور اس میں بخل سے کام نہ لیا جائے۔

قرآن مجید میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے: ''**ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ألا تعدلوا اعدلوا هو أقرب للتقوی**'' (المائدہ: ۸)۔

(۴) مذہبی مذاکرہ کی کامیابی کے لئے ایک نہایت ہی اہم وصف اور خوبی صبر اور بردباری بھی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: ''**خذ العفو وأمر بالمعروف وأعرض عن الجاهلین**'' (الاعراف: ۱۹۹) (آپ درگذر کو اختیار کریں، نیک کام کی تعلیم دیں اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہوجائیں)۔

سورہ فصلت آیت (۳۴-۳۵) میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ''اور یہ بات انہیں کونصیب ہوتی ہے جو صبر کریں اور اسے سوائے بڑے نصیبے والوں کے کوئی نہیں پاسکتا اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آئے تو اللہ سے پناہ طلب کرو یقینا وہ بہت ہی سننے والا ہے''۔

(۵) مذہبی مذاکرہ کرنے والے کے لئے ایک ضروری چیز یہ بھی ہے کہ وہ مخاطب کی زبان اور اس کے محاورے سے بھی واقف ہو، قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ''**وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه**'' (ابراہیم: ۴) (ہم نے ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے)۔

مذہبی مذاکرہ کا موضوع:

مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان مذہبی، سماجی اور سیاسی امور پر گفتگو ہوسکتی ہے، اور ان موضوعات پر مذاکرہ کیا

جاسکتا ہے، البتہ یہاں یہ بات یادرہے کہ مذہبی موضوعات پر یا سماجی موضوعات پر نیز سیاسی موضوعات پر جوبھی گفتگو ہوگی وہ نصوص شرعیہ کی روشنی میں ہوگی، "إن الدین عند الله الإسلام"، "ومن یبتغ غیر الإسلام دینا فلن یقبل منه"، اور "یاأهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا الله ولا نشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضاً أرباباً من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون"، مذہبی مذاکرہ کرنے والوں کے لیے یہ آیات مکمل گائڈ لائن ہیں، ان آیات کو پیش نظر رکھ کر ہی مذہبی مذاکرہ کی گنجائش ایک ایمان والے کو مل سکتی ہے، مذہبی مذاکرہ انجام دینے والے مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ ان کا عقیدہ وحدت دین کا ہو نہ کہ وحدت ادیان کا، کیونکہ وحدت ادیان کا نظریہ اور فکر سراسر کفر اور باطل ہے، اگر کوئی مسلمان اس عقیدہ کا حامل ہوگا تو اس کے کافر اور مشرک ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

بعض روشن خیال علماء اور جدید مفسرین کو قرآن کی یہ آیت کریمہ "إن الذین آمنوا والذین هادوا والنصاری والصابئین من آمن بالله والیوم الآخر وعمل صالحا فلهم أجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون" کو سمجھنے میں بڑی غلطی ہوئی ہے اور اس سے انہوں نے "وحدت ادیان" کا فلسفہ کشید کرنے کی مذموم سعی کی ہے۔ یعنی رسالت محمدیہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، بلکہ جوبھی جس دین کو مانتا ہے اور اس کے مطابق ایمان رکھتا اور اچھے عمل کرتا ہے، اس کی نجات ہوجائے گی، یہ فلسفہ سخت گمراہ کن ہے۔

جمہور مفسرین نے اس آیت کا صحیح مطلب اور مفہوم کو واضح کردیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالی کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا متلاشی ہوگا وہ ہرگز مقبول نہ ہوگا اور احادیث مبارکہ میں بھی نبی کریم ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ اب میری رسالت پر ایمان لائے بغیر کسی شخص کی نجات نہیں ہوسکتی، ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میری اس امت میں جوشخص بھی میری بابت سن لے، وہ یہودی ہو یا عیسائی پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں جائے گا"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وحدت ادیان کی گمراہی، جہاں دیگر آیات قرآنی کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے، وہاں احادیث سے بغیر قرآن کو سمجھنے کی مذموم سعی کا بھی اس میں بہت دخل ہے، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ احادیث کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

مذہبی مذاکرہ کے لیے چند شرطیں:

(۱) حوار اور مذاکرہ کی بنیاد وحدت ادیان جیسے باطل اور کفریہ نظریہ پر نہ ہو۔

(۲) اور نہ اس پر ہو کہ سارے مذاہب میں کچھ نہ کچھ خرابیاں اور اچھائیاں ہیں، اس لیے (نعوذ باللہ) جس مذہب میں جو چیزیں اچھی ہیں اس کو قبول کرلیا جائے اور اسلام مذہب کو بھی ان منسوخ اور باطل مذہب کے مساوی قرار دے دیا جائے، جبکہ اللہ تعالی نے اعلان فرمادیا ہے: "الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دینا"۔

(۳) مذاکرہ کا موضوع اور قرارداد یہ نہ ہو کہ قرآن اور دیگر الہامی کتابوں کو ایک ساتھ دودفتی کے درمیان شائع کیا جائے اور نہ ہی یہ موضوع ہو کہ مسجد اور گرجا گھر کو ملا کر تعمیر کیا جائے اور ہر مذہب والے دوسرے مذہب والوں کی عبادت گاہوں میں عبادت کریں کیونکہ یہ ساری چیزیں ناجائز اور شرع کے خلاف ہیں۔

(۴) اجتماعی طور پر کسی عبادت کی ادائیگی کا مسئلہ مذاکرہ کا عنوان نہ ہو، کہ سب مل کر کسی عبادت کو انجام دیں تا کہ آپسی دوریاں ختم ہوں اور محبت والفت پیدا ہو، کیونکہ قطعاً اس کی گنجائش ہو ہی نہیں ہوسکتی۔ مکہ جیسے سخت حالات میں "قل یا أیھا الکافرون لا أعبد ما تعبدون الخ" جیسی آیات کا نازل ہونا صاف ظاہر کررہا ہے کہ اسلام کا کفر کے ساتھ سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔

(۵) مذاکرہ کرنے والے مسلمان کے ذہن میں یہ بات اور عقیدہ سوفیصد پیوست ہو کہ حق اور آخرت کی نجات صرف اور صرف اسلام میں ہے۔

(۶) مذہبی مذاکرہ کرنے والے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ مخاطب کو باور کرائے کہ اسلامی احکام سوفیصد حق اور سچ ہیں اوراس کے دلائل یہ ہیں، لہذا مذاکرہ کا عنوان یہ نہ ہو کہ دیگر اہل مذاہب کے رسوم واعمال اور فیصلے کو اپنانے کی حوصلہ افزائی ہو، کیونکہ قرآن صاف کہتا ہے :"ومن یبتغ غیر الإسلام دینا فلن یقبل منه"، "ومن یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الفاسقون"، "ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الظالمون"، "ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الکافرون"، "إن الحکم إلا لله"، "إن الدین عند الله الإسلام"۔

الغرض خواہ مذاکرہ کا موضوع مذہبی ہو یا سماجی اور سیاسی اسلام کی پاک اور واضح تعلیمات کی روشنی میں مذاکرہ ہوگا، دیگر مذاہب کو منسوخ اور باطل قرار دینا اور اسلام کو آخری مذہب کا اقرار کرانا ہر مومن کی ذمہ داری ہے۔

مذہبی مذاکرہ کی ابتداء اور آغاز مسلمانوں کی طرف ہو:

مذہبی مذاکرات کی شروعات اور آغاز مسلمانوں کی طرف سے ہونی چاہئے، کیونکہ یہ عالمی امت ہے اور اس امت کی دعوت عالمی ہے اور اس امت کو مکلف بنایا گیا ہے کہ وہ عام طور پر کفار ومشرکین کو اور خاص طور پر اہل کتاب کو اسلام کی دعوت پہنچائیں اور یہ دعوت حکمت وموعظت اور مجادلہ حسنہ سے متصف ہو اور اسلام سے نیچے اتر کر اور اسلامی احکام سے ہٹ کر یہ دعوت نہ ہو، قرآن مجید نے اس کی کھل کر وضاحت کردی ہے، "یاأھل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم أن لا نعبد إلا الله ولانشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله " الخ۔ اس آیت سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ حوار اور مذاکرہ کی پیش کش مسلمانوں کی طرف سے ہو، البتہ اگر کفار اور اہل کتاب کی طرف سے مذاکرہ اور حوار کی پیش کش ہو اور ایمان والوں کو امید ہو کہ تذکیر وموعظت سے ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہوجائیں گے، کیونکہ ان کے اندر طلب ہے تو ایسے مذاکرہ میں شرکت اور حصہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور اگر مذاکرہ غیروں کی طرف سے ہو اور اندیشہ اور خطرہ ہو کہ وہ اس بہانے عیسائیت کی تبلیغ کریں گے اور اس کو ماننے کے لیے ماحول بنائیں گے یا اسلام اور مذہب اسلام کے احکام وقوانین کو تضحیک کریں گے اور اس میں شکوک وشبہات پیدا کریں گے تو پھر اس طرح کے حوار اور مذاکرہ میں مسلمانوں کا شرکت کرنا از روئے شرع درست نہیں ہوگا۔

البتہ باہمی امن وسلامتی اور خوشگوار تعلقات کے قیام کے لیے اور غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے مذاکرہ کرنا جن میں کسی کے اعتقادات ونظریات سے چھیڑ چھاڑ نہ ہو، اس کے لیے مختلف مذاہب کا باہم مذاکرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، خاص طور پر ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ایسے مذاکرہ میں ضرور شرکت کریں اور تبادلہ خیال کریں۔

مذہبی مذاکرات میں دیگر مذاہب کے کتابوں کا حوالہ:

مذہبی مذاکرات کے درمیان دیگر مذاہب کے کتابوں کا حوالہ صرف ان مسائل اور تعلیمات میں دیا جاسکتا ہے جو تعلیمات تمام مذاہب میں مشترک ہوں اور وہ قرآن کی تعلیمات کی مزید تائید کے لیے ہو، قرآنی تعلیمات سے ہٹ کر نہ ہو مثلاً تورات، انجیل اور وید میں آنحضرت ﷺ کے آخری نبی ہونے اور قرآن کا آخری الہامی کتاب ہونے، مذہب اسلام کا آخری مذہب ہونا ثابت ہے، لہذا آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے اور قرآن مجید کا آخری آسمانی کتاب ہونے اور اسلام کا آخری مذہب ہونے کو بتانے کے لئے قرآن کے دلائل کے ساتھ ان آسمانی کتابوں سے (جو محرف اور مبدّل ہونے کے باوجود جس میں بہت مسلمہ حقائق آج بھی موجود ہیں) حوالہ دیا جاسکتا ہے، اعلی انسانی خوبیاں جو ان کتاب میں مشترک ہیں ان کو بھی تحریر وتقریر میں نقل کیا جاسکتا ہے، توحید ورسالت اور عقیدہ آخرت کے اثبات کے لئے بھی ان کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ حوالے اسلامی تعلیمات اور عقائد سے متصادم نہ ہوں۔

قرآن مجید کا ایک مصدر، آسمانی کتاب اور یہود ونصاری:

عہد صحابہ میں تفسیر قرآن کا چوتھا مصدر و مآخذ یہود ونصاری تھے، یہ اس لئے کہ قرآن کریم بعض مسائل میں عموماً اور قصص انبیاء واقوام سابقہ کے کوائف واحوال میں خصوصا تورات کے ساتھ ہم آہنگ ہے، اس طرح قرآن کریم کے بعض بیانات انجیل سے بھی ملتے ہیں، مثلاً حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا واقعہ اور ان کے معجزات وغیرہ۔

البتہ قرآن کریم نے جو طرز ومنہاج اختیار کیا ہے وہ تورات وانجیل کے اسلوب بیان سے بڑی حد تک مختلف ہے، قرآن کریم کسی واقعہ کی جزئیات وتفصیلات بیان نہیں کرتا، بلکہ واقعہ کے صرف اس جزو پر اکتفا کرتا ہے جو عبرت وموعظت کے نقطہ خیال سے ضروری ہوتا ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ تفصیلی واقعہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بعض صحابہ ان واقعات کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے نومسلم اہل کتاب، مثلاً عبداللہ بن سلام، کعب الاحبار اور دیگر علماء یہود ونصاری کی جانب رجوع کرنے لگے، مگر اہل کتاب کی جانب رجوع ایسے امور وواقعات کے بارے میں کیا جاتا تھا، جس کے سلسلہ میں صحابہؓ نے

آنحضور ﷺ سے کچھ نہیں سنا ہوتا تھا، اس لئے کہ جو چیز آپ ﷺ سے ثابت اور منقول ہوتی تھی، اس کے ضمن میں صحابہ کسی دوسرے کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے، خواہ وہ کسی درجہ کا بھی انسان ہو، اس میں شک نہیں کہ تفسیر قرآن کا یہ مصدر چہارم سابقہ مصادر ((۱) قرآن کریم، (۲) نبی کریم ﷺ، (۳) اجتہاد) سہ گانہ کے مقابلے میں بہت کم اہمیت کا حامل ہے، اس لیے کہ تورات وانجیل میں تحریف ہوچکی ہے، یہ فطری بات تھی کہ اہل اسلام اپنے دین کی حفاظت کرتے اور کتاب الٰہی کو ان محرف کتب کے اثرات سے بچاتے، اس لئے صحابہ کرام اہل کتاب سے وہی بات اخذ کرتے تھے، جو ان کے عقیدے سے ہم آہنگ ہو اور قرآن پاک سے متصادم نہ ہو، اس کے خلاف جو بات ہوتی وہ اسے مسترد کردیا کرتے تھے، بعض باتیں ایسی ہوتیں جو نہ تو قرآن کے موافق ہوتیں اور نہ مخالف، ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا، نہ تصدیق کی جاتی اور نہ ہی اسے جھٹلایا جاتا، سرور کائنات آنحضرت ﷺ کا حکم بھی ایسے امور میں یہی تھا کہ نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب (تاریخ تفسیر ومفسرین ر ۶۲ ـ ۶۳)۔

دیگر مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں شرکت کا حکم:

باہمی مذاکرات اور خوش گوار تعلقات نیز مذہبی تشدد اور منافرت کو دور کرنے کی غرض سے بھی دیگر اہل مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کرنا ازروئے شرع جائز نہ ہوگا، البتہ وہ مسلمان جو پولس اور انتظامیہ میں ہیں اگر مذہبی تہوار کے موقع پر ان کی تعیناتی ہوتی ہے اور ان مواقع پر ان کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے تو پھر مجبوری کی صورت میں ان حضرات کے لئے ان خدمات کا انجام دینا اور حفاظت اور نگرانی کرنا جائز ہوگا، البتہ یہ یاد رہے کہ یہ حضرات بھی صرف نگرانی اور حفاظت کی حد تک اپنی ڈیوٹی انجام دیں گے، ان مذہبی رسوم میں شرکت اور اور حاضری اور اس کی طرف میلان یہ کسی طرح جائز اور درست نہ ہوگا۔ قرآن مجید صاف اعلان کرتا ہے: **"ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان"، "لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق"**۔

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ غیر مسلموں کے تہوار ان کے مذہبی تصورات پر مبنی ہوتے ہیں، اس لئے اس میں شرکت یا اس میں کسی طرح کا تعاون جائز نہیں ہے۔

روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مسلمانوں نے ایرانیوں کے طرز پر موسم بہار کی آمد اور اس موسم کے اختتام پر تہوار منانے کی اجازت چاہی لیکن آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی (مشکوۃ المصابیح)، نیز دیگر مذاہب کے تہوار اور مذہبی رسوم میں شرکت غیر مسلم اقوام سے مماثلت بھی ہے، سورج نکلنے، ڈوبنے اور نصف النہار کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ آفتاب پرست قوم اور دوسری قوموں میں عبادت اور پوجا پاٹ کا خصوصی وقت ہے، یہاں غور کرنے کی بات ہے کہ جب اسلام کو غیر مسلموں کے تہواروں سے، یہاں تک کہ ان کی عبادت گاہوں سے بھی مماثلت گوارہ نہیں تو ان کے تہواروں میں شرکت کیسے جائز ہوسکتی ہے؟ کچھ لوگ اس کے لئے جواز فراہم کرتے ہیں کہ مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کے لئے ان کے تہواروں میں شرکت کی

گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن میرے خیال میں یہ کج فہمی اور ناسمجھی کی بات ہے، رواداری اور ہم آہنگی نیز خوش گوار تعلقات کے لئے بھی اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہوگی، رواداری ''مذہب فروشی'' کا نام نہیں یہ تو بے ضمیری کی بات ہوگی، رواداری اپنے عقیدہ اور مذہب پر رہتے ہوئے دوسروں کو انگیز اور برداشت کرنے اور دوسری قوموں کے مذہبی خیالات میں عدم مداخلت کی پالیسی پر قائم رہنے کا نام ہے (مستفاد کتاب الفتاوی ۱/۳۰۶)۔

خلاصہ یہ کہ باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لیے بھی دیگر اہل مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کی اجازت نہیں ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔

ہم آہنگی کی خاطر مسلمانوں کا متوارث تہذیب کو چھوڑنا کیسا ہے؟

میری نظر میں آنحضرت ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی نیز صحابہ کرام کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کی روشنی میں محض خوشگوار تعلقات اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے شریعت کے اعمال خواہ ان کا تعلق واجبات وفرائض سے ہو یا سنن ومستحبات سے یا وہ اعمال مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے تعلق رکھتے ہوں جس نے مسلم معاشرہ میں شعار کا درجہ اختیار کرلیا ہو، ایسے اعمال وشعار کو ترک کرنا شرعاً درست نہ ہوگا، البتہ اگر مسلمانوں کے ان متوارث تہذیب وثقافت کے اختیار کرنے سے یقینی فتنہ وفساد مچتا ہو اور غیر مسلم ممالک میں وہاں کی حکومت مسلمانوں کو ان کے چھوڑنے پر مجبور کرتی ہو اور وہاں کے ایوان میں اس کے خلاف قرار داد منظور کرالیا ہو تو ایسی صورت میں ایسے غیر مسلم ممالک میں جو کہ دار الحرب کے حکم میں ہیں مسلمانوں کو وقتی طور پر ان متوارث تہذیب وثقافت کا (جو شرعاً واجب نہ ہو) ترک کرنا اور چھوڑنا جائز اور درست ہوگا، شریعت مطہرہ کا اصول قرآن وحدیث کی روشنی میں ایسے موقع پر نرمی اور آسانی کا ہے، چنانچہ فقہاء کے یہاں اس کے لئے متعدد قواعد اور اصول موجود ہیں جس میں سے چند یہ ہیں: ''إذا ضاق الأمر اتسع ، وإذا اتسع ضاق''، ''الضرر يزال''، ''الضرورات تبيح المحظورات''، ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة''، ''الحرج مدفوع شرعاً''۔

لیکن مسلمانوں کا ان متوارث تہذیب وثقافت کا چھوڑنا وقتی ہوگا، دائمی نہیں ہوگا، اور ان ملکوں میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ حکومت سے گفت وشنید کے ذریعہ اپنے مطالبات کو منوائیں اور دیگر جمہوری ملکوں کے قوانین کا حوالہ بھی دیں، لیکن مسلمانوں کا ازخود محض اس بنیاد پر ان اعمال اور تہذیب وثقافت کا ترک کرنا کہ اگر ہم غیروں کے رنگ اور ڈھنگ میں رنگ کر رہیں گے تو ان کو دعوت دینا آسان ہوگا اور مدعو کے تالیف قلب کا سبب بنے گا، اور اس کے لئے غیروں کی تہذیب، لباس اور کلچر کو اپنانا خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ ہو گمراہی والا عمل اور سوچ ہے۔

میں اپنے اس موقف کی تائید میں حضرت حذیفہؓ کے اس واقعہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جب شاہ ایران نے لڑائی سے قبل مذاکرات کے لئے آپ کو اپنے دربار میں بلایا تو اس موقع پر شاہ ایران نے آپ کے کھانے کے لئے زبردست انتظام کیا تھا، چنانچہ جب آپ نے کھانا شروع کیا تو کھانے کے دوران آپ کے ہاتھ سے ایک نوالہ نیچے گر گیا، جب نوالہ گرا تو حضرت حذیفہ نے

اس نوالے کو اٹھانے کے لئے نیچے ہاتھ بڑھایا، آپ کے برابر ایک صاحب بیٹھے تھے، انہوں نے آپ کو کہنی مار کر اشارہ کیا کہ یہ کیا کررہے ہو، یہ دنیا کی سپر طاقت کسری کا دربار ہے، اگر تم اس دربار میں زمین پر گرا ہوا نوالہ اٹھا کر کھاؤ گے تو ان لوگوں کے ذہنوں میں تمہاری وقعت نہیں رہے گی اور یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑے گھٹیا قسم کے لوگ ہیں، اس لئے یہ نوالہ اٹھا کر کھانے کا موقع نہیں ہے، آج اس کو چھوڑ دو۔

جواب میں حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے عجیب وغریب جملہ ارشاد فرمایا:

"أأترک سنة حبیبی لھؤلاء الحمقی" (کیا میں ان احمقوں کی وجہ سے سرکار دوعالم ﷺ کی سنت چھوڑ دوں)۔

مذاہب باطلہ پر تنقید کے حدود:

اسلام کی پاکیزہ اور صاف ستھری تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالی کی وحدانیت میں کسی کو شریک ٹھہرانے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، اسلام سے پہلے بھی جتنے آسمانی مذاہب تھے ان مذاہب کی تعلیمات بھی یہی تھیں اور تمام نبیوں اور رسولوں نے اپنی اپنی قوم کو توحید ہی کا سبق دیا اور اسی کلمہ کو دہراتے رہے یا قومی اعبدوا اللہ و لاتشرکوا بہ شیئاً عقل انسانی بھی اس کی گواہی دے گی کہ اس خالق ومالک کے ساتھ کسی کو شریک کرنا خلاف عقل ہے، آسمانی کتابوں میں بھی توحید ہی کی اصلا تعلیم دی گئی ہے، یہاں تک کہ وید جو ہندوؤں کی مذہبی کتاب ہے اس میں بھی توحید کی تعلیمات بھری پڑی ہیں۔

لہذا جب سابقہ مذاہب کی تعلیمات کی بنیاد اور اصل اور جڑ توحید ہے اور ان کو بھی بتادیا گیا ہے کہ اسلام آخری مذہب ہوگا اور محمد ﷺ آخری نبی ہوں گے، قرآن آخری (الہامی) کتاب ہوگی اور اسلام کے آنے کے بعد تمام مذاہب منسوخ ہوجائیں گے اور سب کو آخری نبی کی شریعت کی پیروی کرنی ہی ہوگی اور یہ تمام اشارات ان کی کتابوں میں موجود ہیں تو پھر اگر معبودان باطل پر تنقید کی جائے اور اس کے خلاف دلائل اور شواہد پیش کئے جائیں تو کون سی حرج کی بات ہوگی، لہذا میری نظر میں معبودان باطل پر تنقید کرنا، شرک کی مذمت بیان کرنا یہ عین دلیل ایمان ہے، البتہ مذہبی مذاکرہ کے موقع پر شائستہ زبان استعمال کرنا مذہبی مذاکرہ کرنے والے کی عین ذمہ داری ہوگی۔

گفتگو کرنے کا طریقہ مہذب اور شائستہ ہو، مثبت انداز میں اپنی بات کہی جائے، حکمت اور موعظہ حسنہ کی رعایت کی جائے، "جادلھم بالتی ھی أحسن" کی نصیحت پر کان دھر کے گفتگو کی جائے، ان کی کتابوں سے بھی توحید کے دلائل ڈھونڈ کر ان پر حقیقت آشکارا کیا جائے، خود حضرت عیسیؑ نے اپنی ذات سے الوہیت کی جو نفی کی ہے اور جس انداز سے کی ہے قرآن کی اس آیت کی روشنی میں عیسائیوں کو سمجھایا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مشترک سماجی مسائل میں اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات:

مشترک سماجی مسائل مثلاً غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی پر مسلمانوں کا

مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات عین اسلامی وعملی ہوگا، ایسے موقع پر سارے مذاہب کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر جدوجہد کرنی چاہئے، تا کہ ظلم کا خاتمہ ہواور اہل حق کو ان کا حق ملے، حلف الفضول کا واقعہ اس سلسلہ میں ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

اسلام میں اکرام انسانیت کے پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے، اسلام اپنے ماننے والے کو خاص طور پر یہ تعلیم دیتا ہے، ہر فرد اور ہر گروہ کو خواہ وہ کسی طبقے، کسی علاقے، کسی رنگ اور کسی نسل اور کسی بھی ذات وبرادری سے تعلق رکھتا ہو، محترم سمجھنا اور عزت دینا اور انسانی بنیاد پر ان کی خدمت کرنا۔

اس لئے ان ایشوز پر جن کا سوال نمبر ۶ میں ذکر کیا گیا ہے، مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے میں از روئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ ایسے موقع پر مسلمانوں کو آگے بڑھ کر حصہ لینا چاہئے، واللہ اعلم بالصواب۔

جمہوری ممالک میں اہل سیاست اور مذہبی شخصیات سے سیاسی گفت وشنید:

اس میں شک نہیں کہ عہد حاضر میں جمہوری ممالک کے اندر سیاست میں حصہ داری کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ لہذا اگر اس کے لئے کبھی مذہب کی نمائندہ شخصیات یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت پیش آئے تو مسلمانوں کو ان سیاسی موضوعات اور ملکی قانون اور آئین پر ضرور مذہبی مذاکرہ کرنا چاہئے، اگر چہ کہ ان سیاسی جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف کچھ باتیں بھی موجود ہوں، تب بھی اس کی گنجائش دی جائے گی، بلکہ میری نظر میں غیر مسلم ممالک میں سیکولر حکومتوں کی تشکیل میں مسلمان نہ صرف حصہ لے سکتے ہیں، بلکہ انہیں پوری بیدار مغزی اور فہم وفراست کے ساتھ بھر پور حصہ لینا چاہئے، تا کہ اپنے دینی وملی مصالح کا تحفظ کر سکیں، حکومت دور حاضر میں زندگی کے تمام شعبوں پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتی ہے، حکومت کی تشکیل سے کنارہ کش ہوکر مسلمان اپنے دینی وملی وجود کو قائم رکھنے اور جائز دنیاوی مصالح کی حفاظت میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس سلسلہ میں بہار کا موجود صوبائی الیکشن اور مسلمانوں کی دانشمندی کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے صحیح سیاسی فیصلہ نے کس طرح باطل طاقتوں کے قدم کو روکا اور جمہوریت کی روح کو دفن ہونے سے بچالیا۔

جہاں تک سوال یہ ہے کہ ان تنظیموں اور جماعتوں کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں بھی ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے موقع پر ''اھون البلیتین'' کے اصول پر عمل کرنا مسلمانوں کی مجبوری بن جاتی ہے، شریعت کا اصول ہے کہ جہاں دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کو اختیار کرنا ناگزیر ہوجائے وہاں مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں میں جو ہلکی ہو اس کو اختیار کرے، لہذا اس بنیاد پر مذاکرہ نہ کرنا کہ جمہوری حکومت بھی اسلامی حکومت سے مطابقت نہیں رکھتا اور جمہوریت کا مفہوم شریعت سے متصادم ہے، یہ نظریہ اور سوچ بہتر نہیں ہے، کیونکہ اگر جمہوری حکومت کی مجبوری ہی کے ساتھ سہی اگر تائید نہ کی گئی تو خطرہ ہو سکتا ہے کہ کہیں پورا ملک ہندوراشٹر اور عیسائی قانون والا آمری ملک نہ بن جائے، اس لئے میری نظر میں سیاسی مذاکرات میں شرکت ہونی چاہئے، واللہ اعلم بالصواب۔

مذہبی مذاکرات کے دوران غیر مسلم خواتین سے گفتگو:

اسلام میں پردہ کا ایک مکمل نظام اور سسٹم ہے، دنیا کے کسی بھی مذہب میں پردہ کا اتنا منظم قانون نہیں ہے، اسلام کا قانون حجاب فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے، اور غیروں کو بھی اپیل کرتا ہے کہ اسلام کے اس قانون حجاب کو اختیار کرلو دنیا کی آدھی سے زیادہ برائی کا خاتمہ ہوجائے گا۔

صورت مسئلہ کا مختصر جواب یہ ہے کہ اگر مذہبی مذاکرات کے موقع پر اسٹیج پر فریق مخالف کی طرف سے خواتین بھی ہوں تو مسلمانوں کو اپنی نگاہوں کی حفاظت کرتے ہوئے ضرورت پڑنے پر ان سے گفتگو اور بحث کی اجازت ہوگی اور اگر مسلمانوں کی طرف سے بعض مخصوص مسائل پر بحث کرنے کے لئے مرد حضرات نہ ہوں یا اس موضوع پر کوئی مسلمان عورت ہی نمائندگی کرسکتی ہے تو اس مسلمان عورت کو چاہئے کہ مکمل اسلامی پردہ کے ساتھ مجلس میں شریک ہو اور ضرورت پڑنے پر مذاکرہ میں حصہ لے، اپنی آواز میں لچک نہیں بلکہ گرج اور کڑک والی کیفیت رکھے، یہی قرآنی تعلیم بھی ہے۔

چونکہ مذہبی مذاکرہ میں ہر شخص اپنے مذہب کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا تذکرہ کرے گا، اس لئے اس موقع پر مسلمانوں کو نہیں چوکنا چاہئے کہ خود ان کے مذاہب کا حوالہ دے کر ان کی خواتین کو بھی پردہ کا مکلف بنائیں، مگر حکمت اور دانشمندی کے ساتھ۔

غیر مسلموں کو بھی بتایا جائے کہ آپ کے مذہبی کتابوں میں سیتاجی کا لباس کیا تھا، ان کا پردہ کیسا تھا، عیسائیوں کو بتایا جائے کہ مریم بتولؑ کس طرح پردہ میں رہتی تھیں۔

اس موقع پر محض اس بنیاد پر کہ مذاکرہ میں شرکت نہ کرنا کہ وہاں خواتین بھی ہوں گی بہتر اور درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں اسلام کی دعوت اور پیغام دوسروں تک نہ پہنچانا اس سے زیادہ سنگین جرم ہوگا اور ممکن ہے یہ مذاکرہ دوسروں کے اسلام کا سبب بن جائے یا کم سے کم آپسی منافرت کم ہوجائے، واللہ اعلم بالصواب۔

بین المذاہب مذاکرات – ضرورت واہمیت

مولانا عبیداللہ ابوبکر ندوی (شافعی) ☆

جواب نمبر (۱):

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''جولوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انہوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکال دیا ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ تعالی تم کو حسن سلوک اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے ہیں، اور بے شک اللہ تعالی انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں'' (الممتحنہ: ۸)، مذکورہ آیت سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، جن کی ذہنیت فرقہ پرست اور فسطائیت سے پاک ہو، ایسے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا درست ہے، قرآن کی شہادت کے مطابق کسی قوم کا ہدایت پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالی کی توفیق پر منحصر ہے، لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا مناسب نہیں، اس لئے کہ مسلمان کے ساتھ حسن سلوک کی صورت میں جس طرح اجر ملتا ہے اسی طرح غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک پر بھی اجر ملے گا، رہا مسئلہ برادران وطن اور دیگر اہل مذاہب کے ساتھ مذہبی، سیاسی اور سماجی مذاکرات کا تو اس سلسلہ میں سیاسی وسماجی مذاکرات درست ہیں، جب کہ اس کا مقصد صرف سیاست میں ساجھیداری اور سماج میں عہدہ ومنصب مقصود نہ ہو، بلکہ انصاف کا قیام، ظلم کی روک تھام، سماج کو جرائم اور فحاشی سے پاک وصاف کرنا اور انسانیت کے حقیقی احترام کو عام کرنا مقصود ہو، علاوہ ازیں مذہبی مذاکرات میں اگر دین اسلام کو کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ یا دین اسلام کے کسی حکم میں ردوبدل، یا استہزا کا امکان ہو اور اس کا دفاع ناممکن ہو تو پھر اس طرح مذہبی مذاکرات کی گنجائش نہیں ہوگی، البتہ ان مذاکرات میں اسلام کی تعلیمات کو عام کرنا، اسلام کی ترویج واشاعت، خیر کے کاموں میں تعاون اور دین حق کی صداقت وسچائی کو ثابت کرنے کے مواقع ہوں تو اس صورت میں مذہبی مذاکرات کی اجازت ہی نہیں بلکہ ایسے مذاکرات مطلوب ومحمود ہیں۔

علامہ زحیلیؒ فرماتے ہیں:

''وأجمع الفقهاء على جواز الاستعانة بالمنافقين والفساق لاستعانة ﷺ بعبدالله بن ابى وأصحابه، والخلاصة أن الإسلام لا يتوانى لحظة عن سعيه لإقامة علاقات طبة مع غير المسلمين لتحقيق التعاون البناء فى

B18

☆ جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور۔

سبیل الخیر والعدل والبر والامن وحمایة الحرمات ونحو ذلک" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶۴۲۱/۸)۔

جواب نمبر (۲):

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "بنی اسرائیل کے واقعات کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں" (بخاری: ۳۴۶۱)، حضرت ابونملہ انصاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اہل کتاب جو کچھ تم کو بیان کریں تو تم نہ اس کی تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو، اور تم یہ کہو کہ ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی ہے، پھر اگر وہ خبر باطل ہے تو تم نے اس کی تصدیق نہیں کی اور اگر وہ خبر صحیح ہے تو تم نے اس کی تکذیب نہیں کی" (سنن ابی داود: ۳۶۴۴)، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم کو یہود کی کتابوں کے سیکھنے کا حکم دیا، تو میں نے یہود کی کتابوں کو سیکھ لیا، پھر میں یہود کی طرف سے آنے والے خطوط کو پڑھتا اور آپ ﷺ جب یہود کو خط لکھنے کا ارادہ فرماتے تو میں لکھ دیتا (سنن ابی داود: ۳۶۴۵)، محدثین نے ان احادیث کی روشنی میں یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی مقرر وخطیب ماقبل کی شریعتوں کا کوئی قصہ بیان کرے تو یہ درست ہے، اگرچہ ہمیں اس کی سند کا علم نہ ہو، اس لئے کہ طول زمانہ اور بعد مسافت کی بناء پر اس کی سند کا علم ہونا دشوار ہے، البتہ ابتداء اسلام میں آپ ﷺ نے احکام اسلامیہ کے مستقر ہونے اور قواعد دینیہ کے مستحکم ہونے سے قبل اہل کتاب کی کتب پڑھنے، ان سے مسائل جاننے کو منع فرمایا تھا، تاکہ کسی قسم کے شک وشبہ میں مبتلاء ہونے سے حفاظت ہو سکے، لیکن جب یہ خطرہ ٹل گیا تو اس کے اندر وسعت ہوگئی، لہذا اب اہمی مذاکرات میں دوسرے مذاہب کی کتابوں سے ان امور کو بیان کیا جاسکتا ہے جو شریعت محمدیہ کے موافق ہوں، قرآن وحدیث سے متصادم ومعارض نہ ہوں، بلکہ باعث عبرت ونصیحت ہوں، لیکن اگر وہ امور ہماری شریعت کے اصولی قواعد کے بالکل خلاف ہوں تو ان امور کو بیان کرنا یا ان کی کتابوں کا حوالہ دینا درست نہیں ہوگا، البتہ بطور مثال بیان کرنے میں حرج نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ نقل کرتے ہیں:

"التحدیث بقصصهم من قتلهم أنفسهم لنوبهم من عبادة العجل وتفصیل المذکورة فی القرآن ونحو ذلک لأن فی ذلک عبرة وموعظة لأولی الألباب، وأما النهی فوارد علی کتبه التوریة وما یتعلق بالعمل من الأحکام" (شرح الطیبی ۳۹۰/۱)۔

صاحب عون المعبود نقل کرتے ہیں:

"معناه الرخصة فی الحدیث عنهم علی معنی البلاغ، وإن لم یتحقق صحة ذلک بنقل الاسناد وذلک لأنه أمر قدتعدد فی إخبارهم بعد المسافة وطول المدة ووقوع الفترة بین زمانی النبوة ۔۔۔۔ کان تقدم منه ﷺ الزجر عن الأخذ عنهم والنظر فی کتبهم ثم حصل التوسع فی ذلک ،فکان النهی وقع قبل استقرار الأحکام

الإسلامية والقواعد الدينية خشية الفتنة، ثم لما زال المحذور وقع الإذن في ذلك لما سماع الأخبار التي كانت في زمانهم من الاعتبار" (عون المعبود ۱۰/۶۹، نیز دیکھئے: فتح الباری ۸/۳۴۰، مرقاۃ المفاتیح ۱/۴۰۷، حواشی الشروانی ۹/۳۹۸، تحفۃ الاحوذی ۸/۳۹۵)۔

جواب نمبر (۳):

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص جس قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے گا اس کا شمار اسی میں سے ہوگا" (سنن ابی داود: ۴۰۳۱)، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: "اللہ کے دشمنوں کی عیدوں میں شرکت کرنے سے بچو" (سنن بیہقی ۱۴/۱۱۳)، مذکورہ دلائل کی روشنی میں فقہاء کرام نے یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ دیگر اہل مذاہب جو کہ باطل ہیں ان کے مذہبی عبادات میں انسانی خدمت کے جذبہ اور بھائی چارگی کی فضاء برقرار رکھنے کی غرض سے شرکت درست نہیں ہے، اس لئے کہ انسانی خدمت اور خیر سگالی کے لئے ان کے مذہبی رسوم کے علاوہ بہت سارے مواقع میسر ہیں، نیز انسانی خدمت یقیناً ایک اچھی چیز ہے، لیکن ان کے مذہبی رسوم میں شرکت بہت سے مفاسد اور خرابیوں کا سبب بنتی ہے، اس لئے کہ ان کے رسومات میں ایک طرف بے پردگی تو دوسری طرف شرکیہ اعمال، نیز شراب نوشی اور ناچ گانا بالکل عام سی بات ہے، اور شریعت نے ہمیشہ جلب منفعت کے مقابلہ میں دفع مضرت کو ترجیح دی ہے، لہذا دفع مضرت کو مقدم رکھتے ہوئے ان کے مذہبی رسومات میں شرکت کی کہاں اجازت ہوگی، البتہ ان کے وہ پروگرام جو مذہبی ہوں لیکن ان تمام چیزوں سے پاک ہوں اور ان کے انعقاد کا مقصد ہی امن وسکون، اور بھائی چارگی کا ماحول تیار کرنا ہو تو ایسے پروگرام میں شرکت کی گنجائش ہے۔

شیخ ابن حجر ہیتمیؒ فرماتے ہیں:

"**ومن أقبح البدع موافقة المسلمين النصارى في أعيادهم بالتشبه بأكلهم والهدية لهم وقبول هديتهم وأكثر الناس اعتناء بذلك المصريون، وقد قال ﷺ من تشبه بقوم فهو منهم، بل قال ابن الحاج: لايحل لمسلم أن يبيع نصرانيا شيئا من مصلحة عيده لا لحما ولا دما ولا ثوبا إذ هو معاونة لهم على كفرهم وعلى ولاة الأمر منع المسلمين من ذلك**" (الفتاوی الکبری ۴/۲۱۶)۔

علامہ زحیلیؒ فرماتے ہیں:

"**لا يجوز لهم إظهار أعيادهم فلايجوز للمسلمين مماراتهم عليه ولا مساعدتهم ولا الحضور معهم**" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۲/۷۷۳)۔

جواب نمبر (۴):

اللہ تعالی کا ارشاد ہے "اللہ تعالی تم سے آسانی چاہتا ہے اور تم کو مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا" (البقرۃ: ۱۸۵)، دوسری جگہ اللہ تعالی نے فرمایا: "تم پر دین کے معاملہ میں کوئی حرج اور سختی نہیں ہے" (الحج: ۷۸)، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ

کو جب دوکاموں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں سے آسان کو اختیار کرتے تھے؛ جب کہ اس میں گناہ نہ ہوتا'' (بخاری: ۳۵۶۰)، مذکورہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ شریعت اسلامیہ میں آسانی اور سہولت کا پہلو مشقت وضرر پر غالب ہے، جس کا عکس شریعت کے سارے احکامات میں ہمیں نظر آتا ہے، جیسا کہ نماز جیسی اہم عبادت میں مسافر کے لئے تخفیف کرتے ہوئے چار کی بجائے دو اور دو وقت کی نماز ایک وقت میں ادا کرنے کی گنجائش دی گئی ہے، اسی طرح صلاۃ الخوف بھی شریعت کے سہل اور آسان ہونے کی واضح مثال ہے، نیز بیمار کے لئے قیام پر عدم قدرت کی بناء پر قعود اور اضطجاع کی ہیئت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی گنجائش دی گئی ہے، اس کے علاوہ تابیر نخل کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے ابتداء میں تابیر سے منع فرمایا، لیکن جب صحابہ کو پھلوں کی کمی کی بناء پر نقصان کا سامنا کرنا پڑا تو آپ ﷺ نے تابیر کی اجازت دے دی (سنن ابن ماجہ: ۲۴۷۰)، اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر جب معاہدہ لکھا گیا تو اس وقت آپ ﷺ نے سہیل جو کہ کفار کے قاصد تھے ان کے کہنے پر بسم اللہ اور رسول اللہ لکھنے کا ارادہ ترک کیا (بخاری: ۴۲۵۱)، تاکہ کسی قسم کا فتنہ پیدا نہ ہو اور صلح مکمل ہوجائے، ان تمام صورتوں میں شریعت نے تنگی اور نقصان کے پیش نظر واجبات میں تخفیف اور غیر واجبات کو ترک کی اجازت دی ہے، مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ برادران وطن کے ساتھ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے اور فتنہ سے بچنے کی غرض سے غیر واجب اعمال کو ترک کرنے کی گنجائش ہے، لیکن اصل تو یہ ہے کہ مسلمان تہذیبی وتمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسرے کے سامنے ممتاز رکھے، بلکہ اپنی شناخت کو باقی رکھے، خاص طور پر ان امور میں جو شعائر اسلام تصور کئے جاتے ہیں، اور ہر اس چیز سے بچے جو شریعت اسلامیہ کے متصادم ہو، تاکہ غیر محسوس طریقہ سے غیر اسلامی تصورات ہمارے اندر تحلیل نہ ہوجائیں۔

امام زحیلیؒ فرماتے ہیں :

''إن کل مایتصادم مع شرعة الإسلام، وتجاوز المسلم فی تقلید غیر المسلمین أو التشبه بهم، مستحسنا أفعالهم وقاصدا المشارکة مع أوضاع غیر المسلمین المختلفة فهو حرام'' (الموسوعۃ الفقہ الاسلامی ۱۲/۷۵۰)۔

''وأما إشکالیة التشبه بغیر المسلمین فهذا مرض اجتماعی سائد إلا عند أقویاء العقیدة والعزیمة والمبدأ حیث لایجوز التشبه بغیر المسلمین فی القضایا الحساسة لأن ذوبان الشخصیة المسلمة أمام التیارات الغریبة یهدد بالانسلاخ من الإسلام ،فیحرم التشبه فی الأمور المصادمة للدین معنی وظاهرا أن قصد المسلم ذلک وإلا فعله مکروه سواء فی ارتداء الملابس، وحفلات الأکل والشرب والأعراس'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۲/۷۵۵)۔

جواب نمبر (۵):

ارشاد باری تعالی ہے: ''وَلاَ تَسُبُّواْ الَّذِيْنَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَيَسُبُّواْ اللّهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ'' (سورۃ الانعام: ۱۰۹) (تم لوگ ان معبودان باطلہ کو برا نہ کہو جن کی یہ لوگ خدا کی توحید کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہیں، کیونکہ

تمھارے ایسا کرنے سے پھر وہ بدون سمجھے بے ادبی سے اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے)۔دوسری جگہ اللہ تعالی کاارشاد ہے : "لنا أعمالکم و لکم أعمالکم" (البقرہ:۱۳۹) (ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال)، اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نصیحۃً اور شفقۃً معبودان باطل کی عبادت کرنے والوں سے کہتے ہیں کہ تمہارے اعمال قبیحہ کا ضرر تمہیں لاحق ہوگا۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "آدمی کا اپنے ماں باپ کوگالی دینا کبیرہ گناہ ہے،توصحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آدمی اپنے ماں باپ کوکیسے گالی دے سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب آدمی کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کوگالی دے اوراس کے نتیجہ میں وہ دوسرا اس کے ماں باپ کوگالی دے تواس گالی دلوانے کا سبب یہ بنا" (بخاری:۵۹۷۳)۔

مذکورہ آیت کریمہ کے ذریعہ مسلمانوں کواس بات سے روک دیا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے معبودان باطلہ کے متعلق کوئی سخت کلمہ نہ کہا کرے، اس آیت کریمہ اور حدیث شریف سے ایک اہم اصولی مسئلہ کی ہدایت دی گئی ہے کہ جوکام خود کے لئے کرنا جائز نہیں اس کا سبب اور ذریعہ بننا بھی جائز نہیں،لہذا کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے، نیز جوکام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود ہومگر اس کے کرنے سے فساد لازم آتا ہوتو وہ کام بھی ممنوع ہوجاتا ہے، کیونکہ معبودات باطلہ یعنی بتوں کو برا کہنا کم ازکم جائز توضرور ہے اور ایمانی غیرت کے تقاضہ سے کہا جائے تو شاید باعث ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ممکن ہو کہ باطل مذہب کے پیروکار اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی کریں گے تو بتوں کو برا کہنے والے اس برائی کا سبب بن جائیں گے، اس لئے اس جائز کام کوبھی منع کردیا گیا، اس کی مثال حدیث شریف میں بھی دی گئی ہے، لہذا جوکام اپنی ذات میں جائز بلکہ باعث طاعت وثواب بھی ہو، مگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

اور خود رسول اللہ ﷺ کی مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے افراد کے ساتھ رواداری کا یہ حال تھا کی نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کرکے مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی (احکام اھل الذمہ:۸۲۳)۔

اسی طرح فقہاء نے یہ مسئلہ تحریر فرمایا ہے کہ "اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اوراس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا اس پر واجب ہو تو مسلمان شوہر اس کو روزہ رکھنے سے منع نہیں کرسکتا؛ اگرچہ اس کی وجہ سے مسلمان شوہر جنسی استفادہ سے محروم ہوجائے گا، اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے یا مسلمان شوہر کے گھر صلیب رکھے تو شوہر اس کو منع نہیں کرسکتا"۔

ان مذکورہ نظائر سے یہ بات ظاہر ہے کہ دوسری قوم کے معبودان کو برا بھلا کہہ کر ان کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے، بلکہ مذہب اسلام سے انھیں قریب کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات کو ان کے سامنے پیش کیا جائے، اسلام کے عدل وانصاف ودیگر خصوصیات کا تذکرہ اس انداز میں کیا جائے کہ دیگر مذاہب کا کمزور اور بے بنیاد ہونا واضح ہوجائے، تاکہ اپنا مقصد بھی

حاصل ہوجائے اوران کی دل آزاری نہ ہوسکے،حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کوشریک ٹھہرانے کی گنجائش نہیں ہے،لیکن پھربھی مذہبی رواداریوں کے تحت شریعت مطہرہ معبودان باطل کوناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتی ہے :

”ولاتسبوا الذین یدعون من دون اللہ الخ“۔

علامہ رازیؒ فرماتے ہیں :

”وأما قوله تعالى ”لنا أعمالنا ولكم أعمالكم“ فالمراد منه النصيحة فى الدين كأنه تعالى قال لنبيه قل لهم هذا القول على وجه الشفقة و النصيحة،أى لا يرجع إلى من أفعالكم القبيحة ضرر حتىٰ يكون المقصود من هذا القول دفع ذٰلک الضرر و إنما المراد نصحكم و إرشادكم إلى الأصلح، وبالجملة فالإنسان إنما يكون مقبول القول إذا كان خاليا عن الأغراض الدنوية فإذا كان لشيئ من الإعراض لم ينجح قوله فى القلب البتة فهذا هو المراد فيكون فيه من الردع والزجر ما يبعث على النظر وتحرک الطباع على الاستدلال وقبول الحق“

(تفسیرالکبیرللرازی ۴؍۷۷)۔

امام ابن کثیر قرشیؒ فرماتے ہیں :

”ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله الخ۔ يقول الله تعالى ناهيا لرسوال اللهﷺ والمومنين عن سب آلهة المشركين وإن كان فيه مصلحة، إلا أنه يترتب عليه مفسدة أعظم منها وهى مقابلة المشركين بسب إله المؤمنين و هو الله لا اله إلا هو“وهو ترک المصلحة لمفسدة أرجح منها“ (تفسیرابن کثیر ۲؍۲۲۲،نیز دیکھئے: تفسیرروح المعانی ۵؍ ۶۳ ۳، احکام القرآن للجصاص ۳؍۹، الجامع لاحکام القرآن ۴؍۴۱،شرح مسلم النووی ۱؍۲۶۷، فتح الباری ۱۳؍۴۳۹، الوجیز فی ایضاح قواعدالفقہ الکلیۃ،ص: ۲۶۵،احکام اہل الذمیہ: ۸۲۳،۸۲۴)۔

جواب نمبر(۶):

صلح حدیبیہ کے موقع پرآپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا : ”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر کفارمکہ مجھ سے کسی ایسے لائحہ عمل کا مطالبہ کریں گے جن میں اللہ تعالی کے محارم کی تعظیم ہوتو میں ان کے مطالبہ کو پورا کردوں گا“(بخاری:۲۷۳۱)۔

نبی کریم ﷺ نے مدینہ ہجرت کرتے وقت عبداللہ بن ارقط نامی شخص کی مدد لی تھی،تاکہ وہ شخص آپ ﷺ کو مدینہ جانے والے خفیہ راستوں پر مطلع کردے جب کہ وہ شخص مشرک تھا(مستدرک علی الصحیحین ۴؍۶۷۱۶)غزوہ بنوقینقاع کے موقع پر آپ ﷺ نے یہودیوں سے بھی مدد لی ہے(سنن کبری:۱۷۹۷۰)۔

مذکورہ دلائل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ آپ ﷺ نے مختلف موقعوں پرغیرمسلموں سے مدد لی ہے،انھیں دلائل کی روشنی میں فقہاء نے اس بات پر اتفاق نقل کیا ہے کہ دین اسلام کے قیام کے لئے غیرمسلموں سے تعاون لینے کی اجازت

ہے، لہذا اسلام کی وہ تعلیمات جو دیگر مذاہب کی بھی تعلیمات یا ان مذاہب میں وہ امور محمود اور مستحسن ہیں، جیسے غریبوں کا تعاون، ظلم کا خاتمہ وغیرہ ایسے مسائل پر غور وخوض کرنے اور ایک اچھے معاشرہ کو وجود میں لانے کے لئے دیگر مذاہب کے ساتھ مل کر کوشش کرنے کی نوبت آئے تو ان کے ساتھ اس موضوع پر مذاکرات کرنے کی اجازت ہے۔

”لاحرج في الإسلام من قيام الدولة المسلمة بالتعاون مع المخلصين من غير المسلمين سواء كانوا من أهل الكتاب أم من غيرهم أتباع الديانات الأخرى وذلك من أجل تحقيق الخير المشترک والدفاع عن المصالح العامة، والتعاون على إقامة العدل ونشر الأمن وصيانة الدماء أن تسفک وحماية الحرمات أن تنتهک“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۶۴۲۱/۸)۔

”وأجمع الفقهاء على جواز الاستعانة بالمنافقين والفساق لاستعانته صلى الله عليه وسلم بعبدالله بن أبي وأصحابه“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۶۴۱۸/۸)۔

جواب نمبر (۷):

جمہوری ممالک کے اندر سیاست میں حصہ داری کی بہت اہمیت ہے، اس لئے بھی کہ بعض اوقات مذہب کی نمائندہ شخصیتوں یا کسی اور مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی شخصیتوں کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت پیش آتی ہے، تاکہ ان کے ساتھ باہمی مذاکرات کئے جاسکے، تو اس صورت میں ان کے ساتھ مذاکرات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاکہ آپسی مذاکرات کے ذریعہ سے ہمیں اپنے حقوق کے حصول کے لئے راستہ ہموار ہوگا اور ہم اپنے آپ پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کر کے اپنی بات ان نمائندہ اشخاص کے ذریعہ حکومت تک پہنچاسکیں گے، اگرچہ اس جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونظیر وبنوقینقاع اور بنوقریظہ جو اسلام کے بڑے مخالفین میں سے تھے جو اسلام کے مٹانے کے درپے تھے، اس کے باوجود بھی آپ ﷺ نے ان کے ساتھ بات چیت کی ہے، ان کے درمیان امن کا معاہدہ کیا اور یہ عہد لیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کی مدد نہیں کریں گے۔

”والخلاصه أن الإسلام يحرص على حماية حقوق الإنسان سواء في دار الإسلام أم دار الحرب“ (الموسوعۃ ۶۴۱۶/۸)۔

”كان قد عقد معهم العهود والمواثيق وجعل بينه وبينهم أمانا وشرط عليهم أن لا يظاهروا عليه أحدا“ (منار القاری ۳۲۶/۴)۔

”ومما يلقى الضوء على أنه لا مانع شرعا من التعاون مع غير المسلمين تحديد موقف الإسلام من الديانات الأخرى“ (الموسوعہ ۶۴۱۹/۸)۔

جواب نمبر(۸):

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم“ (نور:۳۰) (آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں)، حضرت ابوزرعہ بن عمرو بن جریرؓ اپنے دادا جریر بن عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ”میں نے رسول اللہ ﷺ سے اچانک پڑنے والی نظر کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی نگاہ کو پھیر دوں“ (مسلم:۵۶۴۴)۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کسی مرد کے لئے اجنبی عورت کو دیکھنا مطلقا حرام ہے، یعنی چہرہ وہتھیلی سمیت پورے جسم کو دیکھنا حرام ہے، چاہے شہوت کے ساتھ دیکھے یا بغیر شہوت کے، فتنہ کا خوف ہو یا نہ ہو، کیوں کہ چہرہ اور ہاتھ بھی ستر میں داخل ہے، کیوں کہ حدیث پاک میں جب اچانک پڑنے والی نظر کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے نگاہ ہٹانے کا حکم دیا ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اچانک پڑنے والی نظر سے مراد بغیر قصد کے اگر کسی اجنبیہ پر نظر پڑ جائے تو گناہ نہیں ہوگا جب کہ وہ اپنی نگاہ کو فورا ہٹالے، بصورت دیگر وہ گنہ گار ہوگا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں :

”ويحرم نظر فحل بالغ إلى عورة حرة كبيرة أجنبية وكذا وجهها وكفها عند خوف فتنة وكذا عند الأمن على الصحيح (منهاج الطالبين ۱/۲۰۴) ومعنى نظر الفجاة أن يقع بصره على الأجنبية من غير قصد فلا إثم عليه في أول ذلك، ويجب عليه أن يصرف بصره في الحال فإن صرفه في الحال فلا إثم عليه وإن استدم النظر أثم لهذا الحديث، فإنه ﷺ أمره بأن يصرف بصره مع قوله تعالى قل للمؤمنين“ (شرح مسلم ۵/۳۱۵)۔

البتہ مذکورہ حدیث سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ عورت کے لئے اپنا چہرہ چھپانا واجب نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے اور مرد پر واجب ہے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھے اور پھیر دے۔

”قال القاضي: قال علماءنا وفي هذا الحديث حجة أنه لا يجب على المرأة أن تستر وجهها في طريقها وإنما ذلك سنة مستحبة لها“ (شرح مسلم ۵/۳۱۵)، اسی طرح بعض فقہاء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ عورت کے چہرہ اور ہاتھ کی طرف دیکھنا حرام نہیں ہے، اس لئے کہ جب حضرت اسماءؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب عورت بالغ ہوجائے تو اس کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس کے جسم کے کسی حصہ کو دیکھا جائے، سوائے ہاتھ اور چہرہ کے“ (سنن ابی داود:۴۱۰۴)۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ بات طے ہوگئی کہ اگر کسی سیاسی پروگرام میں مسلم اور غیر مسلم عورتوں سے سابقہ پڑتا ہے تو اس کی دو حالتیں ہوگی: یا تو ان کا لباس اس طرح ہوگا کہ صرف چہرہ اور ہتھیلی کھلی ہوگی یا پھر جسم کا بعض حصہ مستور ہوگا اور باقی کھلا ہوگا، اگر جسم کا بعض حصہ مستور اور بقیہ مکشوف ہے تو اس صورت میں ایسی عورت کی طرف دیکھنے کی گنجائش اور اجازت نہیں ہوگی، اس کے

برخلاف اگر صرف چہرہ اور ہتھیلی کھلی ہے تو ایسی عورت کے ساتھ شرکت اور مجالست کی گنجائش ہے اور بدرجہ مجبوری ایسی عورت کی طرف دیکھنا بھی جائز ہوگا، جب کہ کسی قسم کے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، ورنہ پھر دیکھنا حرام ہوگا،لیکن جتنا ہو سکے اپنی نگاہوں کو نیچے رکھنے کی کوشش ضروری ہے، اس لئے جن حضرات کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں ہیں ان کے نزدیک بھی چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف دیکھنا مکروہ ہے۔

علامہ جوینیؒ فرماتے ہیں: **"فإن نظر كل واحد منهما إلى عورة صاحبه كان حراما وإن نظر إلى غير العورة كان مكروها"** (نہایۃ المطلب ۹/۲۴۷)۔

بین مذہبی مذاکرات — اصول اور طریقۂ کار

قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی ☆

باہمی مذاکرہ کے مسائل کی نوعیت:

باہمی مذاکرہ کے مسائل کی تین نوعیتیں ہوسکتی ہیں مذہبی، سماجی اور سیاسی اور ان تینوں عنوانوں پر مذاکرات بھی ہوسکتے ہیں، لیکن اس کے لیے کچھ حدود وآداب کی رعایت ضروری ہے، البتہ مذہبی مذاکرہ کے لیے قرآن نے اصول اور انبیاء کے طریقہ دعوت اور اسلوب کو بیان کیا ہے، اس کا اختیار کرنا ضروری ہوگا، خود نبی ﷺ کی پوری زندگی دعوت سے بھری ہوئی ہے، ان سے استفادہ ضروری ہوگا، اس سلسلہ میں جناب ظفر دارک القاسمی نے اچھی بحث کی ہے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

اہل کتاب سے مکالمے کا شرعی اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ انہیں خدا کے دین کی طرف دعوت دی جائے لیکن حکمت ومصلحت کے تحت جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ، حق کو دلائل اور براہین سے واضح کیا جائے اور اسی طرح باطل کا دلیلوں سے بطلان کیا جائے اس اصول کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ سورۃ فصلت میں فرماتا ہے: "**ومن أحسن قولا ممن دعا إلى الله وعمل صالحاً وقال إنني من المسلمين**" (فصلت: ۳۳) (اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور کہے کہ میں یقینا مسلمانوں میں سے ہوں)۔

سورۃ یوسف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "**قل هذه سبيلي أدعو إلى الله على بصيرة أنا ومن اتبعني وسبحان الله وما أنامن المشركين**" (سورہ یوسف: ۱۰۸) (آپ کہہ دیجئے میری راہ یہی ہے، میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بلا رہے ہیں پورے یقین اور اعتقاد کے ساتھ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں نہیں)۔

انبیاء کو جو دعوت سونپ کر میدان کارزار میں اتارا جاتا تھا تو شریعتوں کے مختلف ہونے کے باوجود تمام انبیاء کرام اور رسولوں کی مشترکہ دعوت کا عنوان یہی تھا کہ خدا کے دین کی طرف دعوت دینا اور باطل کا بطلان کرنا، ہر نبی کی دعوت کا عنوان یہ تھا: "**اعبدوا الله مالكم من إله غيره**" (اعراف: ۵۹) (تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود ہونے کے قابل نہیں)۔

مشترکہ اہداف کے لئے سعی کرنا اور مخالف نقاط سے پرہیز کرنا ایسا کوئی اندیشہ انبیاء کی دعوت میں نظر نہیں آئے گا، خصوصا

☆ قاضی دار القضاء آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ واقع مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ فیض العلوم خانقاہ بوڑیہ، یمنا نگر، ہریانہ۔

عقائد اور تصورات کی بابت چپ سادھے رکھنا جو آج کل ادیان کے درمیان مکالمے کا نمایاں ترین بلکہ واحد مقصد رہ گیا ہے، یہ منہج انبیاء کی دعوت سے کوسوں دور ہے۔

سورہ کافرون اس پر واضح ترین دلالت کرتی ہے: "قل یا أیها الکافرون" کی شان نزول یہ ہے کہ مشرکین مکہ نے نبی علیہ السلام کے ایک ہی نقطے پر اصرار کی وجہ سے تنگ آ کر کہا کہ ایسا کر لیتے ہیں کہ ہم عبادت کر لیتے ہیں (اسکی) جس کی تم عبادت کرتے ہو۔اور آپ (سے بھی ہمارا یہی مطالبہ ہے کہ تم) بھی اسکی عبادت کرلیا کرو جس کی ہم عبادت کرتے ہیں۔

انبیاء کے منہج میں مشترکہ نقاط کے ملغوبے کی طرف دعوت دینا قطعا پایا نہیں جاتا، ادیان کے درمیان وحدت پیدا کرنا تو دور کی بات ہے، انبیاء اپنے دین کی طرف پوری شدت سے دعوت دیتے تھے اور پورے زور سے مخالفین کا رد بھی دلائل و براہین قاطعہ سے کرتے تھے۔

مذاکرات کا قرآنی اسلوب:

یہ سچ ہے کہ موجودہ زمانے میں اہل کتاب سے ہمارا واسطہ پڑا ہے اور اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ مکالمے کے لیے طریقہ وضع کیا جائے اور مجھے قرآن مجید اور سنت نبوی کے طریقہ تخاطب کو چھوڑ کر کسی اور منہج کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، گو کہ قرآن مجید میں تمام ہی منکرین اسلام کے ساتھ مکالمہ کیا گیا ہے، لیکن اہل کتاب کے ساتھ مکالمے کی طرف قرآن میں خاص طور پر توجہ دی گئی ہے، اہل کتاب کو دعوت دینے کے چار مراحل کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں، یہ درست ہے کہ یہی چار مراحل باقی ادیان کے پیروکاروں کے لئے بھی ہیں، اس لیے کہ اسلام کی عمومی دعوت کو شامل ہے۔

پہلا مرحلہ اہل کتاب کو اسلام کی طرف دعوت دینے کا ہے، سورۃ آل عمران میں اللہ تعالی فرماتا ہے: **"قل یا أهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا و بینکم ألا نعبد إلا الله و لا نشرک به شیئا و لا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون"** (آل عمران: ۶۴) (اے نبی کہو، اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی انصاف والی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور نہ اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی رب بنالیں، اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو کہ (ہم صرف خدا کے) مسلم (فرماں بردار) ہیں)۔ اس آیت کو ہمارے مضمون کے لحاظ سے نص کہا جاسکتا ہے۔

یہ آیت مبارکہ نبی علیہ السلام کے اس مراسلے میں تحریر کی گئی تھی جو شاہ روم ہرقل کو بھیجا گیا تھا، اس مراسلے میں واضح طور پر اسلام کی طرف دعوت دی گئی ہے، دونوں ادیان کے مشترکہ پہلوؤں کی طرف دعوت نہیں دی گئی ہے۔

مذکورہ آیت کو معاصر زمانے کی اصطلاح میں "وفاقی طرز معاشرت" پر مبنی معاہدہ عمرانی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس مکالمے میں جس چیز کی طرف دعوت دی جارہی ہے اس کا بیان نہایت جلی اور دوٹوک ہے کہ عبادت کو تمام دوسرے معبودوں سے

پھیر کرا کیلیے اللہ وحدہ لاشریک لہ کے لیے خالص کرلیا جائے ،شرک کی ساری صورتوں کو کالعدم قرار دیا جائے ، بنا بریں اہل کتاب کے ساتھ مکالمے میں دعوتی اسلوب کا شرعی منہج کا جوسب سے نمایاں اور واضح ترین عنوان ہے وہ اللہ کے لیے توحید کو خالص کرنا اور شرک کا ابطال کرنا۔

مکالمے کا طریقہ:

اہل کتاب کے ساتھ مکالمے کا ایک ہی اسلوب نہیں ہے، قرآن مجید میں اس بات کا خوب اہتمام کیا گیا ہے کہ جس سے کلام کیا جا رہا ہے اس کی خصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے ، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں مختلف لوگوں کے لیے مختلف اسلوب اختیار ہوئے ہیں:

(الف) بغیر تعبیر کے اسلام کی طرف دعوت دینا اور شرک کا ابطال کرنا، اس کی مثال مذکورہ بالا آیت میں گذر چکی ہے۔

(ب) تذکیری اسلوب، جیسے سورۃ بقرہ کی آیت ۴۷ میں بیان ہوا ہے:"**یا بنی إسرائیل اذکروا نعمتی التی أنعمت علیکم و أنی فضلتکم علی العالمین**"(سورۃ البقرہ:۴۷) (اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی)۔

(ج) خوشخبری اور ڈرانے والا اسلوب، جیسے سورۃ مائدہ میں مذکور ہوا ہے:"**ولو أن أهل الکتاب آمنوا و اتقوا لکفرنا عنهم سیئاتهم و لأدخلناهم جنات النعیم ولو أنهم أقاموا التوراة و الإنجیل و ما أنزل إلیهم من ربهم لأکلوا من فوقهم و من تحت أرجلهم منهم أمة مقتصدة و کثیر منهم ساء ما یعملون**"(سورۃ مائدہ :۶۶،۶۵) (اور اگر یہ اہل کتاب ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان کی تمام برائیوں پر معافی فرما دیتے اور ضرور انہیں راحت وآرام کی جنتوں میں لے جاتے اور اگر یہ لوگ تورات وانجیل اور ان کی جانب جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے روزیاں پاتے اور کھاتے، ایک جماعت تو ان میں سے درمیانہ روش کی ہے، باقی ان میں سے بہت سے لوگوں کے برے اعمال ہیں)۔

(د) اسلوب انکار، جیسے "**یا أهل الکتاب لم تلبسون الحق بالباطل و تکتمون الحق و أنتم تعلمون**"(آل عمران:۷۱) (اے اہل کتاب تم باوجود قائل ہونے کے پھر بھی دانستہ اللہ کی آیات کا کیوں کفر کر رہے ہو؟ اے اہل کتاب باوجود جاننے کے حق و باطل کو کیوں خلط ملط کر رہے ہو اور کیوں حق کو چھپا رہے ہو)۔

سیرت طیبہ میں اہل کتاب کے ساتھ خصوصا اور دوسرے ادیان کے پیروں کاروں کے ساتھ عموما دعوت کے لیے آپ علیہ السلام نے مختلف قسم کے طریقے اختیار کیے۔

(الف) جنہیں اسلام کی دعوت دینا ہو ان کے پاس خود چل کر ان کے مقام پر جانا، جیسے بازار میں، ان کے گھروں میں،

ملاقاتوں میں، یا بیٹھکوں میں خود چل کر جانا۔

(ب) انہیں دارالاسلام کی طرف بلانا۔

(ج) قبائلوں کے زعماء وسرداروں کو خطوط لکھنا۔

(د) جو کفار کے وفود آپ علیہ السلام کی ملاقات کو آتے تھے ان کا استقبال کرنا۔

(ہ) جہاد کے دوران انہیں دعوت دینا۔

(و) ان کی کتابوں سے اسلام کے حق میں دلائل پیش کر کے انھیں سچائی کی طرف راغب کرنا۔

(ز) قرآن مجید کی تلاوت سے انہیں دعوت دینا۔

اہل کتاب کے ساتھ دوسرے اسلوب، مناظرے اور دلائل سے حق کا اظہار، اس کے دو طریقے ہیں:

(الف) قطعی دلائل سے حق کی صداقت کو ثابت کرنا۔

(ب) حق قبول کرنے میں جو شبہات ہو سکتے تھے ان کا ازالہ کرنا۔

یہ درست ہے کہ قرآن میں مناظرے اور جدال کے اسلوب سے ممانعت آئی ہے، لیکن یہ ممانعت کسی خاص مناسبت سے ہے، دیگر آیات میں مناظرے اور جدال کا حکم مکرر مذکور ہوا ہے جیسے "**ادع إلی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن إن ربک هو أعلم بمن ضل عن سبیله وهو أعلم بالمهتدین**" (النحل:۱۲۵) (اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کیساتھ بلایے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجیے، یقینا آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بھی بخوبی جانتا ہے اور وہ راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے)۔

مکالمے کا منہج:

دوسرے ادیان کے ماننے والوں کے ساتھ مکالمے کے لیے حسب ذیل اصول قرآن وسنت سے اخذ ہوتے ہیں:

(الف) کفار چونکہ وحی کے منکر ہوتے ہیں، اس لیے ان کے ساتھ عقل عام کے ذریعہ حق کو بیان کیا جائے، قرآن مجید عقل عام کو اسلام قبول کرنے کے لیے متاثر کرنے والے بے شمار دلائل فراہم کرتا ہے، خصوصا عقائد اور تصورات کو توحید پر لانے کے لیے قرآن میں عقلی دلائل پوری طرح موجود ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن جیسا کلام کوئی مرتب نہیں دکھا سکتا، عقل عام کو متاثر کرنے کے لیے کسی نئی اپچ کی بجائے قرآن کے نہج کا تتبع لازم پکڑا جائے۔

(ب) قرآن میں غیبی امور کی ایسی اطلاع موجود ہے جو پوری طرح روپذیر ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالی کا یہ فرمان کہ قرآن مجید کو محفوظ کر لیا جائے گا، عالم اسلام میں وحی کے آغاز سے لے کر اب تک اور تا قیامت قرآن مجید کو مسلمان لفظا ومعنا محفوظ کرتے چلے آرہے ہیں، تو وہ اسی پیش گوئی کے مصداق ہے، اسی طرح سائنس نے فزکس، فلکیات یا میڈیکل میں انکشافات کیے ہیں، وہ

قرآن مجید کے ساتھ پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔

(ج) نبوت پر دلالت کرنے والے معجزات کے ذریعے نبی ﷺ کی نبوت کا اثبات کیا جائے۔

(د) نبی علیہ السلام کی سیرت اور اخلاقیات سے ان کا نبی ہونا ثابت کیا جائے، جیسے ہرقل نے ابوسفیان سے آپ ﷺ کی سیرت کے متعلق سوالات کے بعد کہا تھا کہ ایسی ہی ہستیاں نبی ہوا کرتی ہیں۔

یہ بھی امر واقع ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات سب کے سب عقل عام سے ثابت کیے جاسکتے ہیں۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ جو شخص اڑیل اور حق کا دشمن ہے اس کے ساتھ دلائل کے ذریعے گفتگو نہ کی جائے، ایسا شخص یا گروہ جو موقع ملتے ہی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں ذرا تردد کرنے والا نہ ہو۔

تیسرا مرحلہ ہے مباہلہ کا، سورۃ آل عمران میں اس اسلوب کو مشروع ٹھہرایا گیا ہے: "**فمن حاجک فیه من بعد ماجاءک من العلم فقل تعالوا ندع أبنائنا و أبنائکم و نسائنا و نسائکم و أنفسنا و أنفسکم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله علی الکاذبین**" (آل عمران: ٦١) (اس لیے جو شخص آپ کے پاس اس علم کے آجانے کے بعد بھی آپ سے اس میں جھگڑے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو اور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلالیں، پھر ہم عاجزی کے ساتھ التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں)۔

مباہلے کا اسلوب معاند اور حق کے دشمن کے ساتھ شریعت میں روا رکھا گیا ہے، اس پر حق واضح ہے مگر وہ ہٹ دھرمی اور اعراض کی وجہ سے حق کے خلاف معاندانہ رویہ رکھنے والے کے حق میں سنت ہے اور آپ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے بعد کسی بھی معاند کے خلاف مباہلہ نہیں ہوسکتا۔

مکالمے کا چوتھا اسلوب دوری اور برات اختیار کرنا۔

یوں تو اہل اسلام اور اہل کفار میں براءت واجب کا رشتہ دین اسلام میں داخل ہوتے ہی شروع ہوجاتا ہے، یہاں ہم ایک خاص قسم کی برات مراد لے رہے ہیں، اس سے مراد ہے، دلائل کے تبادلے بہت ہوچکے، اس کے بعد اب مزید ایسی کوئی سبیل نظر نہیں آتی کہ حق تک پہنچنے میں رکاوٹ دلائل رہ گئے ہیں، جب داعی مخالف کے بارے میں پورا اطمینان کرلے کہ اب وجہ دلائل نہیں کوئی اور شئی ہے تو وہ یہاں دلائل کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے برائت کا اظہار کرتا ہے، جسے قرآن مجید اس طرح پیش کرتا ہے: "**فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون**" (آل عمران: ٦٤)۔

بنا بریں دعوت کے دستیاب اسلوب استعمال کرنے کے بعد مخالف کے شبہات اور اعتراضات کے شافی جواب دے، جبکہ اتمام حجت ہوچکا تو اب مخالف کے لیے یا تو اسلام قبول کرنا رہ جاتا ہے یا پھر حق کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کرنا، اس موقع پر ہمارا جواب یہی سب سے مناسب ہے کہ پس تم گواہ رہو کہ ہم نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر رکھا ہے: "**بأنا مسلمون**" اور ہمارے سواء اور لوگ خدا کی فرماں برداری میں جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔

چنانچہ متذکرہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''مکالمہ بین المذاہب'' کے اہداف قرآن وسنت کے مطابق ہوں، تاکہ اغیار واعداء کسی بھی طرح کی سیاسی چال نہ کھیل سکیں، ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کردوں کہ مفاہمت بین المذاہب کا ایک اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عالم انسانیت کو ہر طرح کا سکون واطمینان حاصل ہو، آج پوری دنیا میں بے راہ روی، خلفشار، بربریت، تشدد پایا جارہا ہے، ان جرائم کے خاتمہ کے لیے ضروری ہے کہ تمام داعیان مذاہب سر جوڑ کر بیٹھیں اور باہم تبادلہ خیال کرکے دنیا کو امن وامان کا گہوارہ بنانے کی کوشش کریں (غیر مسلموں سے مکالمے کا اسلوب قرآن کے خصوصی تناظر میں ر ۳ تا ۸)۔

اس پوری تفصیل سے یہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بین مذہبی مذاکرہ قرآن وسنت کی روشنی میں ضروری ہے ہاں سیاسی اور سماجی مذاکرہ میں توسع ہے، صرف اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ معاشرہ میں اس مذاکرہ کے نتیجہ میں امن وآمان کی فضاء قائم ہو اور سیاسی معاملوں میں مسلمانوں کا کسی طرح کا قومی اور ملی نقصان نہ ہو اور کسی طرح سے اسلامی شعار اور مقاصد شریعت کو نقصان نہ پہنچے، بقیہ صورتوں میں سماجی اور سیاسی مذاکرہ میں کوئی حرج نہیں۔

مذاہب کے مشترکہ تعلیمات سے استفادہ اوران کا حوالہ:

وہ باتیں جو مذاہب میں مشترکہ ہیں ان سے استفادہ بھی درست ہے اور اس سلسلہ میں دوسری کتابوں کا حوالہ دینا بھی درست ہے، اللہ تعالیٰ نے خود اس کا حوالہ دیا ہے: **''قل یا أهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا الله ولا نشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون''** (آل عمران: ۶۴)، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل میں نبی ﷺ کے صفات کے لکھے ہونے کا حوالہ دیا ہے: **''الذین یتبعون الرسول النبی الأمی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التورة والإنجیل یأمرهم بالمعروف وینهاهم عن المنکر ویحل لهم الطیبت ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم إصرهم والأغلال التی کانت علیهم فالذین آمنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذی أنزل معه، أولئک هم المفلحون''** (سورۃ الاعراف: ۱۵۷)، اس آیت کے ذیل میں معارف القرآن میں ہے:

''خاتم الانبیاء ﷺ کی جو صفات تورات وانجیل میں لکھی تھیں ان کا کچھ بیان تو قرآن کریم میں بحوالہ تورات وانجیل آیا ہے اور کچھ روایات حدیث میں ان حضرات سے منقول ہیں جنہوں نے اصلی تورات وانجیل کو دیکھا اور ان میں آں حضرت ﷺ کا ذکر مبارک پڑھ کر ہی وہ مسلمان ہوئے۔

بیہقی نے ''دلائل النبوۃ''، میں نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ اتفاقا بیمار ہوگیا تو آپ اس کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سرہانے کھڑا ہوا تورات پڑھ رہا ہے، آں حضرت ﷺ نے اس سے کہا کہ اے یہودی میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی ہے کہ کیا تو تورات میں میرے حالات اور صفات اور میرے ظہور کا بیان پاتا ہے؟ اس نے انکار کیا تو بیٹا بولا یا رسول اللہ یہ غلط

کہتا ہے، تورات میں ہم آپ کا ذکر اور آپ کی صفات پاتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، آں حضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اب یہ مسلمان ہے انتقال کے بعد اس کی تجہیز وتکفین مسلمان کریں باپ کے حوالے نہ کریں (معارف القرآن بحوالہ تفسیر مظہری ۴/۸۰)، یہ اور اس طرح کے واقعات جس میں آپ ﷺ کے حالات اور صفات کو لوگوں نے تورات اور انجیل سے نقل کیا ہے ثابت کرتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کی کتابوں کا شرعا حوالہ دینا درست ہے اور ان کتابوں سے استفادہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

باہمی مذاکرات کے لئے دوسرے اہل مذاہب کے رسوم میں شرکت:

باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے دیگر اہل مذاہب کے بعض غیر شرکیہ وغیر کفریہ مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کی جاسکتی ہے: "**عن أنس رضی اللہ عنہ أن غلاما لیھود کان یخدم النبی** ﷺ**، فمرض فأتاہ النبی** ﷺ **یعودہ فقال :أسلم فأسلم**" (صحیح البخاری ۲/۸۴۴، کتاب المرضیٰ، باب عیادۃ المشرک)، دوسری حدیث شریف میں ہے: "**وعن سعید بن المسیب عن أبیہ رضی اللہ عنہ قال: لما حضرت أبا طالب الوفاۃ جاءہ رسول اللہ** ﷺ **فوجد عندہ أبا جھل و عبداللہ بن أمیۃ و ابن المغیرۃ**" (صحیح البخاری ۲/۷۰۲-۷۰۳، کتاب التفسیر، القصص، باب قولہ: انک لاتھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء)، علامہ شامی نے کفار کی عیادت اور تعزیت کو جائز کہا ہے: "**وجاز عیادتہ بالإجماع وفی عیادۃ المجوسی قولان الخ وصحح الشامی جواز عیادۃ المجوسی وقال أیضا :وفی النوادر :جار یھودی أو مجوسی مات ابن لہ أو قریب ینبغی أن یعزیہ و یقول: أخلف اللہ علیک خیرا منہ وأصلحک**" (الدر المختار علی رد المحتار ۵/۲۴۸ کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع)۔

فتاوی دار العلوم میں ایک سوال کے جواب میں ہے: "اگر ضرورت اسلامی سے کفار کے ساتھ ہمدردی کی جاوے اور ان کی میت کی تعزیت کی جاوے اور جنازہ کے ساتھ جایا جاوے تو یہ درست ہے، لیکن جے وغیرہ پکارنے سے اور شعار کفار میں شرکت کرنے سے احتراز کیا جاوے — الغرض تالیف قلوب کے لیے اور ضرورت اسلامی کے لیے کفار کے ساتھ اظہار غم کرنا اور ہمدردی کرنا درست ہے، لیکن بہ شرطیکہ شعار کفر میں ان کا شریک نہ ہو" (فتاوی دار العلوم ۱۶/۴۰۲، کتاب الحظر والاباحہ، کفار ومرتدین سے میل جول رکھنے کا بیان)۔

کفار کے شرکیہ اور کفریہ شعار میں شرکت درست نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور موالات سے منع کیا ہے: "**ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار، وما لکم من دون اللہ من أولیاء ثم لا تنصرون**" (ھود: ۱۱۳)، اس آیت کی تفسیر میں علامہ شبیر عثمانی صاحبؒ رقمطراز ہیں، "پہلے "**لا تطغوا**" میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا، اب بتلاتے ہیں کہ جو لوگ ظالم (حد سے نکلنے والے ہیں) ان کی طرف تمہارا ذرا سا میلان اور جھکاو بھی نہ ہو، ان کی موالات، مصاحبت، تعظیم وتکریم، مدح وثناء، ظاہری تشبہ، اشتراک عمل، ہربات سے حسب مقدور محترز ہو، مبادا آگ کی لپٹ تم کو نہ لگ جائے، پھر خدا کے سوا تم کو کوئی مددگار

ملے گا اور نہ خدا کی طرف سے کوئی مدد پہنچے گی، ظالموں کی طرف مت جھکو، بلکہ خدائے وحدہ لاشریک لہ کی طرف جھکو، یعنی صبح وشام اور رات کی تاریکی میں خشوع وخضوع سے نماز ادا کرو، یہ ہے بڑا ذریعہ خدا کی مدد حاصل کرنے کا (ترجمہ شیخ الہند ر ۳۱۰)۔

اسی طرح حدیث شریف میں تشبہ کفار سے منع کیا گیا ہے: "**عن ابن عمر رضی الله عنهما قال :قال رسول الله** ﷺ :**من تشبه بقوم فهو منهم**" (سنن ابی داود، کتاب اللباس، باب فی لبس الشهرة ۵۵۹/۳)، نیز کنز العمال میں ایک حدیث شریف ہے جس میں کسی کے عمل سے راضی ہونے کو اس کے عمل کے ساتھ شریک مانا گیا ہے، لہذا کفار کے ساتھ اگر کسی کام میں شرکت کی جائے تو دل سے اسے ناپسند کرنا ضروری ہے، اور اس میں صرف ضرورت کے بقدر ہی شرکت ہو: "**من کثر سواد قوم فهو منهم، ومن رضی عمل قوم کان شریکا فی عمله**" (کنز العمال، کتاب الصحبة من قسم الاقوال ۲۲/۹ رقم الحدیث: ۲۴۷۳۵)۔

متوارث تہذیب وثقافت سے متعلق اعمال کا ترک:

ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ فساد سے بچنے کی غرض سے کچھ ایسے اعمال جو واجب نہیں ہیں، یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہو، ان کا ترک جب جائز ہوگا، اسی طرح اس کا تعلق شعائر اسلام اور مقاصد شریعت سے بھی نہ ہو، یعنی ایسی تہذیب وثقافت سے نہ ہو جس کی وجہ سے مسلمان پہچانے جاتے ہوں خواہ وہ واجب ہوں یا نہ ہوں، جیسا کہ ہندوستان میں گائے کے ذبیحہ کے سلسلہ میں اکابرین کی رائے ہے، باوجودیکہ گائے کا ذبح کرنا نہ واجب ہے، نہ سنت اور نہ مستحب، بلکہ صرف مباح عمل ہے، لیکن چونکہ اس نے شعار کی حیثیت اختیار کر لی ہے، اس لیے علماء اس کے ترک کی اجازت نہیں دیتے ہیں اور نہ حکومت کی طرف سے ممانعت اور پابندی کو ماننے کے قائل ہیں، ہاں شدید فتنہ کا اندیشہ ہو تو خاص موقع اور خاص مقام پر اس سے وقتی طور پر رک جایا جائے، جیسا کہ جدید فقہی مسائل میں ہے:

"حاصل یہ ہے کہ اصولی طور پر اس (ذبح گائے) کو ممنوع تسلیم کر لینا تو قطعا درست نہیں ہوگا، البتہ فتنہ کے اندیشہ سے وقتی طور پر کسی کام سے مصلحتا رک جانا جائز ہے، جیسے کسی آبادی میں کسی خاص موقع پر اس کی وجہ سے سخت فساد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو، اور وہاں وقتی طور پر اس سے رک جایا جائے، مگر اس کی حیثیت جزوی اور انفرادی ہے" (جدید فقہی مسائل ۲۷۸/۱-۲۷۹)۔

صاحب روح المعانی نے فرمان باری تعالیٰ "**ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوا بغیر علم**" (سورۃ الانعام: ۱۰۸) کے ذیل میں ایک قاعدہ بیان کیا ہے: "**إن الطاعة إذا أدت إلی معصیة راجحة وجب ترکها ما یودی إلی الشر شر**" (روح المعانی جلد ۵/ ۳۶۵/ ۳۶۶)، اس قاعدہ پر حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو ہمارے اس مسئلہ کے حل کے لیے دلیل کا کام دے سکتی ہے (دیکھئے: معارف القرآن ۴۲۱/۳-۴۲۴)۔

علامہ آلوسی کا بیان کردہ قاعدہ مذکورہ اس بات کی طرف مشیر ہے کہ ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ فساد سے بچنے کی غرض سے ایسے اعمال جو شرعا واجب نہیں ہیں یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے، اگر یہ B19

کام مقاصد شرعیہ اور اسلامی شعار میں سے نہیں ہوں اور اس موروثی تہذیب کو مقاصد اسلامی اور اسلامی شعار کا درجہ حاصل نہ ہوا ہو تو ایسے اعمال کا ترک جائز، بلکہ جان ومال ،عزت آبرو کی حفاظت کی خاطر بہتر اور ضروری ہے اور اگر ان کا تعلق مقاصد شرعیہ یا اسلامی شعار سے ہو تو پھر جائز نہیں۔

مذاہب باطلہ کے شرکیہ اعمال پر تنقید اور اس کے حدود وآداب:

مذاہب باطلہ کے شرکیہ عقائد اور ان مسائل پر اظہار خیال میں انہی اصولوں کی رعایت ہونی چاہئے جس کی رعایت انبیاء علیہ السلام نے کی ہے اور انبیاء کی اس کی طرف منجانب اللہ ہدایت بھی کی گئی ہے، وہ دعوت الی الخیر کا اصول ہے جس میں سب سے پہلے حکمت وتدبر پھر خیر خواہی اور ہمدردی کے عنوان سے قرآن کریم کے صحیح مفہوم کی طرف خود قرآن نے بلایا ہے اور آخر میں ”وجادلهم بالتي هي أحسن“ یعنی محبت ودلیل کے ساتھ افہام وتفہیم کی کوشش ہے۔

انبیاء کی دعوت کے عناصر اربعہ کو سامنے رکھ کر ان مسائل پر اظہار خیال کیا جائے جیسے فرمان باری ہے ”ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن“ (النحل: ۱۲۵)، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام صرف کوئی پیغام ہی نہیں پہنچاتے تھے بلکہ حکمت وہمدردی اور خیر خواہی سے اس پیغام کو موثر بناتے اور مخاطب کو ہلاکت سے بچانے کی پوری کوشش کرتے تھے، مذکورہ آیت سے یہی مقصد بتانا ہے۔

مشترک سماجی مسائل پر اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات:

مشترکہ سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر مختلف مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے چاہئیں تاکہ سب ایک فلیٹ فارم پر جمع ہو کر جد جہد کریں، اس کی ایک نظیر نبی کریم ﷺ کی نبوت سے پہلے حلف الفضول کا واقعہ ہے جس میں آپ ﷺ نے شرکت کی اور مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ کوئی مجھے اس معاہدہ کے بدلہ اگر سرخ اونٹ دیتا تو بھی میں نہ بدلتا، اس سے اس طرح کے مذاکرہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، نیز خود قرآن نے اہل کتاب کو اس طرح کے معاملہ میں ایک ہو کر رہنے کی تلقین کی ہے: ”تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم أن لا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون“ (آل عمران: ۶۴)، لہذا اس طرح کے مذاکرہ میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ ایسے مذاکرے ہونے چاہئے۔

ہندوستان میں ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا، جنگ آزادی میں شروع سے اخیر تک ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ رہے اور انھوں نے بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا، سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک میں جہاں مسلمان فرماں رواوں کو خطوط لکھے، وہیں ہندو راجاوں کو بھی خط لکھا اور ان کی طرف سے اس خط کی پذیرائی ہوئی، جلاوطن ہندوستانی حکومت کے قائم کرنے میں ہندو اور مسلمان رہنما برابر کے شریک تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا گاندھی جی سے قریبی تعلق تھا،

جواہرلال نہرو اور اس عہد کے ہندو قائدین سے مولانا ابوالکلام آزادؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ وغیرہ کے قریبی تعلقات تھے، اگر علماء کا اس وقت کے ہندو مذہبی اور سیاسی قائدین سے قریبی ربط وتعلق نہ ہوتا تو ملک کے دستور میں فرقہ پرست عناصر آج جو تبدیلی چاہتے ہیں وہ بات ۱۹۴۷ء میں ہی ہو چکی ہوتی (کلیدی خطبہ حضرت جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب بموقع چوبیسواں سمینار ر ۱۶ تا ۱۷)۔

اسلام مخالف سیاسی پارٹی کے ساتھ مذاکرات:

اگر مذاکرات کا مقصد مسلمانوں کے مصالح کا حصول اور ان سے مفاسد اور ضرر کو دور کرنا اور مثبت نتائج تک پہنچنا ممکن نظر آ رہا ہو اور مسلمانوں کے مسائل برسر اقتدار پارٹی تک پہنچنے کی امید ہو تو ان شرطوں کے ساتھ مذاکرات کی اجازت ہوگی، اگر مذاکرات سے دینی یا دنیوی کوئی کمی مسلمانوں کے اندر واقع ہو تو اس کی اجازت نہیں ہوگی، ”غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی غیر مسلموں کے ساتھ الیکشن میں شرکت ایسے سیاسی شرعی مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں مصالح اور مفاسد کے درمیان توازن کی روشنی میں فیصلہ کیا جاتا ہے، اور ایسے مسائل میں فتویٰ زمانے، مقامات اور حالات کے بدلنے سے بدل جاتا ہے۔

ایسے مسلمانوں کے لئے جو غیر مسلم ممالک میں حق وطنیت کا فائدہ اٹھاتے ہیں، پارلیمنٹری انتخابات اور اس جیسے دیگر انتخابات میں حصہ لینا جائز ہے، کیونکہ اس شرکت کے نتیجہ میں ترجیحی مصالح کے حصول کا غالب امکان ہے، مثلاً اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جاسکتی ہے اور اپنے ملک میں مسلمانوں کے مسائل کا دفاع کیا جاسکتا ہے، اور اقلیتوں کے دینی اور دنیوی حقوق حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اثر اندازی کے میدان میں اپنے رول کو مضبوط ومستحکم کیا جاسکتا ہے، اور معتدل اور انصاف پسند لوگوں کے ساتھ تعاون کر کے حق اور انصاف کی بنیادوں پر تعاون کو اجاگر کیا جاسکتا ہے اور یہ شرکت درجہ ذیل ضابطوں کے تحت ہونی چاہئے:

اول: یہ کہ اس پارلیمنٹری انتخابات میں شریک ہونے والے مسلمانوں کا مقصد اپنی شرکت سے مسلمانوں کے مصالح کے حصول اور ان سے مفاسد اور ضرر کو دور کرنے میں عملی حصہ لینا ہو۔

دوم: یہ کہ مسلمانوں کے اس نمائندے کو یہ غالب گمان ہو کہ اس کی یہ نمائندگی مثبت نتائج تک پہنچائے گی اور اس ملک میں مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے گی، مثلاً مسلمانوں کے مراکز مستحکم ہوں گے، اور ان کے مطالبے فیصلہ لینے والے ذمہ داروں تک پہنچیں گے، اور ان کے دینی ودنیاوی مصالح کی حفاظت ہوگی۔

سوم: یہ ان جیسے الیکشن میں مسلمانوں کی شرکت سے ایسے نتائج نہ مرتب ہوں جن سے ان کے دین میں کمی اور نقصان واقع ہو (المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے ر ۵۰۹ تا ۵۱۰)۔

اسی طرح اس مسئلہ کی نظیر وہ معاہدہ ہے جو آپ ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے بعد مسلم وغیر مسلم قبائل کے درمیان میثاق امن کے نام سے کیا تھا، آپ ﷺ نے ایک ایسا دستاویز معاہدہ مرتب فرمایا جس کے مطابق تمام لوگوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کی

آزادی دی گئی، یہاں تک کہ یہودیوں کی قومی عدالت بھی قائم رکھی گئی، یہودیوں کے بعض مقدمات جب آپ ﷺ کی بارگاہ میں آئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرلیں، اسی طرح ان کے تعلیم وتعلم کے نظام میں بھی کوئی دخل نہیں دیا گیا، یہاں تک کہ یہودیوں کی خواہش پر آپ ﷺ نے ان کی درسگاہ کا معائنہ بھی فرمایا اور جب تک یہودی قبائل کی طرف سے غدر اور دھوکہ دہی کے واقعات پیش نہیں آئے، آپ ﷺ نے اس معاہدہ کو باقی رکھا (کلیدی خطبہ بموقع چوبیسواں سمینار ۱۵/۱۶)۔

بین مذہبی مذاکرات اور بے پردہ غیر مسلم عورتوں کے مسئلہ کا حل:

مذہبی مذاکرات کی مجلسوں اور پروگراموں میں اسٹیج پر عورتیں ہوں تو ایسے مواقع پر مسلمانوں کا طرز یہ ہونا چاہئے کہ ان کی طرف بغیر ضروت کہ نہ دیکھیں اور بغیر ضرورت کے ان سے بات نہ کریں، بلکہ احتیاط برتیں، لیکن جب ان کی تقریر ہو جس سے بچنا ممکن نہ یا ایسی صورت ہو تو پھر مسلمان بقدر ضرورت ان کی باتوں کو سن سکتے ہیں۔

مذاہب کے درمیان مکالمات اور اس کے اصول – اسلامی تناظر میں

مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری ☆

مذہبی، سماجی اور سیاسی مذاکرات:

آبادیوں کے اختلاط اور تعلقات کے اس پھیلاؤ کی وجہ سے بین مذہبی مذاکرات کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے، کیوں کہ مذاکرات دوسروں کو سمجھنے، اپنے آپ کو سمجھانے، غلط فہمیوں کو دور کرنے، امن وامان کو قائم رکھنے، باہمی اختلافات کو صلح کی میز پر حل کرنے، شدت پسندی کو روکنے اور بقائے باہم کے اصول پر رواداری اور ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ رہنے کو آسان بناتے ہیں، یہ سب باتیں دل کو بہلانے کے لئے ہے، درحقیقت بات یہ ہے کہ یہود ونصاری مسلم قوم کو مذہب اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے اور اسلام کی جو اپنی ایک امتیازی شان ہے اس کو ختم کرنے کی غرض سے فیشن ایبل طریقے مختلف مذاہب کے درمیان مکالمات ومذاکرات کا نیا مارکہ ایجاد کیا ہے، تاکہ اسلام کی اصل صورت کو مسخ کردیا جائے، اور نصرانیت کو فروغ دیا جائے، ارشاد باری ہے: **"المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض يأمرون بالمنكر وينهون عن المعروف ويقبضون أيديهم نسوا الله فنسيهم إن المنافقين هم الفاسقون"** (سورہ توبہ: ٦٧) (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں کہ بری بات کی تعلیم دیتے ہیں اور اچھی بات سے منع کرتے ہیں، اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں، انہوں نے خدا کا خیال نہ کیا، پس خدا نے ان کا خیال نہ کیا، بلاشبہ یہ منافق بڑے ہی سرکش ہیں)۔

مختلف مذاہب کے درمیان مذہبی، سماجی اور سیاسی وغیرہ کے ان تمام پہلوؤں پر باہمی مذاکرات کرنا اپنے آپ کو یہود ونصاری اور کفار کے سامنے خود سپردگی کرنے کے مترادف ہوگا اور مسلم قوم اور اسلام کی غیرت اور وقار کے خلاف بھی ہے، دین باطل کے ماننے والوں کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل وخوار کرنا ہے، اس پرآشوب ماحول میں یہود ونصاری اور ہنود ومشرکین وغیرہم سے مکالمات ومذاکرات کرنا شرعاً، عقلاً، دیانۃ، سیاسۃ، حرام ہے، اللہ کے لئے ایسے اقدام کرنے سے اجتناب واحتراز کیا جائے، اسی میں اسلام اور مسلم قوم کی بھلائی مضمر ہے، ان تمام معروضات اور ادلہ اربعہ کی روشنی میں فیشن ایبل مارکہ ''مکالمات ومذاکرات'' اسلام اور مسلم قوم کے لئے سم قاتل ہے، اس ناروا طریقے سے اسلام اور مسلم قوم کی بیخ کنی کی جائے گی، بایں وجہ اس کو میں حرام سمجھتا ہوں (سورہ قصص: ۵۵، سورہ مائدہ: ۵۱۔ ۵۷، ۱۰۰، مسلم ۲/ ۳۴۱، ابوداؤد ۲/ ۵ ٦۳ تا ٦ ٦۳، مسند حمیدی ۲/ ۵۲ ۳ تا ۳۵۳)۔

☆ خادم مدرسہ اسلامیہ شکر پور، بھرواڑہ ضلع دربھنگہ، بہار۔

باہمی مذاکرات کے درمیان دوسرے مذاہب کی کتابوں کا حوالہ دینے اور استفادہ کرنے کا شرعی حکم:

اسلام نے ہم کو ایک انمول اور قیمتی اصول دیا ہے: ''**خذ ما تعرف و دع ما تنکر**'' (مجمع الزوائد ۷/۲۷۵۔۲۷۹، اتحاف السادۃ المتقین ۶/۳۵۴، موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف ۴/۵۹۷) (جو چیز اچھی ہو اس کو لے لو اور جو چیز خراب ہو اس کو چھوڑ دو)۔

اس کی روشنی میں دیگر مذاہب کے علوم سے فائدہ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، جب کہ ہمارے مقاصد شرعیہ سے متصادم نہ ہوں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن فحیث وجدھا فھو أحق بھا**'' (ترمذی ۲/۹۸، ابواب العلم، باب فی فضل الفقہ علی العبادۃ، ابن ماجہ ۲/۳۰۷، ابواب الزہد، باب الحکمۃ، مکتبۃ الاتحاد دیوبند، واللفظ للترمذی، تفسیر ابن کثیر ۶/۳۵، اسرار المرفوعہ/۲۸۴، کشف الخفاء ۱/۴۳۵، موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف ۴/۱۵۷ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان ۲۰۰۴/۲۴ ۱۴ھ) (حکمت و دانائی اور علم کی باتیں مسلمانوں کی گم شدہ دولت ہے، جہاں کہیں بھی پائے اس کو حاصل کرے کیوں کہ اس کا وہ زیادہ حق دار ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مختلف مذاہب کے درمیان بہت سی تعلیمات میں جو اشتراک پایا جاتا ہے، بہ ایں وجہ باہمی مذاکرات کے موقع پر ایسی چیزوں کے بارے میں دوسرے مذاہب کی کتابوں کا حوالہ بہ طور استشہاد کے دیا جاسکتا ہے اور ان سے استفادہ بھی کیا جاسکتا ہے مگر جہاں پر ہمارے مصادر شرعیہ واسلامیہ سے متصادم ہوگا تو اس کا ترک لازم ہوگا۔

غیر مسلموں کے تہواروں میں شرکت کرنے کا حکم:

اہل باطل کی مجلسوں سے پرہیز کا حکم:

قرآن کریم کی آیات ''سورۃ الانعام: ۶۸ تا ۷۳'' میں مسلمانوں کو ایک اہم اصولی ہدایت دی گئی ہے کہ جس کام کا خود کرنا گناہ ہے اس کے کرنے والوں کی مجلس میں شریک رہنا بھی گناہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہئے .... پھر اہل باطل کی مجلس سے رخ پھیرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ اس مجلس سے اٹھ جائیں، دوسرے یہ کہ وہاں رہتے ہوئے کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، ان کی طرف التفات نہ کریں، لیکن آخر آیت میں بتلادیا گیا ہے کہ مراد پہلی ہی صورت ہے، کہ ان کی مجلس میں بیٹھے نہ رہیں، وہاں سے اٹھ جائیں۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ہر ایسی مجلس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہئے جس میں اللہ تعالی یا اس کے رسول ﷺ یا شریعت اسلام کے خلاف باتیں ہورہی ہوں، اور اس کو بند کرنا یا کرانا یا کم از کم حق بات کا اظہار کرنا اس کے قبضہ واختیار میں نہ ہو، ہاں اگر ایسی مجلس میں بہ نیت اصلاح شریک ہو اور ان لوگوں کو حق بات کی

تلقین کرے تو مضائقہ نہیں، اور آخر آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ یاد آجانے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھو، اس سے امام جصاص نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ایسے ظالم، بے دین اور دریدہ دہن لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنا مطلقاً گناہ ہے، خواہ وہ اس وقت کسی ناجائز گفتگو میں مشغول ہوں یا نہ ہوں .... (معارف القرآن ۳/۳۷۰ تا ۳۷۵)۔

برہمن لوگوں کے تہوار میں شریک ہونا، سوال نمبر ۸۴۹ کے تحت حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ (۱۲۶۸ھ۔ ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۴۸ء۔۱۸۸۶ء) جواب تحریر فرماتے ہیں: ''ایسے لہو ولعب کفار میں اہل اسلام کو شریک ہونا حرام ہے، بلکہ ان کی موافقت ورضا موجب کفر ہوتی ہے (مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحیٔ اردو/ ۵۴۱ تا ۵۴۲ مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

ان معروضات کی روشنی میں یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ غیر مسلموں کے تہواروں میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے، بہ ایں وجہ ایسے ناروا مجلسوں، تہواروں، میلوں میں جانے سے اجتناب واحتراز کیا جائے، باہمی مذاکرات اور خوش گوار تعلقات کے لئے دیگر اہل مذاہب کے بعض مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے بھی شرکت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

غیر واجب اعمال کا ترک:

ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے بھی ایسے اعمال کو ترک نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر چہ وہ چیز شرعاً واجب نہ ہو، یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہو، ہر حال میں اس پر عمل پیرا رہنا چاہئے، مادر وطن ہندوستان میں متعصب ومتعنت قسم کے برادران وطن اپنی کثرت کی بنا پر مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتی آرہی ہے، گائے ذبح کرنا اور قربانی کرنا اور اس کا گوشت کھانا ایک جائز ومباح فعل ہے، فرض واجب نہیں، البتہ اگر کوئی ہندو اپنے مذہب کے نقطہ نگاہ سے اس کو زبردستی روکے تو مسلمان کو اس وقت باز آنا درست نہیں ہے اور ہندو کی ممانعت مبنی ہے ان کے اعتقاد باطل پر اور اہل باطل کے اعتقاد کو تسلیم کرلینا مسلمان کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے، اہل باطل، اہل ہنود کو خوش رکھنے کے لئے گائے کا گوشت کھانا اور گائے کی قربانی کرنا چھوڑ دینا، اسلامی وہندی تناظر میں قطعاً جائز نہیں ہے، مسلمان اپنے مذہب پر گامزن ہے اور ہنود اپنے مذہب پر گامزن ہے، اس کے مذہب کی توہین وتذلیل نہیں کی جارہی ہے، گوشت کھانے کی روایت بالخصوص گائے کا گوشت کھانا ویدک دھرم سے ثابت ہے، ان کی مذہبی کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کا ذبح گائے کے سلسلہ میں موقف:

سوال ۶۰۵ کا جواب: ''گائے ذبح کرنا اگر چہ فعل مباح ہے واجب نہیں مگر ایسا مباح نہیں کہ کسی زمانہ یا کسی بلاد خاص میں اس کا رواج ہو، اور دوسرے زمانہ یا بلدہ میں نہ ہو، بلکہ یہ ایک طریقہ قدیمہ ہے، زمان آں حضرت ﷺ وتابعین وجملہ سلف صالحین سے تمام بلاد وامصار میں اور اس کی اباحت پر اجماع واتفاق ہے، تمام اہل اسلام کا، ایسے امر شرعی ماثور قدیم سے اگر ہنود

روکیں اور بہ نظر تعصب مذہبی منع کریں تو مسلمانوں کو اس سے باز رہنا درست نہیں ہے، بلکہ ہرگاہ ہنود ایک امر شرعی قدیم کے ابطال میں کوشش کریں، اہل اسلام پر واجب ہے کہ اس کے ابقاء واجراء میں سعی کریں اور اگر ہنود کے کہنے سے اس فعل کو چھوڑ دیں گے تو گنہگار ہوں گے اور مقصود اس جملہ میں جو جواب سابق میں مرقوم ہے، یہ ہے کہ بہ قصد برانگیختہ کرنے فتنہ وفساد کے، گاؤ کشی نہ چاہئے، مثلاً جہاں عملداری ہنود کی ہو اور گائے وہاں ذبح نہ ہوتی ہو وہاں مسلمان بہ قصد ابتدائے مردم آزاری خواہ مخواہ گائے ذبح کریں، یا عید الاضحیٰ میں کسی ہندو کے مکان کے قریب جا کر بہ ایں خیال ذبح کہ فتنہ قائم ہووے، ایسی صورتوں کا ارتکاب نہ چاہئے، بلکہ ایسی حالت میں ترک اولی ہے اور بلاد ہندوستان جہاں ہمیشہ گائے ذبح ہوتی ہے اور مقصود اہل اسلام اس سے فتنہ انگیزی نہیں ہے، بلکہ ابقائے شریعت قدیمہ ہے، ایسی حالت میں اگر ہنود منع کریں تو ترک اس کا اولی نہیں، بلکہ اس کے ابقاء میں سعی واجب ولازم ہے'' (فتاوی مولانا عبدالحئی اردو، ص: ۳۶۹ تا ۳۷۳، مکتبہ تھانوی دیوبند، اشاعت اول ۱۹۸۹ء)۔

ان معروضات کی روشنی میں روز روشن کی طرح یہ بات عیاں ہوگئی کہ ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے کچھ ایسے اعمال کو بھی ترک نہیں کیا جاسکتا ہے جو شرعاً واجب نہیں ہیں، یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے (اسلام میں عزیمت، رخصت، فرض، واجب، سنن، نوافل، مستحباب وغیرہم کی کیا قدر وقیمت ہے، اس کی تفصیلات کے لئے دیکھیے اور پڑھئے: حسامی ر ۵۷ تا ۶۵ فصل فی العزیمۃ والرخصۃ فیصل پبلیکیشنز)۔ اسلامی تاریخ سے وابستہ کوئی ادنی چیز بھی ہوگی تو اس سے مسلمان دست بردار ہرگز نہ ہوگا، **الإسلام يعلو و لا يعلى عليه**۔

مذاہب باطلہ کے معبودان باطل پر تنقید کرنے اور برا بھلا کہنے کا حکم:

جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو، مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو، یا اس کے نتیجہ میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں وہ کام بھی ممنوع ہوجاتا ہے، کیوں کہ معبودان باطلہ یعنی بتوں کو برا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے، اور ایمانی غیرت کے تقاضا سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چوں کہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہوگیا کہ لوگ اللہ جل شانہ کو برا کہیں گے تو بتوں کو برا کہنے والے اس برائی کا سبب بن جائیں گے، اس لئے اس جائز کام کو بھی منع کردیا گیا۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدواً بغير علم**" (سورہ انعام: ۱۰۸) (اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا، پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بدون سمجھے)۔

''اس لئے خلاصہ اس اصول کا جو آیت مذکورہ سے نکلا ہے، یہ ہوگیا کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت وثواب بھی ہو مگر مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کردینا واجب ہوجاتا ہے، بہ خلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لزوم مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کئے جاسکتے''۔

مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کرنے کے حدود وآداب:

مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ حسنہ کو صدفی صد اپنانے کی ضرورت ہے، جس طرح انہوں نے اپنی قوم کو سمجھانے میں جو رول ادا کیا وہی رول ہم لوگوں کو اپنانے کی ضرورت ہے، تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں حکمت وتدبیر سے کام لینا سنت انبیاء ہے، اس لئے ہمیں بھی کامیابی وکامرانی انہیں کے نقش قدم پر چلنے میں حاصل ہوگی، اپنے اندر وہ علمی لیاقت اور اتباع شریعت اور تقوی، صبر وضبط اور تحمل وحلم اور طہارت وپاکیزگی اور سنجیدگی صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین جیسا پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی اور اپنے آپ کو مکمل طور پر ان صفات محمودہ کے اوپر لانے کی ضرورت ہے، جب جاکر ہمیں اس سلسلہ میں بھرپور کامیابی وکامرانی حاصل ہوگی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ ودعوت کے کام میں جو اصول وقواعد کو اپنے سامنے ملحوظ رکھا اس کا تذکرہ قرآن مجید میں محفوظ ہے۔

مشترک سماجی مسائل میں مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے کا حکم:

اسلامی معاشرہ کو مظلوم کی حمایت اور اس کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے اور ظالم کو اس کے ظلم سے باز رکھنے میں مدد کرنی چاہئے، حلف الفضول کا قیام حضرت نبی اکرم ﷺ کے نوجوانی کے دور میں ۵۸۶ء میں ہوا، اس کا مقصد یہی تھا کہ ظالموں کو اس کے ظلم کرنے سے روکا جائے، اور مظلوموں کو اس کے ظلم سے بچایا جائے، جس کی حق تلفی کی گئی ہو اس کو اس کا حق دلایا جائے، کمزوروں، مفلسوں، معذوروں کی مدد کی جائے، کسی کا مال چھین کر نہ لیا جائے، کسی غریب، یتیم کے جائیداد کو غصب کرکے نہ لیا جائے، بیوہ عورت کو نہ ستایا جائے اور نہ اس کے مال واسباب سے تعرض کیا جائے، بلکہ اس کی حفاظت کی جائے، آپ ﷺ نے ان انجمن کے اہل ممبران کے ساتھ مل کر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خوب اچھے انداز میں کام کیا، اس ادارہ ''حلف الفضول'' کی تشکیل وتالیف میں آپ ﷺ نے بھی معاونت کی تھی، اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک ۲۰ سال کی تھی، اس کے چار ارکان تھے: (۱) فضل، (۲) فضالہ، (۳) مفضل، (۴) فضیل۔ عبداللہ بن جدعان بنی تمیم کے سردار کے گھر پر اس ادارہ کی تشکیل ہوئی تھی

(لسان العرب ۱۱/ ۵۲۷ دار صادر بیروت لبنان، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۸/ ۸۵ تا ۸٦، الکویت طبع دوم ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء)۔

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ فی الواقع حضرت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو نیک کام کی طرف بلائے گا، تو اس کو بھی ثواب ملے گا، ان کے ثواب کے برابر جو نیک کام میں اس کی تابع داری کرے گا اور بتانے والے کا ثواب کرنے والوں کے ثواب کو نہ گھٹائے گا (دونوں کو پورا پورا ثواب ملے گا) اور جو شخص لوگوں کو گمراہی کی طرف بلائے گا تو اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا اس کے تابع دار پر ہوگا، گمراہ کرنے والے کا گناہ کرنے والوں کے گناہ کو نہیں گھٹائے گا (دونوں کو برابر پورا پورا گناہ ہوگا)'' (مسلم ۲/ ۳۴۱، ابوداؤد ۲/ ۶۳۵ تا ٦۳٦، مسند حمیدی ۳/ ۵۲ تا ۵۳ ۳ واللفظ لابی داؤد)۔

کسی بھی انسان کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ صرف وہ خود نیک کام کرے اور برائی سے بچا رہے، بلکہ اس کے لئے یہ بھی

ضروری ولابدی ہے کہ دوسروں کو بھی نیکی وبھلائی اور عدل وانصاف کی بات بتائے ، کہیں ظلم ہورہا ہو، اور کہیں خلاف سنت، کافرانہ ومشرکانہ، رسم ورواج کی وبا پھیل رہی ہو، تو اپنی استطاعت وحیثیت کے مطابق اس کو روکنے کی کوشش کرے، ورنہ ایسا شخص بھی گنہگاروں کی فہرست میں شمار کیا جائے گا، اور وہ عذاب کا مستحق ہوگا، اور روز روشن کی طرح یہ بات عیاں ہوگئی کہ باہم مل کر اچھے کام کرنے کی ضرورت عصر حاضر میں بہت زیادہ ہوگئی ہے، اس لئے مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر جدوجہد کریں اور اس کے اچھے ثمرات کی ضیاء پاشی پوری دنیا میں پھیلے اور بالخصوص مادر وطن ہندوستان مکمل طور پر امن وامان کا گہوارہ بن جائے، اسلام میں کوئی تنگی اور کمی نہیں ہے؛ بلکہ بے حد اس کے اندر وسعت وکشادگی ہے، ایسے اچھے کام کرنے کی شریعت مطہرہ نے دل کھول کر اجازت دی ہے۔

ہندوستان میں غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی مذاکرات کرنے کا حکم:

اسلام ایک عالمی، دائمی، ناقابل تبدیل مذہب ہے، اور ولادت سے وفات تک انسانی زندگی گذارنے کا مکمل آئین ودستور ہے، اس لئے انسانی زندگی کے دینی اور دنیوی کے کسی بھی زاویہ اور شعبے کو دین سے الگ نہیں شمار کرتا ہے اور قوانین وفرامین اور احکامات وہدایات کے حق میں کسی بھی پہلو اور گوشہ کو ناقص ودم بریدہ نہیں چھوڑا ہے، سیاست دین کا ایک اہم پاٹ پرزہ ہے، اجتماعی زندگی کے قیام وقرار اور بقا وحفاظت کے لئے نہایت اہم ومؤثر ہے، اسلام میں سیاست کے سلسلہ میں مکمل اصول وضوابط موجود ہیں اور کسی بھی مرحلہ میں سیاسی معاملات کو دین سے جدا نہیں کیا ہے، بلکہ اسلام کا یہ ایک اہم اٹوٹ حصہ ہے۔

سیاست اسلام سے کوئی خارج چیز نہیں ہے کہ اس سے پہلوتہی کی جائے، بلکہ اسلام میں سیاست کی بڑی اہمیت اور قدر ومنزلت ہے، اس کے لئے گیرائی وگہرائی کے ساتھ قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، جب ہم ہندوستان کے باشندے ہیں تو ہم کو بھی سیاسی میدان میں حصہ لینے کا حق ہے اور برادران وطن کے ساتھ شوق وذوق سے ان کے ساتھ سیاسی مذاکرات کرسکتے ہیں، شرعاً غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی مذاکرات کرنا جائز ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے بھی مشرکین مکہ کے ساتھ اس قسم کی گفتگو کی تھی، صلح حدیبیہ یکم ذوالقعدہ ۶ھ مطابق ۱۳/مارچ ۶۲۸ء کو ہوا تھا (صلح حدیبیہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے: شمس التواریخ ۳/۲۹۷ تا ۳۰۲ مطبع لامع النور آگرہ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء)۔

ہم لوگ جمہوریت کے قائل ہیں آمریت کے نہیں، جمہوریت اور آمریت میں بنیادی فرق ہے: جمہوریت میں عوامی رائے کا احترام کیا جاتا ہے، عامۃ الناس کی بات مانی جاتی ہے، لیکن ایک آمر من مانی کرتا ہے، اور عوام کو محض ڈنڈے کے زور سے ہانکتا ہے، اس لئے ہندوستان میں مسلمانوں کو حتی المقدور سیاست سے وابستہ رہنے کی اشد ضرورت ہے، اگر ہم لوگ یہاں کے سیاسی میدان سے کنارہ کش ہوجائیں گے، تو پھر غیروں کو سب سے زیادہ چھوٹ مل جائے گی، پھر تو وہ ڈکٹیٹر بن کر من مانی کرے گا

اور خواص وعوام کو اپنے ڈنڈے کے زور سے ہانکے گا، پھر بعد میں کف افسوس ملنے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ ہوگا، اس لئے اہون البلیتین کا انتخاب کرلیں، ہمارے لئے اس ملک کی سیاست میں مشارکت لابدی ولازمی ہوگی، کیوں کہ اس ملک میں بلاشرکت سیاست مسلمانوں کا کوئی وزن ووقار نہیں رہے گا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اور اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس کے آغاز ہی میں مدینہ منورہ سے متصل یہودی قبائل سے آپ نے معاہدہ کیا تھا، یہ اسوہ حسنہ ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے کہ ہم بھی غیر مسلموں کے ساتھ سیاست میں مذاکرات ومعاہدات وغیرہ کرسکتے ہیں (یہود سے معاہدہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے: تاریخ اسلام ۱/۳۱ تا ۳۲، صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان کے لئے دیکھئے تاریخ اسلام ۱/۵۱ تا ۵۴، از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنفین اعظم گڈھ یوپی ۱۹۹۸ء)۔

مذہبی وسیاسی اور دینی جلسوں میں مسلم وغیر مسلم عورتوں کی شرکت شرعی نقطہ نظر سے حرام ہے:

ہمارے معاشرہ میں مردوزن کا باہمی اختلاط بھی فقدان غیرت کی ایک واضح مثال ہے، اسلام میں پردے کا جو تصور ہے، وہ دنیا کے کسی بھی مذاہب کے اندر موجود نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے اندر پردے کا رواج غیر مسلموں کے یہاں بھی کسی نہ کسی درجہ میں تھا اور آج بھی دیہات میں ہندو عورتیں پردے کا لحاظ وخیال کرتی ہیں، لیکن شہروں میں جب مذہبی مذاکرات کی مجلسیں یا پروگرام ہوتے ہیں تو بہت دل کھول کر اسٹیج پر خواتین بھی تقریر کرنے کے لئے براجمان رہتی ہیں، سب سے پہلے ان مجالس کے انعقاد کرنے والوں کے اوپر لازم وواجب ہے کہ خواتین کو پہلے سے ہی آگاہ کردیں کہ جب آپ اسٹیج پر آئیں تو پردے کا لحاظ وخیال کرتے ہوئے آنے کی حتی المقدور کوشش کیجئے، کیونکہ یہ دھارمک استھل ہے اور آپ دختران مادر ہندوستان ہیں آپ اپنے پرکھوں کا خیال رکھیں۔

قرآن مجید، کتب حدیث، کتب فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہوں مذہبی مذاکرہ کی مجلس ہو یا سیاسی مذاکرات کی مجلس ہو یا مذہبی پروگرام کی مجلس ہو، یا شادی بیاہ کی مجلس ہو، مردوں کے ساتھ محفلوں، مجلسوں میں شریک نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ شرعاً یہ ناجائز فعل ہے، محفلوں، مجلسوں، میں ازدحام واجتماع کی وجہ سے فتنہ کا خوف زیادہ غالب رہتا ہے، اگر مردوں اور عورتوں کی محفلیں الگ الگ ہوں تو اس کی گنجائش ہے۔

باب سوم

مختصر تحریریں

بین مذہبی مذاکرات – اصول وآداب

مولانا ابوسفیان مفتاحی ☆

ا۔مختلف مذاہب کے لوگوں سے مذہبی، سماجی اور سیاسی ان تمام پہلوؤں پر باہمی مذاکرات ہوسکتے ہیں، اس کی شکل یہ ہوسکتی ہے، مثلاً ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں، ان کو کسی موقع پر حکومت ہند کے زیر نگرانی میں کوئی مسلم تنظیم باجازت حکومت خلوص کے ساتھ ہندوؤں، پارسیوں، عیسائیوں اور بدھسٹوں وغیرہ کو کسی ہال میں جمع کرے اور ان کے سامنے قرآن کی آیات کریمہ جو اللہ کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر کہ اللہ صفات کمال کے ساتھ متصف ہے، وہ پاک ہے صفات نقص سے، اس کی سب سے بڑی دلیل وہ ہے جس کی طرف قرآن نے رہنمائی کی ہے، کیونکہ اللہ کے بیان کے بعد کسی بیان کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا: ”**ألم نجعل الأرض مهادا والجبال أوتادا وخلقناكم أزواجا وجعلنا نومكم سباتا وجعلنا الليل لباساً وجعلنا النهار معاشا وبنينا فوقكم سبعاً شدادا وجعلنا سراجا وهاجا وأنزلنا من المعصرات ماء ثجاجا لنخرج به حبا ونباتا وجنات ألفافا**“ (النبأ:٦۔١٦)۔

(کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں اور تم کو بنایا ہم نے جوڑے اور بنایا نیند کو تمہاری تکان دفع کرنے کے لئے اور بنایا رات کو اوڑھنا اور بنایا دن کو کمائی کرنے کو اور بنایا ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان اور بنایا ہم نے ایک چراغ چمکتا ہوا اور اتارا ہم نے نچوڑنے والی بدلیوں سے پانی کا ریلا، تاکہ ہم نکالیں اس سے اناج اور سبزہ اور باغ پتوں سے لپٹے ہوئے)۔

اور اللہ تعالی نے فرمایا: ”**إن فی خلق السموات والأرض واختلاف الليل والنهار والفلك التی تجری فی البحر بما ينفع الناس وما أنزل الله من السماء من ماء فأحيا به الأرض بعد موتها وبثّ فيها من كل دابة وتصريف الرياح والسحاب المسخر بين السماء والأرض لآيات لقوم يعقلون**“ (البقرہ:١٦٤)۔

(بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات ودن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو کہ لے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی میں جس کو اتارا اللہ نے آسمان سے پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مر گئے پیچھے اور پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے اس کے حکم کا آسمان وزمین کے

☆ جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

درمیان، بے شک ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے)۔

اور اللہ تعالی نے فرمایا: **"فأقم وجهک للدين حنيفا فطرة الله التی فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلک الدين القيم"** (الروم: ۳۰) (سو تو سیدھا رکھ لینا اپنا منھ دین پر ایک طرف کا ہو کر، وہی تراش اللہ کی جس پر تراشا لوگوں کو بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو، یہی ہے دین سیدھا)۔

اور بعض دیہاتیوں سے رب تعالی کے وجود کے بارے میں دلیل پوچھا گیا تو فرمایا: سبحان اللہ بے شک اونٹ کی مینگنی دلالت کرتی ہے اونٹ پر اور اقدام دلالت کرتے ہیں چلنے پر، تو برجوں والا آسمان اور شگاف والی زمین اور موج والے سمندر یہ تمام دلالت نہیں کریں گے اللہ لطیف اور خبیر کے وجود پر؟ ضرور بالضرور دلالت کرتے ہیں اور دلالت کریں گے۔

اور نقل کیا ہے امام رازیؒ نے امام مالکؒ سے، خلیفہ ہارون رشیدؒ نے ان سے اللہ کے وجود کے بارے میں پوچھا تو اس کے لئے استدلال کیا گیا زبانوں کے اختلاف سے، کہ کچھ لوگ عربی بولتے ہیں اور کچھ اردو، کچھ ہندی اور کچھ انگلش وغیرہ بولتے ہیں، تو یہ زبانوں کا اختلاف دلالت کرتا ہے کہ کوئی ذات گرامی ہے جو زبانوں کو بدلتی ہے اور وہ اللہ ہے، اسی طرح استدلال کیا گیا اللہ کے وجود پر آوازوں کے بدلنے سے، کہ کچھ سریلی و باریک آواز والے ہیں اور کچھ لوگ موٹی و بھدی آواز والے ہیں وغیرہ، یہ آوازوں کا بدلنا دلالت کرتا ہے کہ کوئی ذات گرامی ہے جو آوازوں کو بدلتی ہے اور وہی اللہ ہے، اسی طرح استدلال کیا گیا اللہ کے وجود پر نغموں کے بدلنے سے، کچھ لوگ ترنم و خوش آوازی سے پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ درمیانی آواز سے پڑھتے ہیں اور کچھ سیدھے سادے لہجہ میں پڑھتے ہیں وغیرہ، تو یہ تمام دلالت کرتے ہیں نغموں کے بدلنے پر اور وہ اللہ ہے جو نغموں کو بدلتا ہے۔

اور امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ بعض ملحدین نے ان سے باری تعالی کے وجود کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ان سے فرمایا: تم چھوڑو مجھ کو میں ایک امر کے سلسلہ میں متفکر ہوں جس کے بارے میں میرا امتحان لیا گیا، ان ملحدین نے مجھ سے ذکر کیا کہ سمندر و دریا میں ایک عظیم جہاز و کشتی ہے جس میں طرح طرح کے قیمتی تجارتی سامان ہیں اور اس پر کوئی ملاح نہیں ہے جو ان کی حفاظت کرے اور اس کا کوئی چلانے والا نہیں ہے اور وہ اس کے باوجود جاتا اور آتا ہے اور از خود چلتا ہے اور بڑی بڑی موجوں کو پھاڑتا ہے، یہاں تک کہ اس سے نکل جاتا ہے اور خود ہی جہاں چاہتا ہے چلتا ہے اور کوئی ملاح نہیں ہے جو اس کو چلائے، تو یہ سن کر ملحدین بولنے لگے، یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کو کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا ہے، تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ افسوس ہے تم پر یہ موجودات جس میں عالم علوی و سفلی ہیں جو مضبوط اشیاء پر مشتمل ہیں، ان کا کوئی صانع و بنانے والے نہ ہوگا؟ ضرور بالضرور ہوگا اور ہے، تو اس جواب سے قوم کے لوگ حیران ہو گئے اور قول حق کی جانب لوٹ گئے کہ صانع و بنانے والا ہے اور وہ اللہ ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گئے (دیکھئے فتح الملہم ۱/۵۵)۔

اس جیسی آیات اور عقلی دلائل ان کے سامنے رکھے جائیں کہ وہ اللہ تعالی کے وجود اور وحدانیت اور اس کا کوئی شریک نہ ہونے کے قائل ہو جائیں، انشاء اللہ وہ قائل ہو جائیں گے اور حق کی طرف مائل ہو جائیں گے، إن الله يهدى من يشاء وهو أعلم

بالمهتدين، والله يقول الحق ويهدي السبيل، واللہ اعلم۔

۲۔ وباللہ التوفیق: یہ حقیقت ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان بہت سی تعلیمات میں اشتراک پایا جاتا ہے، جیسا کہ ہندوستان کے تعلیمی ادارے اسپر شاہد ہیں، تو باہمی مذاکرات میں ایسی چیزوں کے بارے میں دوسرے مذاہب مثلاً یہود کی کتاب توارت سے اور عیسائیوں کی کتاب انجیل اور داؤدیوں کی کتاب زبور، اور ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور مجوسیوں وغیرہم کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، اوران سے پورا پورا استفادہ کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرات سلف وخلف اور فقہاء وعلماء اور عامۃ المسلمین وغیرہم استفادہ کرتے ہوئے ان کو خاموش کیا، حتی کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوکر مسلمان ہوگئے اور حق کی طرف لوٹ آئے، **إن الله يهدي من يشاء إلى صراط مستقيم**، اوراظہار حق وصواب کے لئے ان سے مناظرہ کیا بالآخر وہ حق کی طرف جھک گئے، واللہ اعلم۔

۳۔ وباللہ التوفیق: باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے دیگر اہل مذاہب کے بعض مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو کے پیش نظر شرکت نہیں کی جاسکتی، یہ اسلام کی شان علو کے خلاف ہے اور اللہ اور رسول ﷺ کی عادت وسنت کے متصادم ہے، مثلاً یہود کے مذہبی تہواروں میں شرکت کی شرعاً اجازت نہیں ہے، کہ انسان رفتہ رفتہ اسلام کو چھوڑ کر یہودی بن جائے گا اور عیسائیوں کے مذہبی تہوار کرسمس ڈے وغیرہ میں شرکت کی شرعاً اجازت نہیں ہے، کہ انسان رفتہ رفتہ اسلام کو چھوڑ عیسائی بن جائے گا اور ہندوؤں کے تہواروں دسہرہ، بھرت ملاپ اور دیوالی وغیرہ میں شرکت کی شرعاً اجازت نہیں ہے، کیوں کہ اس سے انسان رفتہ رفتہ ہندو بن جائے گا اور شیعوں کے مذہبی تہوار تعزیہ وماتم اور یوم غدیر وغیرہ میں شرکت کی شرعاً اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس سے انسان رفتہ رفتہ شیعہ بن جائے گا۔

ہاں انسانی خدمت وبھائی چارہ کی نیت سے ان کے مریضوں کی عیادت کی اجازت ہے اور غریبوں کی امداد وغیرہ کی اجازت ہے اور بس، کہ اس سے اسلام کی شان علو کا اظہار ہے اور اللہ تعالی کا فرمان: ''**وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين**'' صادق ہے، واللہ اعلم۔

۴۔ وباللہ التوفیق: ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے کچھ ایسے اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے جو شرعاً واجب نہیں ہیں، مثلاً ایام قربانی میں شاہراہ عام پر جانوروں کو ذبح نہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ راستہ کی تکلیف دہ چیز ہے اور ہمارے نبی ﷺ نے راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانے کا امر فرمایا ہے، نیز شاہراہ پر جانوروں کو ذبح کرنا اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے اور نہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے، لہذا ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے اس کو چھوڑا جاسکتا ہے، واللہ اعلم۔

نیز جب منزل تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں تو کسی ایک کی شرط کو چھوڑا جاسکتا ہے، واللہ اعلم۔

۵۔ وباللہ التوفیق: یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام کی نظر میں اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کی گنجائش نہیں ہے، اس جہت سے شرک پر اور معبودان باطل پر تنقید کے سوا چارہ نہیں ہے، لیکن بعض دفعہ غیر شائستہ تنقید دل آزاری کا سبب

B20

بن جاتی ہے، خصوصا ہندوستان میں اور بعض اوقات زبان کی بے احتیاطی کی وجہ سے واقعتاً تنقید دل آزار بن جاتی ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کی حدود ہیں کہ اپنی زبان کو کنٹرول کیا جائے، محض توحید کو دلائل سے مثبت انداز میں ثابت کیا جائے، اس طرح کہ صراحۃً مذاہب باطلہ پر تنقید نہ ہوجائے اور مخفی انداز میں تنقید بھی ہوجائے، اوران مسائل پر اظہار خیال میں اسی طرح کے آداب کی رعایت کی جانی چاہئے، کہ مسلمانوں کے دلوں میں توحید پیوست ہوجائے اور شرک ومذاہب باطلہ سے نفرت ہوجائے، واللہ اعلم۔

۶۔ وباللہ التوفیق: مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں، مردوں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی ظلم وغیرہ پر مختلف مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے ضروری ہیں، ظلم وزیادتی تو کسی بھی مذہب میں روا ودرست نہیں ہے، تاکہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع اور متحد ہوکر جدوجہد کریں اور تاکہ ظلم وزیادتی کا سلسلہ بند ہوجائے، یہی اسلام کی تعلیم ہے، اللہ تعالی نے فرمایا: ’’**ولا تعانوا علی الإثم والعدوان**‘‘، نیز دیگر مذاہب بھی اسی کے علمبردار ہیں، واللہ اعلم۔

۷۔ وباللہ التوفیق: جمہوری ممالک جیسے ہندوستان کے اندر سیاست میں حصہ داری کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس کے لئے بھی بعض اوقات مذہب کی نمائندہ شخصیتوں یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت پیش آتی ہے تو ان کے ساتھ باہمی مذاکرات کئے جائیں گے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں تو ضرور مسلم تنظیمیں آگے بڑھ کر اس کے سدباب کی کوشش کریں، واللہ اعلم۔

۸۔ وباللہ التوفیق: پردے کا تصور جو اسلام میں ہے، دوسرے مذاہب بحالت موجودہ اس سے خالی ہیں، اس صورت حال میں جب بین مذہبی مذاکرات کی مجلسیں یا پروگرام ہوتے ہیں تو بہت سی دفعہ اسٹیج پر خواتین مقرر بھی موجود ہوتی ہیں، ایسے مواقع پر مسلمانوں کا طرز عمل اس کی مخالفت میں ہونا ضروری ہے، اگر مسلم ملک ایسا کرتے ہیں تو یہ حجت نہیں، حجت تو صرف رسول اللہ ﷺ کا عمل بن سکتا ہے اور حضرات سلف وخلف ؒ اور قرون مشہود لہا بالخیر کا دور صالح اس سے خالی ملے گا جو کہ قابل اتباع ہے، واللہ اعلم۔

مختلف مذاہب کے درمیان مکالمات کے اصول وآداب

مفتی عبدالرحیم قاسمی ☆

۱۔ اسلام سے پہلے یہود ونصاریٰ ایک دوسرے کی تردید کرتے تھے: ”قالت الیھود لیست النصاریٰ علیٰ شئ وقالت النصاریٰ لیست الیھود علیٰ شئ“ (یہودیوں نے کہا کہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہودی کسی چیز پر نہیں) یعنی دونوں نے ایک دوسرے کے دین کو غیر معتبر کہا، لیکن اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی: ”فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر“ (جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے) ”لا إکراہ في الدین“ (سورہ بقرۃ) (دین میں زبردستی نہیں)۔

بلکہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے فرمایا: ”قل یا أھل الکتاب تعالوا إلیٰ کلمة سواء بیننا وبینکم أن لا نعبد إلا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون اللہ“ (آل عمران) (آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب تم ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ بنیادی تعلیم کی دعوت کے ساتھ مشترک امور پر مذاکرہ کیا جاسکتا ہے اور جب دینی امور میں کیا جاسکتا ہے تو سماجی وسیاسی مسائل میں بدرجہ اولیٰ اجازت ہوگی۔

۲۔ جو چیزیں دوسرے مذاہب میں مشترک پائی جاتی ہیں، مختلف مذاہب کے باہمی مذاکرہ کے وقت انہی کی کتابوں سے ان مشترک چیزوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ان پر حجت قائم کرنے کے لیے ان کی کتابوں کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

معارف القرآن میں ہے: ”تعالوا إلیٰ کلمة سواء بیننا وبینکم“، اس آیت سے تبلیغ ودعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہشمند ہو جو عقائد ونظریات میں اس سے مختلف ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اس چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہوسکتا ہو (معارف القرآن ۲/۸۷)۔

اور آیت: ”شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحا والذي أوحینا إلیک وما وصینا بہ إبراھیم وموسیٰ وعیسیٰ

☆ ناظم جامعہ حسینیہ خیر العلوم نورمحل روڈ بھوپال۔

أن أقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه" (شوریٰ) (اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لیے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا)۔

آیت کے اس جملہ میں جس دین کی اقامت کا حکم اور اس میں تفرقہ کی ممانعت مذکور ہے وہ وہی احکام الٰہیہ ہیں جو سب انبیاء علیہم السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں، انھیں میں تفرق واختلاف حرام اور موجب ہلاکت امم ہے (معارف القرآن ۷/۶۷)۔

۳۔ شریعت مقدسہ نے مسلمانوں کو ایسے مجمع میں شریک ہونے اور بیٹھنے سے منع کیا ہے جہاں آیات اللہ (یعنی اسلامی احکام) کے ساتھ استہزاء یا توہین یا ان کی تکذیب کی جاتی ہو، قرآن پاک میں ہے: "إذا سمعتم آيات الله يكفر بها ويستهزء بها فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا في حديث غيره، إنكم إذا مثلهم" (سورہ نساء)۔

اہل باطل کے ساتھ مجالست کی چند صورتیں ہیں: اوّل ان کے کفریات پر رضا کے ساتھ، یہ کفر ہے، دوم اظہارِ کفریات کے وقت کراہیت کے ساتھ یہ بلا عذر فسق ہے، سوم کسی ضرورت دنیوی کے واسطے مباح ہے، چہارم تبلیغ احکام کے لیے عبادت ہے، پنجم اضطرار اور بے اختیاری کے ساتھ اس میں معذور ہے (معارف القرآن ۲/۵۸۶)۔

کفایت المفتی میں ہے کہ کفار کے ان میلوں اور اجتماعات میں شرکت ناجائز ہے جو مشرکانہ رسوم پر مبنی ہوں اور ایسے افعال واعمال جو مشرکانہ ہوں کرنا مسلمانوں کے لیے حرام ہے، حدیث شریف میں ہے: "من كثر سواد قوم فهو منهم"، غیر اللہ کی پوجا کرنا شرک ہے، غیر اللہ پر چڑھایا ہوا چڑھاوا حرام ہے، لیکن غیر مسلموں کے ہر اجتماع کا یہ حکم نہیں ہے، ان کی شادی بیاہ کی تقریبات میں دعوت کھانا اور ہدیہ قبول کرنا مباح ہے، اسی طرح غیر مسلم اجتماعات میں انتظام وقیام امن کی غرض سے مسلم رضا کاروں کی شرکت بھی مباح ہے، بشرطیکہ ان کی کسی مشرکانہ رسم میں شرکت نہ ہو، گرنتھ صاحب کو سجدہ کرنا یا پھول چڑھانا مسلمانوں کے لیے حرام ہے، اسلام نے دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کی توہین کرنے اور ان کو برا کہنے سے منع کیا ہے، ان کی تعظیم کرنے کا حکم نہیں دیا، خصوصاً ایسی تعظیم جو عبادت کے درجے تک پہنچتی ہو کسی طرح جائز اور مباح نہیں ہوسکتی، مصالحت اور آشتی کے ساتھ زندگی گزارنا اور تجارت، زراعت، صنعت اور سیاست میں اشتراک عمل کرنا جائز اور بعض حالات میں واجب بھی ہوجاتا ہے، خصوصاً ایسے مقامات میں جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مشترک ہو، یا غیر مسلم آبادی کی کثرت ہو، بہر حال یہ لازم ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کے پابند رہیں اور مذہبی شعائر کی عزت وحرمت محفوظ رہے، ورنہ پھر مسلمان پر مذہب کے تحفظ اور اس کا احترام قائم رکھنے کے فرائض عائد ہوں گے (کفایت المفتی ۹/۸۷-۲۷۷)۔

۴۔ قریش نے رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی زمانہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر کی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے اور حجر اسود کو اپنے دست مبارک سے قائم فرمایا، لیکن قریش نے اس تعمیر میں بناء ابراہیمی سے کسی قدر مختلف تعمیر کی تھی اور

ایک حصہ بیت اللہ کا بیت اللہ سے الگ کر دیا جس کو حطیم کہا جاتا ہے اور خلیل علیہ السلام کی بناء میں کعبہ کے دو دروازے تھے، ایک داخل ہونے کے لیے دوسرا پشت کی جانب سے باہر نکلنے کے لئے، قریش نے صرف مشرقی دروازہ کو باقی رکھا، مگر تغیر یہ کیا کہ بیت اللہ کا دروازہ سطح زمین سے کافی بلند کر دیا تا کہ ہر شخص آسانی سے اندر نہ جا سکے، بلکہ جس کو وہ اجازت دیں وہی جا سکے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ صدیقہ سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے اس کو بالکل بناء ابراہیمی کے مطابق بنا دوں، قریش نے جو تصرفات بناء ابراہیمی کے خلاف کیے ہیں ان کی اصلاح کر دوں، لیکن نو مسلم ناواقف مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اس لیے سر دست اس کو اسی حال پر چھوڑتا ہوں (معارف القرآن ۲/۱۱۵)۔

اس سے معلوم ہوا کہ فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے ایسے اعمال کو ترک کیا جا سکتا ہے جو شرعاً واجب نہیں یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے۔

۵۔قرآن کریم نے جابجا بتوں کے بے حس و بے شعور، بے علم و بے قدرت اور بے بس ہونے کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ سمجھنے والے حقیقت کو سمجھ لیں اور نہ سمجھنے والوں کی غلطی یا کوتاہ نظری واضح ہو جائے، جس کے نتیجہ میں ارشاد ہوا ہے: "**ضعف الطالب والمطلوب**"، یعنی یہ بت بھی کمزور ہیں اور ان کے چاہنے والے بھی کمزور ہیں یا یہ ارشاد ہوا ہے: "**إنکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم**"، یعنی تم اور جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں، یہاں بھی کسی کو برا بھلا کہنا مقصود نہیں، گمراہی اور غلطی کا انجام بد بیان کرنا مقصود ہے اور فقہاء رحمھم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص اس آیت کو بھی مشرکین کو چڑانے کے سبب سے پڑھے تو اس کے لیے یہ تلاوت کرنا بھی سب ممنوع میں داخل اور ناجائز ہے (معارف القرآن ۳/۴۲۱)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "**لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم**" (سورہ انعام) (یعنی تم ان بتوں کو برا نہ کہو ورنہ وہ لوگ حد سے آگے بڑھ کر بے سمجھے بوجھے اللہ کو برا کہنے لگیں گے)۔

قرآنی حکم یہ نازل ہوا جس کے ذریعہ مسلمانوں کو روک دیا گیا کہ وہ مشرکین کے معبودان باطلہ کے متعلق کوئی سخت کلمہ نہ کہا کریں (معارف القرآن ۳/۴۱۹)۔

اسلام نے دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کی توہین کرنے اور ان کو برا کہنے سے منع کیا ہے (کفایت المفتی ۹/۲۷۸)۔

۶۔حضرت ﷺ کے نبی بنائے جانے سے پہلے عرب میں فضل نام کے چند حضرات نے جمع ہو کر سماج کے مظلوم بے سہارا لوگوں کی خدمت کے لیے ایک معاہدہ کیا تھا جو حلف الفضول کے نام سے مشہور ہے، اس میں حضور ﷺ بھی شامل ہوئے تھے۔

"**إن الفضول تحالفوا وتعاھدوا أن لا یقیم ببطن مکۃ ظالم**" (بیشک فضلوں نے آپس میں عہد معاہدہ کیا ہے کہ مکہ کے اندر کوئی ظالم نہیں ٹھہرے گا)۔

"**أمن علیہ تعاھدوا وتواثقوا فالجار والمعتر فیھم سالم**" (امن پر ان سب نے معاہدہ کیا ہے کہ پڑوسی اور مسافر ان میں سلامت رہیں گے)۔

حضرت نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس معاہدہ کے وقت میں بھی عبداللہ ابن جدعان کے گھر میں حاضر تھا، اس معاہدہ کے مقابلہ اگر مجھ کو سرخ اونٹ بھی دیئے جاتے تو ہرگز پسند نہ کرتا اور اگر اب زمانہ اسلام میں بھی اس قسم کے معاہدہ کی طرف بلایا جاؤں تو بھی اس کی شرکت کو ضرور قبول کروں گا (سیرت مصطفیٰ ۱/ ۹۵)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنا چاہئے۔

۷۔ حضور ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد یہ ضروری باتیں محسوس کیں : (۱) اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین، (۲) مہاجرین کے توطن کا بندوبست، (۳) مدینہ کے غیر مسلموں خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ، (۴) مدینہ کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

ان تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ نے مدینہ میں اپنی آمد کے چند ماہ بعد ۱ھ میں ایک نوشتہ مرتب فرمایا جسے مدینہ کے لوگوں نے تسلیم کیا، یہ معاہدہ طرفین کی رفاہیت اور حقوق کی نگہبانی میں جامعیت کے اعتبار سے تاریخ کا اہم ترین باب ہے، یہ دستاویز ترپین (۵۳) دفعات پر مشتمل تھی اور یہ میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے (سیاست خارجہ ص ۱۷۵)۔

اور حدیبیہ میں کفار و مشرکین سے معاہدہ کیا، حضور ﷺ اپنے چودہ سو ساتھیوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کی نیت سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں اطلاع ملی کہ قریش نے عہد کیا ہے کہ آپ کو زیارت نہیں کرنے دیں گے اور ایک دستہ راستہ روکنے کے لئے آن پہنچا ہے تو آپ ؐ نے عام راستہ تبدیل کر کے حدیبیہ نامی کنویں کے قرب و جوار میں قیام فرمایا اور سہیل بن عامر کے ساتھ مذاکرات کرنے کے بعد معاہدہ حدیبیہ طے ہوا (رسول اکرم کی سیاست خارجہ/ ۲۹۳)۔

میثاق مدینہ جو ذکر کیا گیا اس سے بھی دیگر مذاہب کے نمائندوں کے ساتھ مذاکرات اور معاہدہ کرنے کی رہبری ملتی ہے، دیگر مذاہب والوں کے ساتھ بالخصوص جبکہ اس جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں مذاکرہ کرنے اور معاہدہ کرنے کی راہنمائی صلح حدیبیہ سے بھی ملتی ہے۔

۸۔ بے پردہ خواتین کی اسٹیج پر موجودگی کے باوجود مذاکرات کرنے کی گنجائش ہے، جس طرح گواہ اور قاضی کے لیے گنجائش ہے "**کقاص و شاهد يحكم و يشهد**" (درمختار علی ہامش ردالمختار ۵/ ۲۳۷)۔

لیکن خواتین سے نظریں بچاتے ہوئے مخاطب ہونا چاہئے۔

ہندوستان میں بین المذہبی مذاکرات: ایک تاریخی جائزہ

مولانا محمد مشتاق تجاوری☆

موجودہ زمانہ بعض اعتبارات سے ایسا منفرد زمانہ ہے کہ اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی، وسائل حمل ونقل اور ذرائع ابلاغ نے ساری دنیا کو عملاً ایک گاؤں میں تبدیل کردیا ہے، اطلاعاتی ٹکنالوجی کے فروغ نے تعلیمی انفجار کو ہر فرد کی دسترس میں کردیا ہے، انڈسٹری اور دیگر ذرائع آمدنی کے بے تحاشا فروغ نے لوگوں کو انفرادی طور پر خودمختاری بخشی ہے، اور وسائل حیات کی فراوانی نے اجتماعی طور پر ایک دوسرے پر انحصار میں اضافہ کیا ہے۔

عالمگیر تبدیلیوں کے اس عہد میں جہاں اور بہت سے مسائل پیدا ہوئے ان میں ایک مسئلہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان روابط کا ہے، ماضی قریب تک یہ صورت حال تھی کہ ایک ملک اور ایک علاقے میں عام طور پر ایک ہی مذہب کے ماننے والے رہا کرتے تھے، اور ان کے باہمی روابط میں مذہب ایک اضافی حیثیت رکھتا تھا لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ مشکل سے ہی کوئی ایک خطہ یا علاقہ ہوگا جہاں صرف ایک مذہب کے ماننے والے ہوں، ورنہ ہر جگہ مختلف مذاہب اور روایات کے لوگ اپنے اپنے تاریخی وروایتی سرمایہ کے ساتھ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہوں، ورنہ ہر جگہ مختلف مذاہب اور روایات کے لوگ اپنے اپنے تاریخی وروایتی سرمایہ کے ساتھ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں، ان حالات میں مذاہب کے ذمہ داروں کو بھی مجبور کیا کہ وہ اپنی روایتی فکر پر نظر ثانی کریں اور مذہبی متون میں ایک دوسرے کے مذاہب کے احترام سے متعلق جو تعلیمات ہیں یا مختلف مذاہب میں جو مشترک روایات ہیں ان کو عام کر کے ایک نیا سماج اور نیا معاشرہ تشکیل دیں جو باہمی احترام اور باہمی اعتماد کی بنیاد پر استوار ہو اور جس میں اپنے مذہب کے ساتھ دوسرے کے مذہب کو بھی عزت کا مقام دیا گیا ہو۔

اس سلسلہ میں دو مثالوں کی طرف اشارہ کردینا کافی ہے: ۱۹۶۵ میں ویٹیکن میں ایک باضابطہ کانفرنس ہوئی، اور اس میں اسلام کو ادیان ابراہیمی کی فہرست میں شامل کیا گیا اور اس موقع پر مسلمان قوم کی مذہبیت اور ان کے دینی اعمال کی سماجی اور روحانی اہمیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا، ایک دوسری مثال عالم اسلام کی متعدد کانفرنسیں ہیں جن میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فروق سے متعدد قدیم فقہی سرمایے پر نظر ثانی کی گئی اور ذمی، دار الحرب اور دار الاسلام اصطلاحات کو بدلنے کی سفارش کی گئی، ذمی کی جگہ لفظ ''مواطن'' کے استعمال پر زور دیا گیا، راشد الغنوشی نے ''حقوق شہریت'' میں اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

مختلف مذاہب کے درمیان اس تعامل اور باہمی اخذ واستفادہ کی تاریخ میں برصغیر ہند کی شناخت سب سے الگ ہے، ہندوستان قدیم ترین زمانے سے مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کا مرکز رہا ہے، ہندوستان میں کبھی بھی لسانی، تہذیبی یا مذہبی یگانگت نہیں رہی، بلکہ ہمیشہ تکثیریت رہی، اس لئے قومی سطح پر ہندوستان کا مزاج توسع اور رواداری کے معاملہ میں دیگر ممالک سے مختلف رہا، یہاں دوسرے افکار و مذاہب کو جگہ دینے کی روایت رہی ہے اوران کے احترام کا جذبہ رہا ہے۔

خاص اسلام کے حوالہ سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں اسلام کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود اسلام کی ہے، عرب اور ہند کے تعلقات اسلام سے قبل بھی استوار تھے، اسلام لانے کے بعد بھی عرب مسلسل ہندوستان آتے رہے اور ساحلی علاقوں میں ان کی بستیاں قائم رہیں، ان کی تفصیلات حسن صرافی کی ''کتاب عجائب الہند''، بزرگ بن شہر یار کے سفرنامے اور مسعودی کی کتاب ''روح الذہب'' میں موجود ہیں، قاضی اطہر مبارکپوری نے عرب و ہند کے تعلقات میں اور سید سلیمان ندوی نے عربوں کی جہاز رانی میں ان روایات کو جمع کر دیا ہے۔

شمالی ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں عربوں کی آمد اس وقت شروع ہوئی جب بنی امیہ اور بنی ہاشم کے درمیان خونریز تصادم شروع ہوئے، شام اور عراق سے بہت سے شکست خوردہ لوگ اپنی جان بچا کر سندھ میں پناہ گزیں ہوئے، اتفاق سے اس وقت راجہ داہر اپنی حکومت کے استحکام کے لئے جدوجہد کر رہے تھے، راجہ داہر نے ان مسلمان پناہ گزینوں سے بھی اپنے علاقے کی بغاوتوں کے استیصال کے لئے درخواست کی اور انہوں نے اپنی جنگی تدابیر سے راجہ داہر کی بہت مدد کی، ان میں دو مسلمان سردار محمد علافی اور حسین سامہ بہت مشہور ہیں، جن کے ساتھ پانچ سو مسلمانوں کا دستہ تھا، بعد میں راجہ داہر نے ان کو اپنے دربار میں خصوصی جگہ عطا کی اور حامد الکوفی کی کتاب ''چچ نامہ'' کے اندراجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان مسلمانوں پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔

جب سندھ کو محمد بن قاسم نے فتح کیا، اس کے بعد ہندو، بودھ اور مسلمانوں کے درمیان مکالمہ کا آغاز ہوا، راجہ داہر کے پایہ تخت برہمن آباد کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کو خط لکھ کر مذہبی معاملات میں استفسار کیا، حجاج بن یوسف نے اس کے جواب میں لکھا:

''تمہارا خط ملا، برہمن آباد کے ہندو خواہشمند ہیں کہ مندروں کو آباد رکھیں اور ان کو اپنے آبائی مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی جائے، جب وہ لوگ ہماری اطاعت قبول کر کے جزیہ ادا کرنے پر راضی ہیں تو ان کے مذہبی اور عائلی مسائل میں مداخلت کی ضرورت نہیں ہے، ان کی جان کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور ان کے مال میں کوئی شخص دست درازی نہ کرے وہ سب ہماری پناہ میں ہیں'' (چچ نامہ/۹۰)۔

حامد الکوفی نے مزید لکھا ہے کہ فاتح سندھ نے خاص طور پر مذہبی رواداری پر بہت زور دیا، علماء دمشق سے یہ فتوی حاصل کیا گیا کہ ہندو مندروں کی وہی حیثیت ہوگی جو خلافت کے دوسرے علاقوں میں عیسائی کلیساؤں یا یہودی معبدوں کی ہے، برہمنوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو ہندو راجاؤں کے زمانے میں حاصل تھے، اس طرح ہندوستان کے اندر اسلام آنے کے

بعد اس سرزمین کی اس روایت کو مزید فروغ ملا جو مذہبی رواداری کی روایت یہاں کا طرہ امتیاز تھی۔

سندھ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوجانے کے بعد عربوں اور مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں ایک نیا دروازہ کھل گیا، عرب اور مسلمانوں نے شمالی ہند میں تجارتی روابط بھی استوار کئے اور ہندو راجاؤں کے دربار میں ملازمتیں بھی کیں، الکامل فی التاریخ اور دوسری تاریخ کی کتابوں میں ایسے متعدد واقعات موجود ہیں جن میں شمالی ہندوستان کے ہندو راجاؤں کے مسلمان ملازمین کا تذکرہ ہے، اس طرح ہندو اور اسلام دونوں مذاہب کے درمیان ایک عملی اور سماجی مکالمہ کا آغاز ہوا جس میں وقت کی رفتار کے ساتھ مزید اضافہ ہوتا گیا۔

عربوں کو ہندوستان سے خاص لگاؤ تھا، غالباً صدیوں کے تجارتی اور سماجی روابط نے ایک خاص طرح کی باہمی انسیت پیدا کردی تھی، اس لئے عربی ادب میں لفظ ہند کا استعمال عام طور پر اچھے معنوں میں ہوتا رہا ہے، عربوں کے بڑے گھرانوں میں خواتین کا ایک پسندیدہ نام ہند تھا اور لفظ ہند کو معیار کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، جیسے سیف ہند وغیرہ۔

عربوں میں علمی تحریک شروع ہوئی تو جس طرح انہوں نے دیگر قوموں کی کتابوں کے عربی ترجمے شروع کئے، اس طرح سنسکرت کتابوں کے بھی تراجم شروع کئے، سنسکرت کی پہلی کتاب جس کا عربی میں براہ راست ترجمہ ہوا وہ غالباً برہم سندھات تھی، ابراہیم فرازی نے ۱۵۶ھ میں اس کا ترجمہ کیا اور اس کے ذریعہ ہندوستانی ریاضیات سے عرب واقف ہوئے، اس دوران ہندوستان کے بہت سے پنڈت اور سنسکرت کے ماہرین بغداد پہنچے اور ان کے ساتھ مسلم علماء کے مذہبی مناظرے، مباحثے بھی ہوئے، اور پنڈتوں میں سے بہت سوں کے نام اور ان کے کام کی تفصیلات ابن ندیم نے الفہرست میں بیان کی ہے۔

ہندوستان کو سمجھنے اور یہاں کے علوم ومعارف سے آگاہی کی پہلی باضابطہ کوشش عربی کے مشہور دانشور جاحظ نے کی اور ان کے بعد ابن ندیم نے، لیکن ان کے کام زیادہ تر ترجمہ یا سنی ہوئی باتوں پر مبنی تھے، عرب علماء اس کمزوری کا احساس کرتے تھے، البیرونی نے اس کام کو مکمل کیا، اس نے سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کر کے ہندوستان کو سمجھا اور یہاں کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور ایک مستقل کتاب عربی میں تصنیف کی، جو کتاب الہند کے نام سے مشہور ہے۔

ہندوستان میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد اس باہمی تعامل کو مزید فروغ ملا، مسلمانوں نے مزید ہندوستانی زبانیں سیکھیں، یہاں کے مذہب اور آداب سے واقفیت حاصل کی، مسعود سعد سلمان کو ہندی کا پہلا باضابطہ شاعر کہا جاتا ہے، بابا فرید الدین اور دوسرے بہت سے مسلمان صوفیہ کا کلام یہاں اس طرح مقبول ہے جس طرح اپنے مذہب کا کلام مقبول ہے۔

تصوف نے اس بین المذاہب تفہیم کو مزید تقویت بخشی اور تصوف کے زیر اثر یہاں وہ گنگا جمنی تہذیب قائم ہوئی جس نے موجودہ ہندوستانی معاشرہ تشکیل دیا، روایتی طور پر ہندوستانی معاشرہ کا پیغام مذہب کا پیغام ہے، جو اپنے مذہب پر جتنا عمل پیرا ہے وہ سب کے لئے اتنا ہی قابل احترام ہے، جو اچھا ہندو ہے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے یکساں قابل احترام ہے، اور جو اچھا مسلمان ہے وہ بھی ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے یکساں قابل احترام ہے، اس پیغام کا سبق ہمیں امیر خسرو کے اس واقعہ

سے ملتا ہے جس میں حضرت نظام الدین اولیاء نے ان سے فرمایا:

ہر قوم راست دینے وقبلے گاہے

(ہر قوم کا اپنا مذہب ہوتا ہے اور اپنا قبلہ ہوتا ہے)

اپنے مذہب پر عمل کرنا اور اچھی طرح عمل کرنا اور دوسرے کے مذاہب کا احترام کرنا اور اپنے مذہب کی طرح کرنا یہ ہندوستانی روایت ہے اور ساری دنیا کو ہندوستان سے یہ پیغام سیکھنے اور اس کو رائج کرنے کی ضرورت ہے، دنیا آج جہاں کھڑی ہے، ہندوستان اس مقام پر ڈیڑھ ہزار سال پہلے تھا، ایک اجنبی مذہب، اجنبی زبان، اجنبی تہذیب اور روایات کا ہندوستان کے مذہب وثقافت کا سامنا ہوا، اسلام نے ہندوستان کو وہ دیا جو شاید کسی ملک وقوم کو کسی ایک مذہب نے دیا ہو، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جدید ہندوستان کی تشکیل بھی اسلام نے کی تھی، لیکن اس سرزمین میں جو رواداری اور جگہ دینے کی روایت تھی، قبولیت حق کا جو جذبہ تھا وہ بھی بے مثال ہے۔

دہلی سلطنت میں ہندو مذہب کے ساتھ ساتھ دیگر ہندوستانی مذاہب کے ساتھ بھی مکالمہ کی روایت کا آغاز ہوا، فیروز شاہ تغلق نے جین مذہب کے عالموں کو بھی خصوصی جگہ عطا فرمائی، علماء، فقہاء اور صوفیہ نے بھی اس عہد میں بڑی خدمات انجام دیں، اور مغل عہد کے آتے آتے اسلام اور ہندوستانی مذاہب کے درمیان مکالمہ اور بقائے باہم کے فکر کا جذبہ اور بڑھ چکا تھا، مغلیہ سلطنت کے بانی بابر کی وصیت، ہمایوں کا رانی کرن وتی کی راکھی کا احترام اور اکبر کا عبادت خانہ اور وہاں کے مذہبی مباحث ہیں، لیکن سب سے بڑا کارنامہ داراشکوہ نے انجام دیا، داداشکوہ نے اپنشد کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، دراصل یہ فارسی ترجمہ ہی وہ پہل ہے جس نے ہندو مذہب کو عالمگیریت بخشی، اس زمانے میں فارسی زبان، علمی زبان تھی، اپنشدوں کا اس میں ترجمہ ہوا تو آناً فاناً یورپ میں پھیل گیا اور پھر یورپ خاص طور پر جرمن اور برطانیہ کے محققین نے قدیم ہندوستانی روایات کو اپنا موضوع بنایا۔

اورنگ زیب کا کردار کچھ مخصوص وجوہات کی بنا پر صحیح شہرت نہ پاسکا، لیکن ہندوستانی تہذیب وروایات کو فروغ دینے میں انکی بڑی خدمات ہیں، اور یہ کوئی انجام نہیں تھا، بلکہ سفر مسلسل کے چند نمونے ہیں، آخری مغلوں کے زمانے میں بھی یہ کام جاری رہا اور انگریزوں کے زمانے میں بھی یہ روایت استوار رہی اور آج بھی جاری ہے۔

اسلام کے ساتھ ہندوستان کا یہ طویل سفر تاریخ کے سینہ پر اس طرح نقش ہے جس طرح دیوار چین ماہ وسال کی گردش کے باوجود یہ کہانی سناتی ہے کہ اس نے کس طرح دشمنوں سے چین کی حفاظت کی، ہندوستان کی اس ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں سرد وگرم ہر طرح کے موسم آئے، لیکن عدل وانصاف اور حق کے تقاضوں کو ہمیشہ پورا کیا گیا، اگر کبھی مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی مذہبی یا کسی دوسری عصبیت کی بنیاد پر ہوئی تو ہندوؤں نے احتجاج کیا اور اگر کبھی مسلمان حاکم نے کسی وجہ سے کسی ہندو کو اذیت دینے کی کوشش کی تو مسلمان علماء چیخ اٹھے، انہی باہمی احترام اور ایک دوسرے کے مذاہب کو جگہ دینے کی روایت کا نام ہندوستان ہے، اور یہ روایت منزل نا آشنا سفر ہے، یہاں تشنہ لبی مے کشی کا حاصل ہے، ہم کسی منزل کی طرف گامزن نہیں ہیں، بلکہ منزل پر سفر

میں ہیں، یہاں جو روایت ہے اور جس نے مختلف مذاہب کو احترام اور جگہ عطا کی یہی منزل ہے، لیکن یہ منزل تاریخ کے دوش پر خود ہی شریک سفر ہے۔

انسان کی ہر کاوش میں کمی کا عنصر ضرور رہ جاتا ہے، یہاں بھی اسکی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جیسے ہندوستان میں ایک دوسرے کے مذاہب کا احترام تو سیکھا اور احترام کے لئے مذہبی بنیادیں استوار کیں، جیسا کہ مرزا جانجاناں نے وضاحت کی ہے، غالباً چار یا پانچ بنیادیں ہیں جن پر کسی مذہب کا ہم احترام کریں گے، ایک توحید ہے، دوسرا کتاب ہے، تیسرا اعمال ہیں وغیرہ لیکن ہم نے دوسروں کے مذہب کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اگر ہم ایک دوسرے کے مذہب کو بھی مزید گہرائی کے ساتھ سمجھیں تو شاید ہندوستان دنیا کو مزید بہتر نمونہ فراہم کر سکے۔

بین مذہبی مذاکرات کے اصول وآداب

مفتی محمد ابوبکر قاسمی ☆

جن شخصی وجمہوری حکومتوں میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، وہاں بین المذاہب مذاکرات کا موقع اگر کسی مسلمان عالم کو ملے تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس میں حصہ لینا چاہئے اور کوشش کرنا چاہئے کہ جس قوم سے گفتگو ہو ان سے انسانیت کی بنیاد پر جن امور ومعاملات میں دونوں قوموں کے درمیان اشتراک پایا جائے ان کو ملحوظ رکھ کر ہی باہم گفتگو کا آغاز کیا جائے، چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۶۴ میں حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کرکے اہل کتاب سے مذہبی گفتگو کا طریقہ بتائے ہوئے ارشاد ربانی ہے:

"قل یاأهل الکتاب تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم أن لا نعبد إلا الله" (إلی قوله) "فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون" (۶۴) (اے محمد ﷺ) آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلم ہونے میں) برابر ہے وہ یہ ہے کہ بجز اللہ تعالی کے ہم کسی اور کی عبادت وپوجا نہ کریں اور اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے، خدائے تعالی کو چھوڑ کر پھر اگر اس کے بعد بھی وہ لوگ حق سے اعراض کریں تو تم مسلمان کہہ دو کہ تم ہمارے اس اقرار کے گواہ رہو کہ ہم تو اس بات کے ماننے والے مسلمان ہیں (اگر تم نہ مانو تو تم جانو))۔

حضرت مولانا ومفتی محمد شفیع صاحبؒ نے مذکورہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں معارف القرآن میں لکھا ہے:

"تعالوا إلی کلمة" اس آیت سے تبلیغ ودعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہشمند ہو جو عقائد ونظریات میں اس سے مختلف ہو تو اس کا طریقہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جن پر دونوں کا اتفاق ہوسکتا ہو، جیسے رسول اللہ ﷺ نے جب روم کے بادشاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دی جس پر دونوں کا اتفاق تھا، یعنی اللہ تعالی کی وحدانیت پر، وہ دعوت نامہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

"بسم الله الرحمن الرحیم من محمد عبد الله ورسوله إلی هرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الهدی أما بعد! فإنی أدعوک بدعایة الإسلام أسلم تسلم یؤتک الله أجرک مرتین فإن تولیت فإن علیک إثم الیریسین

☆ مفتی مدرسہ اسلامیہ شکر پور، بھروارہ، دربھنگہ۔

یا أھل الکتاب! تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم أن لا نعبد إلا الله ولا نشرک به شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله" (بخاری) (میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جونہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے، یہ خط محمد اللہ کے بندے اور اسکے رسول کی جانب سے، روم کے بادشاہ ہرقل کی جانب ہے، سلامتی ہواس شخص کے لئے جوراہ ہدایت کی پیروی کرے، بعد اس کے میں تجھے اسلام کے بلاوے کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسلام لاتو سلامت رہے گا اور اللہ تعالی تجھ کو دوہرا اجر دے گا، اور اگر تو اعراض کرے گا تو تجھ پر ان سب کسانوں کا وبال ہوگا جو تیری رعایا ہیں، اے اہل کتاب ایک ایسی بات پر آ کر جمع ہوجاؤ جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے، وہ یہ کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ شریک کریں اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں اپنوں کو رب بنائیں)۔

"**فقولوا اشھدوا بأنا مسلمون**"، اس آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ تم گواہ رہو، اس سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب دلائل واضح ہونے کے بعد بھی کوئی حق کو نہ مانے تو اتمام حجت کے لئے اپنا مسلک ظاہر کر کے کلام ختم کر دینا چاہئے، مزید بحث وتکرار کرنا مناسب نہیں ہے (معارف القرآن جلد دوم)۔

مذکورہ آیت کریمہ اور مکتوب نبوی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مذہب کو ماننے والے کفار کے سامنے مذہبی گفتگو کا آغاز کس طرح کریں اور دوران گفتگو کن امور کو سامنے رکھ کر گفتگو کریں، مندرجہ آیت میں تین امور کا ذکر ہے: (۱) صرف خدائے تعالی کو معبود ماننا، (۲) شرک نہ کرنا، (۳) اللہ تعالی ہی کو حاکم حقیقی تسلیم کرنا، ان تینوں امور کا اجمالی تذکرہ کلمہ توحید میں ہے اسی لئے آغاز دعوت میں تمام انسانوں کو خطاب کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "**یاأیھا الناس قولوا لا إله إلا الله تفلحوا**" (اے لوگو! صرف اللہ تعالی کے معبود ہونے کا اقرار کرتے ہوئے لاإلہ إلا اللہ کہو کامیاب ہوجاؤ گے)۔

قرآن کریم کی آیات اور مختلف واقعات کے تناظر میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے پڑوسیوں اور ساتھیوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کریں، اگر مذہبی گفتگو کا موقع ملے تو اسلامی عقائد سے بہ تدریج ان کو واقف کریں، کلمہ یاد کرائیں جب وہ اسلامی عقائد سے مانوس ہوجائیں تب ان کو مسلمان ہونے کی دعوت دیں، اول وہلہ میں ان کو مسلمان ہونے کو نہ کہیں خود قرآن کریم میں سب سے پہلا حکم اسلام لانے سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالی کا نام لے کر پڑھنے کو کہا گیا ہے، پھر سورہ مدثر میں "**قم فأنذر**" فرما کر خوف آخرت کی یاددہانی کرائی گئی ہے، آگے رب کی بڑائی اور ہر بری چیز سے علاحدہ رہنے کا حکم دیا گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسلامی توحید کو پیش کیا جائے، پھر بہ تدریج ضروریات اسلام سے آگاہ کیا جائے، لفظ اسلام اور ایمان کا لغوی واصطلاحی مفہوم ذہن نشیں کرایا جائے، جب کوئی اسلامی تعلیمات سے خوب مانوس ہوجائے تب اسے بتایا جائے کہ تم مسلمان ہو، مسلمان رہو، یہی رب العزت کا پسندیدہ دین ہے، چنانچہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت "**ادع إلی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی أحسن**" (سورہ نحل: ۱۲۵)، میں دعوت دین کے اسی اصول کا تدریجی بیان ہے، مندرجہ آیت کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے۔

اسی طرح سورہ آل عمران کی آیت "ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر"، کے پڑھنے اور اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ہمہ دم کوئی جماعت ضرور ایسی موجود رہنی چاہئے جو غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے، اور مسلمانوں کو اصلاح کی دعوت دے، پہلی دعوت کا بیان یدعون إلى الخیر کے ذریعہ اور دوسری دعوت کا بیان ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر کے ذریعہ کیا گیا ہے۔

رہا سماجی اور سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال تو اس کا بیان سورہ قصص کے آخر میں حضرت موسی علیہ السلام کی گفتگو جو قارون سے ہوئی تھی جس میں حضرت موسی نے قارون سے کہا تھا :"أحسن كما أحسن الله إليك ولا تبغ الفساد في الأرض" (آیت: ۷۷) اور سورہ یوسف میں بادشاہ نے خشک سالی سے متعلق جو خواب دیکھا تھا، جس کی تعبیر کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ سے رہائی ملی، پھر بادشاہ سے دوران گفتگو "اجعلني على خزائن الأرض" (یوسف)، حضرت یوسف علیہ السلام نے وزارت مالی کا عہدہ از خود طلب فرمایا، ان دونوں آیتوں کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ:

مختلف مذاہب کے لوگوں سے مذاکرات کرتے ہوئے، مذہبی، سماجی اور سیاسی تینوں نوعیت کے مسائل سے متعلق حالات وواقعات کو ملحوظ رکھ کر ضروری گفتگو کی جا سکتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کے برگزیدہ نبیوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں اور اس وقت کے حکمراں طبقہ سے اس سلسلہ میں ضروری گفتگو کی تھی، جیسا کہ اوپر قرآن کریم کے حوالہ سے اس کا ضروری نمونہ پیش کیا گیا، فقط واللہ تعالی اعلم۔

۲۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے مذاکرات کرتے ہوئے اگر ان کی مذہبی کتابوں میں اسلامی تعلیمات سے موافقت واشتراک پایا جاتا ہو تو اس کا حوالہ دے کر بھی ان سے گفتگو کی جا سکتی ہے، چنانچہ حلت وحرمت کے مسئلہ میں بعض یہودیوں سے جب حضور پاک ﷺ کی گفتگو ہوئی اور انہوں نے اس کو چھپایا تو قرآن کی صراحت کے مطابق ان سے کہا گیا: "قل فأتوا بالتوراة فاتلوها إن كنتم صادقين" (آل عمران: ۹۳) (آپ ان سے کہیے کہ تورات لاؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو)۔

جب وہ تورات لے کر آئے اور پڑھ کر سنایا تو ان کا جرم سامنے آیا، مفسرین نے اسے تفصیل سے ذکر کیا ہے، سورہ احقاف کی چوتھی آیت میں مشرکین مکہ سے اثبات شرک پر دلیل کا صرف مطالبہ ہی نہیں بلکہ دوہرا مطالبہ کیا گیا ہے، "أروني ما ذا خلقوا من الأرض أم لهم شرك في السموات" (اللہ کے علاوہ جن چیز کو تم پکارتے ہو اور ان کی عبادت کرتے ہو مجھے دکھاؤ، انہوں نے کونسی زمین پیدا کی ہے یا یہ کہ ان کا ساجھا آسمانی میں ہے، "ايتوني بكتاب من قبل هذا أو إثارة من علم إن كنتم صادقين" (میرے پاس کوئی کتاب لاؤ جو اس سے پہلے کی ہو، یا کوئی مضمون منقول لاؤ اگر تم سچے ہو)۔

مطلب یہ ہے کہ دین کے باب میں کوئی بھی دعوی بغیر معتبر دلیل کے ہرگز مقبول ومسموع نہیں ہے، لہذا کتاب سے دلیل پیش کرو، اسی طرح حدیث نبوی ہے :"حدثوا عن بني إسرائيل ولا حرج" (بخاری حدیث نمبر: ۳۴۶۱)، بنی اسرائیل سے منقول باتوں کو (اگر قرآن وحدیث سے نہ ٹکرائے تو اسے) بیان کرو (تائیدی بات نقل کرنے میں) کوئی حرج نہیں ہے۔

۳۔ اگر دیگر مذاہب کے لوگ اپنے مذہبی رسوم واعمال کو انجام دے رہے ہوں اس موقع پر باہمی مذاکرات یا خوشگوار تعلقات کی بحالی کے لئے انسانی خدمت یا بھائی چارہ کے پہلو سے بھی شریک ہونا شرعاً جائز نہیں ہے، ارشاد ربانی ہے: ''لا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار...'' (سورہ ہود: ۱۱۳) (ان لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں، ورنہ جہنم کی آگ تم کو چھوئے گی، اور اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی دوست ورفیق نہ ہوگا اور نہ تمہاری مدد کی جائے گی)۔

تفسیر ماجدی میں ہے: یہ ساری وعیدیں رکون الی الکفار یعنی کافروں کی طرف محض مائل ہونے پر بیان ہورہی ہیں، اللہ اللہ! کفر کس درجہ اللہ کی نظر میں مبغوض ہے، علماء محققین کے حسب تصریح بلا ضرورت کفار کی وضع اختیار کرنا، باوجود قدرت ان پر نکیر نہ کرنا، ان کی تعظیم وتوقیر کرنا، بلا ضرورت شرعی ان کے ساتھ مصاحبت ومجالست اور انکے ساتھ مداہنت، یہ سب اسی نہی کے تحت میں آجاتا ہے اور یہ سب مثالیں رکون الی الکفار کی ہیں، ''فاقتضی ذلک النهی عن مجالسة الظالمین وموانستهم والانصات إلیهم'' (جصاص، تفسیر ماجدی ۴۸۲/۲، حاشیہ ۱۵۹)۔

سورہ نساء آیت ۱۴۰ میں ہے: ''إذا سمعتم آیات الله یکفر بها ویستهزأ بها فلا تقعدوا معهم''۔ اس سے زیادہ وضاحت سورہ انعام آیت ۶۸ میں ہے: ''فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین''۔

حدیث نبوی ہے: ''من کثّر سواد قوم فهو منهم ومن رضی عمل قوم کان شریکان فی عمله'' (کنز العمال ۲۲/۹، حدیث: ۲۴۷۳۵ کتاب الصحبۃ، مطبوعہ موسسۃ الرسالہ بیروت، نصب الرایہ کتاب الجنایات الحدیث التاسع ۳۴۶/۳ مطبوعہ مجلس علمی گجرات) (جو شخص کسی قوم کی جماعت کی تکثیر کا سبب ہوگا، اس کا شمار اسی قوم میں ہوگا، اور جو شخص کسی قوم کے عمل سے خوش ہوگا تو دونوں عمل میں شریک ہوں گے)، واللہ اعلم۔

۴۔ جن اعمال کا تعلق مذہب سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے، یا مذہب سے ہے، لیکن شرعاً اس کا درجہ وجوب کا نہیں ہے، اگر اس کے عارضی ترک سے کوئی فتنہ رک رہا ہو یا لوگوں کی باہمی ہم آہنگی برقرار رہتی ہے تو پھر ایسے عمل کو ترک کیا جاسکتا ہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد قریش کے بنائے ہوئے کعبہ کو جو بناء ابراہیم کے خلاف تھا برقرار رکھا، اور اس کی وجہ لوگوں کا نومسلم ہونا اور موجب فتنہ ہونا قرار دیا ہے، حدیث کے الفاظ ہیں:

''ولولا أن قومک حدیث عهد بالجاهلیة فأخاف أن تنکر قلوبهم أن أدخل الجدر فی البیت وأن ألصق بابه فی الأرض'' (بخاری کتاب التمنی حدیث: ۷۲۴۳، باب کتاب الحج باب فضل مکۃ وبنیانہا حدیث: ۱۵۸۳ تا ۱۵۸۶)۔

وفی روایة قال النبی یا عائشة لو لا قومک حدیث عهدهم، قال ابن الزبیر۔ بکفر لنقضت الکعبة فجعلت لها بابین باب یدخل الناس وباب یخرجون'' (بخاری کتاب العلم حدیث ۱۲۶)۔

۵۔ تنقید اگر دل آزاری کا ذریعہ ہو تو اس سے احتراز کیا جائے، لیکن اثبات توحید ورسالت یا ابطال شرک شرعاً واجب ہے، اس لئے کسی کی دل آزاری کے سبب اس کو ترک نہیں کیا جائے گا، البتہ حکمت ودانائی کو ملحوظ رکھ کر اس کی تبلیغ کی جائے گی،

جیسے کلمہ توحید کسی کو سکھانا یا بلند آواز سے اذان دینا یا علی الاعلان نماز پڑھنا وغیرہ شرعاً مطلوب ہے، ان امور کو کسی کی دل آزاری یا برا سمجھنے کے سبب ترک نہیں کیا جائے گا، ہاں کسی کی ممدوح شخصیت کو برا کہنے سے فتنہ بھڑکنے کا خطرہ ہو تو اس سے بچا جائے گا، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبو اللہ عدوا بغیر علم"(سورہ انعام:۱۰۸)۔

۶۔مشترک سماجی مسائل جن کا کسی خاص قوم سے تعلق نہ ہو، جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ تو ایسے مسائل پر تمام لوگوں کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مذاکرات کرنا ہی تمام لوگوں کے لئے نفع بخش ثابت ہوگا، نجی مجلس میں گفتگو کر لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ رائے عامہ کو ہموار کرنا ہوگا تب جا کر بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح ہوگی، قال اللہ تعالی: **"لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول إلا من ظلم الخ"**۔

۷۔جمہوری ممالک میں سیاست میں حصہ داری کی بھی خاص اہمیت ہے، اس لئے جن امور کا تعلق حکومت سے ہو اس کی انجام دہی میں اسلام مخالف جماعت کے نمائندہ سے مل کر بھی مفاد عامہ کا کام کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے کیا اور حکومت کافرہ سے وزارت خزانہ کا عہدہ طلب کیا۔

۸۔دور حاضر کے مغربی ماحول میں اگر مذہبی مذاکرات کی مجلسوں میں کوئی ماڈرن عورت بھی شریک ہو تو قلب ونظر کو بچا کر تبلیغ ومذہبی کام کو انجام دیا جائے، اور عورتوں سے مصافحہ وغیرہ کرنے سے خود کو محفوظ رکھا جائے، فقط واللہ تعالی اعلم۔

مذاکرات بین المذاہب کے اصول وآداب

ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری ☆

۱۔حوار و مکالمہ ایسا اسلوب ہے جو انسان کو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کیا گیا ہے، لہذا آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء نے اسے اپنی دعوت وتعلیم کا ذریعہ بنایا، اللہ تبارک وتعالی کے حکم سے حضرت محمد ﷺ نے اپنی دعوت وتعلیم کا آغاز گفتگو ومذاکرہ سے فرمایا، آپسی گفتگو، مکالمہ اور مذاکرہ کو موضوع وطریقہ کار کے اعتبار سے مختلف قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، طریقہ کے اعتبار سے اسے، برہانی وجدالی، وصفی وبیانی، فطری وعام، تحدی ومباہلتی، تعلیمی وتبلیغی، تعایشی وتعاونی وغیرہ سے مانا جاتا ہے، موضوعات کے اعتبار سے بھی متعلق عنوان دیا جاتا ہے، البتہ یہ مقالہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے پچیسویں فقہی سمینار کے سوالنامہ کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے، اس لئے یہاں پر صرف متعدد ثقافتی سوسائٹیوں میں امن وسلامتی، بھائی چارگی ومحبت کے ساتھ بقاء باہم اور خوشحال زندگی گزارنے کے لئے مختلف مذاہب وادیان کے ماننے والوں کے درمیان مذاکرہ کے اصولوں پر روشنی ڈالی جائے گی اور سوالوں کے جواب بیان ہوں گے۔

۲۔اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ نے عام انسانوں کی فلاح وبہبود، ترقی وخوشحالی، امن وسلامتی کے لئے ایک کثیر مذہبی معاشرہ میں رہتے ہوئے ہر ایک کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کے ساتھ پرامن بقاء باہم اور بھائی چارگی کا ماحول بنانے کی پوری کوشش کی، دنیا کو عام طور پر اور مسلمانوں کو خاص طور پر ایسا لائحہ عمل عطا کیا جس پر عمل کر کے ہر جگہ اور ہر زمانہ میں انسان پر امن بقاء باہم کے ساتھ امن وسلامتی کی زندگی گزار سکتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مقالہ نگار کا رسالہ: أسلوب الحوار في القرآن الكريم والسنة النبوية، الباب السادس)۔

۳۔نو اصولوں کی روشنی میں دینی ثابت شدہ اوامر ونواہی، فرائض وواجبات سے تنازل کئے بغیر ایک مسلمان دوسرے مذہب یا غیر مذہب کے انسان کے ساتھ، اسی طرح غیر مسلم نو اصولوں کی روشنی میں مسلم معاشرہ وسوسائٹی میں اپنے مذہبی مسلمات سے تنازل کئے بغیر مسلمان کے ساتھ مشترک عام نفع ومصلحت اور ترقی کی خاطر پورا تعاون کرسکتا ہے، اور خوشگوار بقاء باہم کے ساتھ نہ صرف رہ سکتا ہے، بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ پوری مستعدی وہمت کے ساتھ ایک فعال ومتحرک نفع بخش رکن بنے۔

الف: پہلا اصول: مختلف قبائل واقوام کے ہوتے ہوئے تمام انسان نسلی اتحاد اور انسانی بھائی چارگی میں مشترک ہیں۔ B21

☆ اسسٹنٹ پروفیسر کے اے نظامی سینٹر فار قرآنک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اللہ تعالی نے انسان کو انسانی حیثیت سے مساوی قرار دیا، صرف تقوی سے مکرم وباعزت بنانے کا اصول ومعیار مقرر کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان نسلی اعتبار سے ایک ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔

"**یاأیھا الناس إنا خلقناکم من ذکر و أنثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند اللہ أتقاکم إن اللہ علیم خبیر**" (الحجرات: ۱۳)۔

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف خاندان بنایا ہے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو، اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، اللہ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے)۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس کی انسانی اخوت ومساوات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: "رسول انسانیت ﷺ کی دوسری بڑی عطا اور دنیا پر ان کا باقی رہنے والا احسان وحدت انسانی کا تصور ہے، اس سے پہلے انسان قبائل واقوام کے اونچے نیچے طبقات اور تنگ نسلی دائروں میں بٹا ہوا تھا، اور ان طبقات کا باہمی فرق ایسا اور اتنا تھا جتنا انسان وحیوان، آزاد وغلام، اور عابد ومعبود کا فرق ہوسکتا ہے، آپ ﷺ سے پہلے وحدت ومساوات انسانی کا تصور خواب وخیال بن چکا تھا، رسول اللہ ﷺ نے صدیوں کی طویل خاموشی اور چھائے ہوئے اندھیرے میں یہ انقلابی، عقلوں کو جھنجھوڑ دینے والا اور حالات کا رخ موڑ دینے والا اعلان فرمایا:

"**یا أیھا الناس ألا إن ربکم واحد، وإن أباکم واحد، ألا لا فضل لعربی علی عجمی، ولا لعجمی علی عربی، ولا لأحمر علی أسود، ولا لأسود علی أحمر إلا بالتقوی، أبلغت، قالوا: بلغ رسول اللہ**" (مسند احمد ۱۷/ ۱۲، حدیث نمبر: ۲۳۳۸۱)۔

(لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، یاد رکھو! کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی عجمی کو کسی عربی پر کسی سرخ کو سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سرخ پر "سوائے تقوی کے اور کسی وجہ سے فضیلت حاصل نہیں ہے، کیا میں نے پیغام الٰہی پہنچا دیا؟ لوگوں نے کہا: اللہ کے رسول نے پہنچا دیا)۔

یہ اعلان دو اعلانوں پر مشتمل ہے، جو امن وسلامتی کے قیام کے لئے دو ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں، جن پر ہر جگہ اور ہر زمانہ میں امن وامان کی عمارت قائم ہوئی، ایک وحدت ربوبیت، دوسری وحدت بشریت، اس طرح ایک انسان دوسرے انسان کا دو رشتوں سے بھائی ہوتا ہے، ایک رشتہ جو بنیادی ہے وہ یہ کہ دونوں کا رب ایک ہے، دوسرا جو ثانوی ہے وہ یہ کہ دونوں کے باپ (مورث اعلی) ایک ہی ہیں" (اس اعلان کی اہمیت اور عالمی مذاہب وثقافات میں تقابلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو: تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ۷/ ۳۔ ۳۸، السیرۃ النبویہ للشیخ ابی الحسن الندوی ۴۶۹ وما بعدہا، دار الشروق، جدہ)۔

ب: دوسرا اصول: تمام انسان انسانی اعتبار سے دوسری بہت سی مخلوقات سے اعلی ہیں اور سب اس میں مشترک ہیں، ارشاد باری تعالی ہے:

"**ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن**

خلقنا تفضیلا" (الاسراء:۷۰)۔

(اور ہم نے آدم علیہ السلام کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی)۔

ج: تیسرا اصول: لوگوں کا مزاجی، عقلی، نفسیاتی، مذہبی، عقیدگی، قومی اور قبائلی طور پر مختلف ہونا فطری ہے، اس اصول کو مان کر تمام انسان، اس نوعی اختلاف کے ساتھ ہی حق پر عمل کرتے ہوئے خوشگوار بقاء باہم کے مکلف ہیں، نہ کہ ان کے فطری فرق کو ختم کرنے کے، ارشاد ربانی ہے:

"**...لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا ولو شاء الله لجعلكم أمة واحدة ولكن ليبلوكم فيما آتاكم**" (المائدہ:۴۸)۔

"**وما كان الناس إلا أمة واحدة فاختلفوا ولو لا كلمة سبقت من ربك لقضى بينهم فيما فيه يختلفون**" (یونس:۱۹)۔

"**ولوشاء ربك لجعل الناس أمة واحدةولا يزالون مختلفين،إلا من رحم ربك ولذلك خلقهم وتمت كلمة ربك لأملئن جهنم من الجنة والناس أجمعين**" (ہود:۱۱۸۔۱۱۹) (اس واضح حقیقت کو سمجھنے کے لئے مزید ملاحظہ ہو: تفسیر سورۃ النحل: ۹۳، شوری: ۸، زخرف: ۳۳، بقرہ: ۲۱۳، ۲۵۱، انعام: ۳۵، حج: ۴۰، ادب الحوار فی الاسلام للدکتور محمد سید طنطاوی ۸/، فقہ الخلاف بین المسلمین للدکتور حسین برہامی ۸/ وما بعدہا، دار المسلم ریاض)۔

د: چوتھا اصول: دنیا و آخرت میں انسان کی کامیابی وسعادت کے لئے اللہ کا بھیجا ہوا پیغام اور صحیح منہج کا انسان تک پہنچنا اور انسان کا اسے جاننا ہر ایک کا حق ہے، اسی کو پہنچانے کے لئے اللہ تعالی نے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا، اور ان پر لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری ڈالی، انسان کو عقل وفہم کی تمام طاقتیں عطا فرمائیں، پھر بھی اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے رد کرنے یا قبول کرنے کا پورا حق ہے، جیسا کہ بعد والے اصول میں ہے، اوپر بیان کردہ اصول اس اصول کا متضاد نہیں، یعنی تکوینی وتقدیری معاملہ شرعی وقانونی فرض وذمہ داری سے متعارض نہیں، نہ ہی قانونی وشرعی عمل کو روکتا ہے، بلکہ انسان ایک ہی وقت میں دونوں چیزوں کا مکلف ہے، اس پر فرض ہے کہ تکوینی وقدری چیز پر ایمان رکھتے ہوئے، خوشگوار پر امن ماحول میں شریعت کے قانون پر عمل کرکے فطری تنوع واختلاف کو عام انسانی مصلحت کی خاطر، اس کے نفع کے لئے استعمال کرے اور اس کی غلط تاویل وتشریح کرکے خودغرض، بیکار، دوسروں کے لئے پریشانی وبدامنی کا ذریعہ نہ بنے، بلکہ اس پر ایمان رکھتے ہوئے اپنے آپ کو انسانی معاشرہ وسوسائٹی کی بھلائی کا متحرک رکن بنائے، خود نیک وبھلا ہو، دوسروں کو نیکی وبھلائی کا راستہ دکھانے والا بنے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**وأن هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله ذلكم وصاكم به لعلكم تتقون**" (الانعام:۱۵۳)۔

ھ: چوتھا اصول: ہر انسان کو اس زندگی میں اپنی مرضی سے دین، منہج حیات، طریقہ زندگی اختیار کرنے کا پورا اختیار ہے، حق واضح کرنے کے بعد کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کا حق ہے، اگر نہیں مانتا تو اس سے انسانی حق اور امن وسلامتی کے ساتھ بقاء باہم اور خوشگوار زندگی کا حق کوئی نہیں چھین سکتا۔

"وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر" (الکہف:۲۹)۔

"لا إکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" (البقرہ:۲۵۶)۔

بعض مسلمانوں کی اولاد اور رشتہ دار دوسرے مذاہب میں داخل ہو گئے تھے، انہوں نے ان کو اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کرنا چاہا تو یہ آیت نازل ہوئی اور مجبور کرنے سے مطلق نفی ہو گئی (آیت کے شان نزول میں مختلف روایات ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر ابن کثیر ۱/ ۶۸۳، حریت اختیار کے لئے ملاحظہ ہو: الحوار والمناظرۃ فی الاسلام، احمد دیدات نموذجا فی العصر الحدیث للدکتور ابراہیم بن عبد الکریم السنیدی/۲۱)، اس اصول پر عمل کرتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے دعوت وتعلیم کے پورے ۲۳ سال میں دین اسلام کو سمجھانے کے لئے ہر طرح عقل کو مطمئن کرنے والے طریقے اختیار فرمائے، پھر بھی اگر کوئی مطمئن نہ ہوا اور اپنے دین پر قائم رہا تو آپ ﷺ نے کبھی کسی کو اپنی فکر قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا (سنت وسیرت کی مفصل نصوص کے لئے رجوع ہو: موسوعۃ أصول الفکر السیاسی والاجتماعی والاقتصادی من نبع السنۃ الشریفۃ وہدی الخلفاء الراشدین، اعداد: خدیجۃ النبراوی ۱/۱ ۴۳۔ ۴۴۵ دار السلام، القاہرہ)۔

و: پانچواں اصول: دوسرے کے مذہب ومعبود کا مذاق نہ اڑانا، بلکہ ایسے طریقے اور مذاکرہ کی مجلس سے بچنا جہاں بات سنجیدگی کے بجائے مذاق وسخریہ تک پہنچ جائے، چونکہ ایسی صورت میں نہ ہی پر امن وخوشگوار ماحول میں اصولی ونفع بخش گفتگو ممکن ہے اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ، اس لئے اگر مذہبی بات بھی ہو اور غلطی بتانا ضروری بھی ہو تو پر وقار انداز میں اور اسلوب تعریضی میں، نہ کہ ڈائریکٹ حملہ کر دیا جائے، جب کہ نفع عام کے کاموں میں پر امن بقاء باہم میں اگر ایسے موضوع، محور سے ہٹانے والے ہوں تو ان سے بچنا بہتر ہے اور دوسرا کوئی مناسب موقع اس کے لئے تلاش کیا جائے اگر ضروری ہو (ادب الحوار والمناظرۃ للدکتور علی جریشۃ/۸۹)۔

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم کذلک زینا لکل أمۃ عملہم ثم إلی ربہم مرجعہم فینبئہم بما کانوا یعملون" (الانعام:۱۰۸)۔

"وقد نزل علیکم فی الکتاب أن إذا سمعتم آیات اللہ یکفر بہا ویستہزأ بہا فلا تقعدوا معہم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ إنکم إذا مثلہم إن اللہ جامع المنافقین والکافرین فی جہنم جمیعاً" (النساء:۱۴۰)۔

ز: چھٹا اصول: مذہب وملت کی تفریق کے بغیر تمام انسانوں کے درمیان عدل ومساوات کا اصول، تاکہ انسان انسان کے اکرام میں کوتاہی کا شکار نہ ہو، ارشاد الٰہی ہے:

"یا أیہا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا اعدلوا

هو أقرب للتقوى واتقوا الله إن الله خبير بما تعملون" (المائدہ:۸)۔

(اے ایمان والو! اللہ تعالی کے لئے پوری پابندی کرنے والے انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو، اور خاص لوگوں کی عداوت تمہارے لیے اس کو باعث نہ ہوجاوے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو کہ وہ تقوی سے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالی سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالی کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے)۔

ح: ساتواں اصول: مذہب وملت کی تفریق کے بغیر تمام انسانوں کے درمیان بہتر اور عام فلاح وبہبود کے کاموں میں تعاون کا اصول، تاکہ انسان انسان کی فلاح وبہبود میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور انسان کے اکرام میں کوئی کوتاہی نہ کرے، ارشاد الہی ہے:

"ولا يجرمنكم شنآن قوم أن صدوكم عن المسجد الحرام أن تعتدوا وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب" (المائدہ:۲)۔

(اور ایسا نہ ہو کہ تم کو کسی قوم سے (جو اس سبب سے) بغض ہے کہ انہوں نے تم کو مسجد حرام سے روک دیا تھا وہ تمہارے لئے اس کا باعث ہوجاوے کہ تم حد سے نکل جاؤ اور نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو اور اللہ تعالی سے ڈرا کرو بلاشبہ اللہ تعالی سخت سزا دینے والے ہیں)۔

ط: آٹھواں اصول: مذہب وملت کی تفریق کے بغیر ہر امن پسند انسان کے ساتھ حسن سلوک کا اصول، تاکہ انسانیت کا اکرام ختم نہ ہونے پائے، ارشاد باری تعالی ہے:

"لاينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (الممتحنہ:۸)۔

(اللہ تعالی تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالی انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں)۔

ی: نواں اصول: انسان کی جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت کا اصول، ارشاد باری ہے:

"من أجل ذلك كتبنا على بني إسرائيل أنه من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعاً ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا، ولقد جاءتهم رسلنا بالبينات ثم إن كثيرا منهم بعد ذلك في الأرض لمسرفون" (المائدہ:۳۲)۔

(اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی شخص کو بلا معاوضہ دوسرے شخص کے یا بدون کسی فساد کے (جو) زمین میں (اس سے پھیلا ہو) قتل کرڈالے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کرڈالا اور جو شخص کسی شخص کو بچا ولیوے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچالیا اور ان (بنی اسرائیل) کے پاس ہمارے بہت سے پیغمبر (بھی) دلائل واضحہ لے کر آئے پھر اس

کے بعد بھی بہتیرے ان میں سے دنیا کی زیادتی کرنے والے ہی رہے)۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"إن دماء کم وأموالکم حرام علیکم، کحرمة یومکم هذا، فی شهر کم هذا، فی بلدکم هذا، ألا کل شیء من أمر الجاهلیة تحت قدمی موضوع، ودماء الجاهلیة موضوعة، وإن أول دم أضع من دمائنا دم ابن ربیعة بن الحارث، کان مسترضعاً فی بنی سعد فقتلته هذیل، وربا الجاهلیة موضوع، وأول ربا أضع ربانا، ربا عباس بن عبد المطلب، فإنه موضوع کله" (صحیح مسلم بشرح النووی ۸/۴۰۲-۴۲۱، رقم: ۲۹۴۱، واللفظ لہ، کتاب الحج باب حجۃ النبی ﷺ)۔

(تمہارا خون اور تمہارا مال ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ آج کا دن، یہ مہینہ اور یہ شہر حرام ہیں، آگاہ رہو کہ جاہلیت کے زمانہ کے کاموں میں سے ہر چیز میرے قدموں کے نیچے پامال ہے اور جاہلیت کے زمانہ کے خون معاف کرتا ہوں اور وہ خون ابن ربیعہ بن حارث کا خون ہے جب کہ بنو سعد دودھ پیتا بچہ تھا جسے ہذیل نے بنو سعد سے جنگ کے دوران قتل کر دیا تھا اور جاہلیت کے زمانہ کا سود بھی پامال کر دیا گیا ہے اور میں اپنے سود میں سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود معاف کرتا ہوں)۔

مذکورہ بالا اصولوں کی روشنی میں مندرجہ ذیل سطور میں سوالنامہ کے جوابات لکھے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سیدھا راستہ کی توفیق عطا فرمائے، کوتاہی وغلطی کو معاف فرمائے، آمین۔

۱۔ مذہبی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر باہمی مذاکرات ہو سکتے ہیں، چونکہ اللہ کے رسول ﷺ کے عہد میں اس کی مثالیں موجود ہیں:

☆ مذہبی مذاکرہ خوشگوار ماحول میں ایک دوسرے کے مذہب کو جاننے کا بہترین ذریعہ ہے، حکمت سے اپنے مذہب کو دوسروں تک پہنچانے کا بڑا ذریعہ ہے، اس میں دوسرے کو دعوت کا احساس بھی نہیں ہوتا اور پیغام پہنچ جاتا ہے، اس کی دلیل نجاشی کی دربار میں حضرت جعفر طیار کا بیان ہے، یہ یاد رہے کہ پرامن بقاء باہم کے لئے مذاکرہ دعوتی نہیں ہوتا۔

☆ سیاسی وسماجی مذاکرہ کی دلیل مکی زندگی میں: حلف الفضول، طائف سے واپسی میں اللہ کے رسول ﷺ کا مطعم بن عدی کی حمایت حاصل کرنا، حضور اکرم ﷺ کا اپنے چچا ابوطالب سے حمایت لینا، بعثت کے ساتویں سال کے آخر میں اقتصادی وسماجی بائیکاٹ اور شریف النفس کافروں کا تعاون ومروت، مسلمانوں کی پریشانی دور کرنے میں اس وقت موجود قانون سے مدد، حبشہ کی ہجرت اور مسلمانوں کے مذاکرہ کا اثر، ہجرت حبشہ سے واپسی میں مکہ کے بعض لوگوں سے حمایت لینا اور حضرت ابوبکر کا ابن الدغنہ سے حمایت لینا ہے۔

مدنی زندگی میں: صلح حدیبیہ، میثاق مدینہ، نجران کے نصاریٰ کے ساتھ معاہدہ، اسی قبیل سے وہ سب معاہدات جو اللہ کے رسول اور غیر مسلموں کے درمیان کئے گئے۔

۲۔ مذاکرات میں دوسرے مذہب کی مشترک چیزوں کا حوالہ نہ صرف دیا جاسکتا ہے، بلکہ مشترک بہتر چیزوں کے فروغ میں تعاون مطلوب ہے، جو تعاون علی البر والتقوی کے قبیل سے ہے، اوپر پہلے سوال کے جواب میں اس کی دلیلیں بھی موجود ہیں، خود قرآن میں یہود ونصاری کے ساتھ حوار میں ان ہی کی اصل تعلیمات کا حوالہ دیا گیا ہے، مشرکین کو ان کے ربوبیت کے اقرار سے الوہیت کے اقرار کی بات کہی گئی ہے، مدینہ میں عبداللہ بن سلام کے اسلام کے قصہ میں یہودیوں سے اس حوالہ سے بات کہی گئی ہے۔

۳۔ خوشگوار تعلقات اور باہمی مذاکرات کے لئے دیگر مذاہب کے ان مذہبی رسوم واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت کرسکتے ہیں جس میں مسلمان کا تعلق کام یا عقیدہ کے اعتبار سے صرف باہر کے کام سے رہے، اور دعوتی مقصد سے تجربہ کار دینداروں کی نگرانی میں ہو، جیسے پانی کی سبیل لگانا، غریبوں کو کھانا کھلانا، پریشان حالوں کی مدد کرنا، مسافروں کا تعاون کرنا وغیرہ، اگر یہ شرک، کفر یا گمراہی تک پہنچ جائے یا صرف چند دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کے لئے ہو تو شرعاً جائز نہیں ہے، بلکہ یہ پرامن بقاء باہم کے مذاکرہ اور اس کی روح کے خلاف ہے، اس لئے کہ مذاکرہ دوسرے کے ساتھ خوشگوار ماحول قائم رکھنے کے لئے ہوتا ہے نہ کہ دین اور دینی اقدار چھوڑنے کے لئے۔

۴۔ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے ایسے اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے جو شرعاً واجب نہیں ہیں، چونکہ وہ مصلحت عامہ سے متعلق ہیں، اس لئے بہتر مصلحت عامہ کے لئے ان کو چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

۵۔ مسلمانوں پر دعوتی فریضہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ان طریقوں کو اپنائیں جو مثبت ہوں اور ان کے ذریعہ اپنی بات پیش کردیں، اس سے خود بخود حق واضح ہو جائے گا، جیسا کہ منہج نبوی سے ثابت ہے، جو حوار عادی، تعلیمی، تبلیغی، دعوتی، وصفی، برہانی وغیرہ میں موجود ہے، البتہ صرف حوار جدالی ایک ایسی قسم ہے جس میں مجادلانہ طریقے سے بات ہوتی ہے، لیکن یہ بھی اس وقت جب سارے طریقے ناکام ہو چکے ہوں، اور سامنے والا فریق اسی پر مصر ہو، یہاں تک کہ بات تحدی وچیلنج تک پہنچ جائے جو مباہلہ میں ہوتا ہے، اس میں بھی کسی کے مخصوص معبودوں کو برا بھلا نہیں کہا گیا، بلکہ اس میں بھی موضوع سے ہی گفتگو ہوتی ہے، خود قرآن کریم میں بھی اس سلسلہ میں اچھے طریقے سے جدالی مذاکرہ کی بات کہی گئی ہے: ”وجادلهم بالتي هي أحسن“ (النحل: ۱۲۵)، لیکن یہ اصرار کرنا کہ جب تک ہم دوسرے کو یا ان کے معبودوں کو یا کاموں کو صاف لفظوں، غیر علمی طریقے سے نہیں کہیں گے، تسلی نہیں ہوگی، یہ اسلام کی روح اور اصولوں کے خلاف ہے جو اوپر گذر چکے ہیں۔

۶۔ مشترک سماجی مسائل پر مصلحت عامہ کی خاطر نہ صرف مذاکرہ کرنا بلکہ مل کر جدوجہد کرنا، اوپر بیان کئے ہوئے بنیادی اصول کا حصہ ہیں، جیسے اکرام انسان، عدل، اچھے کاموں میں تعاون وغیرہ۔

۷۔ جمہوری ممالک میں مذہب کی نمائندہ شخصیتوں یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے ساتھ گفت وشنید اور باہمی مذاکرہ کرنا جائز ہے، تاکہ اسلام کے مقاصد کو حاصل کرنے میں آسانی ہو، غلط فہمیاں دور ہوں، حق بات سمجھ میں آنے

کے بعد غلط ارادے بدلیں، اللہ کے رسول ﷺ کے مکالمات ومحاورات زیادہ تر مخالفین ہی کے ساتھ تھے، اوران موضوعات پر تھے جو مختلف فیہ تھے، چاہے مکی زندگی میں ہوں یا مدنی زندگی میں، صلح حدیبیہ میں کہاں تک مصلحت کا خیال ہے وہ سب پر عیاں ہے، یہود ونصاری اور مشرکوں کے ساتھ باہمی مذاکرات سب سے بڑی دلیل ہیں، پھر جیسا کہ مذکورہ اصولوں میں موجود ہے کہ اپنے دین وایمان سے تنازل کے ساتھ اس قسم کے مذاکرہ بقاء باہم کے لئے ہو بھی نہیں سکتے، وہ دوسری قسم کے ہوتے ہیں، جسے مناظرانہ کہے جاسکتے ہیں، ان کو بقاء باہم کی گفتگو کے دائرہ سے خارج رکھا جاتا ہے۔

۸۔ پردے کی بات مسلمانوں کے ساتھ ہے، دوسرے اس کے مکلف نہیں، اسلامی حکومت میں بھی وہ اپنے مذاہب پر عمل کرنے میں آزاد ہیں، معتبر روایات سے یہ بات نہیں ملتی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مکہ اور مدینہ میں غیر مسلموں کے ساتھ بات چیت میں، کپڑوں اور پردہ کی کوئی شرط لگائی ہو، ان کے ساتھ بقاء باہم کی بات حسب ضرورت کبھی فرض، کبھی واجب، کبھی مستحب، تو کبھی حرام ومکروہ ہوتی ہے، اس لئے اس طرح کے پروگراموں میں مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اسلامی اخلاق ومعیار کا خیال رکھیں، اپنے دامن کو بچاتے ہوئے، عفت وپاکدامنی کے ساتھ، اپنی بات دوسروں تک پہنچادیں اور اللہ سے ڈرتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ خود اغیار سے آگے بڑھ جائیں اور نہ صرف اپنے آپ کو ذلیل کریں، بلکہ اسلام کی بدنامی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے بڑے گناہ کے مرتکب ہوں، **واللہ أعلم بالصواب، وأسأل اللہ التوفیق والسداد ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ۔**

عصر حاضر میں بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

قاضی ذکاء اللہ شبلی ☆

۱۔ اسلام آفاقی اور آسمانی مذہب ہونے کے ساتھ عالمگیر مذہب ہے اور تمام ہی انسانوں کے خیر وفلاح کا ضامن ہے، اس کی حقانیت اور صداقت کو مذاہب والوں کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لے کر پیش کرنا تبلیغ اسلام کا ذریعہ ہونے کے ساتھ باطل عقائد والوں کی فکری وذہنی اصلاح کا سبب ہوگا، اس لئے میرے نزدیک سماجی وسیاسی امور کے ساتھ مذہبی امور پر بھی مذاکرات درست ہے۔

۲۔ نیز اسلام اور ہادی عالم ﷺ کی ذات اقدس کے بارے میں جو خبر دیگر مذاہب والوں کی کتابوں میں دی گئی ہے اس کا حوالہ دینا خود اس مذہب وعقیدہ والوں کے لئے مسکت ہوگا، اس لئے ان کتابوں سے استفادہ بایں شرط جائز ہوگا کہ خود کے پائے اثبات میں کوئی فرق نہ آئے۔

۳۔ باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے اپنے عقیدہ کے خلاف کسی قسم کا عمل ناجائز اور حرام ہوگا، اور شرکیہ امور میں کسی طرح کی شرکت بھی اس کے تعاون اور حوصلہ افزائی ہوگی، جبکہ اللہ تعالی نے اس سے منع فرمایا ہے، ارشاد باری ہے: ''ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان''۔

(۴) البتہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کی غرض سے ایسے اعمال ترک کئے جاسکتے ہیں جو شرعاً واجب وضروری نہ ہوں۔

(۵) اظہار خیال اور اپنا مدعا پیش کرنے یا کسی بھی عمل کے خیر وشر کے بیان میں جبکہ منفی گوشوں اور منکرات کے ذیل میں آنے والے امور کو بیان کرنے سے فتنہ وفساد کا خطرہ ہو تو ایسے موقع پر اس کے مثبت پہلو کو بیان کرنا چاہئے، دوسرے کے اعمال کی خرابی کو بتانے کے بجائے اس موقع کے عمل اور اس عمل کے خیر والے گوشہ کو واضح کرنا چاہئے، مثلاً شرک کی خرابی کو بتانے کے بجائے توحید باری کی عظمت واہمیت کو بتایا جائے تو بہتر ہوگا۔

(۶) مشترک سماجی مسائل میں دیگر مذاہب والوں کو ساتھ لینا یا ان کے ساتھ مل کر کام کرنا ''عین رحمت'' کا سبب ہوگا اور اسلام کے دین رحمت کی ترجمانی ہوگی۔

۷۔ جمہوری ممالک میں باطل افکار یا عقائد پرستوں کے ساتھ اگر گفت وشنید کی ضرورت پیش آئے تو ان کے ساتھ اپنے

☆ دار القضاء اندور، مدھیہ پردیش۔

مذہب اسلام کی بالا دستی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس میں کسی طرح کی کمی یا تبدیلی عدم رضا وتائید کے ساتھ مذاکرات میں شرکت میرے نزدیک درست ہے۔

۸۔ اسلام اور دین وشریعت کی ترجمانی اور پیغام حق وصداقت کے لئے ایسے اسٹیج و پروگرام میں حاضری وشرکت میرے نزدیک درست ہے۔

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی ☆

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''**اللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیه**'' (مسلم: ۶۸۵۳) (اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے)۔

احادیث مبارکہ میں جن چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور جسے بڑی اہمیت حاصل ہے ان میں باہمی تعاون اور جذبہ اخوت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**'' (نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور سرکشی میں ہاتھ روک لو)۔

اوپر مذکور حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے باہمی تعاون کے فوری اور لازوال فائدے کا ذکر فرمایا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کا تعاون کرتا رہتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی مدد فرماتا رہتا ہے، پھر صحیح اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے بھی آپس کے تعاون اور اشتراک عمل کی بڑی ضرورت اور اہمیت ہے، اس لیے بھی اس کی بڑی تاکید اور فضائل وارد ہوئے ہیں۔

اس تمہید کے بعد سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

جواب: ۱۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے عقیدے پر ثابت قدمی کے ساتھ ساتھ دوسرے مذہب سے رواداری کے سلوک کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس رواداری کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسانی اخلاق وسلوک میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا جائے اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی سے بچا جائے، ان کے دیوی دیوتاؤں اور بزرگوں کو برا بھلا نہ کہا جائے، البتہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان عقیدہ اور مذہب کے معاملات میں ''لو اور دو'' کا رویہ اختیار کریں، اس مسئلہ میں اسلام کی غیرت کا حال یہ ہے کہ اس نے دوسری قوموں سے تشبہ سے سختی سے منع کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''**من تشبه بقوم فهو منهم**'' (ابوداؤد: ۴۰۳۱)۔

اسلام کے احکام کی اصل بنیاد ''توحید'' پر ہے، اور اس میں ادنیٰ درجہ لچک اختیار کرنے کی گنجائش نہیں، اس لیے کسی ''مورتی پوجا تیوہار'' پر مبارک باد، اظہار مسرت، اس طرح کے مشرکانہ عقیدہ مظہر جلوس کا استقبال کرنا قطعاً جائز نہیں (بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/ ۳۳۴)۔

☆ کھنڈ پیڑا، شجاع گنج، فیض آباد، یوپی۔

مذہبی پہلو کے اعتبار سے جہاں عقیدے پر آنچ آنے کا خطرہ ہو وہاں دیگر مذہبی گروہوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جن امور کا تعلق سماج سے ہے ان میں دیگر مذاہب کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا جاسکتا ہے، غزوہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ آپ نے جو حسن سلوک فرمایا، تمام اہل سیر نے اس کا ذکر کیا ہے۔

جن سیاسی معاملات میں دین وایمان کا خطرہ نہ ہو ان میں اخوت و بھائی چارہ کے تحت مختلف مذاہب کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا جاسکتا ہے۔

جواب: ۲۔ضرورت کے وقت دیگر مذاہب کی مستند کتابوں کا حوالہ بھی دیا جاسکتا ہے اور ان کی کتابوں سے فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے، جیسا کہ مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی تفسیر میں کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

جواب: ۳۔ہم یہاں غیر مسلموں کے حق میں استغفار اور تجہیز وتکفین کے حوالہ سے باہمی تعلقات کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔

ثواب پہنچانا یا استغفار کرنا صرف مسلمان ہی کے لئے جائز ہے، کافر اور مشرک کے لئے جائز نہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين ولو كانوا أولي قربى من بعد ما تبين لهم أنهم أصحاب الجحيم" (توبہ: ۱۱۳) (نبی اور ایمان والوں کے لئے روا نہیں کہ یہ ظاہر ہوجانے کے بعد کہ مشرکین دوزخی ہیں ان کے لئے دعا کریں، گو وہ ان کے قرابت دار ہوں)۔

اس لئے کافر والدین کے لیے نہ استغفار جائز ہے اور نہ ہی ایصال ثواب۔

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک شخص جو حالت کفر میں مرجاتا ہے وہ خدا کا باغی ہے، اس لحاظ سے وہ یقینا اس لائق ہے کہ اس سے بے تعلقی برتی جائے، یہ بے تعلقی، بے مروتی اور ناروا داری نہیں، بلکہ وفاشعاری اور انصاف کا تقاضا ہے۔

خود آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں اس کی دو واضح مثالیں ملتی ہیں: ایک مثال حضرت ابوطالب کی ہے، جو آپ ﷺ کے چچا بھی تھے اور محسن ومحافظ بھی، لیکن ایمان ان کے لیے مقدر نہیں تھا، آپ ﷺ نے ان کے لئے دعاء مغفرت کی تو مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

دوسری مثال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے رأس المنافقین عبداللہ بن ابی پر نماز جنازہ پڑھی، جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا، حالانکہ وہ باطن میں ایمان سے محروم تھا، اس موقع سے بھی ارشاد خداوندی ہوا:

"ولا تصل على أحد منهم مات أبدا ولا تقم على قبره إنهم كفروا بالله ورسوله وماتوا وهم فاسقون" (التوبہ: ۸۴)۔

(ان میں سے مرنے والوں پر آپ کبھی بھی نماز نہ پڑھیں، اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور فسق کی حالت میں رہے ہیں)۔

اس لئے غیر مسلموں کے لیے استغفار، قرآن کی تلاوت، ایصال ثواب وغیرہ جائز نہیں ہے۔

عام طور سے ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ مسلمان غیر مسلم کے جنازے میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح غیر مسلم کو مسلمان اپنے جنازے میں شریک کرے یا نہ کرے؟ تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر کسی غیر مسلم کا انتقال ہوجائے تو مسلمان کا ان کے مرگھٹ تک جانا اور ان کے جنازے میں شریک ہوکر چلنا جائز نہیں ہے، خواہ مرنے والا غیر مسلم محلہ کا پڑوسی ہو یا غیر محلہ کا اور چاہے اپنے تعلق داروں میں سے ہو، اسی طرح غیر مسلم کی مسلمانوں کے جنازے میں شرکت جائز نہیں ہے (احسن الفتاوی ۲۳۳/۴)۔

غیر مسلموں کے لیے استغفار اور ایصال ثواب تو قطعاً ناجائز ہے، اور اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے (ترمذی: ۲۰۳۷)۔

البتہ اگر کہیں کسی خاص موقع پر مسلمان کا نہ جانا محسوس کیا جائے اور اس سے باہمی فاصلہ بڑھ جانے کا خطرہ ہو تو پسماندگان کی دلداری اور تسلی کی نیت سے جایا جاسکتا ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو ابو طالب کی وفات کے بعد ان کی تدفین کی ذمہ داری انجام دینے کی ہدایت فرمائی تھی (اعلاء السنن ۲۸۲/۸، کتاب الفتاوی ۱۶۷/۳)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ شرکیہ افعال کو چھوڑ کر، فتنہ وفساد سے بچتے ہوئے انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے شرکت کی اجازت ہے، انشاء اللہ اس سے تعلقات خوشگوار رہوں گے۔

جواب: ۴۔ ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کی غرض سے ان اعمال کو ترک کیا جاسکتا ہے، جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت سے ہے، اس لئے کہ اسلام میں فساد فی الارض کو ناپسند کیا گیا ہے، اور آپس میں اخوت وبھائی چارہ کا حکم دیا گیا ہے، اور ایک دوسرے کے درمیان صلح صفائی کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ شب قدر کی تعیین کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ آپس میں دو لوگوں کے جھگڑے کی وجہ سے شب قدر کی تعیین اٹھالی گئی، اس لئے اگر کوئی ایسا عمل ہے جس کا تعلق شرعاً فرض وواجب کے درجہ میں نہیں تو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ باعث ثواب ہے۔

جواب: ۵۔ ’’**قل یا أیها الکافرون، لا أعبد ما تعبدون، ولا أنتم عابدون ما أعبد، ولا أنا عابد ما عبدتم، ولا أنتم عابدون ما أعبد، لکم دینکم ولی دین**‘‘ (الکافرون: ۱-۶)۔

(کہہ دیجئے اے انکار کرنے والو، میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں، اور نہ مجھے اس کی عبادت کرنی ہے جس کی عبادت تم کرتے رہے ہو، اور نہ تمہیں اس کی عبادت کرنی ہے جس کی عبادت میں کرتا ہوں، تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین)۔

مکہ کے کچھ سرداروں نے آپ ﷺ کے سامنے پیشکش رکھی کہ کچھ دن آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کرلیا کریں تو ہم آپ کے خدا کی عبادت کرلیا کریں گے، اس پر یہ سورہ نازل ہوئی اور اس میں بات صاف کردی گئی کہ غیروں کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ درست نہیں ہوسکتا جس میں ان کے شعائر اختیار کرنے پڑیں، شرک کی ملاوٹ کرنی پڑے، چنانچہ اس سورہ میں صاف کہہ دیا

گیا کہ ایسی مصالحت ممکن ہی نہیں تم جو کررہے ہو، اس کے نتائج تم خود ہی دیکھ لوگے اور میں جس دین پر ہوں اس کے نتائج کا میں خود ذمہ دار ہوں۔

انسان کی اخلاقی زندگی کے جن پہلوؤں سے لوگوں کا سب سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے، اور جن کے اثرات ونتائج بھی دوررس ہوتے ہیں ان میں اس کی زبان کی شیرینی یا تلخی بھی ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ اپنے متبعین ومتعلقین کو شیریں گفتاری اور خوش کلامی کی بڑی تاکید فرماتے، اور بدزبانی اور سخت کلامی سے شدت کے ساتھ منع فرماتے، بعض مرتبہ آدمی کسی ایک بول سے اوج ثریا تک پہنچ جاتا ہے اور بعض مرتبہ دیکھنے میں کسی معمولی بات سے تحت الثری میں جا گرتا ہے، اس لئے زبان کی حفاظت اور اس کا برمحل استعمال بے حد ضروری ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''الكلمة الطيبة صدقة'' (البخاری: ۲۹۸۹، مسلم: ۲۳۳۵) (بھلی بات کہنا بھی صدقہ ہے)۔

کسی کے ساتھ اچھی بات نرم لہجے میں کرنا اس کے دل کی خوشی کا باعث ہوتا ہے، اور اللہ کے بندہ کے دل کو خوش کرنا بلاشبہ بڑی نیکی ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتانا، کسی کو مناسب مشورہ دے دینا، نہ جاننے والے کو ضروری علم سے باخبر کردینا، جھگڑنے والوں میں صلح صفائی کرادینا، الغرض زبان سے کوئی بھی بھلائی کا بول بول دینا، کلمہ خیر میں داخل ہے، اور یہ نیکیاں کمانے کا بہت آسان نسخہ ہے، صرف توجہ اور ارادے کی ضرورت ہے۔

دوسری طرف زبان کی حفاظت کی تاکید بھی فرمائی گئی ہے کہ اس سے ایسی بات نہ نکل جائے جس سے منفی اثرات مرتب ہوں اور کسی بندہ خدا کا دل دکھے، جھوٹ، غیبت، چغلی، بدگوئی، فحش کلامی، لڑائی جھگڑا، گالیاں بکنا، یہ سب زبان کے گناہ ہیں، یہاں تک کہ بے ضرورت زیادہ گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں، حدیث میں زبان کی مثال درانتی سے دی گئی ہے، جس طرح اس سے کھیتی کاٹی جاتی ہے، اس کے ساتھ اچھی بری گھاس بھی کٹتی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی قینچی جب چلتی ہے تو آدمی بھول جاتا ہے کہ اس نے اپنے لیے کیا اچھا برا جمع کرلیا، اس لیے اس کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس لئے باطل عقائد پر تنقید کے لئے ایسا لہجہ اپنایا جائے جس سے دل پر کانٹا بن کر نہ چبھے اور اپنا پیغام بھی پہنچ جائے۔

جواب: ۶۔ دور جاہلیت میں عورتیں انسان اور حیوانات کے درمیان ایک منحوس مخلوق سمجھی جاتی تھیں، معاشرتی زندگی میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، جب چاہا چوپایوں اور گھر کے دوسرے سامانوں کی طرح انہیں فروخت کردیا، کبھی قرض کے عوض گروی رکھ دیا، محمد بن مسلمہ کہتے ہیں کہ میں جب کعب بن الاشرف کے یہاں قرض مانگنے گیا تو اس نے کہا کہ تم اپنی عورتوں کو میرے پاس رہن میں رکھ دو پھر قرض دوں گا، شقاوت و بربریت کا یہ عالم تھا کہ زچگی کے وقت پہلے سے ہی ایک گڑھا کھود کر رکھا جاتا، جب لڑکے کی پیدائش ہوتی تو خوشیاں منائی جاتیں، اور اگر لڑکی پیدا ہوتی تو اسی گڑھے میں ڈال دیا جاتا، مرد لڑکیوں کے باپ بننے کے لئے قطعاً تیار نہ ہوا کرتے، اس وقت اس کی جو حالت ہوتی قرآن کریم نے اس کی طرف منظر کشی کی ہے:

''وإذا بشر أحدهم بالأنثى ظل وجهه مسوداً وهو كظيم'' (النحل: ۵۸) (جب بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی

جاتی تو اس کا چہرہ بے رونق ہو جاتا اور دل ہی دل میں گھٹتا رہتا)۔

ایسا بدبخت شخص ذلت سے بچنے کے لئے اس کو زندہ درگور کر دیتا: "وإذا الموؤدة سئلت...." (التکویر:۸) (جس وقت لڑکی سے جو زندہ درگور کی گئی تھی پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور کے بدلے مار ڈالی گئی)۔

ان کا یہ تصور تھا کہ ان لڑکیوں کی پرورش و پرداخت کہاں سے ہوگی، ان کے کھانے پینے کا نظم کیسے ہوگا، کسی کو داماد بنانا میرے لئے عار و شرم کی بات ہے۔

جب اسلام کی شعاع پھیلی تو اس نے معاشرہ میں عورتوں کو عزت و احترام کا مقام دیا اور رتبہ کے لحاظ سے مردوں کے ہم پلہ بنایا، قرآن کریم میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر کیا: "إن المسلمين والمسلمات والمؤمنين والمؤمنات" (الاحزاب:۳۵)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم میں عورتوں کے نام سے مستقل ایک سورہ، سورۃ النساء رکھا، عورتیں چاہے ان کی حیثیت ماں کی ہو، یا بہن کی، بیٹی کی ہو یا بیوی کی، ہر ایک کے الگ حقوق و آداب بیان کئے، اور واضح طور پر فقر و فاقہ کے خوف سے ان کے قتل کو ناجائز ٹھہرایا، کہ تم اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشہ سے قتل نہ کرو۔

"ولا تقتلوا أولادكم خشية إملاق نحن نرزقهم وإياكم إن قتلهم كان خطأ كبيراً" (الاسراء:۳۱) (مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو ہم ان کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے)۔

اسلام بنیادی طور پر ظلم کا مخالف ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کا وجود ہی دنیا سے ظلم مٹانے کے لئے ہوا ہے، اسلام کی فطرت یہ ہے کہ وہ ظلم کو برداشت نہیں کر سکتا، پورا اسلامی نظام ہر سطح پر ظلم کو ختم کرنے کے لئے مستعد رہتا ہے، اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ آدمی جہاں تک بھی ہو سکے اپنی قوت اور اثرات کا استعمال کر کے مظلوم کی حمایت کرے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من لا يرحم لا يرحم" (مسلم کتاب الفضائل:۶۰۲۸) (جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا)۔

رسول اللہ ﷺ نے اخلاق کے سلسلہ میں جن باتوں پر خاص طور سے زور دیا ہے، اور آپ کی اخلاقی تعلیم میں جن کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نرمی کا اور رحم دلی کا معاملہ کرے، آپ ﷺ نے اس کی عظمت یوں بھی بیان فرمائی ہے کہ نرمی اللہ تعالی کی ذاتی صفت ہے، پھر فرمایا کہ اللہ تعالی کو یہ محبوب ہے کہ اس کے بندوں کا باہمی معاملہ اور برتاؤ نرمی کا ہو، یہ بھی فرمایا کہ وہ نرمی پر جس قدر دیتا ہے سختی پر نہیں دیتا۔

یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ آپس کی ملاطفت، رحم دلی اور نرمی سے جتنے کام بن جاتے ہیں وہ کسی اور چیز سے نہیں بنتے، پھر اس میں اللہ کا خاص فضل اور اس کی نگاہ رحمت شامل ہو جاتی ہے، اور یہی سنت کا طریقہ ہے، اس کے برخلاف جو لوگ درشتی سے کام لیتے ہیں اور سنگ دلی برتتے ہیں وہ عام طور پر عنایات ربانی سے محروم رہتے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: "ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء" (تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا)۔

یہ نرمی اور مہربانی ہر ایک کے ساتھ ہو، اس میں اپنوں، پرایوں میں کوئی فرق نہ کیا جائے، البتہ جو جتنا زیادہ رشتہ میں قریب ہو، پڑوس کی قربت رکھتا ہو اس کا حق بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔

اولاد خدا تعالی کا بہت بڑا انعام ہے، اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے آپ کو اپنے ایک نیک بندے کی پرورش کی توفیق بخشی اور یہ موقع فراہم فرمایا کہ آپ اپنے پیچھے اپنے دین و دنیا کا جانشیں چھوڑ جائیں۔

چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لئے دوڑ دھوپ کو آپ ﷺ نے اللہ کی راہ میں جدوجہد بتایا ہے (طبرانی)۔

انسان اس دنیا میں اللہ کی بندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور یہی اس کا اصل مقصود ہے، البتہ ضرورت زندگی کے لئے کسب معاش کی بھی اجازت دی گئی ہے، کسب معاش میں خدا کی مقدر کی ہوئی حلال اور طیب رزق کی تلاش مقصود ہو اور اس کی رزاقیت پر بھروسہ ہو تو وہ عین عبادت اور کار دین میں مشغول ہونے والوں میں شمار ہوتا ہے۔

شریعت کا مزاج یہ ہے کہ سب سے پہلے بچے کو دینی تعلیم سے واقف کرایا جائے، اس کے بعد اگر کوئی دوسرا کمانے کے لئے نہیں ہے تو پھر اس کو کوئی کام سکھایا جائے یا مزدوری پر لگایا جائے، بچہ کو مزدوری پر لگانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی وسعت کے بقدر ہی اس سے کام لیں، اجرت پر رکھنے والوں کو ضرورت سے زیادہ کام لینے کی شریعت کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

معاشرے کے وہ افراد جن کے قلوب معصیت اور ظلم کے تسلسل سے زنگ آلود ہو گئے ہیں، نہ انہیں اپنی عفت وعصمت کی پرواہ ہے اور نہ ہی دوسروں کی آبرو کا لحاظ، یہ معاشرے کے لئے سم قاتل اور ناسور بنے ہوئے ہیں، ان پر قابو پانے کے لئے ایسی سزاؤں اور تنبیہات کا تعین کیا جائے کہ آمادہ جرم نہ ہونے پائیں، اور اگر اس کی جرأت کریں تو ان کا نفاذ مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچا دیں، تاکہ دوسروں کے لئے عبرت بن جائیں۔

ظلم جس نوعیت کا ہو سزا اسی کے لحاظ سے ہو، اسلامی تعزیرات کا آخری درجہ سزائے موت ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ قاضی یا حاکم مجرم کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ لے، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کی وجہ سے ہی وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے، جس میں فسق وفجور، شر وفساد، ظلم و ناانصافی کا صفایا ہو جاتا ہے، بڑے سے بڑے عادی مجرموں کا حوصلہ جرم پست بلکہ فنا ہو جاتا ہے۔

اس لئے ان سب جرائم کے خاتمہ کے لئے دیگر مذاہب سے تبادلہ خیال کیا جا سکتا ہے۔

جواب: ۷۔ آبادیوں کے اختلاط اور تعلقات کے اس پھیلاؤ کی وجہ سے بین مذہبی مذاکرات کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے، اس ضرورت کے پیش نظر ایسی چیزوں میں مذاکرات کئے جاسکتے ہیں جن میں مذہب کے خلاف کوئی ایسی بات نہ پائی جائے جس سے دین وایمان کا خطرہ ہو، اس لئے کہ سیاست میں مسلمانوں کو حصہ کی اجازت دی گئی ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں اسلامی حکومت کا قیام فی الوقت ممکن نہیں ہے اور دنیا کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ مسلم مما لک کی طرف ہجرت بھی نہیں کی جاسکتی، پھر جب رہنا یہیں ہے تو سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے سے اسلام پر مکمل طور سے دشمنوں کے حاوی ہوجانے کا خطرہ ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سیاست سے مسلمانوں کے وسیع تر دینی وملی مفاد متعلق ہیں، اگر وہ جمہوری نظام سے بے تعلق ہوجائیں تو ان سے ان کو غیر معمولی نقصان پہنچ سکتا ہے، اوران کے مفاد پر کاری ضرب لگ سکتی ہے، جس کے بعد مسلمانوں کے لئے اپنی تعلیمی اور تبلیغی مساعی جاری رکھنا بہت ہی مشکل ہوجائے گا، اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمان اپنا میدان تعلیم، تجارت، صنعت اور فلاحی کاموں میں امتیاز اور تفوق پیدا کریں، اور معاشرے میں ایسا لازمی عنصر بن جائیں جس کی ہر جگہ ضرورت پڑے، خاص قسم کے حالات میں اگر مفاد عامہ وابستہ ہوں تو غیر شرعی نظاموں میں شرکت کی گنجائش ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں وزیر خزانہ بنا دیا جائے: "**اجعلی علی خزائن الأرض**" (یوسف:۵۵) (اور ہم نے یوسف کو ملک کا اقتدار عطا کیا)۔

اور ظاہر ہے کہ اس وقت مصر میں قوانین الٰہیہ کے تابع حکومت نہیں تھی، اس کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام کی اس نظام میں شرکت پر قرآن شاہد ہے، اس لئے الیکشن میں شریک ہونے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہے کہ کسی ناجائز چیز کا ارتکاب نہ ہو، ورنہ جس گناہ کا ارتکاب وہ کرے گا اس کا گناہ اس کو ہوگا، اسی طرح الیکشن میں شرکت اتنی ہی ہو جتنی شرعاً ضروری ہے۔

ایک غلط فہمی تو یہی ہے کہ آج کی سیاست مکر وفریب کا دوسرا نام بن چکی ہے، اس لئے شریف آدمیوں کو سیاست میں کوئی حصہ نہ لینا چاہئے، اس لئے عقلمندی اور شرافت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سیاست کو دور دور سے برا کہا جاتا رہے، بلکہ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے چھیننے کی کوشش کی جائے جو اسے مسلسل گندا کررہے ہیں، بالفاظ دیگر سیاست میں شرکت کرنا جائز ہے۔

کسی مذہب کی سیاسی جماعت کی نمائندہ شخصیت کے ساتھ گفت وشنید کی جاسکتی ہے، جبکہ گفت وشنید کے درمیان کوئی ایسی بات نہ ہو جو اسلام مخالف ہو، اور اگر اسلام مخالف باتیں ہیں تو گفت وشنید کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ معصیت میں تعاون سے منع کیا گیا ہے۔

"**ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان**" (المائدہ:۲) (گناہ اور معصیت کے کاموں میں تعاون نہ کرو)۔

جواب:۸۔شریعت کے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حکم کے اندر بہت ساری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں، بعض مصلحتوں کو ہماری کوتاہ نگاہی دیکھتی ہیں اور بعض کو نہیں، شریعت نے عورتوں کے لئے پردہ کا جو نظام بنایا ہے وہ بھی انسانی فطرت کے مطابق بہت اہم اور ضروری ہے، اسی میں عورت کا تحفظ ہے اور ان کی عصمت وعفت کی حفاظت بھی، نیز یہ ان کو ظاہری وباطنی بہت سی برائیوں سے روکتی ہے، بلکہ معاشرہ کے مصالح کا مدار اسی پر ہے۔ B22

خواتین سے بنیادی طور پر ایسی ذمہ داریاں متعلق کی گئی ہیں جو اندرون خانہ کی ہیں، اور انہیں شمع محفل بننے کے بجائے گھر

کی ملکہ بنایا گیا ہے، انہیں محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اس لئے عورتوں کو اس طرح کے پروگراموں میں شرکت نہیں کرنی چاہئے، اور اس لئے بھی کہ عورت سراپا پردہ ہے، اور اس کی آواز بھی پردہ میں شامل ہے، لیکن اگر ضرورتاً اور مصلحتاً عورت کو اسٹیج پر آنا ہی پڑے تو پورے پردے کے ساتھ آئے اور مردوں سے الگ ہو کر بیٹھے، مسلمانوں کو اس طرح کی مجالس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن اگر شرکت ضروری ہو تو اختلاط سے بچتے ہوئے ان سے علاحدہ جگہ کا انتخاب کرنا چاہئے۔

دیگر اہل مذاہب سے مذاکرات اور اس کے اصول وآداب

مفتی محمد مقصود فرقانی ☆

(۱) مختلف مذاہب کے لوگوں سے مذہبی، سماجی اور سیاسی تینوں پہلوؤں پر باہمی مذاکرات کرنا درست ہے، اس کے بہت اچھے نتائج ثابت ہوں گے، الموسوعۃ الفقہیہ (۶/۱۲) پر ہے:

"قال ابن تیمیة: لو أن المسلم بدار حرب أو دار کفر غیر حرب لم یکن مأموراً بالمخالفة لهم وللکفار، فی الهدی الظاهر لما علیه فی ذلک من الضرر بل قد یستحب للرجل أو یجب علیه أن یشارکهم أحیانا فی هدیم الظاهر إذا کان فی ذلک مصلحة دینیة من دعوتهم إلی الدین والاطلاع علی باطن أمورهم لأخبار المسلمین بذلک أو دفع ضرر هم عن المسلمین ونحو ذلک من المقاصد الحسنة"، اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصلحت دینی اور سیاست شرعی کا تقاضا یہ ہے کہ کفار وغیرہ سے مذہبی، سماجی اور سیاسی مشارکت ومذاکرات ہونا چاہئے، اس سے دعوت الی الاسلام کا راستہ ہموار ہوگا اور مختلف مذاہب کے لوگوں کے باطنی امور پر مسلمانوں کو اطلاع ہوگی، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو کفار وغیرہ سے نقصان کم سے کم پہنچے گا اور اسی طرح موسوعہ فقہیہ (۲۸۹/۱۲) پر ہے کہ مسلمان کے لئے کافر کی تعزیت کرنا درست ہے، امام شافعیؒ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے۔

"ذهب الأئمة الشافعی وأبو حنیفة فی روایة عنه إلی أنه یعزی المسلم بالکافر وبالعکس"۔

اور صفحہ ۱۳ پر ہے کہ کفار وغیرہ کو مسلمانوں کے شہروں میں آباد ہونے سے نہیں روکا جائے گا، تاکہ وہ مسلمانوں کے شہروں میں بیع وشراء کریں اور یہ چیز ان کے لیے دعوت اسلام کا ذریعہ بن جائے: **"ولا یمنعون من أن یسکنوا فی أمصار المسلمین فی غیر جزیرة العرب یبیعون ویشترون لأن عقد الذمة شرع لیکون وسیلة لهم إلی الإسلام وتمکینهم من المقام أبلغ إلی هذا المقصود"**، البتہ مسلمانوں کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ کفار وغیرہ کو خوش کرنے کے لیے ان کے مندر اور گرجا گھر میں داخل ہوں، ایسی مشارکت درست نہیں ہے، اسی کتاب الموسوعۃ الفقہیہ (۹/۱۲) کی عبارت ہے:

"إنما یمنعون أن یدخلوا علیهم بیعهم وکنائسهم"، اور اسی کتاب کی (جلد ۷/ ۱۱۲) پر ہے کہ حربی کے ساتھ تجارت کرنا جائز ہے اور مسلمان کے لئے یا ذمی کے لئے امان لے کر تجارت کی غرض سے دار الحرب میں داخل ہونا درست ہے اور

☆ مفتی جامع العلوم فرقانیہ رامپور، یوپی۔

حربی کے لئے دارالاسلام میں تجارت کے لئے داخل ہونا درست ہے۔

"تدل عبارات الفقهاء على جواز الاتجار مع الحربيين فللمسلم أو الذمي دخول دار الحرب بأمان للتجارة وللحربي دخول دارنا تاجراً بأمان"۔

اور صفحہ (۱۲۸) پر ہے کہ جب مسلمانوں کا کفار وغیرہ سے اختلاط ہوگا تو یہ اختلاط دعوت اسلام کے لئے راستہ ثابت ہوگا اور اس میں مسلمانوں کی طرف سے کفار کے لئے اکراہ بھی نہیں ہوگا۔

اور صفحہ (۱۳۲) پر ہے: **"تجوز معاملة الإيجار والاستئجار بين المسلمين وأهل الذمة في الجملة"**۔

اور صفحہ (۱۴۶) پر ہے کہ تعامل اہل کتاب کے ساتھ جائز ہے اور حضور ﷺ نے ایک یہودی سے تعامل فرمایا ہے۔

اور الموسوعۃ الفقہیہ (۲۵/ ۲۳۳) پر ہے کہ کفار سے دین کی مصلحت وحکمت کی وجہ سے صلح کرنا جائز ہے:

"الدعوة إلى المسلم مع الكفار وموادعتهم ومهادنتهم من قبل إمام المسلمين جائزة إن كان في ذلك مصلحة تعود على المسلمين فقد ذكر الحنفية أن الإمام إذا رأى أن يصالح أهل الحرب أو فريقاً منهم وكان ذلك مصلحة للمسلمين فلا بأس به لقوله تعالى وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله ووداع رسول الله ﷺ أهل مكة عام الحديبية على أن يضع الحرب بينه وبينهم عشر سنين، ولأن الموادعة جهاد معنى إذا كان خيراً للمسلمين لأن المقصود وهو دفع الشر حاصل بهما"۔

(۲) مذہبی مذاکرات میں دوسرے مذہب کی کتابوں سے حوالہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، ان سے حوالہ دینا اور ان سے استفادہ کرنا درست ہے۔

(۳) اس سوال کا جواب سوال نمبر ایک کے جواب میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے کہ باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لیے دیگر اہل مذاہب کے بعض افعال واعمال میں انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے تعلق سے شرکت کرنا جائز ہے، البتہ ایسے رسوم جو غیر مسلموں کے شعار میں داخل ہیں اور ان کے مذہب میں شامل ہیں، ان میں مسلمانوں کے لئے شرکت کرنا جائز نہیں ہے، جیسے ان کے بت خانہ میں داخل ہونا اور ان کے تہوار میں شریک ہونا اور جو ان کی عید کے دن ہیں ان دنوں میں انہیں ہدیہ تحفہ دینا، ان دنوں کی عظمت سمجھ کر یہ درست نہیں ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۲/ ۷)۔

موسوعہ ۲۱/ ۱۲ پر ہے: **"لا خلاف بين الفقهاء في أنه لا يجوز للمسلم أن يدفن كافراً ولو قريباً إلا لضرورة بأن لا يجد من يواريه غيره فيواريه وجوبا"**، ان عبارات سے معلوم ہوا کہ کفار کے مذہبی رسوم میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، البتہ یہ کہ کوئی شرعی ضرورت پیش آجائے تو اس وقت شرکت درست ہے جیسے کہ کافر کو کوئی دفن کرنے والا نہ ہو اور وہ مرجائے تو پھر یہ مسلمان اسے گڑھے میں دفن کردے۔

(۴) فتنے اور فساد سے بچنے کے لیے ایسے اعمال کو ترک کرنا جائز ہے جو شرعاً نہ واجب ہیں اور نہ وہ مذہب میں داخل

ہیں، بلکہ فتنہ کو دفع کرنے کے لیے ایسے اعمال کو ترک کردینا بہتر ہے، جیسے آج کل گائے کے ذبیحہ کا مسئلہ ہے، ہمارے ملک کی جو صورتحال ہے اور گائے کے ذبیحہ کی وجہ سے جو فتنہ وفساد ہورہا ہے اور مسلمانوں کا جانی ومالی نقصان ہورہا ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے گائے کا ذبیحہ نہ کرنا بہتر ہے، بلکہ اس کا جو متبادل ہے اور اس سے فتنہ وفساد کا بھی کوئی خوف نہیں ہے مسلمانوں کو اس کا ذبیحہ کرنا بہتر ہے۔

(۵) دعوت اسلام کے لئے اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کو وہ اسلوب اختیار کرنا چاہئے جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "**ادع إلی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتي ھي أحسن**" (سورہ نحل: ۱۲۵)۔ اور رسول کریم ﷺ نے جب اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی تو فرمایا: "**تعالوا إلی کلمة سواء بیننا وبینکم أن لا نعبد إلا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا نتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون اللہ**" (سورہ آل عمران: ۶۴)۔

ان دونوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اہل مذاہب کو دعوت اسلام دینے میں حکمت ومصلحت ملحوظ نظر رکھنا چاہئے اور ان کے معبودوں وکتابوں پر ایسی تنقید نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اللہ رب العزت پر اور ہمارے انبیاء ورسولوں پر تنقید کریں، کیونکہ جب ہم ان کے معبودوں وغیرہ کو برا کہیں گے تو وہ ہمارے رسولوں کو برا کہیں گے اور بجائے اسلام کی طرف متوجہ ہونے کے اسلام ومسلمانوں سے متنفر ہوجائیں گے، اس کے لیے ان سے اشتراک اور باہمی مذاکرات اور حسن سلوک وحسن اخلاق بہتر کارگر ثابت ہوگا۔

الموسوعۃ الفقہیہ (۲۱/۲۷۳) پر ہے کہ کفار کے بتوں کو برا نہیں کہنا چاہئے اور قرآن کریم نے بھی اس کی تائید فرمائی ہے: "**ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم**" (سورہ انعام: ۱۰۸)۔

(۶) مشترک سماجی مسائل جن کا مذکورہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ ایسے مسائل میں سب لوگوں کو متحد ہوکر کام کرنا چاہئے، اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اگر حکومت سے متعلق کوئی مسئلہ ہوگا تو حکومت پر بھی اس کا دباؤ ہوگا اور مسلمانوں کو حقوق حاصل کرنے میں مدد ملے گی اور اگر حکومت سے متعلق نہیں ہوگا تو ان مسائل پر عمل کرنا اس اتحاد کے ساتھ آسان ہوگا۔

(۷) اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دیگر اہل مذاہب کے ساتھ جمہوری ملک میں سیاست میں گفت وشنید کرنا مسلمانوں اور اسلام کے لئے مفید ہے تو ضرور مسلمانوں کو ان سے گفت وشنید کرنا چاہئے اور ان سے مذاکرات بھی کرنا چاہئے اور اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دیگر اہل مذاہب سے سیاست میں اشتراک ومذاکرہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے مضر ہے اور دیگر اہل مذاہب کے لئے قوت وفائدہ کا باعث ہے تو پھر ایسی صورت میں مسلمانوں کو دیگر اہل مذاہب سے سیاست میں مذاکرہ نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کا نقصان ہے۔

الموسوعۃ الفقہیہ میں پر ہے:

"وقد أجمع الفقهاء على جواز المهادنة حتى كانت في ذلک مصلحة للمسلمين لقوله تعالى فلا تهنوا وتدعو إلى السلم وأنتم الأعلون، فأما إذا لم يكن في الموادعة مصلحة فلا يجوز بالإجماع، وقال ابن العربي فإذا كان المسلمون على عزة ومنعة وقوة وجماعة عديدة وشدة شديدة فلا صلح وإن كان للمسلمين مصلحة في الصلح لنفع يجتلبونه أو ضرر يدفعونه فلا بأس أن يبتدئ المسلمون إذا احتاجوا إليه"(۲۳۲/۲۵)۔

(۸)اس سوال کے جواب میں دو شقیں نکلتی ہیں: اول یہ کہ مسلمان خواتین اسٹیج پر تقریر کریں، دوسرے یہ کہ غیر مسلم خواتین تقریر کریں، شریعت اسلامی نے عورت کو پردے کا حکم دیا ہے جس کے ساتھ مسلم خواتین مکلف ہیں اور غیر مسلم خواتین پردے کی شرعاً مکلف نہیں ہیں، اخلاقاً اور شرم وحیاء کو پیش نظر رکھتے ہوئے غیر مسلم خواتین کو بھی پردہ کرنا چاہئے، شریعت مطہرہ میں عورت کے چہرے اور دونوں ہاتھ پہنچوں تک اور دونوں پاؤں ٹخنوں تک پردے میں شامل نہیں ہیں، لیکن چونکہ فتنہ عموماً عورت کے چہرے ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے فقہاء نے لکھا کہ عورت کو چہرے کا بھی پردہ کرنا چاہئے (شامی)، لہذا مسلم خواتین کو اول تو مردوں کی مجلس میں تقریر نہیں کرنا چاہئے اور اگر وہ تقریر کریں تو باپردہ ہو کر تقریر کریں اور مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کی تقریر پر دھیان دیں، ان کی باتوں کو باغور سنیں اور شیطانی وسوسہ اور برے خیالات کی طرف ہرگز متوجہ نہ ہوں، اگر کوئی شیطانی خیال آئے تو اسے فوراً دل سے نکالیں اور لاحول ولا قوۃ إلا باللہ العلی العظیم پڑھ لیں اور اگر غیر مسلم خواتین تقریر کریں تو ان کو بھی ادباً واخلاقاً حتی الامکان باپردہ ہو کر تقریر کرنا چاہئے اور اگر وہ باپردہ نہ ہوں تو مسلمان انہیں پردے کا مشورہ دیں اور ان سے کہیں کہ آپ پردے کے ساتھ تقریر کریں، لیکن اگر کسی ایسی جگہ غیر مسلم خواتین کی تقریر ہو کہ جہاں نہ مسلمان انہیں پردہ کا مشورہ دے سکتے ہیں اور نہ وہ پردہ کر سکتی ہیں اور وہ بغیر پردہ کے تقریر کریں تو مسلمانوں کو ان خواتین کی تقریر سننے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اس میں بھی مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے دل ودماغ کو شیطانی تصورات وخیالات سے پاک رکھیں اور ذہن ان کی تقریر کی طرف متوجہ رکھیں، ان کی آواز ولباس اور جسم کی ساخت کی طرف ہرگز توجہ نہ کریں۔ فقط ہذا ما سنح لی واللہ اعلم بالصواب۔

مختلف دیانات کے مابین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

مولانا عبدالرؤف قاسمی ☆

جواب (۱): مختلف مذاہب کے لوگوں سے مذہبی امور میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایک اپنے اپنے مذہب پر عمل پیرا رہیں، ایک دوسرے پر مذہبی چیزوں میں رخنہ اندازی نہ کریں، بالفاظ دیگر مصالحت تو ہوسکتی ہے، لیکن اسلامی شعائر میں اختلاط کے طور پر مفاہمت نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تلبسوا الحق بالباطل وتكتموا الحق وأنتم تعلمون" (سورہ بقرہ: ۴۲)۔

(اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو، اور نہ حق بات کو چھپاؤ جبکہ تم اچھی طرح جانتے ہو)۔

ہم تو صرف مامور ہیں اس بات کے کہ رسول خدا ﷺ کے لائے ہوئے اوامر کو عمل میں لائیں، اور نواہی سے اپنے کو باز رکھیں، چنانچہ ارشاد ربانی:

"وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا" (سورہ حشر: ۷)۔

(اور رسول تمہیں جو دے اس کو لے لو اور جس سے تمہیں روکے اس سے رک جاؤ)۔

ہمیں مکمل طور پر اسلام میں داخل ہونے کا حکم کیا گیا اور غیروں کی پیروی سے منع کیا گیا۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

"يا أيها الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة ولا تتبعوا خطوات الشيطان إنه لكم عدو مبين" (سورہ بقرہ: ۲۰۸)۔

(اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقین جانو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے)۔

سماجی امور:

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سماجی امور میں حدود شرعیہ میں رہ کر غیر قوم کے ساتھ آپس کی ہمدردی، اتحاد اور اتفاق سے تعلقات کو استوار کرنا حسن معاشرت کے لئے جائز ہی نہیں، بلکہ انتہائی مفید اور نفع بخش کار ہے، چنانچہ محسن عالم جناب رسول اکرم ﷺ نے غیر مسلموں کی مہمان نوازی کی ہے، چنانچہ وفد بنونجران اور عدی بن حاتم وغیرہ کی مہمان نوازی کا واقعہ مشہور

☆ جامعہ اسلامیہ جلالیہ ہوجائی، آسام۔

ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے یہودی بچہ کی بیماری پر اس کی عیادت کی ہے۔

"أن غلاما يهوديا كان يخدم النبي ﷺ فمرض فأتاه النبي ﷺ يعوده، فقال :أسلم، فأسلم" (صحیح بخاری شریف، حدیث: ۵۶۵۷، باب عیادۃ المریض)۔

نیز آپ ﷺ نے ان کی مدد فرمائی، ان کو تحائف دیئے ہیں اور ان کے ساتھ اکرام اور احترام کا معاملہ فرمایا، نیز غزوہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ آپ ﷺ نے جو حسن سلوک فرمایا، اہل سیر نے اس کو ذکر فرمایا، انہیں وجوہات کی بنا پر غیر قوم بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک اور اولاد آدم ہونے کے ناتے مدد بھی کرنا چاہئے۔

امور سیاسیہ:

جن مسلمانوں کے اندر ہر قسم کی صلاحیت ہو وہ صحیح طور پر سیاست میں شریک ہو کر دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا سکتا ہو، اور غلط بات پر نکیر بھی کرتا ہو اور صحیح راہ عمل بھی پیش کرنے کا عزم و ارادہ ہو، ایسے لوگوں کو سیاست میں شریک ہونا درست و مفید ہے۔

"عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال :إن من أعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر" (ترمذی شریف ۲/ ۴۰، ابواب الفتن)۔

جواب (۳): دیگر اہل مذاہب سے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لئے سماجی، اقتصادی، مزاج و مذاق کی ہم آہنگی اور علاقہ و زبان کے اتحاد کی بنیاد پر تو ایک دوسرے کے ساتھ ذاتی دوستی ہوسکتی ہے، لیکن مذہبی حیثیت سے کفار کبھی بھی مسلمانوں کا حقیقی اور سچا خیر خواہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ قرآن کریم میں بالکل واضح انداز میں فرمایا گیا:

"يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا بطانة من دونكم لايألونكم خبالا" (سورہ آل عمران: ۱۱۷)۔

(اے ایمان والو! اپنے علاوہ کسی کو راز دار مت بناؤ، وہ تم سے فساد کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے)۔

البتہ غیروں کے ساتھ مدارات کی حد تک یعنی انسانی ہمدردی کی وجہ سے ایسی تقریب میں شرکت کی جاسکتی ہے جس سے وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائے، بشرطیکہ ان کی پوجا پاٹ یا مذہبی رسوم میں تعاوناً اور عملاً شریک نہ ہو، ہاں! اگر غریب و نادار ہو تو اس کو مال دے کر اس کی امداد کر سکتے ہیں۔

نیز ان کی ارتھی کو ہاتھ نہ لگاتے ہوئے اور ان کے مذہبی امور و معاملات میں عملاً و قولاً شریک نہ ہوتے ہوئے محض انسانی رواداری و ہمدردی کی حد تک یا دفع مضرت کی نیت سے دور سے شریک ہو جانے کی گنجائش ہے، لیکن یہ بات یاد رہے کہ ان مذکورہ حدود و قیود سے تجاوز کرنے کی **"لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"** کے تحت اجازت نہ ہوگی (نظام الفتاوی ۳/ ۱۹۰)۔

۴۔ جن امور کا تعلق صرف مسلمانوں کی متوارث تہذیب و ثقافت سے ہو، دین و مذہب سے ان کا کوئی سروکار نہ ہو، ان چیزوں کو دفع مضرات کی خاطر ترک کرنا اولی ہی نہیں بلکہ شرعاً مطلوب بھی ہے، چنانچہ اللہ تبارک و تعالی کا ارشاد ہے: **"والفتنة**

أشد من القتل"(سورہ بقرہ:۱۹۱)(اور فتنہ یہ قتل سے بھی زیادہ سخت چیز ہے)۔

۵۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ قرآن کریم کی بنیادی مقاصد میں سے ایک بہت ہی اہم مقصد اثبات توحید اور معبودان باطلہ اور امور قبیحہ پر تنقید کرنے کے تین طریقے ہیں جس کو باری تعالی نے سورہ النحل آیت ۱۲۵ میں بیان فرمایا ہے:"**ادع إلى سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن**"(آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف دعوت دیجئے حکمت کے ذریعے اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجئے اس طریقہ سے جو بہتر ہو)۔

مذکورہ تین طریقوں (۱) حکمت، (۲) موعظت حسنہ، (۳) جدال احسن میں سے، "حکمت" سے مراد یہ ہے کہ ہم مثبت انداز سے نہایت پختہ اور اٹل مضامین، مضبوط دلائل و براہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز سے اثبات توحید اور امور قبیحہ پر تنقید کو پیش کریں، جن کو سن کر فہم و ادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا دینے پر مجبور ہو جائے، دنیا کے خیالی فلسفے ان کے سامنے ماند پڑ جائے، اور کسی قسم کی علمی و دماغی ترقیات وحی الہی کی بیان کردہ حقائق کا ایک شوشہ تبدیل نہ کرسکیں، "موعظت حسنہ" سے مراد انتہائی موثر اور رقت انگیز نصیحتیں جو نرم خوئی اور دلسوزی کی روح سے بھری ہوئی ہو، چنانچہ یہ بات بالکل ناقابل انکار ہے کہ اخلاص، ہمدردی اور شفقت و حسن اخلاق سے خوبصورت اور معتدل پیرایہ میں جو نصیحت کی جاتی ہے بسا اوقات پتھر دل کافر بھی موم ہو جاتے ہیں، بے جان میں جان پڑ جاتی ہیں۔

۶۔ مشترک سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں پر ظلم وستم اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر روک ٹوک کرنے کے لئے مختلف اہل مذاہب کا اتحاد فکر ہو کر جدوجہد کرنا کارمفید ہے، کیونکہ اس سے پاکیزہ معاشرت وجود پذیر ہوتی ہے اور بہت سارے فسادات دور ہو جاتے ہیں اور حدیث ذیل پر عمل بھی ہو جاتا ہے۔

ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"**من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلک أضعف الإیمان**"(بخاری شریف)۔

یہ بات مسلم ہے کہ تمام اہل رائے نے قوم وسماج کے اصلاح کے لئے جب کوئی قانون وضابطہ بنائے تو اس قانون وضابطہ پر عمل کرنا سب پر ضروری ہے، بشرطیکہ یہ شریعت کے برخلاف نہ ہو، چنانچہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

"**السمع والطاعة على المرأ المسلم فیما أحب أو کره مالم یؤمر بمعصیة**"(مشکوۃ،ص:۳۱۹)۔

(حضرت رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان پر سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے پسندیدہ چیز میں بھی اور ناپسندیدہ چیز میں بھی جب تک معصیت کا حکم نہ کیا جائے)۔

اہل علم سے یہ چیز مخفی نہیں ہے کہ اللہ تعالی ہمیں انصاف اور لوگوں سے ہمدردی کا مکلف بنایا ہے، جب سماج میں عدل وانصاف اور ہمدردی نہیں رہے گی تب تو ہر قسم کی برائی کرپشن، ظلم وستم اور زیادتی وغیرہ ختم نہیں ہوگی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو چیزیں سماجی اعتبار سے ہندو مسلم سب کے نزدیک منکر ہیں، جیسے چوری، زنا، شراب نوشی، جوا، رشوت خوری، کرپشن، بے حیائی، ظلم وستم اور ایذاء رسانی وغیرہ ان کو ختم کرنے کے لئے مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنا ناگزیر ہے۔

۷۔ جمہوری ممالک کے اندر بعض ایسے صلاحیت منداور دانشور لوگوں کو سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے جو اپنے ایمان ویقین کے اعتبار سے پختہ ہوں اور اپنی قوم وملت کے لئے فکر مند ہوں، ان کو چاہئے کہ غیر قوم کے ساتھ بھی ہمدردی اور مواسات کا اظہار کر کے اپنا ہمنوا بنانے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھے اور ظلم وبربریت کو مٹانے کی جدوجہد کریں۔

۸۔ دور حاضر میں تقریباً سب ہی ملک کے حالات ایسے ہوگئے کہ کوئی بھی سیاسی تنظیم عورتوں سے خالی نہیں ہے، بلکہ بعض بعض ملکوں میں پوری حکومت کی باگ ڈور عورتوں کے ہاتھوں میں ہے، بعض عورتیں ایسے ایسے عہدوں پر فائز کی گئی ہیں جن سے قومی اور سماجی بہت سارے حقوق اور امور وابستہ ہیں، ان حقوق کو حقداروں تک رسائی ان سے گفت وشنید اور ان کے پروگراموں میں شرکت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور یہ قاعدہ مسلم ہے :"الحاجة تنزل منزلة الضرورة "، یعنی جہاں امت کی اجتماعی حاجات اس درجہ تک پہنچ جائیں کہ امت مشقت شدیدہ میں پڑے تو ان حاجات کو ضرورت کا درجہ دے کر محظورات کو مباح قرار دیا جاسکتا ہے (الاشباہ والنظائر، ص:۷۵)۔

انہیں وجوہات اور اپنی قوم وملت کے مفاد اوران کے مستحقہ حقوق کو ان تک پہنچانے کی غرض سے معتبر اور دیندار لوگوں کو اپنے آپ کو عورتوں کے اختلاط سے دور رکھ کر اور ہر طرح کی برائی اور گندہ خیالات سے بچتے ہوئے ایسے پروگراموں میں شرکت کی گنجائش ہوگی، جہاں خواتین مقرر بھی اسٹیج پر موجود ہوں (مستفاد از ''ضرورت وحاجت'' مرتب قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ، ص:۸)۔

بین مذہبی مذاکرات — اصول وآداب

مفتی عبدالمنان صاحب ☆

۱۔ مختلف مذاہب کے لوگوں سے جن امور پر مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، وہ بنیادی طور پر تین نوعیت کے مسائل ہوسکتے ہیں: مذہبی، سماجی اور سیاسی، ان تینوں میں سے سماجی اور سیاسی موضوعات پر مختلف جہتوں سے ایک دوسرے سے مربوط کرنے اور باہمی مفاہمت کے لئے مذاکرات ہوسکتے ہیں، لیکن مذہبی مذاکرہ ایک حساس اور کٹھن اور باریک پن کے مانند ہے، باہمی تعلقات کے لئے مشترکہ مذہبی امور میں مذاکرہ تو ہوسکتا ہے، لیکن دوسرے کے مذہب میں جو شرکیہ عقائد ہیں، مثلاً مورتی و بت پوجا وغیرہ یہ تو آگ اور پانی کا مسئلہ ہے، شرکیہ عقیدہ رکھنے والوں سے عقائد کے سلسلہ میں مذاکرہ ہو اور شرک کی برائی کی جائے تو اس سے فضا مزید خراب ہوسکتی ہے، جیسے اللہ تعالی نے فرمایا ہے: "**ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم**" (سورہ انعام)، یعنی تم ان کے معبودان باطلہ کو گالی مت دو، پھر وہ لوگ تمہارے برحق معبود کو گالی دیں گے، لہٰذا عقائد کے سلسلہ میں گفتگو نہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۲) مختلف مذاہب کی بہت سی تعلیمات میں اشتراک پایا جاتا ہے، مثلاً سب مذہب میں چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، زنا کرنا، شراب پینا، دوسرے کے اموال بغیر حق کے لے لینا، قتل وغارت کرنا، فساد مچانا وغیرہ ممنوع ہے، ان چیزوں سے روکنے کے لئے باہمی مذاکرات کی ضرورت ہو تو ان کی کتابوں کا حوالہ دینا ناجائز نہیں ہوگا، بلکہ اس قسم کی گفتگو سے سماجی اتحاد قائم ہوگا اور ایک دوسرے سے قریب ہونے کا موقع ملے گا۔

(۳) باہمی مذاکرات اور خوشگوار تعلقات کے لئے دوسرے اہل مذاہب کے بعض مذہبی رسومات واعمال میں (جس میں شرک نہ ہو) انسانی خدمت اور بھائی چارہ کے پہلو سے شرکت ممنوع نہیں ہوگی، شرط یہ ہے کہ اپنے مذہب پر ٹھیس پہنچنے والی کوئی حرکت نہ ہو۔

(۴) باہمی ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے اور فساد سے بچنے کی غرض سے کچھ ایسے اعمال جو شرعاً واجب نہ ہوں اور شعار اسلام میں سے بھی نہ ہوں ترک کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے، یا جن کا تعلق مذہب سے نہیں ہے؛ بلکہ مسلمانوں کی متوارث تہذیب وثقافت سے ہے، ایسے اعمال کو ترک کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے۔

☆ دارالحدیث پرمائی ویٹی، آسام۔

(۵) یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام کی نظر میں اللہ تعالی کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس جہت سے شرک پر اور معبودان باطل پر تنقید کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے، لیکن بعض دفعہ شائستہ تنقید بھی دل آزاری کا سبب بن جاتی ہے اور بعض زبان کی بے احتیاطی کی وجہ سے واقعتاً تنقید دل آزاری بن جاتی ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے مذاہب باطلہ پر تنقید کے سلسلہ میں اللہ تعالی کا فرمان "ولاتسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم" (سورہ انعام) کا خیال رکھنا مناسب ہوگا، ان کے معبودان تو یقینا باطل ہیں، اگر ان کو گالی دی جائے گی تو وہ لوگ ہمارے برحق معبود کو گالیاں دیں گے، چونکہ ان کو برحق معبود کا علم نہیں ہے، بلکہ دشمنی ہے، اس دشمنی کی وجہ سے اللہ تعالی کو برا بھلا کہیں گے۔

لہذا میرے خیال میں عقائد کے سلسلہ میں مذاکرات سے فائدہ کے بالمقابل نقصان کا پہلو غالب ہوجانے کا اندیشہ ہے، اتنا ہوسکتا ہے کہ اللہ کی صفت ربوبیت، خالق کائنات، مالک ارض وسماء کے دلائل بیان کئے جائیں، جیسا کہ اللہ تعالی نے قرآن میں کفار کو سمجھانے کے لئے مذکورہ چیزوں کا بیان فرمایا ہے۔

(۶) مشترک سماجی مسائل، غربت، کرپشن، بے حیائی، عورتوں مزدوروں اور عمر دراز لوگوں کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنا چاہئے، تاکہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر ظلم وستم وزیادتی کو دور کریں، غربت اور کرپشن دور کرنے کے لئے تو سیاسی طاقت وسماجی اتحاد کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور مذکورہ امور پر مذہب کے لوگ جو صاحب عقل وصاحب مروۃ ہوں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور متحدہ محاذ تیار کرنے پر راضی ہوں، اس صورت میں ہر طبقہ کے لوگ اور ہر درجہ کے افراد ماننے پر مجبور ہوں گے۔

لہذا اس سلسلہ میں مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات کرنا اور متحدہ پلیٹ فارم تیار کرنا بہت ضروری ہے۔

(۷) جمہوری ممالک کے اندر سیاست میں حصہ داری کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس کے لئے بعض اوقات نمائندہ شخصیتوں یا کسی مذہب کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعت کے گفتگو کی جب ضرورت ہوتی ہے تو ان کے ساتھ باہمی مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، لیکن جس جماعت کے نصب العین میں اسلام مخالف باتیں موجود ہوں تو بھی مسلمانوں کے سیاسی وجمہوری مفاد کے لئے باہمی مذاکرات میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۸) بین مذہبی مذاکرات کی مجلس یا پروگرام میں اسٹیج پر خواتین مقرر کا موجود ہونا دوسرے مذاہب میں کوئی عیب نہیں، چونکہ ان کے یہاں پردہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، صرف اسلام میں پردہ کا تصور ہی نہیں بلکہ ایک لازمی حکم ہے، ایسی مجلس میں مسلمانوں کے قومی وسیاسی مفاد کے لئے شرکت کی ممانعت نہیں ہوگی، مسلمانوں کو "قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم" کے حکم پر عمل کرتے ہوئے، نیز اپنی دینی حیثیت بحال رکھتے ہوئے خاتون کی تقریر سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

باب چہارم

مناقشہ

مناقشہ :

بین مذاہب مذاکرات

مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اس موضوع پر عرض مسئلہ پیش کیا۔

مولانا عتیق احمد بستوی :

یہ موضوع بہت ہی اہم ہے، اس لئے کہ اس وقت جو ملکی اور عالمی حالات ہیں، اس میں بین مذہبی مذاکرات کا موضوع بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اور بہت سے مسائل اس سے جڑے ہوئے ہیں، اس کے بارے میں ہمیں کچھ فیصلے دینے ہیں، رہنمائی کرنی ہے، آپ حضرات کو بحث کا موقع دینے سے پہلے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس موضوع سے متعلق کچھ تمہیدی باتیں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب فرمائیں گے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی :

واقعہ یہ ہے کہ دونوں عرض جو اس نشست میں پیش کئے گئے بہت ہی دقت نظر کے ساتھ لکھے گئے ہیں، سوال میں بھی تمام پہلوؤں کا احاطہ تھا اور جوابات میں بھی تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا، یہ موضوع اس وقت عالمی سطح پر بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، آپ جانتے ہوں گے کہ مذاہب کے درمیان ڈائیلاگ کا سلسلہ پوری دنیا میں چل رہا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس کے مطلوبہ نتائج جیسے آنے چاہئیں وہ نہیں آپا رہے ہیں، لیکن اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے اور اب اس کی بہت شدید ضرورت خود اس ملک میں ہوگئی ہے، آپ نے سنا ہوگا اور اخبار میں پڑھا ہوگا کہ ہندوستان میں ایک فرقہ پرست تنظیم RSS ہے، اس نے اعلان کیا ہے کہ ہم سال 2016 کو ہندوؤں کے اتحاد کا سال بنائیں گے، اور ہمارے عام برادرن وطن بہت سادہ لوح اور انصاف پسند ہیں، جو فرقہ پرست عناصر ہیں خاص کر اونچی ذات کے لوگ ہیں، وہ عام ہندوؤں کو آلہ کار بناتے ہیں اور ان کے پاس اس کمیونٹی کو متحد کرنے کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے، کوئی ایسا عقیدہ نہیں ہے جس پر تمام فرقوں کا اتفاق ہو، کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جس پر تمام فرقوں کا اتفاق ہو، کوئی ایسی عبادت نہیں ہے جس پر سب کا اتفاق ہو، کوئی ایسا تہوار نہیں ہے کہ جس پر سب کا اتفاق ہو، تو ان حالات میں جو اتحاد کی بنیاد بنائی جاتی ہے وہ مسلمانوں سے نفرت کی، مسلمانوں سے نفرت پیدا کر کے ہندوؤں کو متحد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان حالات میں یہ بات بہت ضروری ہوگئی ہے کہ ملک میں برادران وطن کی جو مختلف کمیونٹیز ہیں، ان سے ہم

الگ الگ بات کریں، اور میثاق مدینہ جس کا ابھی ذکر آیا، اس میں ایک بات بڑی اہم ہے، وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اس میثاق پر یہودیوں کے دستخط بحیثیت یہودی نہیں کروایا، اور اس وقت بچے ہوئے کچھ مشرکین بھی موجود تھے، اسی لئے وہ آیت نازل ہوئی جب انصار نے اپنے مشرک رشتہ داروں کی کفالت اور ان کی مدد روک دی تو اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا، لیکن بحیثیت مشرک ان کے دستخط اس پر نہیں کرائے گئے، رسول اللہ ﷺ نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ ان کو قبیلوں میں بانٹ کر ان سے دستخط کرایا جائے، یہودی قبائل سے آپ ﷺ نے دستخط کرایا، انصار سے بحیثیت انصاری قبائل کے آپ ﷺ نے دستخط کروائے، تاکہ مسلمانوں کا مسئلہ قبیلوں کے بنیاد پر ایک ایک گروہ سے ہو، کہ ایک مذہب سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کے ساتھ اگر مسلمانوں کا مقابلہ ہو اور اگر کبھی کوئی اختلاف پیدا ہوا تو سارے یہود متحد ہو جائیں گے، اسی لئے آپ نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے ان کی شرارتوں کے سد باب کے لئے بتدریج قدم اٹھایا، بنونضیر سے، بنو قریضہ سے وغیرہ، تو اس وقت ہندوستان میں اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے برادران وطن کے جو مختلف گروہ ہیں ان سے مسلمان الگ الگ مذاکرات کریں، خود ہم جس ریاست آسام میں بیٹھے ہوئے ہیں، اس میں آپ جانتے ہیں کہ شمال مشرق کی ریاستوں میں بہت چھوٹے چھوٹے قبائل موجود ہیں، ان کے نظریات الگ ہیں، ان کے مذہب الگ ہیں، ان کی ثقافتیں الگ ہیں، اور ہمارے یہاں جو برہمن ہیں ان کا مزاج دوسری قوموں کو اپنے اندر جذب کر لینے کا ہے، حالانکہ ان کی اصل لڑائی دراوڑ سے تھی، مگر انہوں نے ان کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا، اس ریاست میں کیسے خوں آشا واقعہ پیش آئے ہیں، تو صحیح معنوں میں ہم صحیح طریقہ سے مذاکرات کریں جس میں احکام شریعت کی پابندی بھی ہو اور جس میں مصلحت شناسی اور قوت فیصلہ بھی ہو، جب ہم اس ملک کی صورتحال کو بدل سکتے ہیں اور جو منصوبے ہمارے خلاف بنائے جا رہے ہیں ہم ان کا انشاء اللہ مقابلہ کر سکتے ہیں، اس سلسلہ میں چند اصولی باتیں جو ذہن میں آتی ہیں وہ یہ ہیں:

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا، تیرہ سال آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں گذارے، اور پھر آٹھ سال آپ ﷺ نے مدینہ میں گذارے، اس طرح ۱۳ اور ۸ کل اکیس سال ہوئے تب مکہ فتح ہوا، اور پھر تمام اہل مکہ دامن ایمان میں آ گئے اور پھر دو سال کے اندر پورے جزیرۃ العرب نے اسلام کے سامنے اپنا سر جھکا دیا، تو کیا اللہ اس بات پر قادر نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو طائف کے بازاروں میں پتھر کھانے سے اور شعب ابو طالب میں پیٹ پر پتھر باندھنے سے بچا لیتا، اور پہلے دن جب آپ ﷺ نے صفا پر اپنی نبوت کا اعلان کیا سب لوگ ایمان لے آتے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس امت کو جن جن آزمائشوں سے گزرنا تھا رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے رفقاء اعلیٰ مقام کو ان تمام آزمائشوں سے گزارا گیا، تاکہ فقہاء کے سامنے یہ نظیر موجود ہو کہ جو اسلام کا عہد غلبہ ہوگا جس میں آپ کسی علاقہ میں بحیثیت فاتح داخل ہوں گے اور جب آپ بحیثیت مفتوح یا مغلوب یا ایک کمزور شریک کی حیثیت سے جب آپ کسی قوم کے ساتھ ہوں گے تو اس وقت آپ کا طرز عمل کیا ہوگا، تو اس لئے ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور یہ آپ سب جانتے ہیں کہ فقہ کی تدوین کا اصل کام عباسی دور میں ہوا ہے، اور

وہی دور امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کا ہے، بلکہ اکثر مجتہدین کا وہی دور ہے اور اگر آپ غور کریں تو مسلمانوں کے غلبہ کا عروج کمال عباسی دور تھا، جب یورپ وافریقہ اور ایشیا تینوں برآعظموں میں اسلام کے غلبہ کا جھنڈا لہرایا جارہا تھا تو اس میں جو مسائل لکھے گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس وقت کے حالات کے اعتبار سے تھے اور فقہاء چونکہ اس طرح کے حالات سے نہیں گذرے جو مکی دور کا تھا جو حبشہ کا دور تھا، اس لئے انہوں نے اس کی طرف نسبتاً کم توجہ کی، اس لئے کہ انسان جن حالات سے گذرتا ہے تو اس کے بارے میں وہ زیادہ دقیق النظری سے کام لیتا ہے، زیادہ اس کی کھوج میں پڑتا ہے، تو ہمیں اصولی طور پر رسول اللہ ﷺ کا جو مکی دور ہے، اس دور کو سامنے رکھ کر ایسے مسائل کے بارے میں غور کرنا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فقہاء نے بھی اس کو ملحوظ رکھا ہے، آخر ہمارے یہاں دارالاسلام اور دارالکفر میں فرق کیا گیا ہے یا نہیں کیا گیا؟ اور اس فرق کی بنیاد کیا ہے؟ اس فرق کی بنیاد غالب اور مغلوب ہونا ہے، تو اس سے معلوم یہ ہوا کہ عہد غلبہ کے احکام اور عہد مغلوبیت کے احکام میں فرق ہونا یہ ایک فطری چیز ہے، یہ قرآن وحدیث سے بھی ثابت ہے اور فقہاء کے یہاں بھی اس کی نظیریں اور اس کی مثالیں موجود ہیں۔

تیسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسلام کا اصل مقصود حرب وجنگ نہیں ہے اور نہ دوسروں پر تسلط حاصل کرلینا، اصل مقصود اسلام کا امن ہے، اسی لئے ہمیشہ امن کی تعریف کی گئی اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ اگر مد مقابل صلح کے لئے تیار ہو تو تم کو صلح کو قبول کرنا چاہئے، صلح کی طرف تمہارا جھکاؤ ہونا چاہئے، تو ہم مذاکرہ اس نقطہ نظر سے دیکھیں کہ یہ اسلام کی اصل تعلیم مذاکرہ ہے، محاربہ اصل تعلیم نہیں ہے۔

اور چوتھی بات اس سلسلہ میں یہ ہے جس کو ہمارے بعض دوستوں نے غالباً ذکر بھی کیا کہ ہم اس نقطہ نظر سے بھی دیکھیں کہ یہ بین مذہبی مذاکرات دعوت کی پہلی سیڑھی ہے، دعوت کی پہلی بنیاد یہ مذاکرات ہیں جیسا کہ حضور ﷺ نے اہل کتاب سے فرمایا اور جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عذر محال کے طور پر جن جن چیزوں کی وہ پوجا کیا کرتے تھے ان کا ذکر کیا اور آخر میں ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جو عبادت کے لائق ہوں، تو ہم اس نقطہ نظر سے بھی دیکھیں کہ مذاکرہ کا مقصد صرف وقتی مسائل کو حل کرنا نہیں ہے، بلکہ دعوت اسلام کے فریضہ کو انجام دینا بھی اس کا ایک مقصد ہے۔

اور اس سلسلہ میں پانچویں بات یہ ہے کہ مذاکرات کے اندر خاص کر ہندوستان میں ہمیں یہاں کے مزاج کو ضرور سامنے رکھنا ہوگا، جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا، اس قوم کے مزاج دیگر قوموں کو ہضم کرنے کا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ ۱۹۴۸ تک لنگائیت کا شمار ہندوؤں میں نہیں تھا، کرناٹک اور آندھرا کے بڑے علاقے میں ان کی آبادی ساڑھے سات کروڑ ہے، اور ان کو آج تک اعتراض ہے کہ ہمیں ہندو کیوں کہا گیا، لیکن انہوں نے ان کو ہندو قرار دے دیا، جیسے سکھ ہیں، یہ کوئی ہندو نہیں ہیں، لیکن ہمارے ملک کے دستور میں ان کو ہندو قرار دے دیا گیا، جیسے بدھسٹ ہیں، مہاتما بدھ جی کی تحریک تو اٹھی ہی

B23

تھی ہندوفکر کی مخالفت کے لئے ، لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کو بھی ہندوقرار دے دیا گیا، اور آزادی سے پہلے جو آخری مردم شماری ہوئی تھی، اس میں جہاں اور مذہب کے نام آئے تھے وہاں ایک نام آیا تھا محمدی ہندو، بہت سے لوگوں نے اپنے نام کے ساتھ محمدی ہندو لکھا تھا، اور مرار جی ڈیسائی جو ملک کے وزیر اعظم بھی رہے ان کا بیان بھی تھا کہ ہم بہت سے خداؤں کی عبادت کرتے ہیں، مسلمان ہم سے صلح کرلیں، ہم محمد صاحب کی بھی عبادت کرلیں گے، ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہے، تو ان کے لئے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ جب اتنی لاکھوں کروڑوں خدا ہیں تو اگر ایک اور اضافہ ہوجائے تو اس سے کیا بگڑتا ہے، یہ بھی ہمیں پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ہم مذاکرات اتنی دانشمندی کے ساتھ کریں اور انہی اصولوں کی پابندی کے ساتھ کریں کہ ہماری شدت پسندی بھی ظاہر نہ ہو اور یہ بھی نہ ہوجائے کہ لوگ اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں، یہ جو ہندوتوا کا نام دیا گیا ہے، اس کا مقصد یہاں کی موجودہ اقلیتوں کو ضم کرنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہندوتوا کوئی مذہب نہیں ہے، یہ اس ملک کا کلچر ہے، اس ملک کی ثقافت ہے، آپ نماز پڑھیئے، اپنی مسجدیں رکھیئے، لیکن ہندوتوا آپ قبول کرلیجئے، تو ہمیں اس ملک میں خاص کر مذاکرات میں اس بات کو پیش نظر رکھنا ہوگا، ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم ومغفور کا ایک مضمون ہے، ہر سال یورپ میں تمام مذاہب آسمانی یعنی مسلمان، یہودی اور عیسائی، ان تینوں مذاہب کے تھنک ٹینک کا ایک پروگرام ہوتا ہے، تو اس میں ایک سال یہ بھی شریک ہوئے، اس مجلس میں یہ بحث تھی کہ مسلمان اہل مغرب کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، ڈاکٹر محمود صاحبؒ نے کہا کہ اس سلسلہ میں تین نظریئے پائے جاتے ہیں: ایک نظریہ تو شروع میں یہ تھا کہ مغرب سے لوگ بہت زیادہ نفرت کرتے تھے، ان کی ہر چیز ناپسند کرتے تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس نے مغرب کی ہر چیز کو قبول کرنا شروع کردیا، اور تیسرا گروہ وہ تھا جس نے بتایا کہ جو اچھی چیزیں ہیں اس کو قبول کرو اور جو خراب چیزیں ہیں اس کو قبول نہ کرو اور اس وقت مسلمانوں کا یہی نقطہ نظر ہے، تو ڈاکٹر صاحب نے اس میں لکھا ہے کہ مجھے حیرت ہوئی کہ کئی بڑے بڑے مستشرق علماء اور مفکر کھڑے ہوگئے اور انہوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ ہماری ٹکنالوجی اور علم تو حاصل کریں لیکن آپ ہماری ثقافت اور تہذیب کو برا کہیں، ہم اس کو برداشت نہیں کرسکتے، تو دعوت کے لئے مذاکرات ضروری ہے، لیکن اس خطرے سے بھی ہمیں آگاہ ہونا چاہئے کہ یہ مذاکرہ خدانخواستہ انضمام پر ختم نہ ہو۔

اور یہ بات کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ چونکہ بہت سی شرائط کی بات آئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مذاکرات کے لئے کچھ شرطیں تو متعین کی جاسکتی ہیں، لیکن ان کی تطبیق حالات اور اعتبار کے لحاظ سے ہوگی، اب آپ دیکھئے بنونضیر کا وفد حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے مسجد نبوی میں عبادت کرنا چاہا اور حضور ﷺ نے اس کی اجازت دے دی، ظاہر ہے کہ عام حالات میں اس کی اجازت نہیں ہوسکتی، لیکن حضور ﷺ نے ان کو اسلام سے قریب کرنے کے لئے ایک ایسا عمل قبول فرمالیا، ہم سب جانتے ہیں کہ حضور ﷺ حجاز کے میلے میں بھی گئے، عکاظ کے میلے میں بھی گئے اور وہاں بھی آپ ﷺ نے دعوت اسلام پیش فرمائی اور ہمیں معلوم ہے کہ ان میلوں میں کس طرح رقص وسرور کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں اور منکرات ہوتے تھے، لیکن حضور ﷺ دعوت کی

مصلحت کے لئے وہاں تشریف لے گئے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو بلایا جو ایک خاتون تھیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی، تو میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ اصول تو مقرر کئے جاسکتے ہیں، لیکن اس کی تطبیق وتنفیذ تو بہر حال یہ انفرادی اور جزوی حالات کے تابع ہوگی، میں بہت شکر گزار ہوں مولانا عتیق احمد بستوی صاحب کا کہ انہوں نے مجھے اظہار خیال کا موقع عطا فرمایا۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

ملک کے جو موجودہ حالات ہیں ان میں تو خواہی ناخواہی یہ راستہ ہم کو اپنانا پڑے گا، مسئلہ اس کا ہے کہ ہم اس کے لئے تیار ہوں، اور مذاکرات میں ہوتا یہ ہے کہ اسلام کی نمائندگی ان لوگوں سے کرائی جاتی ہے جو خود مسلمان نہیں ہوتے، اسلام سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں ہے کہ ابھی ہمارے طبقہ علماء میں ایسی بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو ایسے اجتماعات میں نمائندگی کرسکیں، بین مذاہب مذاکرات کے موضوع پر مذاکرہ میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ ان مذاہب کا مطالعہ بھی ہو اور ان زبانوں سے واقفیت بھی ہو، بہر حال موجودہ حالات میں یہ کام بہت ضروری ہے اور ایک بات اور بھی ہے کہ اس وقت امریکہ اور یورپ کے عیسائی اور یہودی کا احساس یہ ہے کہ اس وقت الحاد اور دہریت کا جو دور چل رہا ہے اور بڑھتا جارہا ہے، اس میں ان تمام مذاہب کی جو مشترک قدریں ہیں وہ بھی خطرے میں ہیں، اسی طرح اس وقت مغرب میں قانون سازی میں اور سماج میں فواحش اور منکرات کا ایک سیلاب ہے، ان کو روکنے کے لئے بھی کیا کچھ کوششیں ہونی چاہئیں، اب ان کی طرف سے بھی یہ باتیں آتی ہیں اور وہ وہاں مسلم علماء سے اور مسلم قائدین سے مذاکرات کرتے ہیں اور حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا عبدالرحیم حسنی کشمیری:

دو تین باتیں مجھے عرض کرنی ہیں: ہمارے یہاں کشمیر میں امرناتھ یاترا ہوتی ہے، سوالنامہ میں وہ شق آنی چاہئے تھی جو نہیں آپائی، امرناتھ یاترا میں ہندو بڑی تعداد میں آتے ہیں، پہلے ہزاروں میں تھے، اب لاکھوں میں آنے لگے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی وغیرہ بھی ہوتی ہے، اور اس میں جو عملہ ہوتا ہے چاہے وہ سیکوریٹی کا عملہ ہو، طبی عملہ ہو اور جو لوگ گھوڑوں پر وہاں تک ان کو لے جاتے ہیں، یہ سب مسلمان ہوتے ہیں، اس میں جو شرکاء ہیں وہ تین قسم کے ہیں: ایک پولیس کا عملہ، وہ تو شرکت پر مجبور ہے، اور دوسرا طبی عملہ ہے، وہ بھی کسی حد تک مجبور ہے، اور تیسرا وہ ہے جو ان کو لے کر گفا تک جاتا ہے، ان کی روزی روٹی کا مسئلہ اس سے وابستہ ہے، تو اس سلسلہ میں بھی فقہ اکیڈمی کی طرف سے رہنمائی کی ضرورت ہے، کہ ان تینوں صورتوں میں کیا حکمت عملی اپنائی جائے، کیونکہ ہمارے یہاں یہ مسئلہ عملاً پیش آرہا ہے، میں نے اپنے مقالے میں غیر مسلمین کے ساتھ معاملات میں جو شرکت ہوتی ہے، اس میں میں نے تفصیل سے کانگریس کے تین ادوار کا تجزیہ اور اس تاریخ کو پیش کیا ہے، چونکہ فقہ اکیڈمی مسلمانوں کا ایک علمی

وفقہی پلیٹ فارم ہے، اور مسلمان اس سے رہنمائی کی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں، تو یہاں سے آج کل کے حالات کے مطابق جو رہنمائی ہو وہ جامع اور بھرپور ہونی چاہئے اور اس میں تمام شقوں کا خیال ہونا چاہئے اور سابقہ تجربات جو ملک کی تقسیم سے پہلے سے لے کر ملک کی تقسیم کے بعد اب تک ہوئے ہیں، ان سے بہرحال ہمیں صرف نظر نہیں کرنا چاہئے، شرکت کے سلسلہ میں ہم صرف فقہی نظائر کو سامنے نہ رکھیں، بلکہ عملاً جو کچھ ملت اسلامیہ ہند کے ساتھ پیش آیا ہے اس کو بھی ہم ذہن میں رکھ کر ملت کی رہنمائی کریں، یہ بہت ضروری چیز ہے۔

دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ بین المذہبی مذاکرات کے سلسلہ میں تجربہ اور ہمارے اکابر کے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ اگر آدمی روحانی اور عملی طور پر مضبوط نہ ہو تو بجائے اس کے کہ وہ داعی ہو وہ مدعو بن کر واپس آتا ہے، حضرت شاہ عبد العزیز کا ایک واقعہ ہے، ان کے دور میں ایک فتین کھڑا ہو گیا تھا، حضرت نے کہا وہاں مت جاؤ، اس نے کہا میں جاؤں گا، اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ اس کا جو مرید بنتا تھا وہ بھویں بھی مونڈ الیتا تھا اور تمام بال مونڈ الیتا تھا، سر پر دیگچی لے کر آتا تھا، تو حضرت نے اس کو منع کیا، مگر وہ وہاں گیا اور وہی صورت بن کر آیا۔ اور مرزا قادیانی کا مشہور واقعہ ہے کہ حکیم نور الدین جو اس کا پہلا جانشین بنا ہے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، لہذا وہ چیزیں بھی ہمارے سامنے رہنی چاہئیں۔

مفتی ارشد فاروقی:

بین مذہبی مذاکرات اصول و آداب، ہمہ جہت ہے، مفید و نافع ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ مذاکرات کون لوگ کریں؟ اس سلسلہ میں ابھی کچھ رہنمائی سامنے آرہی ہے، اس میں مزید وسعت اس طرح دی جاسکتی ہے، علامہ شامی کا وہ جملہ ہم بہت سنتے اور سناتے ہیں ''من لم یعرف أحوال زمانه فهو جاهل'' مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف مذاہب ہیں، مختلف اقوام ہیں، مختلف زبانیں ہیں، مختلف رسوم ہیں، مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کیا اس سے واقف ہوتے ہیں، ہمارا احساس یہ ہے کہ مدرسہ سے فارغ کسی طالب علم کو ہندوستان کے کسی بازار میں رکھ دیا جائے تو وہ بازار والوں سے بات کرنے کی قدرت عمومی طور پر نہیں رکھتا، ایسے ماحول میں اس بات کی ذمہ داروں کے لئے بہت بڑی اور اہم ضرورت ہے کہ صرف ایک چھوٹا سا عنوان جو بڑا وسیع ہے، اکیڈمی مدارس سے گذارش کرے اور اس کے سرپرستان و ذمہ داران مطالعہ ہند کو اپنے مدارس کے نصاب میں شامل کریں، اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگ تیار ہوں گے جو پوری باتیں کریں گے۔

دو باتیں مجھے اور عرض کرنی ہیں: ہندوستان میں تمام مذاہب کے رہنماؤں کا ایک متفقہ پلیٹ فارم تیار کرنے کی کوشش کی جائے، جہاں کم سے کم سالانہ ایک اجتماع ہو، تا کہ ایک دوسرے سے واقفیت ہو سکے، اور یہ بات کہ مذاکرات کس سے ہوں، اس وقت ہندوستان میں ہر طرف سے اکھڑ کر ایک لمبے عرصے سے محنت کے بعد جو عنوان سامنے آرہا ہے وہ ہے RSS، تو RSS سے دوبدو براہ راست مذاکرات کا آغاز اکیڈمی کو تمام علماء کے ساتھ مل کر کرنا چاہئے، جو دعوتی نقطہ نظر سے انشاء اللہ بہت ہی نفع آور ہوگا۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

جہاں تک مدارس کے نصاب میں داخل کرنے کی بات ہے، تو میں نے شروع میں عرض کر دیا ہے کہ تیاری کی ضرورت ہے، ہمارے پاس واقعی ان افراد کی کمی ہے جو اس میدان میں آگے بڑھ سکیں، لیکن اللہ کا فضل یہ بھی ہے کہ ان ہی مدارس سے وہ لوگ پیدا ہو رہے ہیں، جو مختلف میدانوں میں کام کر رہے ہیں اور ان میں کام کرنے کا حوصلہ ہے، اور مدارس کے فضلاء ڈھیرے ڈھیرے دوسری زبانیں سیکھ رہے ہیں، انٹرنیٹ کا استعمال وغیرہ کے میدان میں وہ ترقی کر رہے ہیں، تو اگر سنجیدگی سے مدارس کے نصاب میں کچھ تبدیلیاں اگر درکار ہیں تو اس کو مرتب کیا جائے اور باقاعدہ ان ذمہ داروں کے پاس بھیجا جائے، اور جہاں تک مذاکرات کی بات ہے اور مولانا کی تجویز ہے کہ RSS سے گویا فقہ اکیڈمی ڈائیلاگ کرے تو ہمارے پاس تو افراد ہی ایسے نہیں ہیں تو ہم ڈائیلاگ کیسے کریں؟ ابھی تیاری کرنے کی ضرورت ہے، تا کہ کچھ لوگ ایسے تیار ہو جائیں جو ڈائیلاگ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں، تب تو ہم سوچ سکتے ہیں، ابھی یہ تجویز قبل از وقت ہے۔

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی:

متوارث تہذیب وثقافت سے جائز امور کو کسی مصلحت کی وجہ سے ترک کرنے کا جو مسئلہ تھا، ہم نے یہ سمجھا تھا کہ ایسی چیزیں جو مسلمانوں میں رواج پا گئی ہوں، لیکن کتاب وسنت اور کسی شرعی دلیل سے وہ ثابت نہ ہوں، جیسے بعض ممالک کی ایک مخصوص شکل ہے، ہم نے مسلمانوں کے شعار کے ترک کی بات نہیں کہی ہے، یہ وضاحت ہم نے کر دی ہے، اگر غلط فہمی ہو تو معذرت ہے۔

مفتی سلطان کشمیری:

غیر مسلمین سے مذاکرات کے بارے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن کریم نے اہل کفر کی دو قسم بیان کی ہیں اور پہلے سے ابھی تک موجود ہے، ایک تو وہ جنہوں نے باضابطہ طور پر اسلام کی مخالفت کو اپنا مشن بنایا ہے، اور دوسرا وہ طبقہ ہے جن کے یہاں نرم گوشہ ہے، وہ مسلمانوں کا بھی احترام کرتے ہیں اور اسلامی قوانین کو بھی بہت زیادہ احترام سے لیتے ہیں، تو اس طبقہ میں جو نرم گوشہ رکھتا ہے ان سے مذاکرات کا تو انشاء اللہ فائدہ ہوگا، لیکن دوسرا وہ طبقہ جن کے یہاں تشدد ہے، ان سے مذاکرات اور دعوت کے لئے ہم میں سے عام آدمی کوئی نہ جائے، بلکہ ہم میں سے جو دین کے لحاظ سے پختہ ہیں اور اہل تقوی ہیں، اگر وہ ان سے مذاکرات کریں اور دعوت دیں تو امید ہے کہ کہیں سے کوئی فائدہ نظر آئے گا اور اس میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔

مفتی زاہد علی خاں:

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ دینیات میں تمام مذاہب کے مطالعہ اور تحقیق وریسرچ کا مکمل نظم ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ ریسرچ میں کس طرح کا معاملہ ہوتا ہے، ہم نے مدارس سے فارغین کے لئے ایک پیپر انڈین

ریلیجین اینڈ کلچر بنایا، یعنی ہندوستانی مذاہب اور اس کی تہذیب، جس کو ہم صرف مذہب کے نقطہ نظر سے لیتے ہیں، اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ مذاہب کی مشترکہ قدریں بہت زیادہ ہیں اور چونکہ ہم جن کو ہندو کہتے ہیں مذہبی طور پر وہ اس طرح نہیں ہیں، یہ ایک سیاسی طور پر یا سماجی طور پر کہا جاتا ہے، حقیقتاً ہندو کوئی نہیں ہوتا، مذہبی طور پر کوئی اصطلاح پائی نہیں جاتی، تو ان میں جو مذاہب ہیں اور ان کی جو مذہبی مسلمہ کتابیں ہیں ان کا علاحدہ علاحدہ مطالعہ کرنے کے لئے ہمارے لوگوں میں سے مقرر کیا جائے، کافی سرمایہ اردو میں اور اس کے علاوہ دوسری زبانوں میں بہر حال موجود ہے اور ہم اگر ان میں سے مشترکہ قدریں تلاش کریں گے تو ہمیں بہت سی چیزیں ایسی مل جائیں گی کہ ہم ان سے مذاکرات کرنے میں اپنی پوزیشن کو انشاء اللہ ان سے بہتر محسوس کریں گے، میں نے ذاتی طور پر بھی کبھی کبھی اس کی کوشش کی ہے اور الحمد اللہ اس طرح کے پروگراموں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، اور جیسا ہم جانتے ہیں کہ اگر ساڑھے تین فیصد برہمنوں کی تعداد سے ہم صرف نظر کرلیں تو ہندوستان کی بقیہ ۹۰ فیصد جو تعداد ہے وہ ہم سے کسی طرح سے بھی نہ مذہبی طور پر اور نہ پوری طرح سیاسی طور پر ٹکرانا چاہتی ہے، بلکہ وہ ہم سے اتحاد چاہتی ہے، ہمیں اپنے نقطہ نظر کی ان کے سامنے مستقل وضاحت کرتے رہنا چاہئے، اور یہ بغیر ملے جلے اور ڈائیلاگ کے بغیر ممکن نہیں ہے، ہمیں ایک ٹیم تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ان کی قدروں کو پہچان لے اور اپنی قدروں کو بھی، تو پھر اس کے بعد انشاء اللہ مذاکرات کامیابی کے ساتھ ہوں گے، اور ہمارے لئے کافی مفید ثابت ہوں گے۔

مولانا فضل کریم آسام:

دو سال پہلے میرا ہندوؤں کے اجلاس میں جانا ہوا تھا، جو کہ خالص مذہبی اجلاس تھا، مجھے باقاعدہ اجلاس میں بلایا گیا تھا، اور الحمدللہ میری تقریر جم کر ہوئی، اور عام طور پر مندروں میں ایک گانا بجایا جاتا ہے، اوم ہرے کرکے، جس گانے کا مطلب تقریباً وہی ہے جو سورہ فاتحہ کی آخری تین آیت کا معنی ہے، میں نے وہ بیان کیا تو اس کے دو تین دن بعد کافی لوگ آئے اور میری دعوت پر ان لوگوں نے اسلام قبول کرلیا، تو میرے خیال میں ان کے اجلاس میں شرکت سے جو منع کیا جارہا ہے، میرے خیال میں یہ نہیں ہونا چاہئے، اگر کسی کے اندر یہ بات ہے کہ وہ جاسکے تو اجازت ہونی چاہئے، دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں درگا پوجا ہوتی ہے، پوجا کے وقت ہم دیکھتے ہیں کہ اختلاف بھی ہوگیا تھا، سیاسی معاملہ میں ہمارے یہاں آسام میں خاص طور پر، تو وہ مورتی ندی میں پھینکنے کے لئے جارہے تھے، وہ بھی ان کا مذہبی کام ہے، راستہ میں جتنی بھی مسجدیں پڑیں وہاں مسلمان لوگ پانی لے کر کھڑے تھے، ان کو پانی پلا رہے تھے اور وہ لوگ جارہے تھے، تو یہ اس کو بڑا ہی اتحاد و اتفاق کا معاملہ سمجھا گیا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں عید کی نمازیں ہوتی ہیں اور میدان میں لوگ جاتے رہتے ہیں تو ہندو لوگ مندر سے نکل کر وہاں پانی وغیرہ پلاتے ہیں، تو کیا اس کی گنجائش ہے کہ ہندو لوگ جب پوجا کے لئے جاتے ہیں، مورتی لے کر جاتے ہیں مسلمان مسجد کے سامنے کھڑے ہو کر پانی پلائیں؟ میرے خیال میں اس کو بھی سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ ہوجائے تو بہتر ہوگا۔

مفتی مقصود فرقانی:

بڑی معذرت کے ساتھ اور بغیر تنقید کے بہت مؤدبانہ طریقہ سے مجھے یہ بات عرض کرنا ہے کہ مولانا اختر امام عادل صاحب نے جو عرض مسئلہ پڑھا، اس میں خواتین کی نشست کے بارے میں، ان کی تقاریر وغیرہ سننے کے بارے میں جن دو نقطوں کو بیان کیا کہ پندرہ حضرات کے مقالے تھے، وہ جواز کے تھے اور پانچ کے عدم جواز کے، انہوں نے ان پندرہ کی رائے تو ظاہر کی ہے، لیکن ان پندرہ حضرات نے جن پہلو کی روشنی میں وہ رائے ظاہر کی ہے ان کو بیان نہیں کیا، جس کی وجہ سے وہ رائے کالعدم ہوگئی، اور پانچ کی رائے بھی ظاہر کی اور پانچ کے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جس میں وہ خود بھی ہیں، تو وہ رائے غالب آ گئی، اس لئے عارضین حضرات آئندہ ان چیزوں کا لحاظ رکھیں کہ پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جائے اور رائے کو بھی ظاہر کیا جائے، تاکہ صحیح وضاحت ہو جائے۔

مفتی انور علی اعظمی:

عرض مسئلہ میں یہ بات کہی گئی کہ مسلمانوں کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ اس پر خاموش بیٹھیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اتر پردیش جیسی ریاستیں جہاں باقاعدہ حکومت کی طرف سے اس پر پابندی عائد ہے، اس سلسلہ میں مسلمان کیا کر سکتے ہیں اور اگر فتوی بھی پوچھا جاتا ہے تو دیوبند اور دوسرے تمام اداروں کے حضرات انتہائی حکمت سے کام لیتے ہیں اور مستفتی کو یہ جواب دیتے ہیں کہ گائے کی قربانی کرنا ہمارے لئے حکومت کی طرف سے عائد پابندی کی صورت میں صحیح نہیں ہے، تو اس کے لئے جدوجہد کرنے کی بات کہی گئی ہے تو وہ جدوجہد کس طرح کی ہو، اس سلسلہ میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ آج سے تقریبا سوا سو سال پہلے 1892 میں جب مئوناتھ بھنجن ایک چھوٹا سا قصبہ رہا ہوگا، اسی موقع پر ہزاروں ہندوؤں نے ہمارے قصبہ کو گھیر لیا، اور دونوں فریقوں کے درمیان بہت بڑی معرکہ آرائی ہوئی اور مسلمان شہید بھی ہوئے، تو اس وقت تو گنجائش تھی، مگر آج جب باقاعدہ اتر پردیش جیسی ریاستوں میں گائے کشی کی پابندی کا قانون بن چکا ہے اس سلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس پر بھی ہمیں غور کرنا چاہئے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

یہ تو واقعی مسئلہ ہے کہ جہاں پر قانون بن چکا ہے اور عملاً اس کا نفاذ ہے اور وہاں اگر اس کی خلاف ورزی کی جاتی ہے، وہاں بڑا فتنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور خطرات ہوتے ہیں، بعض وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے، وہاں اس کے باوجود بھی لوگ کرتے ہیں اور کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، تو ظاہر ہے کہ وہاں کے اصحاب افتاء وہاں کے حالات کی روشنی میں ایک رائے دے رہے ہیں کہ اس کو نہ کرنا بہتر ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

ایک تو ہے کسی مباح چیز سے رک جانا، اور ایک ہے اس کی ممانعت کو گویا قبول کرلینا، تو یہ جو دوسری شکل ہے یہ تحریم حلال کی شکل ہے، تو ہم وہاں یہ فتوی دے سکتے ہیں کہ شریعت میں اس کی گنجائش ہے، لیکن جہاں اس سے فتنے کا اندیشہ ہو وہاں آپ اس سے باز رہنے کی کوشش کریں، تاکہ مسلمانوں کے ذہن میں جو اس کی حلت ہے وہ باقی رہے، ایسا نہ ہو کہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی سوچ ایسی بن جائے، اور ایسی شکل بھی نہ ہو کہ جس سے فتنہ وفساد پیدا ہو۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی:

بین مذہبی مذاکرات میں مجوسی بادشاہ کے دربار میں ربیع بن عامرؓ کا مذاکرہ اور بادشاہ حبشہ کے یہاں حضرت جعفر طیارؓ کا مذاکرہ یہ سب نمونے ہمارے پیش نظر ہیں، میں اس ملک میں کم سے کم اپنی برادری میں ایسا شخص ہوں کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں غیر مسلموں کے ساتھ میرے مذاکرات سال بھر میں کم سے کم 50 تو ہوتے ہی ہوں گے، اور بارہ بنکی کے علاقہ میں تو آج تک تو یہ ہے کہ میرا جانا ہوتا ہے تو مندروں سے میری آمد کا اعلان ہوتا ہے، انبالہ میں RSS کے بہت بڑے ممبر بہار کے گورنر اور پارلیمنٹ کے اسپیکر سورج بھان جی نے جب میری بات سنی تو یہ ریکارڈ میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں آج پہلی مرتبہ اسلام کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہوا ہوں، ابھی راجستھان کے اسی طرح کے ایک پروگرام میں شرکت ہوئی جہاں غیر مسلموں کی بڑی تعداد موجود تھی اور اس میں سیاسی رہبر بھی تھے اور انہوں نے یہ طے کیا کہ ہمیں خود اپنے معاشرہ میں مسلمانوں کو سمجھنا ہوگا اور ان سے ہمیں قریب رہنا ہوگا، یہ خود انہوں نے اعلان کیا، شیخوپورہ بہار کے ہندو کلکٹر نے جب باتیں سنی تو انہوں نے فوری طور پر کئی ہزار روپئے نکالے اور کہا کہ میں منتظمین مدرسہ کو یہ روپئے اس لئے دیتا ہوں کہ وہ قرآن شریف منگوائیں اور اس کو پڑھوائیں، کیونکہ قرآن پاک کی تعلیم ہی آج انسانیت کے لئے بہت بڑی چیز ہے، اس طرح کے مختلف نمونے میرے سامنے رات دن آتے ہیں، بیڑ جو مہاراشٹرا کا بڑا مشہور شہر ہے، شیوسا گرسنگھ کانگریس کے منسٹر تھے، انہوں نے پروگرام میں پرتبھا پاٹل جو صدر جمہوریہ تھیں ان کے ساتھ مجھے بلایا اور اس پروگرام کے بعد انہوں نے جو مجھ کو لیٹر دیا اگر آپ اسے پڑھیں تو محسوس کریں گے کہ بین مذہبی مذاکرات کے کتنے اہم فائدے ہوتے ہیں، جالون میں فساد تیار تھا، وہاں لوگوں نے طے کیا کہ ایک پروگرام سب لوگوں کے ساتھ مل جل کر کیا جائے، چنانچہ پروگرام ہوا اور لوگوں نے عہد کیا کہ ہم کبھی کسی مسلمان کے ساتھ لڑیں گے نہیں، میرا تجربہ یہ ہے کہ اس طرح کے مذاکرہ میں ہندو طبقہ جو ہے وہ علم پسند ہے اور میں نے محسوس کیا کہ علم کے عنوان پر ان کے اندر تشدد نہیں ہے، تحمل ہے، اور بہت سی بات جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن ان کے عمل میں نہیں ہے، ان کی ویدک پستکوں کے حوالے سے جب یہ بات کہی جاتی ہے تو وہ نرم پڑتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس طرح کے مذاکرات میں خصوصی طور پر ان کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی زبان کا استعمال ہو، ابھی اوم کا ذکر کیا گیا، میں لوگوں کو بتاتا ہوں کہ دیکھو اوم لکھا جاتا ہے بائیں طرف سے، تین شوشے، آگے

جا کر جب وہ مڑتا ہے تو وہ گول بنتا ہے اور اس کے اوپر ایک نقطہ ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک نقطہ رکھا جاتا ہے، میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ ہندو مذہب میں اوم کا استعمال اگر چہ ان کے عقیدہ کے مطابق بھگوان کے لئے ہوتا ہے، لیکن گاندھی جی نے احمد آباد کے گاندھی آشرم میں جو اپنے ہاتھ کے چودہ نمونے چھوڑے ہیں اس نمونے میں گاندھی جی نے لکھا ہے کہ یہ جو تیسرا شوشا ہے، میں نے کہا یہ تو سب پڑھتے ہیں مگر گاندھی جی نے جو آگے لکھا ہے وہاں جا کر آپ پڑھیں گے تو محسوس کریں گے کہ آخری شوشہ جو ہے یہ محمد لفظ کی دال ہے اور یہ جو گول مڑا ہے یہ محمد کا میم ہے اور یہ چاند اور جو نقطہ ہے یہ میم کی تشدید ہے اور آگے خود گاندھی جی نے اپنی تحریر میں ح اور م کو واضح کیا ہے، اس طرح گائتری منتر کے شروع میں جو اوم لفظ آیا ہے اور جس میں سورج دیوتا سے پرارتھنا ہے، یہ دراصل خود محمد رسول اللہ ﷺ سے ان کی عقیدت کا اظہار ہے، تو اس قدر وہ لوگ خوش ہوتے ہیں، اس قدر قریب آتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ فاصلہ مٹ گیا ہے، رہ گئی بعض وہ چیزیں جن کو وقت کے تقاضے کے مطابق ترک کر دینا چاہئے، ہمارے بہت سارے حضرات نے اس کا ذکر بھی کیا ہے، میں ایک تجرباتی مثال آپ کو دیتا ہوں، میں جب کناڈا گیا تو میں نے ہری پگڑی باندھ رکھی تھی، میری ہری پگڑی دیکھ کر وہاں کے علماء میں چرچا ہونے لگی کہ یہ بدعتی مسلک کے تو نہیں ہیں، جب میں نے یہ بات سنی تو مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے تو سنت سمجھ کر ہرے رنگ کی پگڑی باندھی تھی، مجھے ایک بات یاد آئی حضرت ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ میں لکھا کہ اگر کوئی سنت اہل بدعت کا شعار بن جائے تو اس کا ترک افضل ہے، اسی طرح مسلمانوں کا کوئی ایسا عمل اگر فتنہ وفساد کا سبب بن جائے تو اس کا ترک بہر حال اسلام ہے، غیر اسلام نہیں۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

میں مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ نوجوان فضلاء کو تیار کریں، تاکہ امت کے لئے وہ اس کام کو آگے بھی جاری رکھیں۔

مولانا شمس الدین:

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ فقہ اکیڈمی اس سلسلے میں کوئی اقدام کرے اور کوئی ایک تربیتی کورس مرتب کیا جائے اور اس کا نصاب تیار ہو جس سے نوجوان فضلاء امت کے اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے تیار ہو سکیں، تو انشاء اللہ یہ ایک بہترین اور مستحسن اقدام ہوگا، اور میں درخواست کرتا ہوں مولانا شاہین جمالی صاحب سے کہ وہ اپنے ادارے میں الگ سے اس سلسلہ میں ایک ادارہ قائم کریں، انشاء اللہ ہم لوگوں کا تعاون اس میں رہے گا، تاکہ اس کے لئے کچھ افراد تیار ہو جائیں۔

چودھری صاحب:

میں فقہ اکیڈمی کے علماء حضرات کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں کچھ مسلمان ہندوؤں کی پوجا وغیرہ میں

شرکت کرتے ہیں اور وہ دوطرح کے ہوتے ہیں: مجبوری طور پر اور ایک اجتہاہی طور پر، مجبوری یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کے پاس بطور چندہ پیسے مانگنے آتے ہیں، اور اگر چندہ نہ دیا جائے تو فساد ہونے کا امکان ہوتا ہے، اور کچھ اجتہاہی طور پر اور ہمارے کچھ مسلمان بھائی مورتیاں بنانے والوں کے یہاں کام کرتے ہیں، اسی طرح سیاست داں ووٹ کے لئے ان کے مکتب پر جاتے ہیں اور پیسے وغیرہ دے کر ان کا تعاون کرتے ہیں، ان کے مندروں میں جاتے ہیں پیسہ بھی دیتے ہیں اور ان سے ملاپ کر کے ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں، تو یہ سب ہمارے خیال میں شرعا بالکل ناجائز ہے اور حرام ہے، اور دیکھنا یہ ہوگا کہ ان سب کاموں سے ہم اپنے بھائیوں کو کیسے واپس لائیں، اس بارے میں غور وفکر کرنے کی درخواست ہے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

اس نشست کے لئے جو وقت طے کیا گیا تھا، اس سے کافی زیادہ وقت ہو گیا ہے، میں معذرت خواہ ہوں ان حضرات سے جن کا نام آیا اور وقت کی کمی وجہ سے بلایا نہیں گیا، ان سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنی باتیں لکھ کر بھیج دیں، تا کہ تجویز کمیٹی کے سامنے وہ ساری باتیں موجود رہیں۔

☆☆☆